

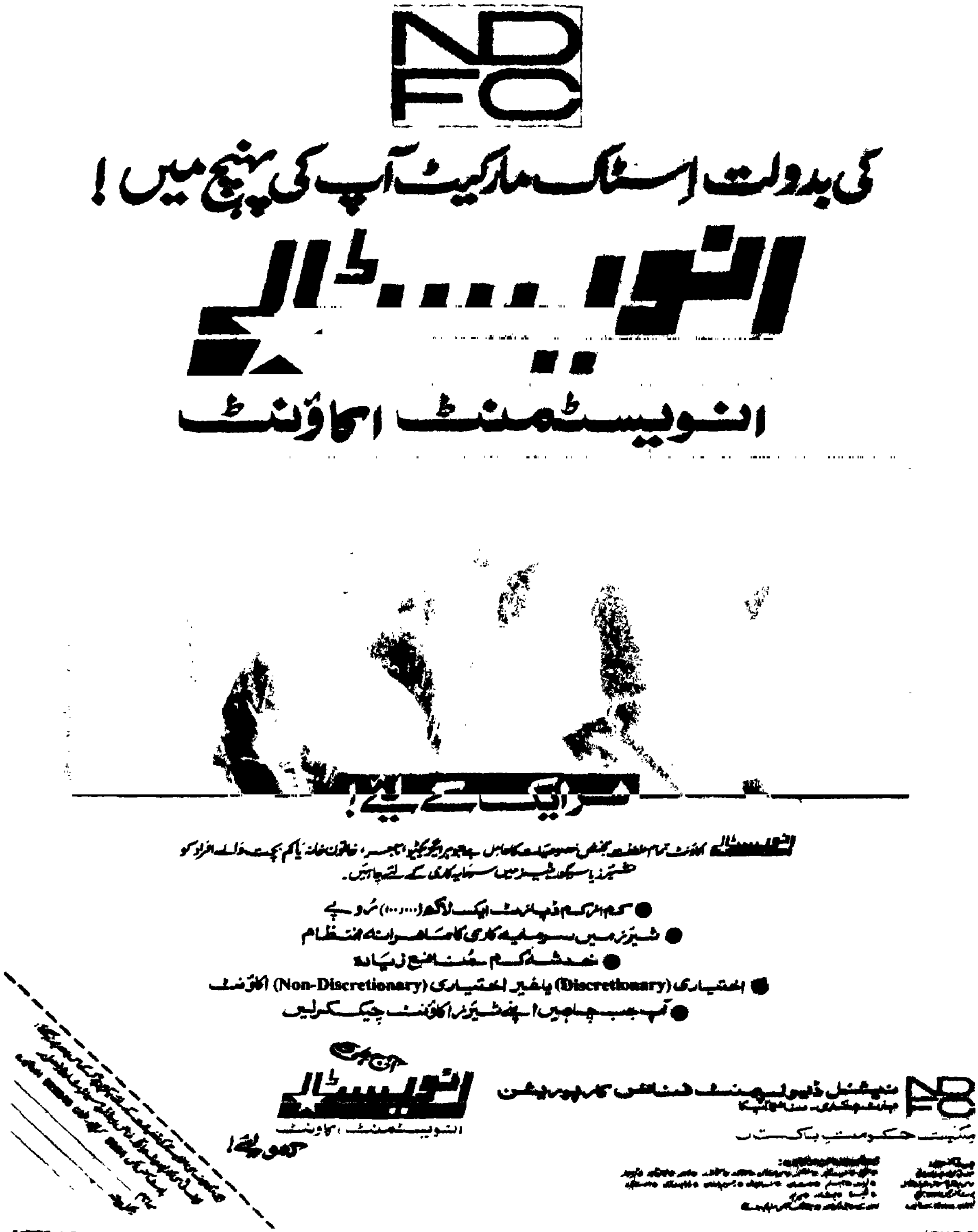
DUE DATE

Late Fine Re. 1.00 per day for first 15 days.
Rs. 2.00 per day after 15 days of the due date.

سیپ کراچی

" قرآنِ حکیم کی مقدّس آیات اور احادیثِ نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہوں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔"

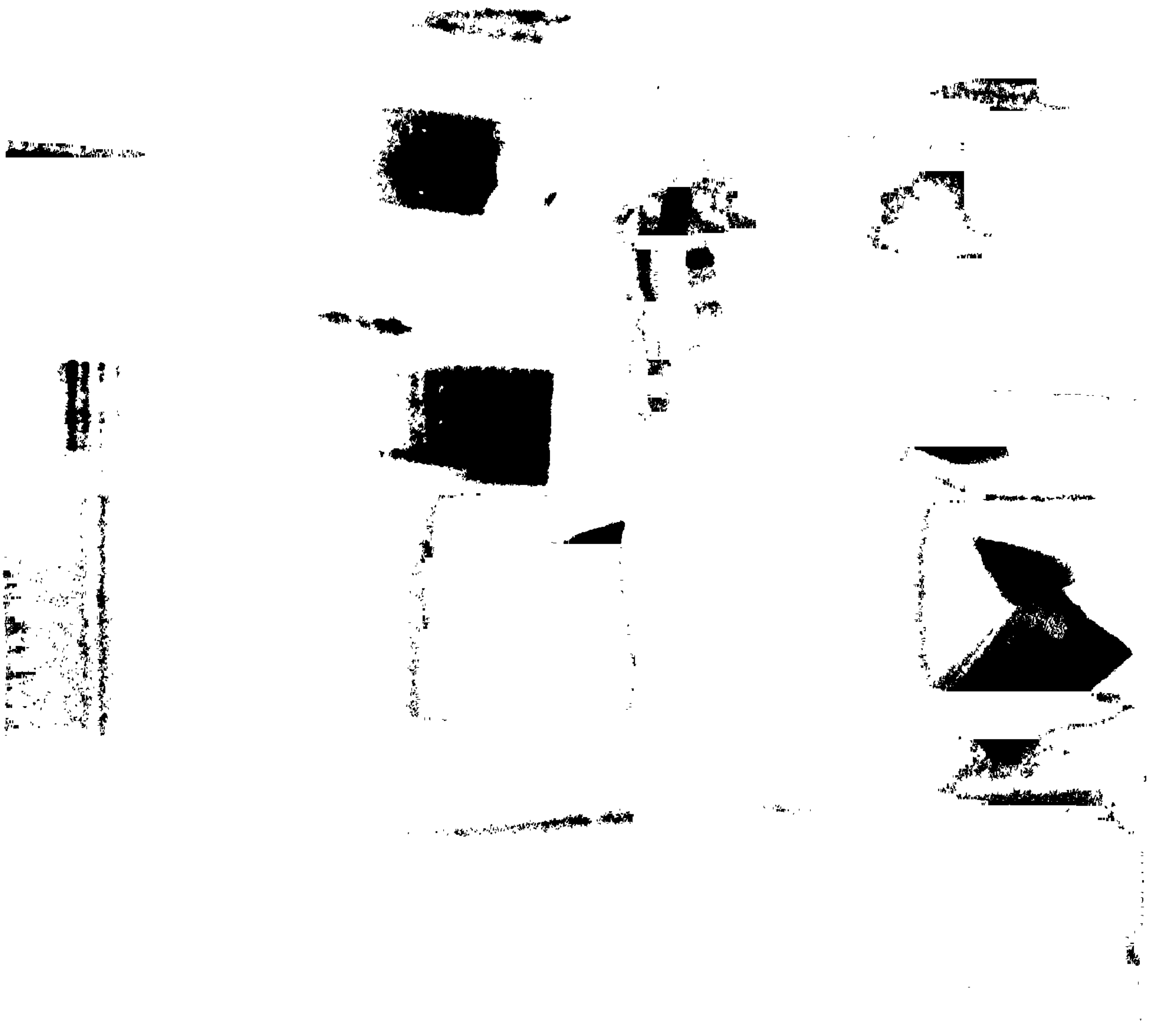
سیپ کراچی ۔۔ ۵



NDFC
کی بدولت اسٹاک مارکیٹ آپ کی پہنچ میں!
انویسٹال
انویسٹمنٹ اکاؤنٹ
ہر ایک کے لیے!
کم از کم ڈپازٹ ایک لاکھ (۱۰۰،۰۰۰) روپے
شیئرز میں سرمایہ کاری کا ماہرانہ انتظام
خدشہ کم منافع زیادہ
اختیاری (Discretionary) یا غیر اختیاری (Non-Discretionary) اکاؤنٹ
آپ جب چاہیں اپنے شیئرز اکاؤنٹ چیک کرلیں
آج ہی انویسٹال انویسٹمنٹ اکاؤنٹ کھولیے!
نیشنل ڈیولپمنٹ فنانس کارپوریشن
ملکیت حکومت پاکستان
NDFC-1-84
ASIATIC

سیپ کراچی ــــ ۷

نہ وقت کا زیاں نہ انتظار کی زحمت
پاکستان میں روزانہ ۱۸۲ پروازوں کی سہولت



ان میں ہماری روزانہ ۲۴ بین الاقوامی پروازیں بھی شامل کیجئے تو ہم ہی آپ کو روزانہ دوسروں سے کہیں زیادہ مقامات تک پروازیں فراہم کرتے ہیں۔ خاص طور پر ہمارے اندرون ملک دائرۂ پرواز کا مقابلہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔ مثلاً صرف کراچی اور لاہور کے درمیان ہم روزانہ تقریباً ساٹھ پروازیں پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح ملک میں دیگر مقامات تک رسائی کے لئے ہم آپ کی سہولت کے مطابق ہر وقت تیار ہیں۔ پروازوں کا وسیع ترین دائرۂ کار ہمارے ساتھ سفر کا ایک اور جواز۔

PIA
پاکستان انٹرنیشنل



Dirty, [illegible] extraordinary furniture [illegible]

Classic cleaners has managed to retain the look of many interiors to their original form.
Offices or homes, Classic cleaners has a way with carpet cleaning.
Using the most modern machines, specially formulated chemicals and the Classic touch, your carpets remain as good as new.
Special on-the-spot cleaning facility at your place adds convenience for the customers.
And that's one of our prime objectives too.

Get your carpets Classic cleaned

CLASSIC CLEANERS (PRIVATE) LTD

BAHADURABAD	CLIFTON	GARDEN EAST	Main Korangi Road,	N NAZIMABAD	SADDAR	FACTORY
Ph 4939411	Ph 573820	Ph 7226525	Phase-1 D H A	Ph 6649705	Ph 518105-527746	Ph, 6316616-6328588
BURNS ROAD	DEFENCE	LANDHI-KORANGI	MALIR HALT	NEW TOWN	UNIVERSITY ROAD	CARPET CLEANING UNIT
Ph 2633515	Ph 5840867	Ph 319480	Ph 480809	Ph 7218131	Ph 473734	Ph 6331391

CC/07/93

حبیب بینک

ایک مکمل بینک



حبیب بینک اپنی نت نئی اسکیموں کے ذریعے بین الاقوامی سطح پر جدید بینکاری کی خدمات پیش کرتا ہے۔ بینک کمپیوٹرز، آٹوکیش مشینوں اور جدید ٹیلی کمیونیکیشن سسٹمز سے لیس ہے۔

ملک کے اندر اور بیرونِ ملک اپنی پھیلی ہوئی شاخوں کے وسیع جال، ذیلی اداروں، جوائنٹ وینچرز، مینیجنگ ایجنسیز، نمائندہ دفاتر اور دنیا بھر میں بڑے تجارتی مراکز میں غیر ملکی نمائندوں کے ذریعے حبیب بینک قومی اور بین الاقوامی سطح پر ہر طرح کی بینکاری خدمات انجام دینے میں پیش پیش ہے۔

بہتر خدمت کی روایت

حبیب بینک لمیٹڈ

PID (Islamabad)

فکرِ نو کا ترجمان

ماہنامہ

سیپ

شمارہ : ۶۲

ناولٹ نمبر

مدیر :

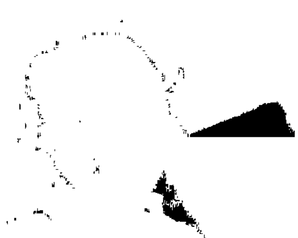
نسیم درّانی

قیمت فی پرچہ: تیس (۳۰) روپے

سیپ پبلی کیشنز

پوسٹ بکس: ۳۲۲۴ کراچی ۷۵۷۳۰
فون : ۶۷۳۲۶۷-۶۳۲۰۱۰۶
فیکس: ۶۸۴۰۲۸

ترتیب



محمد احسن فاروقی

سرآب : ۶۱











ستیہ پال آنند

پُشتہا پشت زہر پھُوٹے گی : ۱۰۸



اُمِ عمّارہ

یہ گزرے دنوں کا قصہ ہے : ۲۳۶

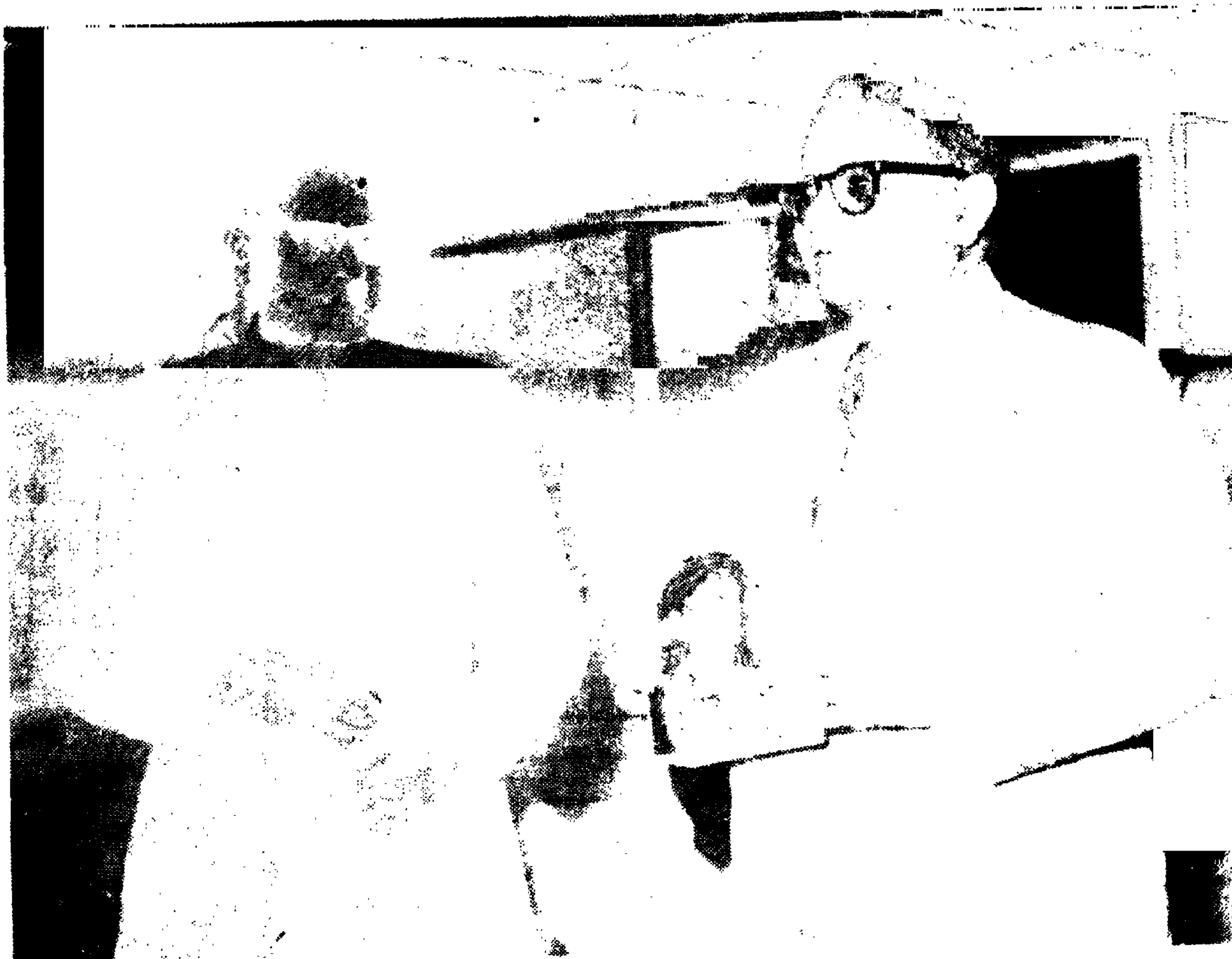
امراؤ طارق

عینائم کے ترا سے برتا مار : ۱۳۲









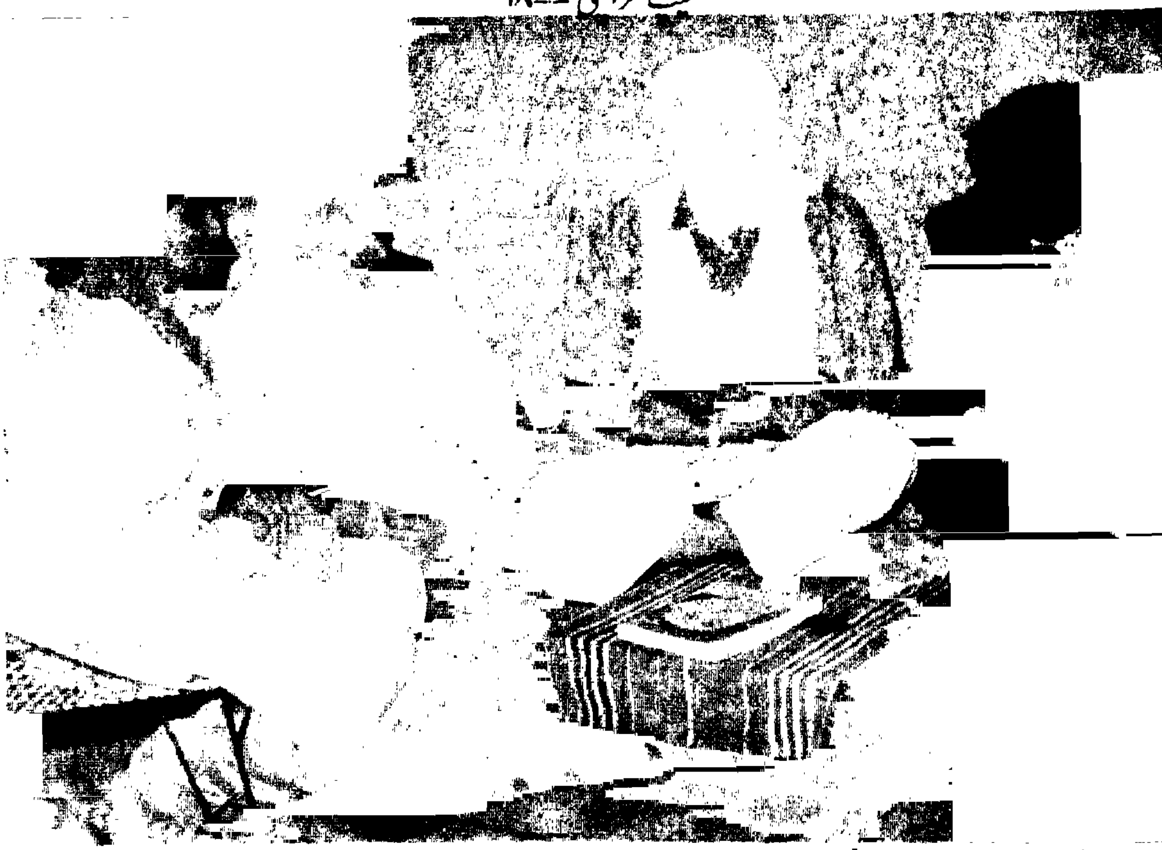
سیپ کے پہلے ناولٹ نمبر، شمارہ ۱۰ (۱۹۶۷ء) کی تقریب رُونمائی میں، تقریب کے صدر، ڈاکٹر ممتاز حسن اور جناب شمس زبیری۔



ضمیرالدین احمد (مرحوم)، نسیم درّانی (۱۹۸۹ء)



دائیں سے بائیں: جناب قمر جمیل، جناب سلطان جمیل نسیم، جناب ضمیرالدّین احمد، نسیم درّانی، جناب امراؤ طارق (۱۹۸۹ء)



بائیں سے دائیں: محترمہ سعیدہ افضل، محترمہ بیگم محمدؐ احسن فاروقی: جناب ڈاکٹر محمدؐ احسن فاروقی، نسیمؐ درّانی (۱۹۶۷ء)



بائیں سے دائیں: جناب افسر آذر، جناب ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، نسیمؐ درّانی (۱۹۶۸ء)

احمد ظفر

حمدِ باری تعالیٰ

جو میں نے لب پہ خدا کا کلام لکھا ہے
بہ صد خلوص بہ صد احترام لکھا ہے

کبھی وہ پھول کی خوشبو ، کبھی رم آہو
علامتوں نے جسے صبح و شام لکھا ہے

بغور دیکھتا رہتا ہوں آسماں کو میں
یہ کہکشاں تو نہیں اس کا نام لکھا ہے

مری نجات کی خواہش تمام کیسے ہو
مری جبیں پہ اگر نا تمام لکھا ہے

وہ لا مکاں ہی سہی پھر بھی جانتا ہوں میں
دلِ شکستہ میں اس کا قیام لکھا ہے

اسی کے دم سے سفینے رواں ہیں لہروں پر
صبا کا باغ میں جس نے خرام لکھا ہے

عطا اسی سے ہوئی حرمتِ حروف ظفر
بغیر جس کے جو لکھا ہے خام لکھا ہے

ضمیر اظہر

حمدِ باری تعالیٰ

کڑی دُھوپ
صحرا
میں بھٹکا ہُوا کب سے ششدر
گراں پا
تحیّر میں گُم تھا
کہ کیسے صراطِ طلب ڈھونڈ پاؤں
وسیلہ کہیں آب کا دے دکھائی
تو صَبر آزما پیاس اپنی بجھاؤں
اِس عالم میں میرے خدا تُو نے مجھ کو
سُجھایا وہ رستہ
جو شاداب بستی کی جانب رواں تھا۔

فضل پرویز

نعتِ رسُولِ مقبولؐ

اے کاش مجھ کو حج کی سعادت نصیب ہو
جس رُخ نگہ اُٹھاؤں دیارِ حبیبؐ ہو

ہر دم طواف کرتی ہیں آنکھوں کی پُتلیاں
گویا دیارِ احمدؐ مُرسل قریب ہو

رستہ بڑا کٹھن ہے، تو، مَیں پاشکستہ ہُوں
راہِ سفر میں اِسمِ مُحمّدؐ جریب ہو

کیا مُعجزہ مِلا ہے تمہیں سب سے مُنفرد
"اُمّی ہو اور سارے جہاں کے ادیب ہو"

کشمیر و بوسنیا و فلسطیں دُہائی دیں
ہم زخم خوردگان کے تم ہی طبیب ہو

غارِ حرا سے ماہِ منوّر ہُوا طلُوع
خِلقت پکار اُٹھی یہی سب کا نقیب ہو

پرویز! مجھ کو دولتِ دُنیا سے کیا غرض
تقلیدِ اُسوۂ حسنہ ہی نصیب ہو

جعفر شیرازی

نعتِ رسولِ مقبولؐ

شرف حاصل کبھی تو ہوگا اِس دَر تک رسائی کا
کہ میری زندگی تو نام ہے اُن کی گدائی کا

جمالِ سیدِ لولاک کا پَرتو کہاں تک ہے
احاطہ کرلیا ہے نُور نے ساری خدائی کا

میں آنکھیں میچ کر کھولوں تو جا پہنچوں مدینے میں
رہے احساس تک باقی نہ مجھ کو نارسائی کا

یہاں ہوتے ہیں خم سر بادشاہوں، کجکلاہوں کے
عجب اعجاز ہے سرکار کی فرمانروائی کا

جو پیہم چومتی رہتی ہے اس روضے کی جالی کو
مجھے کتنا جنوں ہے اس ہوا سے آشنائی کا

خدا نازاں، نبوّت فخر کرتی ہے اس انساںؐ پہ
درس جس نے دیا انساں کو انساں کی بھلائی کا

یہ جعفر کے لئے کتنا بڑا اعزاز ہے آقا
کہ منصب مل گیا ہے آپ کی مدح سرائی کا

اختر ہوشیار پوری

نعتِ رسولِ مقبولؐ

وہ زیست کی صبح کا اُجالا
وہ شامِ اَبد کی دیپ مالا

آئینہ صفت ضمیرِ پیکر
ادراک کا زر فشاں حوالہ

بطحا کی پہاڑیوں پہ چمکا
پہنے ہُوئے حرف کا دوشالہ

جیسے کہ کوئی صحیفہ اُترے
جیسے ہو صدا کا بول بالا

پیغامِ حیات دے کے اُس نے
گرتا ہُوا آدمی سنبھالا

راہوں میں بھٹکتے قافلوں کو
ساحل پہ گُہر کی طرح اُچھالا

راتوں کی گھنیری ظلمتوں کو
راتوں کے طلسم سے نکالا

جیسے کوئی آفتاب اُبھرے
جیسے کوئی روشنی کا ہالہ

کیا اُس کی عنایتوں کا احوال
ہم کو نئی زندگی میں ڈھالا

بخشش کا وسیلہ بن گیا ہے
بخشش کی نوید دینے والا

اے رحمتِ کُل بہار ساماں
اختر کے بھی درد کا ازالہ

شوکت ہاشمی

نعتِ رسولِ مقبولؐ

دھاریوں میں گنبدِ خضریٰ کی دھارا نور کا
گنبدِ خضریٰ تو ہے سارے کا سارا نور کا

صبحِ طیبہ میں جھلکتی ہے بشارت نور کی
شامِ طیبہ میں چمکتا ہے ستارا نور کا

یہ بھی اُس نورِ مجسم کا کرم ہے دوستو!
زندگی خود بن گئی ہے استعارا نور کا

ہر قدم پر کہکشاں ہے ہر قدم پہ آفتاب
ہے مدینے کا سفر سارے کا سارا نور کا

ہاں بفیضِ مصطفےٰ یارو! بفیضِ مصطفےٰ
ضوفشاں ہے شامِ صحرا میں منارا نور کا

نور کے گھر میں چمکتے ہیں درودوں کے حروف
نور کی بستی میں اُترا ہے ستارا نور کا

نور کا بکھرا ہوا موسم ہے شوکت اور میں
نور کا بہتا ہوا دریا کنارا نور کا

نعتِ رسولِ مقبولؐ

ہم پر رسولِؐ پاک کا احسان ہے بہت
وجہِ نجات اُسوۂ ذی شان ہے بہت

دونوں جہاں میں رحمتِؐ کُل کی پناہ میں
اللہ کے حبیبؐ کا فیضان ہے بہت

اے عاشقِ نبیؐ! تجھے میرا سلام ہو
تو خوش نصیب صاحبِ عرفان ہے بہت

ہر ہر قدم پہ یادِ نبیؐ ہم رکاب ہے
طیبہ! ترا سفر مجھے آسان ہے بہت

معلوم ہے علاجِ غمِ زندگی مجھے
یعنی ہوائے وادیِ فاران ہے بہت

اب میں ہوں اور عشقِ رسالت مآبؐ ہے
اب میرے پاس دولتِ ایمان ہے بہت

دل میں ہے اُنکی یاد تو آنکھوں میں شوقِ دید
اے رہروِ حرم! یہی سامان ہے بہت

خیر البشر حضورؐ ہیں نورِ خدا حضورؐ
شوکت دلیلِ آیۂ قرآن ہے بہت

نسرین آفتاب

نذرِ محسنِ انسانیتؐ

تُو کبھی ساقیٔ کوثر ہے کبھی ابرِ کرم
تجھ کو آواز دے
ہر لمحہ میری تشنگی تشنہ لبی
اپنا ہر زخم دکھاؤں تجھ کو
اپنا ہر دُکھ
جو کسی سے نہ کہوں
تجھ سے کہوں
تُو کہ ہے چارہ گرِ دل زدگاں
اے شہِ عرب و عجم
پیکرِ الطاف و کرم
آج اِس سوچ میں ہُوں
مَیں تجھے کیا نذر کروں
پاس کچھ بھی تو نہیں
اشکِ ندامت کے سوا

مجید تمنّا

نعت شریف

نہ مہر و ماہ نہ گلہائے نو بہار میں ہے
جو حسن سیرتِ آقائے نامدار میں ہے

گنہگار نہ مایوس ہوں کہ رحمتِ حق
نبیؐ کی جنبشِ ابرو کے انتظار میں ہے

دِل و نظر میں اُجالے جہاں جہاں روشن
کہ نُورِ عشقِ نبیؐ روح کے دیار میں ہے

ہزار گوہرِ اخلاق و حکمت و عرفاں
نبیؐ کی فکر کے دریائے بے کنار میں ہے

درِ نبیؐ پہ ہے دربان جبرائیلِ امیںؑ
شکوہِ قیصر و کسریٰ تو کس شمار میں ہے

سحر ہے مطلعِ دیوانگانِ روئے رسولؐ
کرن کرن ہے کہ دامان تار تار میں ہے

مسرّتوں کا گلستاں محبتوں کی بہار
ترے تبسّمِ فردوس درکنار میں ہے

ترے قدومِ بہاراں لزوم کے دم سے
چمن چمن ہے کہ صحرائے خارزار میں ہے

اِدھر بھی بارشِ رحمت ہو اے سحابِ کرم
خزاں نصیب یہ عاصی بھری بہار میں ہے

غریب و راندہ و مظلوم و بے نوا کے لئے
فلاح تیرے نظامِ فلاح کار میں ہے

قسم ہے خونِ شہیداں کی جو ہے تجھ پہ نثار
اَبد کا رنگ اُسی عمرِ مستعار میں ہے

سدا ہے زندہ و پائندہ و درخشندہ
صداقت ایسی ترے قولِ پائیدار میں ہے

سقوطِ مکّہ یہ کہتا ہے ترا خُلقِ عظیم
کہ شانِ فتح کریمانہ انکسار میں ہے

تری خُدائی ہے دُنیا ہو یا کہ عقبیٰ ہو
بشر سدا ترے احسان کے حصار میں ہے

نبیؐ بغیر خُدا تک رسائی نا ممکن
نبیؐ ہی رابطہ انسان و کردگار میں ہے

کرے احاطہ تریؐ وسعتِ سخاوت کا
یہ تاب کب مرے دامانِ تار تار میں ہے

بِلا رسولؐ کی معراج سے بشر کو عروج
مقامِ عرش بھی اِنساں کے اختیار میں ہے

بروئے کار جو آئے تو فاتحِ عالم
وہ جذبہ جو دلِ عُشّاقِ جاں نثار میں ہے

ترے تصورِ تاباں کی ہے رہینِ کرم
جو روشنی مری چشمِ ستارہ بار میں ہے

عمل اہم ہے نبیؐ کی رضا زیادہ اہم
کرے قبول کہ رد اُس کے اختیار میں ہے

اسے عطا غمِ عشقِ حضورؐ ہو جائے
یہ دِل اسیر ابھی غم ہائے روزگار میں ہے

یہ چند اَشکِ ندامت قبول ہو جائیں
مرا سوالِ کرم چشمِ اشکبار میں ہے

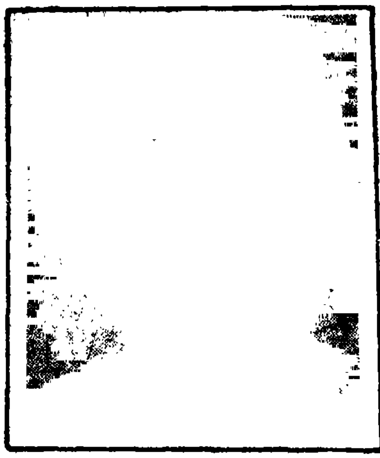
ثنا نبیؐ کی تمنّا ہے مایۂ بخشش
یہی ثنا مرے سامانِ افتخار میں ہے

سیپ کراچی — ۲۷

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ ناولٹ

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

سراب



محمد خان نے کہا " یہ گلی ہے اسے برہان کہتے ہیں" اور گلی میں آگے بڑھتے ہوئے ایک جگہ پر ایک کنواں دکھاتے ہوئے کہ "یہ کاریز ہے" میں نے دیکھا کہ اسی کنواں میں کوئی دس فٹ نیچے پانی کا نالا بڑی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ وہ کہنے لگا "ادھر آب گم ہے وہاں پانی زمین میں گم ہو جاتا ہے اور یہاں نکلتا ہے۔ آب گم سے یہاں تک کہیں پانی نہیں ہے۔ اللہ تعالٰی کا قدرت ہے"

ایک منٹ تک میں کاریز کے کنارے کھڑا ہوا پانی کے بہاؤ کو غور سے دیکھتا رہا۔ ایک بڑھی عورت ایک پیپا لئے ہوئے آئی جس میں ڈور بندھی ہوئی تھی اور اس پیپے کو کاریز میں ڈال کر پانی بھرا اور سر پر رکھ کر گلی کے اندر چلتی گئی۔ واپس ہو گئی۔ میں محمد خان کے ساتھ آگے بڑھتا ہوا ایک کچے مکان تک پہونچا۔ اس مکان کی کچی دیوار بڑی خاص صنعت سے بنی ہوئی نظر آئی۔ اسی میں ایک دروازہ بہت ہی بھدا سا لگا ہوا تھا۔ اسی دروازہ کو محمد خان نے کھٹکھٹایا اور تھوڑی دیر میں ایک لڑکی نے اسے اندر سے کھولا۔

اس لڑکی نے مجھے دیکھا اپنے چہرہ کو چادر سے جو وہ اوڑھے ہوئے تھی چھپایا اور گھر کے اندر غائب ہو گئی۔

"آپ آیئے" محمد خان نے دروازے کے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ میں ایک کافی بڑے کمرے میں پہونچا۔ جس میں ایک طرف ایک کھٹیا پڑی ہوئی تھی۔ "آپ اس پر بیٹھو آپ سے پہلے جو بابو تھا جس کی جگہ آپ آیا ہے وہ یہیں رہتا تھا۔ میں آپ کا بستر اور اسباب اٹھا کر لاتا ہوں"

میں کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ چلا گیا۔ گھر کے اندر سے نکل کر ایک عورت آئی جو کچھ جوان اور کچھ ڈھلی ہوئی تھی اور جو چادر نہیں اوڑھے تھی وہ مسکراتی ہوئی بولی "آپ بابو یہاں رہو گے۔ آپ کا بیوی ہے بچہ ہے؟"

"نہیں میری ابھی تک شادی نہیں ہوئی"

"میرا لڑکا کراچی چلا گیا" اور یہ کہہ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔میں نے دیکھا کہ وہ جوان لڑکی جس نے دروازہ کھولا تھا اندر کے دروازے سے جھانک رہی تھی۔

"یہ تمہاری کون ہے؟" میں نے پوچھا

"یہ لڑکے کا بیوی ہے - لڑکا اسے چھوڑ کر بھاگ گیا"۔

"یہ تو بہت خوبصورت ہے لڑکا کیوں چھوڑ کر بھاگ گیا؟

"ہم نے لڑکے کا شادی کیا تھا وہ اسے پسند نہیں کرتا اسی لئے بھاگ گیا" اور پھر وہ زار و قطار رونے لگی۔

اسنے میں محمد خان اور ایک اور آدمی میرا سامان لئے ہوئے آئے۔ محمد خان نے کہا "یہ ہمارا بھائی ہے۔ یہ ابھی یہاں آیا۔ اپنی بیوی کو شہید کر دیا"

بیوی کو شہید کرنے کے معاملہ پر میں چکرایا میں نے پوچھا "بیوی کو شہید کر دیا"

اس نے سمجھایا "ہمارے یہاں قاعدہ ہے' اگر ہمارا بیوی کسی اور سے پھنس جائے تو ہم سب جمع ہو کر پہلے اس سے سوال کرتے ہیں' جب وہ اپنا گناہ مان لیتا ہے تو اس کا شوہر اس کے قریب بھونک دیتا ہے۔ وہ مرجاتا ہے تو دفن کر دیتا ہے"

"خوب قاعدہ ہے۔ اس سے کوئی عورت بچ نہیں سکتی"

"اگر وہ بھاگ کر سردار کے یہاں پہونچ جائے اور سردار اسے رکھ لے تو ہم نہیں شہید کر سکتا۔ وہ سردار کی بیوی ہو جاتا ہے"

"تو تمہارے سرداروں کے یہاں بہت سی عورتیں ہوں گی"

"ہمارے سردار کے یہاں سب کام ایسی ہی عورتیں کرتی ہیں وہ سب سردار کی بیوی ہوتی ہیں"۔

دونوں مرد گھر کے اندر چلے گئے اور لڑکی سے کچھ کہہ گئے۔ لڑکی میرے اسباب کے پاس آئی اس کی چادر اب سر پر یوں رکھی ہوئی تھی کہ اس کا چہرہ صاف صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا کرتا پھٹا ہوا تھا اور اندرونی جسم اس میں سے جھانک رہا تھا۔ اس کی شلوار بھی گھٹنے پر سے پھٹی ہوئی تھی۔ میں اسے غور سے دیکھتا رہا۔ اس نے میرا بستر پلنگ پر بچھایا میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس کو محبت سے مگر کچھ خوف کے ساتھ دیکھتا رہا۔

"کیا دیکھتے ہو' صاحب"

"تمہارے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں؟"

"میرا آدمی چلا گیا ہے کراچی' سال بھر سے یہ کپڑے پہنے ہوئے ہوں۔ کوئی کپڑے نہیں بناتا"

اتنے میں محمد خان کی عورت بھی کمرے میں آئی۔ میں نے کہا "یہ تمہاری بہو ہے۔ یہ پھٹے کپڑے پہنے ہے۔ تم خیال نہیں کرتیں"

اب محمد خان بھی آگیا "ہمارے پاس روپیہ نہیں۔ اس کا آدمی بھاگ گیا۔ کپڑے کون بنائے"

"یہ ہمارا کام کررہی ہے ہم اس کو کپڑے بنا دیں گے۔ کتنے روپیہ میں اس کے تینوں کپڑے بن جائیں گے۔"

"ساٹھ ستر روپیہ لگے گا۔"

"میں نے سو کا نوٹ جیب سے نکال کر دیا اور کہا" آج ہی اسے کپڑے بنا دو"

وہ لاشعوری طور پر میرے قریب آگئی۔ اس کے جسم سے بدبو کا ایسا بھپکا نکلا کہ میں نے منہ پھیرلیا۔

وہ سب چلے گئے۔ میری نگاہوں کے سامنے وہ لڑکی تھی۔ اس کی صورت اتنی اچھی تھی جتنی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کا جسم بھی بڑا گٹھا ہوا تھا مگر اس کے کپڑوں سے جو بدبو نکلی تھی وہ ایسی خراب تھی کہ میرے رخ کو اسی کی طرف سے پھیرلیتی تھی۔ میں پلنگ پر لیٹ گیا اور مجھے جلالؔ کا شعر یاد آیا

تمام عمر رہی جستجوئے یار جلال ـــ رہے سفر ہی ہم گو کبھی سفر نہ کیا

میں بہت چھوٹا تھا آٹھویں جماعت میں ہونگا۔ سلیما پورے طور سے جوان تھی شادی شدہ تھی۔ میں اسے کیسی محبت سے دیکھتا تھا۔ گورا رنگ بڑی بڑی آنکھیں۔ بڑی ہونے کی وجہ سے وہ مجھ سے بڑی بے باک تھی۔ مجھ سے پیسے چھین لیا کرتی تھی۔ اکیلے میں مجھ کو چمٹا لیتی میرے منہ پر پیار کرتی۔ روز ہی یہ دلکش کھیل ہوا کرتا تھا۔ پہلی محبوبہ Deep as first love اسکول سے واپس آکر اسی کے ساتھ کھیلا رہتا۔ وہ بہت کچھ اسی لڑکی کی طرح تھی۔ مگر اس کے جسم سے یہ بو نہیں آتی تھی۔ ایک دن اسکول سے واپس آیا تو معلوم ہوا کہ وہ چلی گئی۔ اس کا شوہر اسے لے گیا۔ پھر نہ آئی معلوم ہوا بچہ ہونے میں مرگئی۔ ہائے کتنی خوبصورت تھی۔ ایسی خوبصورت بھی

بھی نہیں دیکھی۔ یہ کچھ ایسی ہی ہے۔ اب بیس برس کے بعد نظر آئی۔ مگر اس کے جسم سے کس قدر بدبو آتی ہے۔
پھر لاڈو نظر آئی۔ وہ اس سے کچھ ملتی ہوئی تھی۔ حالانکہ اس کا رنگ پختہ سیاہ تھا' بڑی بڑی آنکھیں اب بھی نگاہ کے سامنے ہیں۔
وہی زمانہ تھا یا اس سے کچھ پہلے ۔ اس محل میں سات برس کا لڑکا بھی نہ جانے پاتا تھا۔ میں کچھ ایسے ہی سن کا ہوں گا دور بر آمدے میں بیٹھا تھا۔ وہ بر آمدے میں استانی کے پاس بیٹھی ہوئی سبق لے رہی تھی۔ قرآن شریف کی آیت مجھے سنائی دے رہی تھی۔
اس کا لہجہ کتنا دلکش تھا۔ مجھے اس فقرہ کے معنی نہیں معلوم تھے۔ اب معلوم ہیں اور غور کرتا ہوں تو میرے تمام نظاروں کی بنیاد یہی رہی۔ وہ ایک دفعہ پھر دکھائی دی تھی محل میں شادی کی ہڑبونگ تھی۔ وہ ایک اور لڑکی تھی اس نے کہا تھا "ان سے نہ بولو یہ لڑکے ہیں۔ امی جان منع کرتی ہیں" پھر ایک رات میں لحاف میں چھپا لیتا تھا۔ وہ چمک کر طرح سامنے آگئی۔ بجلی کی روشنی میں اس کا چہرہ کیسا چمک رہا تھا۔ وہ کہہ رہ تھی "دادی اماں چلئے آپ کا بلاوت ہیں" اور غائب ہوگئی تھی۔ چمک کی طرح اب تک وہ چمک آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ تسرہ ناظرین تسرہ ناظرین اسی سے ملنے کے کیا کیا خواب نہیں دیکھے اب یہ بھی نہیں۔ ساری زندگی خواب تھی بے ہوشی کا عالم۔ کاش اب بھی یہی بے ہوشی کا عالم آجائے مگر نہیں یاد عہد غم بھی غم ہے یاد عہد عیش بھی یہ سب بچپن کے خواب تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی پہلے جنم میں یہ سب دیکھا تھا۔ اسی جنم سے کوئی تعلق ہے۔ اس وقت جسم تھا ہی نہیں محض روح تھی۔ آنکھیں تھیں تسرناظرین محض ناظر تھا۔ حسن کا نظارا۔ اس وقت بھی اسی عالم میں گم ہو جاتا ہوں

سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر
ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

ہاں شباب کا احساس اسی کھتری سے ہوا۔ وہ کتنی تیز تھی۔ مجھے کھتریوں سے کیوں سب سے زیادہ لگاؤ رہا۔ وہ خود بڑی بے باک ہوتی ہیں۔ صاف ستھرے چہرہ والیوں کو ناز ہوتا ہے اور اسی ناز میں وہ تن جاتی ہیں۔ لوگ ان کی طرف دوڑتے ہیں۔ وہ لفٹ نہیں دیتیں۔ کھتریاں اپنے کو مردوں کے منہ میں گھسیڑ دیتی ہیں اور اس لئے مرد ان کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ وہ پہلے کھتری سب ہی سے ہنسا کھیلا کرتی تھی۔ میرے پلنگ سے ملے ہوئے تخت پر وہ رات بھر لیٹی رہی اور میں اس کے چہرہ کو رات بھر دیکھتا رہا۔ لالٹین کی دھیمی دھیمی روشنی میں اس کا کھتراپن نظر نہیں آتا تھا۔ چہرہ کتنا حسین تھا۔ مگر قریب ہی دو بڑھیاں رات بھر باتیں کرتی رہی تھیں اور صبح کو ان بڑھیوں کو چلتا کیا تھا۔ وہ منڈلاتی رہی تھی' مگر اسی سے تعلق کرنے والے سب ہی تھے۔ کس کس کے ساتھ اسے نہیں دیکھا۔ میں بھی بڑھ سکتا تھا مگر مجھ سے نہ بڑھا گیا۔ کوئی جوان نہیں یاد آتا جس سے اس کا تعلق نہ ہوا ہو مگر میں سب کرشمے دیکھتا ہی رہا۔ اسے کہتے سنا "یہ میاں مولوی ہیں"
مگر اس سے زیادہ کھتری سکو سامنے آگئی تھی اور یہ میری طرف اس سے زیادہ بڑھی تھی۔ وہ پارسا تھی' مگر مجھ سے فلرٹ کرتے ہوئے اسے اچھا لگتا تھا۔ میں بار بار اس کے یہاں کسی بہانے سے ضرور جاتا۔ چہلیں کرتا۔ کتنے دفعہ اسے گود میں اٹھالیا اور منہ پر چٹاچٹ پیار کئے۔ بچے ہوتے رہے اور آخر کار وہ اپنے میاں کے ساتھ چلی گئی۔ چند برسوں کے بعد پھر دیکھا تو اس میں کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

اور آخر میں یہ بنو۔ یہ اتنی کھتری نہیں تھی جتنی وہ دونوں۔ کبھی کبھی یہ خیال ہوتا کہ وہ کھتری ہے ہی نہیں۔ جس دن وہ ایک دم سے سامنے آئی تھی تو وہ چادر اسی طرح اوڑھے ہوئے تھی کہ اس کا چہرہ پورا نہیں دکھائی دیا تھا۔ اس سے روز ہی ملاقات ہوتی رہی' مگر میں دل سے پوچھتا رہا "کیا وہ حسین ہے؟" خوابوں میں بھی دکھائی دیتی' مگر اس سے منہ ملانے کو جی نہ چاہتا۔ میں اسے ترک ہی کر دیتا مگر وہ منڈلا منڈلا کر میرے سامنے آتی رہی۔ وہ میرے گھر بھی نہ معلوم کتنی دفعہ آئی اور میں بھی اس کے یہاں کتنی دفعہ گیا۔ ایک دفعہ سنگھار کئے ہوئے وہ خود کسی قدر قریب آگئی تھی۔ میں نے اس کے ہونٹ انگلی سے چھوئے اور چھوتے ہی گھبرا کر گھر سے باہر بھاگ

لیا۔ تصور میں وہ زیادہ سے زیادہ حسین ہوتی جاتی مگر روبرو آکر یہی بری لگتی کہ اس سے ملنے کو جی نہ چاہتا۔ جس دن یہ طے کرتا کہ اس کی طرف نہ جاؤں گا اسی دن وہ خود میرے یہاں آ جاتی۔ عجیب چکر تھا نہ بندھتا تھا نہ ٹوٹتا تھا۔ میں نے اس پر کتنے روپئے خرچ کئے۔ مختلف جگہ جانے کے کرائے دیئے۔ قرض دیئے جن کو اس نے ادا کرنے کا نام بھی نہیں لیا۔ ایک دن اس نے مجھے محسن کہا تھا مگر زیادہ تر وہ یہ سمجھتی رہی تھی کہ میں اس کے حسن کا گرویدہ ہو کر سب کچھ کرتا ہوں۔ میں نے اس کے جسم کا ہر حصہ دیکھا تھا مگر کوئی بھی جاذب نظر نہ ہوا تھا۔ اس کی توجہ ہی سے اس سے لگا رہا' مگر اور عورتوں کو بھی دیکھتا رہا۔ وہ سب اس سے ضرور اچھی تھیں کیا اسی سے عشق تھا؟

جن عورتوں سے گہرا عشق ہوا وہ کھتریاں نہیں تھیں۔ شاید حسین بھی نہیں کہی جاسکتیں تھیں۔ انہیں دور سے دیکھا اور دور ہی دور رہا۔ چودہ برس کے سن تک اپنے گھر کے سامنے والے گھر کے اوپر کے برآمدے میں وہ دکھائی دی تھی۔ کیا حسن تھا۔ کم از کم میرے تصور میں جو حسن کا کمال ہو سکتا تھا اور اب بھی ہے اس کی وہ پوری مکمل تصویر تھی۔ اس کو دیکھنے کے بعد کوئی اور اچھی نہ معلوم ہوتی۔ کسی کی طرف رخ نہ کرتا مگر

جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی
ایک بھی اس سے ملاقات نہ ہونے پائی

مگر وہ ہی سب سے بہتر عالم تھا'

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات و دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

اور سات برس کے بعد وہ دوسرا کرشمہ نظر آئی جس کو بھی دور ہی دور سے پوجتا رہا پھر وہ نظر آتر گئی۔ ہر سال ایک نئی سامنے آتی اور پورے سال سر پر سوار رہتی۔ اب ان کے نام بھی یاد نہیں۔ شہروں شہروں' صوبوں صوبوں میں دیکھتا پھرا۔ ہاں سکھر کی وہ ح سب سے زیادہ قریب آئی اس کا نام بھی یاد نہیں۔ اس نے سب قواء مضمحل کر دیئے۔ کیا عالم تھا۔ وہ جتنی قریب آئی اتنا ہی اس سے عشق کم ہوتا گیا۔ آخر کو اس سے بھاگ لیا۔ اس کو سب سے زیادہ روپئے دیے ہوں گے۔

اس وقت یہ سامنے ہے۔ اس سے اچھی کوئی کبھی نہیں دکھائی دی۔ مگر یہ کس قدر گندی ہے اور اسے کوئی بھی اشارہ کروں تو شاید میں اور یہ دونوں شہید کر دیئے جائیں۔

(۲)

وہ ادھیڑ عمر کے تھے مگر نہایت تندرست تھے۔ وہ خود میرے پاس آکر بیٹھے اور کہنے لگے "اب کے مہینے تنخواہ نہیں ملے گی۔ صوبے کے پاس بجٹ ہی نہیں ہے۔ سارا خزانہ خرچ ہوجائے گا اور یہ دنیا بھی بس چار برس کی ہے۔ زیادہ سے زیادہ سب بھوکے مرجائیں گے۔ میں نے اپنا سامان کرلیا ہے۔ مجھے اتنی ٹیوشن مل جائیں گی کہ میرے تین بچوں کا سہارا ہوجائے گا۔ بڑا لڑکا اور بڑی لڑکی اس سال ایم ایس سی کرلیں۔ رہی چھوٹی لڑکی وہ نائنتھ کلاس میں ہے اور بیوی کراچی جاتی ہے وہاں سے سامان لاکر فورٹ سنڈیمن میں بیچ لیتی ہے۔ اس نے بڑا روپیہ جمع کرلیا ہے۔ میں اس کے ساتھ کام نہیں کرسکتا۔ تجارت ہی کرنا ہوتا تو گریجویشن کی کیا ضرورت تھی بھلا۔۔۔۔"

وہ یوں ہی اور بہت کچھ کہتے گئے اور مسکرا مسکرا کر مجھ سے اپنی فراست کی داد چاہتے رہے۔

دفتر کے لوگ ان کی باتیں سن سن کر مسکراتے رہے۔

ایک دم سے وہ یہ کہہ کر اٹھے "بڑا کام پڑا ہے۔ یہاں کسی کو ایک لفظ بھی لکھنا نہیں آتا۔ سب میں ہی لکھتا ہوں۔ میں ہندوستان میں امپیریل سیکریٹریٹ میں کام کرچکا ہوں۔ ہندو لوگ کام کرتے ہیں۔ میں نے پاکستان آپٹ کیا تھا۔ میں یہیں کوئٹہ میں پڑھاتا تھا۔ یہیں،

پیدا ہوا۔ پارٹیشن ہوا تو میں نے کہا چلو بلوچستان ہی میں رہیں گے۔ یہاں ایک سے ایک جاہل افسر بنا بیٹھا ہے اور میں کلرک ہوں۔ کوئی ایک ڈرافٹ تو لکھ دے مجھے۔ مجھ سے ہی لکھوائے جاتے ہیں۔"

یہ کہتے کہتے وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور مسکراتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل دئے تھے۔

میرے پاس بیٹھے ہوئے کلرک نے کہا "یہ یوں ہی دن بھر وقت خراب کرتا ہے۔ اپنا کام کچھ نہیں کرتا۔ اس کے سپرنٹنڈنٹ بنگالی صاحب ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کنٹرولر صاحب نے اسے خواہ مخواہ رکھ لیا ہے۔ یوں ادھر ادھر بیٹھتا پھرتا ہے اور پاکستان کا بجٹ ختم ہونے کے بابت اڑاتا رہتا ہے۔ آپ اس کے پھیر میں نہیں آیئے گا"

چھٹی ہونے تک وہ منڈلا منڈلا کر کئی بار میرے پاس آئے۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کی باتیں کرتے رہے۔ لوگوں کی نااہلی اور اپنی بے پناہ قابلیت کا بار بار ذکر چھیڑتے رہے۔ چھٹی کے وقت میرے ساتھ ساتھ دفتر سے باہر آئے اور بولے " آپ نے اب تک شہر بھی دیکھا۔ یہاں شہر میں سب لوگ میرے شاگرد ہیں"

"اچھا آپ ٹیچر بھی ہیں"

اور کیا یہاں کی تنخواہ میں بسر نہیں ہوتی۔ اب ٹیوشنوں پر جاؤں گا تو رات کے بارہ بجے تک پڑھاتا رہوں گا۔"

سڑک پر ایک بڑی گاڑی جا رہی تھی۔ اس کو انہوں نے آگے بڑھ کر ہاتھ دیا۔ وہ رک گئی ڈرائیور سے پشتو میں کچھ کہا اور میری طرف رخ کرکے بولے "آیئے اس گاڑی پر شہر چلیں"

میں بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا اور ہم لوگ اسٹیشن کے قریب جناح روڈ پر اتر گئے۔

اب ہم دونوں ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ انہوں نے کہا" یہ سب دوکانیں پنجابیوں کی ہیں۔ پہلے یہ سب سکھوں کی تھیں۔ پارٹیشن ہوا سب سکھ بھاگ گئے اور پنجابیوں کو یہ دوکانیں اور یہ سب مکان دے گئے۔ یہ سب علاقہ پنجابیوں کا ہو گیا۔ ایک آدھ دوکان پٹھانوں کی بھی ہے' مگر سب پنجابیوں کی سمجھتے ہیں۔ میں نے تو سکریٹریٹ سے آپٹ کیا تھا۔ میں بھی جس پر چاہتا قبضہ کر لیتا مگر مجھے بزنس سے سخت نفرت تھی۔ اب کیا ہے۔ یہاں آفس میں پڑا ہوں۔ خیر مگر میں' میں ہی ہوں یہ جاہل لوگ ہیں۔ مجھے کیا کرنا ہے۔ بچے پڑھ جائیں گے۔ میرا کام لگا ہوا ہے۔جب چاہوں جو کام کروں۔"

اور وہ نہ معلوم کیا کیا اپنے بابت کہتے رہے۔ میں نے کچھ زیادہ سنا نہیں۔ میرا دھیان' اس صورت کی طرف لگا ہوا تھا جو میری نگاہوں میں کھب گئی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ جو عورتیں میرے پاس سے گزر رہی تھیں وہ منہ چادر میں لپیٹے ہوئے تھیں' اور ان کی ایک آنکھ کھلی ہوئی تھی۔ بڈھی' منہ پر کثرت سے جھریاں پڑی ہوئی عورتیں' صاف صاف دکھائی دیتیں۔ یا پھر آٹھ آٹھ دس دس برس کی لڑکیاں' یہ کہا جا سکتا تھا کہ اس شہر میں جوان عورتیں ہیں ہی نہیں۔

وہ بولے "دیکھئے یہ احمد صاحب کی کوٹھی ہے جو وزیر ہیں۔ بس یہاں بڑے بڑے بلوچوں ہی کی تین چار کوٹھیاں ہیں۔ ورنہ شہر میں آپ کو کوئی بلوچی دکھائی ہی نہیں دے گا۔"

"یہ خوب ہے بلوچستان کا خاص شہر ہے اور یہاں بلوچی نہیں"

"بلوچی اپنے علاقوں میں ہیں اپنے سرداروں کے ہاں کام کرتے ہیں۔ یہاں ان کے سردار آتے ہیں۔ سردار لوگوں کے بچے سب انگلینڈ میں پڑھتے ہیں عام آدمیوں کو کوئی کام نہیں کرنے دیتے۔ وہ ان کو ہی اپنا سب کچھ سمجھتے ہیں۔ مگر یہ تو پارسیوں کی کالونی ہے۔ یہاں پارسی نہ معلوم کب سے بسے ہیں۔ یہ بڑے مالدار لوگ ہیں سرکاری ملازمت میں بھی ہیں۔ لکھ پتی کروڑ پتی۔ ان کی بزنس کراچی میں بھی ہے اور لاہور میں بھی۔"

"یہاں ہندو لوگ نہیں ہیں"

"آگے مچھر روڈ پر بہت ہندو ہیں۔ ڈاکٹر، وکیل، ایک میرے شاگرد کی کیمسٹ کی دوکان ہے مجھے کاسٹ پرائز پر سب دوائیں دیتا ہے"
"میں دیکھ رہا ہوں کہ یہاں کیمسٹ کی دوکانیں بہت ہیں، اتنی دور میں پانچ یا چھ تو ضرور مل گئی ہوں گی"
"ابھی آگے دیکھئے ہر پانچویں دوکان کیمسٹ کی ہوگی"
"یہاں دواؤں کی اتنی ضرورت ہے؟ لوگ تو تندرست نظر آتے ہیں"
"یہاں کا پھیر ہے۔ کیمسٹ تو نام کے ہیں۔ اصل میں اسمگلرز ہیں۔ چرس اسمگل کرتے ہیں سو سو اور دو دو سو کی دوائیں بھی لے جاتے ہیں۔"

قندھاری بازار میں فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے وہ بائیں طرف ایک سڑک پر مڑے اور کچھ دیر تک اپنے مخصوص حالات پر روشنی ڈالتے گئے جو میں نے نہیں سنی، میں کیوں کہ مختلف قسم کی دوکانوں کو دیکھ رہا تھا۔ ایک طرف میں نے دیکھا کہ ایک دوکان میں ایک عورت بہت گوری اور موٹی بڑے خاص طریقہ پر رنگی ہوئی کھڑی ہے۔ میں نے پوچھا "یہ کس قسم کی عورت ہے"

"آئیں؟ آپ جانتے نہیں۔ یہ پراس ہے ادھر گلی میں سب یہی ہیں" اور گلی کے نکڑ پر کھڑے ہو کر کہنے لگے "اس پوری گلی میں یہی یہ ہیں سب شمال سے آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں"

آگے بڑھ کر ہم لوگ داہنے کو مڑے وہ بولے "یہ سورج گنج بازار ہے" یہاں میں نے گھڑیوں کی دوکانیں کثرت سے دیکھیں اور پوچھا "یہاں کے لوگ گھڑیاں بھی بہت خریدتے ہیں؟"

"سب اسمگل کرکے لاتے ہیں۔ کچھ پرزے بدل دیتے ہیں اور بیچتے ہیں۔ اور اپنے ہاتھ میں بندھی ہوئی گھڑی کو دکھاتے ہوئے بولے "میں نے یہ افغانستان سے منگائی چار سو روپے کی یہاں بارہ سو کی ملے گی۔ میں یہاں سے کچھ نہیں خریدتا۔ سب سامان باہر ہی سے منگاتا ہوں یہ میری قمیص کا کپڑا۔ یہ چپل سب بارڈر کے ادھر کے ہیں"

یہ سب کہتے ہوئے وہ ایک بڑی دکان کے پاس سے گزرے اور کہنے لگے "یہ یہاں کا سب سے بڑا آدمی ہے۔ میرا شاگرد ہے۔ ہر قسم کی انگریزی اور یونانی دوائیں یہاں ملتی ہیں اور اس کا بہت بڑا کارخانہ ہے۔ آج کل بڑے نقصان میں آگیا ہے کیونکہ دوائیں دیکھنے والا حکیم چلا گیا ہے۔ اسی فکر میں ہے کوئی حکمت جاننے والا ملے تو سب دوائیں ٹھیک سے لگوائے"

یہ کہتے کہتے وہ داہنی طرف ایک اور دوکان کی طرف مڑ کر بولے "یہ بھی میرا شاگرد ہے۔ آپ کی طرف مراد آباد کا ہے"

ہم دونوں ایک دوکان میں داخل ہوئے جہاں ہر قسم کے بسکٹ اور شربت کی بوتلیں رکھی تھیں اور ایک صاحب ان کے پاس کھڑے تھے۔ ہمارے ساتھی نے کہا "یہ صاحب آپ کی طرف کے ہیں۔ ہمارے دفتر میں آئے ہیں" اور میز پر رکھے ہوئے بسکٹوں ہی سے کئی اٹھا اٹھا کر اپنے منہ میں رکھتے گئے۔

وہ صاحب بولے "آپ بھی مراد آباد کے ہیں"

میں نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا "آپ تقسیم کے بعد آئے"

"نہیں میرے والد ۱۹۴۰ء میں یہاں آکر جم گئے تھے۔ فوج سے ریٹائر ہو کر انہوں نے یہ کاروبار کیا۔ اب میں اسے چلا رہا ہوں"

میرے ساتھی نے کہا "اس نے پڑھ تو لیا۔ گریجویٹ ہے۔ مگر نوکری کا جھنجٹ نہیں پالا۔ اب چار پانچ سو روپیہ روز کماتا ہے۔ نوکری میں یہ کبھی بھی نہ ملتے"

میں نے یہاں سے ایک پاؤنڈ بسکٹ خریدے اور ہاتھ میں لئے چلتا رہا۔ میرے ساتھی کہتے رہے "یہ پڑھ لکھ کر ہم نے ساری زندگی خراب کی اور اب میرے لڑکے بھی پڑھ لکھ گئے ہیں۔ ان کی بھی زندگی خراب ہوئی۔ اچھا تھا تجارت میں لگتے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اب پاکستان کیا دنیا بھر کے پاس کوئی پیشہ نہیں رہ جائے گا۔ سب ختم ہی ہوجائے گا۔ کچھ برس کی بات ہے"

سیپ کراچی --- ۳۴

ہم لوگ لیاقت روڈ پر آ گئے۔ یہاں مجھے وہ مارکٹیں دکھائی دیں جو کوئٹہ کی خاصی چیز ہیں۔ میں نے کہا "مارکٹوں کو دیکھیں"
میرے ساتھی بولے "ان میں کیا دیکھئے گا۔ کوئی کام کی چیز تو ہے ہی نہیں۔ سب اسمگل کئے ہوئے سامان ہیں۔ گھڑیاں، مشین، اونی سامان، برتن گلاس یہی سب ہے۔ آپ کو اور ہم کو ان کی کیا ضرورت ہے"
ہم دونوں لیاقت بازار کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ گئے اور بائیں طرف مڑے۔ انہوں نے کہا "یہ روڈی بازار ہے"
کافی دور تک ہر قسم کی دوکانیں تھیں اور ایک کافی بڑا سینما بھی تھا۔ میرے ساتھی بولے "میں یہاں پکچرز دیکھنے آتا ہوں۔ مجھے پکچرز کا بڑا شوق ہے۔ یہ سینما بھی میرے شاگرد کا ہے۔ وہ مجھے بغیر ٹکٹ تصویر دیکھنے دیتا ہے۔ آپ اگر تصویر دیکھیں تو آپ کو بھی ٹکٹ نہیں لینا پڑے گا"
"ابھی پکچر شروع ہونے میں کافی دیر ہے۔ کسی اور دن آپ کے ساتھ آؤں گا"
ہم ایک چھوٹے چوراہے پر پہنچے۔ وہ داہنے طرف مڑتے ہوئے بولے۔ "یہ مکانگی روڈ ہے۔ یہاں فرنیچر کی دوکانیں ہیں۔ مگر یہ سامنے جو ہے وہ ہندوستانیوں کا امام باڑہ ہے۔ یہاں سے عشرہ کے دن علم اور تابوت اٹھتے ہیں۔ یہی سڑک آگے کچی ہے مگر وہ ہماری طرف جاتی ہے"
"یہاں سے ہماری گلی کتنی دور ہوگی"
"یہی دو میل کے قریب ہوگی۔ اگر آپ پیدل چلنے کے لئے تیار ہوں تو ہم پیدل ہی واپس چلیں"
چنانچہ ہم اسی سڑک پر چلتے گئے۔ ایک جگہ گوشت کی دوکانیں نظر آئیں اور آگے بڑھے تو خالی میدان تھا جس میں ایک کچی سڑک کے نشان تھے۔ انہوں نے کہا "اب یہ سڑک بن جائے گی۔ ایک آدھ برس لگے گا۔ اور یہاں ایک عمارت بھی بن رہی ہے جس میں گھی کا کارخانہ ہوگا۔"
کچی سڑک پر چلتے ہوئے اور اپنے جوتے مٹی میں بھرتے ہوئے دیکھ کر ہنستے ہوئے آخر کو ہم گھر واپس پہنچ گئے۔

(۳)

معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کی پہاڑیوں کے مخصوص پتھر کو انسانی صورت میں تراش دیا گیا ہے۔ وہ میرے سامنے زمین پر بیٹھی چولھے پر توس سینک رہی تھی اور میں اس کے چہرہ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا رنگ ویسا ہی تھا جیسا کوہ مردار کا۔ اس کی لمبی نوکیلی ناک پہاڑ کی نگر کی طرح تھی۔ گالوں کی ہڈیاں پہاڑ کی چوٹیوں کی طرح تھیں۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں توس پر لگی ہوئی تھیں جو توے پر رکھا تھا۔ کوہ مردار اور کوہ چھلتان اور اس میں مناسبت زیادہ سے زیادہ نمایاں ہوتی جارہی تھی۔
کئی دفعہ اس کے کہنے پر "میاں کیا دیکھتے ہو" میں نے اس کا منہ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا تھا "یہ دیکھتا ہوں، یہ کتنا خوبصورت ہے" اور اس کے منہ پر چٹا چٹ پیار کرلئے تھے۔ وہ سپردگی کے عالم میں آگئی تھی۔ اس کے ساس اور سسر اسے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے تھے اور اس نے باہر جانے کا دروازہ بند کرلیا تھا۔ مجھے خوف تو تھا کہ اگر میں نے اس سے کوئی حرکت کی تو اگر میں نہیں تو وہ ضرور مار ڈالی جائے گی۔ مگر اسے اسی خیال پر کھلکھلا کر ہنسی آتی رہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ اس کی ساس کے پاس مرد آتے رہتے ہیں اور سسر انہیں آپ کے پاس اکیلے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ مجھے محسوس ہوا تھا اس کے ساس سسر اسے گھر میں اس لئے چھوڑ گئے تھے کہ میں اس سے بیباک ہوسکوں
مگر نہیں میں جھجکتا رہا تھا۔ وہ قریب سے قریب آتی گئی تھی۔ جو کپڑے میں نے بنوائے تھے ان کو پہن کر اور ہر طرح کا سنگھار کرکے وہ میرے سامنے آئی تھی۔ اس کے جسم سے اس بدبو کی جگہ جس نے پہلے پہلے اس کی طرف سے میرا منہ پھیر دیا تھا ایک خاص

قسم کی خوشبو آرہی تھی جو مجھے مستی کے عالم میں ڈال رہی تھی۔ وہ میرے پلنگ پر میرے سامنے بیٹھ گئی تھی اور اپنے سینے کھول دیئے تھے دن دھاڑے......

"کوئی آجائے گا"

"آئے گا دروازہ کھٹ کھٹائے گا۔ میں نے اندر سے بند کرلیا ہے۔"

اور پھر میرے اندر وہ قوت اور جرائت آگئی تھی جس پر مجھے خود تعجب تھا۔

اس کے ساس اور سسر مغرب کے وقت آئے تھے اور اس وقت گھر کے اندر کے حصے میں پڑے سو رہے تھے۔ ان کی صاف صاف اجازت کہ وہ میرے پاس جب چاہے آئے۔ ان کا مقصد کیا تھا؟

"وہ چاہتے ہیں میں کسی طرح الگ ہوجاؤں وہ اپنے لڑکے کے پاس کراچی جائیں"

"تو لڑکا تو چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ جب چاہیں چھوڑ دیں"

"ان کا زر جو پھنسا ہے۔ میرے والد کے پاس ایک پائی بھی نہیں ہے"

"کتنی رقم ہوگی"

"پانچ سو روپیہ"

"بس اتنا"

"کیا تم دے دو گے"

"پانچ سو کیا میں پانچ ہزار دے دوں گا"

اور اس پر وہ خوشی کے مارے مجھ سے ایسی چمٹ گئی تھی کہ میں کیا بتاؤں۔ میں عورتوں سے اب تک جھجکتا رہا تھا۔ سکھر میں ایک عورت کے بہت قریب آیا تھا مگر وہ بال بچوں والی تھی مجھ سے رقم وصول کرتی رہی تھی۔ مگر یہ عورت بالکل لڑکی تھی بالکل معصوم تھی۔

"اچھا تو کل میرے باپ ماں کے یہاں میرے ساتھ چلنا"

"ضرور چلوں گا تم ایسی خوبصورت ہو" اور یہ کہہ کر میں اس کے منہ پر پیار کرتا رہا تھا

میرے پلنگ کے پاس اس نے ایک دری بچھا لی تھی۔ اس پر اس نے چائے کا سارا سامان لگایا اور بولی "میاں اٹھ کر چائے پیو"

میں لوٹا لے کر گھر سے باہر آگیا اور منہ ہاتھ دھو کر واپس آیا تو وہ پیالیوں میں چائے بنا چکی تھی اور مکھن لگا ہوا ایک توس کھا رہی تھی

"تمہارے ساس سسر اگر آجائیں اور تم کو ایسے بیٹھے ہوئے دیکھیں تو کیا کہیں گے"

"وہ آج اتوار ہے۔ آدھے دن تک سوتے رہیں گے"

ہم دونوں ناشتہ کرتے رہے۔ پھر اس نے سب برتن دھو کر ایک کنارے رکھ دیئے

"ہم اپنے مادر پدر کے گھر جاؤں گا" وہ بولی

"کیسے جاؤ گی"

"میں نے کل شام محمد خان سے کہہ دیا تھا۔ وہ بولا مادر پدر سرآب میں آگیا ہے۔ میں بولا صبح ان کے پاس جائے گا"

"اچھا تو تم اب سرآب جاؤ گی۔ اکیلی! ڈر تو نہیں لگے گا"

"ڈر کس کا!" یہ کہہ کر اس نے اپنا چہرہ اس طرح تانا کہ وہ بڑی بہادر معلوم ہوئی۔

"مجھے بھی آج چھٹی ہے۔ کہو تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں"

سیپ کراچی --- ۳۶

"نانا' ہم خودی جائے گا' تم بعد میں آنا"
"مجھے وہ گھر نہیں معلوم جہاں تمہارے مادر پدر ہیں"
"ہم آگے جاکر ایک درخت کے پاس تمہارا انتظار کریگا۔"

وہ گھر کے اندر گئی اور چادرے کو خاص طرح سے لپیٹتے ہوئے آئی۔ اس کا سارا چہرہ ڈھکا ہوا تھا صرف ایک آنکھ دکھائی دے رہی تھی۔ اس انداز میں وہ اور بھی اچھی لگی۔ دروازے پر جاتے ہوئے بولی "تم آتے وقت آواز دینا' محمد خان کو ' میں جارہا ہوں۔ دروازہ بند کرلو اندر سے" اور یہ کہتی ہوئی وہ نکل گئی۔

میں نے اٹھ کر کپڑے پہنے اور آواز دی "محمد خان میں شہر جارہا ہوں' اندر سے دروازہ بند کرلو۔" محمد خان آنکھیں ملتا ہوا آیا۔ میں باہر نکل گیا۔ اس نے دروازہ بند کرلیا۔

آج سرد ہوا تیز آرہی تھی۔ اس لئے میں نے یہاں کی خاص ٹوپی کو کانوں پر کھینچ کر گلے پر اسٹریپ باندھ لیا تھا۔ ہاتھوں میں چمڑے کے دستانے پہن لئے۔ یہاں کی سردی کی وجہ سے گندا صابن جایا کرتا تھا اور اکثر لوگ مجھے پہچان نہ پاتے تھے۔ اس طرح کہ لدابندھا میں بستی سے گزر کر سڑک پر آیا اور تیزی سے سرآب کی طرف روانہ ہوا۔

کافی دور چلنے کے بعد سناٹا آگیا۔ یہاں میں نے ایک درخت کے نیچے اسے کھڑا دیکھا۔

"آؤ اب میرے ساتھ چلو" اس نے منہ سے چادر ہٹاتے ہوئے کہا اور ہم دونوں سڑک پر روانہ ہوگئے۔

کچھ قدم آگے جاکر وہ بولی "یہ ٹھیک نہیں' ہم آگے چلے گا' آپ چار قدم پیچھے آؤ"

غرض اسی طرح ہم چلتے رہے۔ وہ کبھی کبھی مڑ کر پیچھے منہ کھول کر ہنستی اور میرا جی چاہتا کہ اس کا منہ چوم لوں۔ ہم یوں ہی چلتے گئے کافی آگے جاکر ایک میل کا پتھر نظر آیا جس پر میں نے سکھر ۲۸۲ میل لکھا ہوا پڑھا۔

چلتے چلتے میرا دھیان سکھر کی طرف گیا اور وہ عورت یاد آئی جو وہاں میرے کام کیا کرتی تھی۔ وہ کیسے شوق سے میرے کمرے میں جھاڑو دینے لگتی تھی۔ پہلے دن جھاڑو دیتے ہوئے اس نے اپنے شوہر کی بد معاشیوں کا دفتر کھول دیا تھا۔ کم بخت شراب پیتا ہے' رات رات بھر غائب رہتا ہے۔ کمائی کرتا ہے مگر مجھے پیسہ نہیں دیتا۔ میں چار جگہ کام کرکے پیسے کماتی ہوں اور بچوں کو پالتی ہوں۔ وہ یہ سب کہتی رہی تھی اور میں اس کے سانولے سلونے چہرے کو غور سے دیکھتا رہا تھا اور جب وہ جھاڑو دیتے دیتے میرے پلنگ کے پاس آئی تھی تو میں نے ایک دم سے اٹھ کر اس کا منہ چوم لیا تھا۔ اس نے کہا مجھے دس روپیہ کی ضرورت ہے میں نے اسے دس روپیہ کا نوٹ دیتے ہوئے خوب چمٹایا اور اٹھاکر اپنے پلنگ پر ڈال دیا تھا۔ مگر یہ محسوس کرکے میرے جسم میں جنسی اشتعال پیدا نہیں ہوا تھا اسے چھوڑ دیا تھا اور وہ باقی کمرے کی جھاڑو دے کر چلی گئی تھی۔

اس کے بعد سے جب بھی وہ آئی میں نے طرح طرح سے اس کے جسم کا جائزہ لیا مگر کسی طرح میرے اندر جنسی محرک اشتعال میں نہیں آیا۔ اس نے میری کم زوری سے فوراً فائدہ اٹھانا شروع کیا۔ ہر بار مجھ سے روپے ضرور مانگ لے جاتی۔ ایک دن بولی میرے اوپر تین سو روپیہ قرض ہے آپ اس کا انتظام کردیں تو میں اطمینان سے ہوجاؤں میرے احساس کم تری نے مجھے مجبور کیا تھا کہ تین سو روپیہ بینک سے نکال کر دوسرے دن اسے دے دوں جب میں بینک سے روپیہ نکال رہا تھا تو مجھے تمام وقت یہ احساس ہوتا رہا تھا کہ میں عجیب قسم کی حماقت کررہا تھا' میں نے روپیہ نکال ہی لیا تھا اور دوسرے دن اسے دے بھی دیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ اور بھی بیباک ہوگئی تھی اور صبح دفتر جانے تک کئی بار میرے یہاں آنے لگی تھی۔ اکثر وہ میرے پلنگ پر لیٹ جاتی میرا احساس اور بھی کم زور پڑتا گیا تھا اور میں آخر اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ آخر ایک دن اس نے پچاس روپے مانگے اور میں نے جیب سے نکال کر اسے دے دیے اس کے بعد سے وہ غائب ہوگئی اور دریافت کرنے پر مجھے معلوم ہوا تھا کہ اس کے میاں کو حیدر آباد یا کراچی میں نوکری مل گئی

تھی اور وہ اپنے بال بچوں کو لے کر چلا گیا تھا۔

میں اس عورت کا در سے مقابلہ کرنے لگا جو بڑی مستعدی سے میرے آگے چل رہی تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پھر مجھے دیکھتی اور کھل کھلا کر ہنس دیتی۔ سکھر والی عورت سے مجھے یہ محسوس ہوگیا تھا کہ میں عورت سے تعلق کے قابل ہی نہیں ہوں' مگر اس عورت نے میرے پاس آکر کس طرح ایسا اشتعال پیدا کردیا تھا کہ میں یکدم سے پورا مرد ہوگیا اور اس وقت بھی مجھے وہ برا نکیخۃ کررہی تھی۔

چلتے چلتے آخر کار ہم سرآب روڈ کے خاتمے پر پہنچ گئے۔ سڑک پر ایک زنجیر لگی ہوئی دکھائی دے رہی تھی اور قریب ہی کچھ کچی دکانیں تھیں جن میں سے ایک میں ٹین کی کرسیاں پڑی تھیں اور کچھ لوگ چائے پی رہے تھے۔

"تم میاں یہاں بیٹھو ہم والد کے پاس جائے گا"

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کو سڑک سے اتر کر گلی کی طرف جاتا دیکھتا رہا۔ ایک آدمی نے چائے کی چھوٹی کیتلی میرے سامنے رکھ دی اور میں ایک پیالی میں چائے انڈیل کر پیتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ وہ گلی کے کچے مکانوں کے درمیان غائب ہوگئی۔

مجھے یاد آیا کہ حیدر آباد میں ایک صاحب تھے جو یہ دیکھ کر کہ میرے یہاں کوئی عورت نہیں تھی بولے تھے۔

"آپ کے یہاں کوئی عورت نہیں ہے۔ میری بیوی آپ کے یہاں آکر آپ کا کام کردیا کرے گی" میں خاموش رہا تھا۔

عورت کے نام پر میرے دل میں گدگدی ہونے لگتی تھی اور یہ تصور کرکے کہ ایک عورت میرے گھر میں آئے گی اور میرا کام کرے گی میرے سامنے عجیب سماں بندھنے لگتا تھا۔ دوسرے دن اپنے اسکول جاتے وقت وہ میرے یہاں اپنی بیوی کے ساتھ آئے تھے۔ بیوی کا چہرہ برقعہ میں چھپا ہوا تھا۔ انھوں نے زور کے ساتھ کہا تھا"ان سے کیا پردہ" تم ان کے یہاں روز اسی وقت آجایا کرنا۔ بلکہ میں تمھیں اسکول جاتے وقت یہاں چھوڑ جایا کروں گا اور تم ان کے ضروری کام کرکے اپنے گھر چلی جایا کرنا۔"

بیوی نے بڑی بیباکی سے برقعہ اتار کر الگ رکھ دیا تھا۔ میں نے ان کو نگاہ نیچی کیے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اچھی خاصی سی معلوم ہوئی اور جلدی سے باورچی خانے میں چلی گئی تھیں۔ میں جاکر بیٹھک کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ وہ کشتی میں چائے کا سامان لگائے ہوئے آئی تھیں اور کشتی کو میز پر رکھ کر میرے سامنے بیٹھ گئی تھیں۔ وہ اپنے جسم کو اچھی طرح سے چادر میں لپیٹے ہوئے تھیں اور چادر کے سرے کو اس طرح اوڑھے ہوئے تھیں کہ ماتھا اور کان اچھی طرح ڈھکے ہوئے تھے اور آنکھیں اور ناک اور گال ہی مجھے دکھائی دے رہے تھے۔

انھوں نے چائے کی پیالی بناکر میرے سامنے رکھی تھی۔ میں چائے پیتا رہا اور انھیں کن انکھیوں سے دیکھتا رہا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا تھا "آپ کے کتنے بچے ہیں؟" اور انھوں نے بتایا تھا کہ چھ بچے ہیں۔ میں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ ان کا پیٹ پھولا ہوا تھا اور میں نے کہا تھا کہ چھ ہیں اور ساتواں ہونے والا ہے۔ وہ گھونگھٹ اور زیادہ کاڑھتے ہوئے بولی تھیں "میں عاجز ہوں ہر دوسرے سال ایک بچہ ہوجاتا ہے۔"

"سب میں بڑا لڑکا کتنا بڑا ہوگا؟"

"اب بارہ سال کا ہوجائے گا۔ ساتویں میں پڑھتا ہے سب سے چھوٹا کچھ مہینے اور دو برس کا ہے۔"

جب وہ میرے سامنے سے کشتی اٹھاکر باورچی خانے کی طرف جارہی تھیں تو میں نے ان کے پیٹ پر نگاہ جمائی تھی جس پر سے چادر ہٹ گئی تھی۔ وہ نمایاں طور پر بڑا تھا۔ وہ باورچی خانے میں کافی دیر تک رہی تھیں اور میں سوچتا رہا تھا کہ میں بھی ان کے سامنے جاکر بیٹھ جاؤں' مگر ہمت نہ پڑی تھی اور میں بیڈ روم میں پلنگ پر لیٹا ان کا تصور باندھ رہا تھا۔ وہ کسی طرح سے دلکش نہیں تھیں اور مجھے ہرگز ہرگز نہیں بھائی تھی۔ پھر مجھے یہ بھی خیال تھا کہ شوہر نے مجھ پر اعتبار کیا تھا اس لئے اگر میں ان کی طرف غلط خیال کروں گا تو برا ہوگا۔

سیپ کراچی --- ۳۸

کوئی گھنٹہ بھر کے بعد وہ بالکل بیباکانہ میرے سونے کے کمرے میں چلی آئی تھیں اور اب ان کا سارا چہرہ گردن سے لے کر سینے تک کا حصہ کھلا دکھائی دے رہا تھا۔ کرتی میں ابھرے ہوئے سینوں پر ململ کا دوپٹہ گلابی رنگ کا پڑا ہوا تھا۔ وہ نہایت سریلی آواز میں بولی تھیں :

"میں نے سالن تیار کرکے کرہائی پر رکھ دیا ہے روٹی پکاکر ٹوکری میں رکھ دی ہے۔ آپ نکال کر کھالیجئے گا۔ اب میں جاتی ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے ان کے چہرہ پر پڑا ہلکا گلابی رنگ دوڑ گیا تھا اور ان کی آنکھوں میں بڑی خاصی شرماہٹ آگئی تھی۔ انھوں نے میرے سامنے چادر ... اوڑھا اور سلام علیک کہہ کر باہر جانے لگی تھیں پھر دروازے سے واپس میرے پاس آئی تھیں اور باتیں کرنے لگی تھیں۔ مجھے اب یاد نہیں کہ وہ کیا کیا باتیں کرنے لگی تھیں مگر یہ یاد ہے کہ وہ کئی بار جا جاکر واپس آئیں اور ہر بار زیادہ کھل کر مسکراہٹ کے ساتھ نہ معلوم کیا کیا کہتی رہی تھیں میں باتیں سننے کے بجائے زیادہ سے زیادہ غور سے انھیں دیکھتا رہا تھا اور جب وہ چلی بھی گئی تھیں تو ان کا نہایت معمولی چہرہ ایک خاص تاثر کے ساتھ میرے ذہن پر جم گیا تھا۔ اس دن دفتر میں بار بار ان کے جاتے وقت کا تاثر میرے سامنے آتا رہا تھا اور جب میں رات میں سوگیا تو خواب میں بھی انھیں دیکھتا رہا۔

دوسرے دن میں ان کو غور سے دیکھنے ہی کے لئے اٹھ بیٹھا تھا اور پہلا کام جو میں نے کیا تھا وہ یہ کہ باورچی خانہ میں جاکر ان کو توس سینکتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ ایسی دلکش نہیں تھیں جیسی میرے تصور میں ہوگئی تھیں، مگر مستقل طور پر بری لگی تھیں۔ اب پہلی دفعہ مجھے ان کا چہرہ نچا نچا معلوم ہوا تھا اور جب وہ چائے کا سامان میز پر لگاکر میرے پاس بیٹھی تھیں تو مجھے ان کے ماتھے اور گال پر کئی چیچک کے نشان دکھائی دیے اب انھوں نے بڑی بیباکی سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں اس پر وہ مجھے زیادہ ہی بری لگی تھیں، مگر ان کو بار بار دیکھے جانے کی وجہ سے شاید یہ سمجھی تھیں کہ میں ان پر پورے طور سے ریجھ گیا ہوں اسی لئے وہ اب زیادہ بیباک ہوتی گئی تھیں اور دروازے سے تیسری دفعہ واپس آنے پر کہنے لگی تھیں؟ "ارے میں بھولی جارہی تھی۔ اگر آپ کے پاس پچاس روپے ہوں تو دے دیجئے۔ ضرورت ہے مہینے پر دے دوں گی۔"

ان کے لہجے میں بڑی دلکشی تھی اور ان کے دلکش ہونٹ اسی دلکشی کے ساتھ کھلے تھے کہ مجھے بے تحاشہ انھیں چوم لینے کو دل چاہا تھا، مگر اپنے کو روک کر میں نے پرس سے دس دس کے پانچ نوٹ نکالے تھے اور ان کو دے دیے تھے۔

خیر وہ میرے یہاں آتی رہتیں اور میں بھی ان کے یہاں جاتا رہا۔ ان کے سب بچے مجھ سے مانوس ہوگئے تھے اور وہ خود مجھ سے زیادہ سے زیادہ بیباک ہوتی گئی اور زیادہ سے زیادہ روپے کی ضرورت کا اظہار کرتی گئی تھیں اور میں انھیں رقمیں دیتا گیا تھا۔ انھیں جگہ جگہ کی سیر کرنے کا بڑا شوق تھا چنانچہ میرے ساتھ ساتھ بیٹھ کر وہ حیدر آباد سے کراچی آئی تھیں اور ہر اس مقام پر گئی تھیں جہاں لوگ سیر کو جایا کرتے تھے۔ میں نے ان کو اکثر کپڑے خرید کردیے۔ ہر سیر میں پچاس تو ضرور ان پر خرچ ہوجاتا۔ میں ان سے جتنا قریب آیا شاید پہلے کسی عورت کے نہ آیا تھا، مگر جتنا قریب آیا اتنی ہی نفرت ہوتی گئی۔ عجیب معاملہ تھا۔ تصور میں وہ بڑی حسین نظر آتیں، مگر سامنے آنے پر بری لگنے لگتیں۔ میں انھیں تعجب کے ساتھ غور سے دیکھتا اور دل میں سوچتا کہ تصور اور حقیقت میں کتنا فرق ہے۔ اکثر بہت زیادہ قریب آجانے پر ان سے دور ہوجاتا۔ ایک دفعہ تو ایک خط میں ایک لفظ پڑھوانے کے بہانے وہ مجھ سے اس قدر قریب آئی تھیں کہ میرا منہ ان کے منہ سے لگ گیا تھا۔ مجھے ان کا منہ چوم لینا چاہئے تھا، مگر میں ان کے پاس سے بھاگا تھا اور گھر سے باہر نکل کر اپنے گھر چلا گیا تھا۔ کیا مجھے ان سے لگاؤ تھا؟ عجیب کشمکش تھی۔ وہ اسی سے فائدہ اٹھاتی رہیں اور مجھ سے رقم اینٹھتی رہتی۔ میں نے کبھی حساب نہیں کیا، مگر اب سوچتا ہوں تو کئی ہزار کی رقم ضرور خرچ کی ہوگی۔

میں سارا واقعہ یوں ہی دہرا رہا تھا کہ ایک شخص میرے سامنے آکر بولا :

"آپ ہی آئے ہیں در کے ساتھ؟"

میں نے کہا "ہاں۔"

"میرے ساتھ آیئے۔" اس نے کہا۔ (۲)

وہ گلی سڑک سے کافی دور تھی۔ مٹی کے کچے مکانوں کے علاوہ اس میں ایک مسجد بنی نظر آرہی تھی جو سب مکانوں سے اونچی بنی ہوئی تھی کچھ دیر سستالینے کے باوجود میرے پیر تھکنے لگے تھے اور جو شخص میرے ساتھ جارہا تھا میں اس کے ساتھ ساتھ چلنے سے قاصر تھا' مگر اس اطمینان کی وجہ سے کہ یہ لوگ مجھے قبول کررہے تھے میں کافی خوش تھا۔ در کی حسین شکل میرے سامنے تھی اور میں چلا جارہا تھا۔

ہم اس مسجد پر پہنچے جو تمام وقت میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ وہاں ایک طرف ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ جن کے سر پر بڑا صافہ جسے منڈاسا کہتے ہیں وہ بندھا تھا۔ ان کی لمبی داڑھی پیٹ تک آرہی تھی اور سرخ رنگی ہوئی تھی۔ چہرہ پر جھریوں میں خون چھلک رہا تھا۔ عربی اور فارسی کے بڑے ماہر تھے صاف صاف اردو بھی بول لیتے تھے۔

مجھ سے مصافحہ کرنے کے بعد وہ بولے "آپ ہی کا معاملہ ہے"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ معاملہ سے ان کا کیا مطلب مگر ان کے رعب میں میں نے کہہ دیا "جی ہاں"

"آپ کنٹرولر کے دفتر میں ملازم ہیں۔"

"جی ہاں۔"

"کتنی تنخواہ ہے۔"

"پانچ سو اور الاؤنس وغیرہ علاوہ۔"

"آپ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ آپ کے والد اور والدہ کہاں کے ہیں۔"

"میں مراد آباد کا رہنے والا ہوں۔ والد والدہ بچپن ہی میں مرگئے تھے۔ ان کی کچھ جائداد تھی جو ایک چچا کے قبضے میں تھی انہوں نے ابتدائی تعلیم دلائی۔ ہائی اسکول کرچکا تھا کہ تقسیم ہوئی کراچی آکر سیکریٹریٹ میں ملازم ہوا۔"

"شادی ہوچکی ہے"

"جی نہیں' کسی نے شادی ٹھیرائی نہ کسی نے کی۔"

"تم غفور کی لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہو۔"

"جی ہاں ضرور اور وہ بھی مجھ سے راضی ہے۔ مگر وہ شادی شدہ ہے اور اپنے خسر کے پاس رہتی ہے۔"

"مجھے سب معلوم ہے۔ اس کے میاں نے طلاق دے دی ہے چھ مہینے ہوئے عدت کے دن بھی پورے ہوگئے اور وہ اپنے باپ کے پاس واپس آجاتی' مگر اس کا سسر خرچہ مانگتا ہے اس نے شادی میں پانچ سو روپے خرچ کئے تھے۔ اگر لڑکی کا باپ وہ دے دے تو ابھی لڑکی کو وہ آجانے دے گا۔"

"میں پانچ سو روپیہ کل ہی دے دوں گا۔ آپ محمد خان کو دے دیجئے گا آج اتوار ہے نہیں تو آج ہی بینک سے نکال کر دے دیتا۔"

غفور نے کہا "اب آدھا دن آگیا ہے کچھ کھانے کے لئے ہوجائے۔"

مولوی صاحب نے میری طرف نگاہ جمائی میں نے بٹوے سے ایک پچاس کا نوٹ نکالا اور کہا "بھائی صاحب کھانے کا سب سامان لے آیئے۔"

غفور اور اس کے ساتھ ایک اور آدمی جو پینٹ اور کوٹ ایسا کچھ پہنے تھے فوراً باہر گئے اور تھوڑی دیر میں خمیری روٹیاں اور مرغے کا گوشت لے کر واپس آئے میں ان لوگوں کے ساتھ کھانا کھاتا رہا۔

باتوں باتوں میں مولوی صاحب نے پوچھا۔ "محمد خان کو روپیہ دے کر در کو اس سے الگ کرلوگے تو رہوگے کہاں؟"

"مجھے یہیں قریب ہی کالونی میں گھر مل جائے گا۔ میں نے دیکھا ہے مگر اب تک انھیں محمد خان نے جانے نہیں دیا۔"

غفور نے کہا "نکاح کی دعوت کے لئے بھی روپیہ ہوگا۔"

"پانچ سو روپیہ محمد خان نے دیا تھا وہ بھی میں دے دوں گا۔"

"نہیں اب منگائی بڑھ گئی ہے پانچ سو میں کچھ نہ ہوگا۔ کم سے کم دو ہزار چاہیے۔"

"میں یہ بھی دے دوں گا۔"

مولوی صاحب نے کہا "دعوت کی ضرورت کیا ہے۔ یہ دوسری شادی ہے تم یہاں رہنے کا ٹھکانہ کرنا چاہتے ہو وہ صاحب کردیں گے۔"

کھانے کے بعد میں مولوی صاحب سے رخصت ہوا اور گلی کے اندر ایک جگہ یا جہاں کچی دیواریں کھڑی تھیں اور اس پر چھپر پڑا تھا۔ غفور نے کہا "یہاں ہم مکان بنالے گا اور آکر رہے گا۔ دو ہزار میں سب کچھ ہوجائے گا۔ در کی ماں اور بہنیں اور بھائی سب آجائے گا آپ بھی اسی مکان میں رہنا۔"

سڑک پر آکر ایک بس کے زنانے درجہ میں انھوں نے در کو بٹھادیا۔ یہ زنانہ درجہ صرف ایک پردہ کے ذریعہ مردانے سے الگ تھا میں پردہ کے پاس بیٹھا بس چلی در نے پردہ ہٹاکر کہا "ہم شہر جائے گا شہر کا ٹکٹ لینا۔"

بس رکتی ہوئی سواریوں کو بٹھاتی ہوئی اس گلی پر بھی رکی جہاں ہم رہتے تھے۔ در نے ایک دفعہ پھر پردہ سے منہ نکال کر کہا "یہاں نہیں اترے گا۔"

بس رک رک کر چلتی رہی بڑی بڑی عمارتوں اور ان کے آگے کھلی زمین پاس سے گزرتی رہیں اکثر عمارتوں کے پاس سائن بورڈ بھی لگے ہوئے تھے جن سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ عمارتوں میں کون سے دفتر ہیں۔ کئی جگہ عمارتوں کے درمیان وسیع میدان بھی خالی پڑے تھے۔ ایک جگہ ایک خالی میدان پر اٹھائی گیروں نے اپنے خیمے بھی کھڑے کر رکھے تھے۔ آخر کو ریل کی کراسنگ آئی اور اسے پار کرکے بس ریل کے اسٹیشن کی طرف مڑی۔ اسٹیشن سے داہنے ہاتھ پر مڑکر جناح روڈ پر آگئی اور کافی دور چلنے کے بعد بائیں کو مڑی اور ایک کالج کے پاس رکی یہاں کافی لوگ اترے اور کالج کے پاس کی سڑک پر ہوتے ہوئے لیاقت بازار کی طرف چلتے ہوئے دکھائی دیے۔ پھر جناح روڈ کے چوراہے پر داہنے کو مڑکر بس قندھاری بازار میں آگئی تھی۔ کافی دور چل کر آخر کو اڈا آگیا۔ یہاں سب لوگ اتر گئے اور بس خالی ہوگئی۔

در مجھ سے پہلے ہی اتر گئی تھی۔ اور چادر میں منہ چھپائے کنارے کھڑی ہوگئی تھی۔ میں اس کے پاس پہنچا تو اس نے جدھر سے بس آئی تھی ادھر اشارہ کرتے ہوئے کہا "ہم ادھر چلے گا۔"

ہم دونوں چوراہے کو پار کرکے اس جگہ آئے جہاں فٹ پاتھ پر لوگ مختلف قسم کی چیزیں شیشے لگے بکسوں میں رکھے بیٹھے تھے ایک جگہ انگوٹھیوں کا بکس رکھا ہوا تھا۔ وہاں رکے۔ در نے کہا "ہم انگوٹھی لے گا۔"

اس نے بکس کو غور سے دیکھ کر چار انگوٹھیاں نکلوائیں اور مجھے دکھاتے ہوئے بولیں "ہم یہ لے گا۔"

یہ انگوٹھیاں نہایت معمولی تھیں اور دو سے تین روپیہ تک کی تھیں اس نے انگوٹھیوں والے سے بات کی اور میں نے جیب سے نکال کر بارہ روپے دے دیے اس نے ہر انگلی میں ایک انگوٹھی پہنی اور اپنے ہاتھ کو دیکھتی ہوئی میرے ساتھ چلی۔ سڑک پار کرکے وہ ایک دکان پر آئی جہاں میرے حساب سے بہت سستا سامان رکھا ہوا تھا۔ اس نے وہاں سے کئی سر پر لگانے والے پھول دار کلپ خریدے اور ایک کنگھا لیا جو سر پر لگ جاتا تھا ایک جوڑی ہاتھ میں پہننے کے موتیوں کے لچھے بھی لئے یہ سب سامان دس روپے کے لگ بھگ ہوگا۔ پھر وہ چوراہے کو پار کرکے لیاقت روڈ کے چوراہے پر گئی اب وہ مجھ سے دو قدم آگے تھی اور پھر پھر کر مجھے دیکھتی جارہی تھی۔

چھوٹی دکانوں کے بازار سے گزرتے ہوئے وہ بائیں کو مڑی اور دکانوں کے درمیان آگئی جہاں چادرے لٹکے ہوئے تھے۔ ایک دکان کے پاس کھڑے ہو کر اس نے ایک سرخ رنگ کا چادر پسند کیا اور میری طرف مڑ کر کہا۔

"ہم یہ لے گا۔"

"ضرور لے لو۔" میں نے کہا۔

یہ نہایت معمولی تھا اور دکاندار نے اس کی قیمت بست و پنج روپیہ بتائی میں نے قیمت ادا کردی اور اس نے چادر ایک بڑے کاغذ میں لپیٹ دیا۔ ور نے اسے بغل میں دبا لیا۔

اس سڑک کو پار کر کے ایک دکان آئی جس میں ربڑ کی سلیپریں رکھی تھیں یہاں پہنچ کر اس نے سرخ ربڑ کی سلیپر لی جو سات روپے کی تھی۔ ہم آگے بڑھتے چلے گئے۔ اچھے اور قیمتی سامانوں کی دکانوں کی طرف اس کی نگاہ نہ جاتی تھی اور ہر چھوٹی دکان پر سنگھار کا کوئی معمولی سامان دیکھ کر وہ یہ کہہ اٹھتی "ہم یہ لے گا" اور میں اسے وہ معمولی چیز دلا دیتا۔

اس نے کھانے کی بہت سی چیزیں جیسے کباب' کلیجی کی بوٹیاں' تکے وغیرہ بھی لئے اور ایک ڈیڑھ روپے کی ٹوکری بھی لی جس میں سامان رکھ لیا۔ مجھے اب یاد بھی نہیں کہ کیا کیا سامان تھا مجھے اس کا بلک کر کہنا "ہم یہ لے گا" اور اس پر میرا وجد میں کر فوراً دام دے دینا یاد ہے۔ غرض اس کے سارے ارمان نکل گئے اور بس پر واپس آتے وقت میں نے حساب لگایا تو سب سو سے بہت کم روپے ہوں گے مجھے وہ کراچی والی یاد آئی جس کے ساتھ جانے پر سینکڑوں خرچ ہوگئے تھے اور پھر میں اسے پسند بھی نہیں کرتا تھا۔ میں نے سوچا در کتنی سستی بیوی رہے گی اور میرا اس سے نکاح کر لینے کا ارادہ اور بھی پختہ ہوگیا۔

آخر کو وہ تھک کر بولی "اب گھر چلو۔"

ہم دونوں بس پر بیٹھ گئے اور برمان کے پاس اترے۔

اس نے اپنے سامان کی ٹوکری ہاتھ میں لٹکا کر گلی کے اندر جاتے ہوئے کہا "ہم پہلے جائے گا تم بہت دیر بعد میں آنا۔"

میں قریب دس منٹ ایک چائے کی دکان پر بیٹھا رہا اور پھر گھر پہنچا اس نے آکر دروازہ کھولا۔

(۵)

اب دفتر کے کافی لوگوں سے میں مانوس ہوگیا تھا۔ مجھ سے قریب بیٹھنے والے نعیم صاحب تھے جو چار پانچ برس ہی میں ریٹائر ہونے والے تھے۔ وہ کام کرتے کرتے مجھ سے متوجہ ہو کر کہتے "میرے سب عزیز بدایوں میں ہیں۔ میں یہاں آکر پھنسا' مارا گیا۔ نہ میرا کوئی ٹھکانہ ہوا۔ نہ میرے بچوں کا۔ لڑکا یونی ورسٹی میں پڑھتا ہے۔ دو برس سے فیل ہو رہا ہے۔ کوئی سنوائی نہیں کرتا۔ انگریزی میں پورے تین سوال کیے اور فیل۔"

"پورے پورے سوال انگریزی میں اس سے آپ کا کیا مطلب ہے۔ انگریزی یا اردو میں کوئی جواب اس طرح پورا یا مکمل نہیں ہوتا جیسے حساب یا سائنس کے پرچے ہیں۔"

"ارے میاں شرحوں میں جو جواب ہوتے ہیں وہ پورے کے پورے لکھ آیا اور پورے سوال کیسے ہوتے ہیں۔"

"شرحوں سے یاد کیے ہوں گے کچھ نہ کچھ تو بھول گیا ہوگا اور پھر انگریزی کی غلطیاں ہوں گی۔ نمبر نہیں ملے"

"بھولنے کا سوال ہی کیا ہے میاں۔ اس نے پورے کے پورے نقل کر دیے۔"

"اور پکڑا نہیں گیا۔"

"یہاں سب ہی نقل کرتے ہیں کوئی بھی پکڑا نہیں جاتا۔"

"اچھا میں نے بھی کراچی میں گریجویشن کیا۔ میرے زمانے میں کئی لڑکے پکڑے گئے اور نکال بھی دیے گئے۔"

"وہ زمانہ گیا۔ اب وہاں بھی دھڑلے سے نقل ہوتی ہے۔ یہی رہ گیا ہے۔ ایک حمام میں سب ننگے۔کون کسے کہے اور یہ ٹیچر جواب

ہیں۔ یہ سب بھی اسی طرح پاس کیے ہوتے ہیں۔ اور فرسٹ ڈویژن یوں ملتا ہے۔ ایک صاحب زادے سکھر میں تھے۔ وہ تمام اگزامنوں سے ملتے رہے اور امپارٹنٹ سوال پوچھتے رہے۔ ان سوالوں کے جوابات انھوں نے ایک ٹیچر سے لکھوالئے۔ آٹھ پرچوں کی آٹھ کاپیاں امتحان میں وہی لے کر جاتے اور ان میں سے جو سوال پوچھا جاتا نقل کردیتے فرسٹ ڈویژن آئے اور کھٹ سے پروفیسر ہوگئے۔"

"مگر پروفیسر ہوکر پڑھاتے کیسے ہوں گے۔"

"یہ کیا بات ہوئی ان ہی کاپیوں سے لڑکوں کو املا بول دیتے اور گھنٹہ ختم ہوجاتا۔ بات ہی کیا ہوئی۔"

میں یہ سب سن کر تعجب کرنے لگا اب تعلیم کیا رہ گئی ہے۔ اتنے میں ایک جوان کلرک پاس آئے جو پچیس برس کے ہوں گے اور جن کا نام سیف اللہ خاں تھا۔ وہ ہماری باتیں سن رہے تھے اور ایک دم بولے "میں نے یہ سب درجہ فرسٹ ڈویژن میں پاس کئے، مگر ایم اے میں مجھے تھرڈ دیا گیا۔"

"یہ کیسے ہوا؟"

"میں سائنس کا اسٹوڈنٹ تھا برابر فرسٹ کلاس لاتا رہا اور بی ایس سی کے بعد والد کا انتقال ہوگیا تو میں نے یہاں نوکری کی اور انگریزی میں پرائیوٹ ایم اے کیا۔ اس میں مجھے تھرڈ کلاس دیا گیا۔ میں کہتا ہوں جس کو فرسٹ ملا ہے اس کی اور میری کاپیاں باہر کسی اگزامنر کو بھیجی جائیں پھر دیکھئے زیادہ نمبر کسے ملتے ہیں۔"

"تو کیا باہر کے اگزامنوں سے آپ کو بڑی امید ہے۔ اندر کے اگزامنر تو آدھے سے کم ہوتے ہیں۔ باہر والوں نے بھی آپ کو تھرڈ ہی دیا ہوگا جب ہی تو ٹوٹل تھرڈ ہی رہا اور پھر آپ کو دوسرے کی کاپی بھجوانے سے کیا سروکار ہے اور اگر ایسا ہی ہو تو ہر ایک کی کاپیاں پھر سے لکھوائی جائیں۔"

وہ میرا منھ دیکھنے لگے اور میں نے ان کا منھ غور سے دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ ان کی کھوپڑی میں ایسی عقل ہے جو اپنے بات سوچنے سے آگے نہیں جاسکتی۔

میں ایک دم ہنس پڑا اور وہ اٹھ کر میرے پاس سے چلے گئے۔

نعیم صاحب بولے "اس سالے کے عقل ہے ہی نہیں۔ دن بھر گھومتا ہے اور دفتر کا ایک حرف کام نہیں کرتا۔ انگریزی میں فرسٹ ڈویژن کا خواہاں تھا اور ایک جملہ انگریزی کا لکھ نہیں سکتا۔ سائنس کے سوال نقل کرتا تھا پورے کے پورے نمبر پاتا تھا۔ انگریزی کے نقل کرتا ہے ان میں کوئی نمبر نہیں ملتے۔"

میں اپنا کام کرنے لگا اور نعیم صاحب بھی کام کرنے میں مصروف ہوگئے۔ سیف اللہ اپنی سیٹ سے غائب ہوگیا۔

کچھ دیر کے بعد نعیم صاحب بولے "اور بھی آپ کو معلوم ہے ان خانہ بدوش لوگوں کی زندگی کیسی زندگی ہے؟"

"کیسی زندگی؟"

"جنسی زندگی۔ ہر شخص کی بیوی کئی کئی سے پھنسی ہوتی ہے۔ بڑے کرپٹ لوگ ہیں۔"

"مگر میں نے سنا ہے کہ اگر کوئی عورت کرپٹ ہو تو اس کا میاں پورے قبیلے کے سامنے اسے قتل کردیتا ہے۔"

"یہ بھی ان کی چال ہے۔ قتل ضرور کرتے ہیں مگر کرپشن کی وجہ سے نہیں بلکہ کوئی اور وجہ سے اور زیادہ تر اب تو اسے کمائی کا ذریعہ بناتے ہیں۔"

"کمائی کا ذریعہ؟ یہ کیسے؟"

"یہ ہمارے ہاں چپراسی ہے نا۔ اس کی بیوی یہاں ایک حیدر صاحب تھے ریٹائر ہوگئے ان کے پاس آکر لیٹ گئی۔ میاں نے ہی بھیجا تھا اور اس سے روپیہ اینٹھتا رہا۔"

"وہ تو ڈھلی ہوئی عورت ہے۔"

"حیدر صاحب بھی قریب پچپن کے تھے۔ ان کے بال بچے تھے اور جو یہاں نہیں تھے' کراچی میں ہی رہے اور تین برس کے بعد وہ بھی چلے گئے تھے تم ان کی جگہ آئے ہو۔"

میں نے سوچا کہ یہ بات تو ٹھیک ہی کہہ رہے تھے' مگر انھیں مبالغہ بھی تھا۔ مجھے یاد آیا کہ وہ نہیں بلکہ اس کی بہو میرے پاس کیسے آکر بیٹھ گئی تھی اور میں نے پوچھا "اگر ان میں سے کسی سے نکاح کرلے۔"

"روپیہ ہونا چاہئے نکاح بھی کرسکتا ہے اور نکاح کرکے مصیبت مول لے لیتا ہے۔"

"مصیبت کیسی؟"

"نکاح آسانی سے ہوجاتا ہے۔ ایک مولانا ہیں وہ کردیتے ہیں۔ مگر اب آئے ہو تو جاتے کہاں ہو۔ سارا خاندان گھر میں بھر جاتا ہے۔ پورے کنبے کا بار اٹھانا پڑتا ہے۔ اور پھر کسی دن سارا گھر صاف کرکے سب چل دیتے ہیں کہیں جو پتا ملے۔ اپنے حساب سے لوٹ لینے کے لئے شادی کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک بزنس ہے اب یہ لوگ بھی بزنس مائنڈ ہوتے جارہے ہیں۔"

وہ پھر کام کی طرف متوجہ ہوگئے اور میں بھی اپنا کام کرتا رہا۔ میں اب ایک سرکاری کوارٹر ہی میں آگیا تھا جس میں در کے ساتھ اس کا سارا خاندان یعنی باپ' ماں' بہنیں اور دو بھائی بھی رہتے تھے۔ محمد خان ملازمت چھوڑ کر کراچی چلا گیا تھا اور اس کی جگہ میں نے در کے باپ کو دلوادی تھی۔ جو مکان اس نے مجھے دکھایا تھا اس کے بنوانے میں مدد کررہا تھا۔ قریب دو ہزار دے چکا تھا۔ وہ کسی طرح مجھے لوٹنے والے نہیں نظر آرہے تھے۔ میری ان سب کے ساتھ زندگی اچھی طرح گذر رہی تھی اور لوگوں کی بیویوں کے جو خرچے تھے انکے مقابلے میں در کا کوئی بھی خرچہ نہیں تھا۔ اس لئے نعیم صاحب کے خیالات مجھے غلط طرفداری پر مبنی معلوم ہوتے تھے۔

پھر کام کرتے کرتے وہ بولے' "ارے میاں تم کہیں جاتے ہی نہیں۔"

"کہاں جاؤں میں کسی کو جانتا ہی نہیں۔"

"نئی جگہ یہی ہوتا ہے' مگر ہماری طرف کے یہاں کافی لوگ ہیں اور پھر دوسرے صوبوں کے بھی مہاجر ہیں۔ یہاں مہاجروں میں کراچی سے زیادہ یکجہتی ہے۔ پرسوں ایک جگہ میلاد شریف ہے وہاں میرے ساتھ چلو بہت لوگوں سے ملاقات ہوجائے گی اور تمہاری شادی بھی تو نہیں ہوئی ہے۔ یہاں لوگوں کی اپنی لڑکیاں بڑی پرابلم ہیں میں تمہاری شادی بھی اچھی جگہ کرادوں گا۔"

"مجھے شادی نہیں کرنا ہے۔"

وہ ہنس کر بولے۔ "اگر نہیں کروگے تو یہاں کوئی چانس لے گا اور پھر لٹ کر کراچی واپس ہوگے۔ اپنی حفاظت کے لئے شادی کرو۔ ضرور کرو' میں تو یہی کہوں گا۔"

(۶)

نعیم صاحب بڑے پہنچے ہوئے لوگوں میں تھے' مگر ان کو یہ نہ معلوم ہوا کہ میرے گھر میں جو ان کے گھر سے کوئی چار مکان دور تھا کون لوگ رہتے تھے۔ اتوار کے دن وہ میرے گھر کے سامنے آکر بولے "ارے میاں آؤ شہر چلتے ہیں۔"

میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے گھر میں قدم رکھیں اسی لئے جلدی سے کپڑے پہن کر باہر آیا اور ان کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ وہ بولے "یہاں کا پانی بہت بھاری ہے پیٹ خراب ہوجاتا ہے۔ اس کا ایک علاج ہے۔ روز کم از کم ۵ میل چل لیا کرو اور آج اتوار کو یا کسی چھٹی کے دن تو دس سے پندرہ میل ضرور چل لینا چاہئے۔"

میں ان کے ساتھ سرآب روڈ پر چلتا رہا۔ وہ خاموش رہنے والے آدمی نہیں تھے۔ برابر ہر چیز پر کمنٹری کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ہم سرآب روڈ ختم کرکے بروری روڈ پر آگئے اور داہنے کو ریلوے اسٹیشن چھوڑ کر ایک گلی میں مڑے اور ایک بڑے بنگلے میں داخل ہوگئے۔

اس بنگلے کے لان پر ایک صاحبہ ٹہل رہی تھیں جو لمبی قمیض اور شلوار پہنے تھیں اور گلے میں ایک چٹ سی ڈالے تھیں قمیض میں ان کے سینے بڑے ابھرے نظر آرہے تھے۔ وہ ایک دم سے بولیں' "نعیم صاحب میں آپ کا انتظار کررہی تھی۔ آج بہت لیٹ ہوگئے۔"

نعیم صاحب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ نئے صاحب ہمارے یہاں آئے ہیں"

صاحبہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو اور بھی کھول کر مجھے گھورا اور بولیں "ہی از کوائٹ ینگ۔ ان میرڈ آئی تھنک"

نعیم صاحب بولے "ان کی شادی کرانا ہے۔ یہ بھی تلاش ہے۔ ان کو میں آج سب گھر دکھاؤں گا جہاں شادی ہوسکتی ہے۔"

صاحبہ اس پر ہنستی رہیں اور گھر کے اندر جاکر ایک کاغذ لائیں اور نعیم صاحب کو دیتے ہوئے بولیں "پلیز یہ چیزیں لے آیئے گا۔" پھر میری طرف رخ کرکے بولیں۔ "یہ جب چاہیں ہمارے یہاں آئیں میری اجازت ہے۔"

میں اور نعیم صاحب بنگلے سے باہر آئے نعیم بولے "لو تمہاری قسمت جاگ گئی وہ تمہارے اوپر ریجھ گئیں تمہیں بلارہی ہے۔ تم روز ہی کوئی بہانا نکال کر یہاں آجایا کرو پھر دیکھو کیا کیا حاصل ہوتا ہے۔"

"کافی سن کی ڈھلی ہوئی عورت ہے۔" میں نے کہا۔

"مگر اسی کی وجہ سے میاں کو اتنی ترقی ہوئی یہ بڑے افسر لوگ اسی لئے بیویاں کرتے ہیں کہ ان کے ذریعہ پروموشن چلتا رہے۔ یہ دیکھو بالکل میم ہورہی ہے انگریزی میں کیسی فروڈ ہے اردو کیسے اٹک اٹک کر بولتی ہے۔ تم جب اس کے یہاں آؤ گے تو معلوم ہوگا کہ کتنی انگریز ہے اور کتنی محبت دار ہے۔ کھلنڈری ہے۔ تم ضرور آیا کرنا۔ یہی ترقی کی کنجی ہے۔ تم نے تو گریجویٹ کیا ہے۔ ایم اے ہو نہ معلوم کہاں پہنچ جاؤ گے۔"

نعیم صاحب مجھے یہ سمجھاتے ہوئے چلے جارہے تھے کہ موٹر کا ہارن بجا دونوں سڑک سے الگ ہوگئے۔ موٹر میں وہی بیٹھی ہوئی تھی جس سے ہم ابھی مل کر آئے تھے اور جس کی بابت باتیں کررہے تھے۔

نعیم بولے "یہ موٹر چلانا سیکھ رہی ہے۔ ڈرائیور ہے۔ سیکھی ہوئی تو ہے' مگر ابھی ہاتھ صاف نہیں ہے تو صبح کو ایک چکر ادھر لگالیتی ہے اور ڈرائیور ساتھ رہتا ہے۔ یہ مقام عجیب ہے کوئی موٹر پر حملہ کردے۔ یہاں دن دھاڑے لوٹ مار ہوجاتی ہے۔ اس لئے فوج کی جیپیں دن بھر سڑک کے چکر لگاتی رہتی ہیں اور رات میں ہماری سرآب روڈ پر تو ہر سو قدم پر ایک فوج کا سپاہی کھڑا ہوتا ہے۔ تم نئے آدمی ہو رات میں نکلنے کی کوشش نہ کرنا۔"

"میرے پاس کیا ہے جو کوئی لوٹے گا۔"

"ارے میاں یہ کپڑے پہنے ہو۔ ہاتھ میں گھڑی تو لگی ہے یہاں کے لٹیروں کے لئے یہی بہت ہے۔ تمہیں مار کر کسی گڑھے میں ڈال دیں گے تاکہ پولیس کو خبر نہ ہوسکے۔"

یوں ہی باتیں کرتے ہوئے انھوں نے ایک رکشا جاتے ہوئی دیکھی اور اسے روک کر بولے "ہزارہ کی بستی کا کیا لوگے۔"

رکشا والا بولا "تین روپے۔"

"تین نہیں دو دیں گے چلنا ہو تو چلو۔"

رکشا والا راضی ہوگیا اور ہم دونوں رکشا میں بیٹھ کر قندھاری بازار والی سڑک سے ہوتے ہوئے ایک سڑک پر آگئے جو کچھ دور سناٹے میں جاکر ہزارہ کے لوگوں کی بستی میں ایک دکان پر رکی۔

یہ دکان کافی بڑی تھی اور اس کے مالک برکت علی صاحب بڑے پرلطف انسان تھے۔ نعیم صاحب نے میرا ان سے تعارف کراتے ہوئے کہا "یہ صاحب عارف ہیں ہمارے ہاں ابھی آئے ہیں۔ کراچی' حیدرآباد' سکھر میں رہے اور اب یہاں آگئے ہیں ہمارے دفتر میں" اور میری طرف رخ کرکے بولے "برکت علی صاحب یہاں سب سے پرانے ہیں اس تمام بستی میں سب سے بزرگ ہیں۔"

میری عمر ستر برس ہے۔ فوج سے ریٹائر ہو کر یہ دکان کا کاروبار کیا۔ ہم ہزارہ لوگ کوئٹہ میں تجارتی ہیں۔ ہم کوئی تیس سے چالیس ہزار ہوں گے۔ باقی پنجابی' پٹھان' وغیرہ ہیں ہمارے آدھے بھی نہیں ہیں۔ اور آپ مہاجر لوگ تو بہت ہی کم ہیں۔ بس ملازمت پر آتے جاتے ہیں کوئی رہ بسنے کا خیال نہیں کرتا۔"

"بلوچ بلوچ یہاں نہیں ہیں؟"

"ہے مگر تھوڑا ہے' کوئٹہ سے باہر رہتا ہے' پہاڑوں پر' سرداروں کے پاس زیادہ رہتا ہے۔"

نعیم صاحب نے کہا "عارف صاحب ابھی کنوارے ہیں۔"

ہزارہ صاحب بولے "تو ہم ان کا شادی بڑا اچھی جگہ کرادے گا۔"

"مجھے شادی نہیں کرنا ہے۔ نعیم صاحب یوں ہی کہہ رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ کیا بات ہوا ہم اب ستر برس کا ہے اور ہمارا دو بی بی ہے۔ دو کے بغیر کام نہیں چلتا۔ تمہارا علاج ہونا چاہیے۔ ہماری پاس دوائیں ہیں۔ ایک کھاکر دیکھو کیا حال ہوتا ہے۔"

"اچھا ایک دوا مجھے دے دیجئے میں کھاکر دیکھوں گا پھر بتاؤں گا۔"

انھوں نے ایک بڑے منہ کی شیشی میں مجھے ایک معجون دی اور کہا کہ یہ چالیس دن کا ہے بیس روپیہ قیمت ہے کھاکر دیکھو دو چار دن ہی میں کیسے جیتاب ہوتے ہو۔"

میں نے بیس روپے دے کر ان سے دوا لے لی۔

نعیم صاحب وہ سب سامان لیتے رہے۔ جن کی فہرست وہ لائے تھے۔ انھوں نے یہ سب سامان ایک تھیلے میں رکھ دیا میں سڑک پر ٹہل لگاتا رہا۔ میں نے دیکھا کافی تعداد میں عورتیں ادھر آجارہی تھیں سب کے منہ چادروں میں بند تھے' مگر ہر ایک چادر ٹھیک کرنے کے بہانے مجھے اپنے چہرے کی جھلک ضرور دکھاتی یہ سب نہایت درجہ گوری تھیں اور سب کے چہرے ایک ہی طرح کے تھے ناکیں خاصی انداز میں چپٹی مگر نوک نکلی ہوئی ان کے جسم بڑے جاذب نظر تھے۔ گھر میں در کو چھوڑ آیا تھا اس سے ہر ایک بہت اچھی تھی۔

"اچھا میاں اب چلیں۔" نعیم صاحب کی آواز میرے کانوں میں آئی۔

برکت علی صاحب نے کہا "یہ ہماری دوا چالیس دن کھاکر دیکھو اور ہمارے پاس متواتر آتے رہو۔ ہم آپ کا شادی کسی ایسی جگہ کرائے گا کہ زندگی بھر یاد کرو گے ہم کو دعا دو گے۔"

نعیم صاحب ایک رکشا لے آئے تھے۔ اس پر سامان رکھا گیا اور ہم دونوں اس پر بیٹھ کر واپس ہوئے وہ بولے "اب بہت دیر ہوگئی ہے۔ اب کی اتوار کو تمھیں اور بہت سے لوگوں سے ملاؤں گا۔ تمھاری زندگی میں بہار آجائے گی کبھی کوئٹہ چھوڑنے کا نام ہی نہیں لوگے میں بھی ریٹائر ہو کر یہیں رہوں گا۔ خاندان والے کراچی میں ہیں تو کیا ہوا میں یہاں ایک اور خاندان بنالوں گا۔"

(۷)

مغل مصوروں کے لحاظ سے وہ مثالی خوب صورت تھی۔ کتابی چہرہ' اونچی ناک' بڑی بڑی آنکھیں چوڑا ماتھا' صراحی دار گردن' انھیں دیکھ کر وہ تمام تصویریں آنکھوں کے سامنے پھر گئیں۔ ان تصویروں کی مثالی عورتوں کے رنگ سیاہ سلونے بلکہ پختہ کالے تھے یا نہ تھے مگر ان کا رنگ پختہ کالا تھا۔ سن کافی ہونے کی وجہ سے کچھ ڈھل ضرور گیا تھا' مگر معلوم ہوتا تھا کہ وہ مالش وغیرہ کے ذریعہ اس کا دکھاوا بنائے ہوئے تھیں۔ کپڑوں کا بھی بہت اچھا ذوق تھا سفید شلوار سیاہ رنگ کی کرتی جس میں گلا سینے کے ابھار تک کھلا ہوا اور سفید دوپٹہ گلے میں پڑا ہوا۔ سر پر بڑے سیاہ چمک دار بال خاص طور پر بنے ہوئے اور مانگ نکلی ہوئی۔ پہلی ملاقات میں انھیں عجیب محویت سے دیکھتا رہا۔

وہ میری نگاہوں سے نگاہیں ملاتے ہوئے شرما رہی تھیں مگر برابر مسکراتی رہی تھیں اور کئی بار کھل کھلا کر ہنس بھی دی تھیں وہ

انگلینڈ' امریکا ہو آئی بلکہ تمام یورپ کی سیر کرچکی تھیں۔ وہ کراچی میں کافی عرصہ رہی تھیں مگر کوئٹے کا سا خاموش اور کافی حد تک خاموش مقام انھیں بہت پسند تھا۔ یہاں کے ایک بڑے اسکول کی پرنسپل تھیں اور اسکول سے ملے ہوئے بنگلے میں رہتی تھیں۔

مسکرا مسکرا کر باتیں کرنا ایک خاص ادا تھی جو میرے دل میں کھبتی گئی۔

غصہ تو انھیں آتا ہی نہیں تھا "جس بات پر اوروں کو غصہ آتا ہے اس پر میں نے ہنسنا سیکھا ہے۔"

"میں نے ایک ڈرامہ پڑھا تھا جس میں تین آدمی یہ طے کرنے بیٹھے کہ کون سب سے بڑا جھوٹ بولے آخر میں ایک شخص جیتتا ہے اور یہ سب سے بڑا جھوٹ بولتا ہے کہ میں دنیا بھر میں گھوما ہوں اور میں نے کبھی کسی عورت کو غصہ میں نہیں دیکھا۔ سب مان جاتے ہیں کہ اس سے بڑا جھوٹ نہیں ہے۔"

"عورتیں بڑی جلدی غصہ کرنے لگتی ہیں' مگر آپ میرا ان عورتوں میں شمار ہی کیوں کریں۔"

"آپ کتنی ہی مردانی بننے کی کوشش کریں' مگر مجھے تو آپ عورت ہی معلوم ہوتی ہیں۔ دنیائے نسوانیت کا معجزہ"

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑتیں اور میرے لئے چائے لینے گھر کے اندر چلی جاتیں۔

تھوڑی دیر بعد ایک نوکرانی چائے کا سب سامان میرے سامنے میز پر رکھ جاتی۔ وہ سفید دوپٹے کے دامن لہراتی ہوئی کمرے میں آتیں میں ان کو محویت سے دیکھ کر کہتا "یہ ادا کہیں مردوں میں آسکتی ہے۔"

میں چائے کی پیالی سامنے رکھتے ہوئے ان کے چہرے کو تکتا رہتا۔ وہ مجھے دیکھتی ضرور اور خوش بھی ضرور ہوتیں مگر آنکھوں سے آنکھیں نہیں ملاتیں۔

کافی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرکے وہ کہتیں "آیئے ٹہلنے چلیں۔ یہاں کا پانی بھاری ہے۔ اس لئے سہ پہر کو میں دو میل ضرور ٹہل آتی ہوں۔ ادھر میدان میں اس کوہ مردار تک۔"

اور بستی سے دور میدان میں آکر وہ پری کی طرح اڑنے لگتیں۔ وہ تخت پر ہوتیں اور میں تخت کا پایا پکڑے لٹکا ہوتا۔ کوہ مردار تک پہنچتے پہنچتے وہ تھک کر بیٹھ جاتیں اور میں بھی ہانپتا ان کے پاس گرجاتا۔ وہ کھل کھلا کر ہنستیں مجھے محسوس ہوتا کہ وہ مجھ پر ہنس رہی ہیں میں کیسا احمق ہوں کہ انھیں گود میں نہیں اٹھالیتا اور ان کے ہونٹوں کے نہایت خوشنما خط کو کیوں نہیں چومتا۔

"اچھا پرسوں چھٹی ہے گلستاں چلیں گے۔ اسکول کی ویں پر تین چار لڑکیاں ساتھ لے لیں گے۔"

ان میں چار لڑکیوں سے وہ بڑی مانوس تھیں۔۔ یہ سب کتنی پیاری پیاری لڑکیاں ہیں اور انھیں میرے سامنے چمٹالیتیں اور منہ پر چٹا چٹ پیار کرتیں۔۔ لڑکیاں شرماتی نہیں تھیں بلکہ کھل کھلا کر ہنسنے لگا کرتی تھیں۔۔

شام کو میں گھر آتا اور در کو دیکھتا تو محسوس کرتا کہ میں جانور ہوں جو ایک جانور سے بندھا ہوا ہوں مگر انسانوں کی محبت سے محروم ہوں۔

در اب بالکل تہذیب یافتہ ہوگئی تھی۔ میں نے اسے سفید شواریں' ریشم کے پھول دار کرتے اور ململ کے دوپٹے بنوادیے تھے۔ وہ سالن' دال پکانا اور چپاتیاں پکانا بھی سیکھ گئی تھی اردو بھی بہت صاف بولنے لگی تھی۔ اس کے باپ نے دور والی گلی میں اپنا مکان بنالیا تھا اور بیوی بچوں کو لاکر ان کے ساتھ اسی مکان میں رہنے لگا تھا۔ وہ دفتر آنے سے ایک یا دو گھنٹے پہلے میرے یہاں آجاتا اور مجھ سے پیسے لے کر روز مرہ کا سب سامان لادیتا۔

در کو یہ شوق تھا کہ اس کے بچہ ہوجائے۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ اکثر لوگوں کے یہاں جاتی اور رات میں بڑی افسردگی کے ساتھ مجھ سے کہتی وہ لوگ کہتے ہیں تو بانجھ ہے اور بہت سے لوگوں کا نام لے کر بتاتی کہ اس کے دو یا چار بیویاں ہیں ان میں ایک کی دو بانجھ نہیں ہیں اور دوسریوں کے ہر سال بچے ہورہے ہیں۔

وہ اپنی ماں باپ کی سب سے بڑی لڑکی تھی اور اس کے بعد سے ماں کے یہاں ہر سال بچہ ہوتا رہا تھا۔ اس کی عمر اندازاً چودہ برس کی ہوگی۔ اسے خود حساب نہیں آتا تھا۔ اس کی ماں کے پانچ بچے مرچکے تھے تین بہنیں اور تین بھائی تھے۔ اس سے چھوٹی بہن اب جوان ہورہی تھی اور اس کی بھی شادی ہوجانے والی تھی ماں ایک لڑکے کو گود میں لے کر آتی اور مجھے بتاتی کہ اس کے چھ مہینہ کا پیٹ ہے اس کی اس سے چھوٹی بہن اکثر میرے بستر پر لیٹ کر سوجاتی ہیں۔ لحاف الٹتا تو دیکھتا کہ ننگی پڑی ہے۔ میں در سے کہتا تو وہ ہنستی ہوئی آتی اور اس کی پیٹھ پر دو ہنٹر مار کر نہ معلوم کیا کیا بکتی اور پھر باپ اسے گھر پہنچا آتا۔

در کے ساتھ میرے عورت سے تعلق کا نیا دور شروع ہوا تھا۔ اس سے پہلے میرا مسلک تھا۔

دیکھ لیتے ہیں لگی دل کی بجھالیتے ہیں
یا ٹک دیکھ لیا' دل شاد کیا' خش بخت ہوئے اور چل نکلے

کیسی کیسی عورتیں شروع ہی سے سامنے آتی رہیں مگر کسی سے جنسی تعلق نہ ہوسکا۔ مجھے یقین ہوچکا تھا کہ میں اس معاملہ میں بیکار ہوں مگر در کے ایک بیباکانہ یا معصومانہ قدم نے مجھے مرد بنادیا تھا۔ میں اس کا شکر گزار تھا اور دوسری عورتوں کی طرف پرانے قسم کی توجہ سے بالاتر ہوگیا تھا مگر ہیڈ مسٹریس نے پھر میرے اندر پرانے قسم کی محبت جگادی تھی۔ اس کے ساتھ وادیوں میں گھومتے گھومتے یہ محسوس ہوا تھا کہ وہ بیوی ہونے کے لئے زیادہ موزوں تھیں حالانکہ مجھ سے کافی بڑی تھیں۔

"تم سمجھ گئے ہوگے کہ مجھے کبھی کبھی ہی مرد سے دلچسپی ہوتی ہے اور تم ان میں سے ایک ہو۔"

"تو تم میرے ساتھ شادی نہیں کرسکتیں۔"

"میرے لئے شادی کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ میرے میاں تھے میرے بچے ہیں جو امریکا میں ہیں۔ اب جوان ہونے والے ہیں میں تم سے پندرہ برس بڑی ہوں گی تم سے شادی کرنے میں بدنامی ہے۔ بڑی بدنامی' ہم لوگ یوں ہی ملا کریں گے۔۔"

اور ایک دن وہ میرے گھر آئی اور میرے بیٹھک میں آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر دم لینے لگیں میں ان کی طرف متوجہ تھا کہ ایک دم سے در کمرے میں آئی اور ان کو اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے گھورتے ہوئے بولی۔ "یہ کون ہے ہم اس کو قتل کردے گا۔"

مسٹریس اس پر کھل کھلا کر ہنسی اور بولیں "یہ لڑکی تو بڑی خوب صورت ہے" اور ایک دم سے اٹھ کر اسے چمٹاتے ہوئے اور منہ پر چٹاچٹ پیار کرتے ہوئے بولیں۔ "آ چل باورچی خانے میں تیرے ساتھ چائے بناؤں گی وہاں تو مجھے مار ڈالنا۔"

کافی دیر بعد در مسکراتی ہوئی کشتی ہاتھ میں لئے اور مسٹریس اس کے پیچھے پیچھے آئیں۔ ہم سب چائے بناتے اور پیتے رہے در برابر مسٹریس کو ٹیڑھی آنکھوں سے دیکھے جارہی تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ہنس دیتی۔

"آج میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔۔" مسٹریس نے کہا

"کیوں تم جاؤ گی؟" میں نے پوچھا۔

در پہلے کھل کھلا کر ہنسی اور پھر شرما گئی اور بولی "نہیں آج نہیں۔"

مسٹریس کے اور میرے درمیان کوئی راز نہیں تھے اور یہی ہماری دوستی کی پختہ بنیاد تھی۔۔ میں نے ان سے کہا "تمھیں لڑکیوں ہی سے دلچسپی ہے تو مردوں کی طرف کیوں رجوع ہوتی ہو۔"

"کبھی کبھی منہ کا مزہ بدلنے کے لئے۔ اگر تم ایسے سامنے آجاتے ہو تو انکی طرف رجوع کرلیتی ہوں اور تمہارے سلسلے میں تو دونوں مزے ملے۔ یہ در تو ایسی اچھی لڑکی ہے جیسی آج تک کوئی نہ ملی۔۔"

"مجھے بھی ایسی لڑکی کوئی نہ ملی۔"

"وہ بالکل قدرتی ہے۔۔ بالکل Istinct کا معاملہ ہے۔"

"یہ تو مخدوش ہے کسی مرد کے ساتھ جاسکتی ہے۔"

"آخر میں وہ تمھیں چھوڑ کر اپنے گھر والوں کے ساتھ جائے گی۔"

"ممکن ہے، مگر ـــــ عشرت صحبت خوباں ہی غنیمت سمجھو ـــ نہ ہوئی غالب اگر عمر طبیعی نہ سہی۔"

"یہ تم نے میرے دل کا شعر پڑھا ہے۔ مگر یہ لڑکی تمھاری زندگی کے ارتقاء میں بڑا اہم مقام رکھتی ہے۔"

"اور تمھاری زندگی میں؟"

"میری زندگی میں ایسی ہر سال آتی جاتی رہتی ہیں۔"

"وہ اور قسم کی ہوتی ہوں گی ایسی نہیں"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ میں یہاں کی عورتوں میں سے جتنی چاہوں ملازم نہیں رکھ سکتی یا تمھاری طرح خرید نہیں سکتی۔ مگر ان سے وقتی لگاؤ ہوتا ہے۔ ان میں نزاکت اور نفاست نہیں ہوتی۔ پھر پھر۔ بڑی جلدی نفرت ہونے لگتی ہے آخر جسم اور اس کی تختی ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔"

اس طرح مسٹریس کے ہماری زندگی میں داخل ہوجانے سے مجھے میرے اور در کے لگاؤ میں جو مستحکم چل رہا تھا ایک خاص قسم کا رخنہ سا نظر آنے لگا۔

(۸)

ظاہر ہے کہ مسٹریس کے ساتھ جب میں چمن گیا تو در کو ساتھ لینے کا سوال ہی نہیں اٹھا ان کی مائکرو وین ڈرائیور کے ساتھ دو مرد بیٹھے تھے۔ جو ان کے اسکول کے کلرک تھے۔ اس کے پیچھے سیٹ پر میں تھا اور میرے پاس ایک اور صاحب تھے جو یونی ورسٹی میں ملازم تھے۔ اور مسٹریس کے خاص دوستوں میں تھے۔ مسٹریس خود دروازے کے پاس ایک سیٹ پر بیٹھی تھیں جو گاڑی میں سب سے زیادہ مرکزی سیٹ کہلائی جاسکتی تھی۔ ان کے پاس سیٹ پر دو لڑکیاں تھیں اور پیچھے کی سیٹ پر تین لڑکیاں تھیں لڑکیوں میں ہر ایک جوان اور بن بیاہی تھی اور ایک دبلی پتلی گوری میری توجہ کی کچھ دیر مرکز رہی مگر پھر میں سارا وقت مڑ مڑ کر مسٹریس کو دیکھتا رہا وہ ساڑی میں کچھ زیادہ لمبی لگنے لگتی تھیں اور میں ان کے سامنے یہ محسوس کرتا جیسے میں بہت چھوٹا ہوں اور کسی بالشتے کی طرح منہ اٹھاکر انھیں تک رہا ہوں۔

تھوڑی دیر تک میں پہاڑوں کے منظر اور ان میں مختلف قسم کے پتھروں کو دیکھتا رہا۔ پھر میری آنکھیں پتھرانے لگتیں اور میں منہ پھیر کر مسٹریس کو دیکھتا جو اور زیادہ سے زیادہ دلکش معلوم ہونے لگتی۔

ہم ایک پہاڑ کے پاس سے گزرے جس کی بابت لوگوں نے کہا "یہ پہاڑ معلوم ہوتا ہے کہ عورت لیٹی ہے۔"

"ہاں بالکل۔" لڑکیوں نے کہا۔

"مگر مجھے انسانی جسم کا کوئی اندازہ نہیں ہوا۔ میں نے مسٹریس کی طرف دیکھا اور پھر پہاڑ کو دیکھا مجھے محسوس ہوا کہ وہ ہی اس قدر بڑی ہوگئی تھی جیسے کہ پہاڑ اور وہ اس پر لمبی لمبی لیٹی تھیں۔۔ ایک لمحہ میں یہ مجھے اپنے تصور کا مبالغہ معلوم ہوا اور میں ان کو غور سے دیکھتا اور سر جھکاتا رہا۔

میرے دل میں ان کی طرف سے بڑے بڑے جذبات اٹھ رہے تھے۔ کبھی کبھی میری نظر ان لڑکیوں کی طرف بھی جاتی جو ہمارے ساتھ تھیں مگر وہ ذرا بھی حسین نہ محسوس ہوئیں تو نظر ہر پھر کر مسٹریس ہی پر ٹکتی وہ آنکھوں میں مجھ سے باتیں کرتیں اور ہنس پڑتیں۔ یہی دلکش کھیل ہوتا رہا یہاں تک کہ ہم گلستاں پہنچ گئے۔

اس کے بعد ہم ایک کھلے میدان میں آئے جس پر سڑک کے کنارے ایک نہر سی چل رہی تھی۔ اس کے پاس ہی میں نے ایک بڑا پہاڑ دیکھا اور ہماری گاڑی اس پہاڑ پر چلنے لگی۔ تھوڑی دیر میں وہ پہاڑ کے اوپر آگئی میں نے دیکھا کہ سڑک پہاڑ کے کگر پر تھی اور اس

کے نیچے بیا نشیب تھا مجھے خیال ہوا کہ اگر ڈرائیور ذرا سا چوک جائے تو گاڑی ہزاروں فٹ نیچے گر جائے گی۔ اب ہماری وین دھیرے دھیرے چلتی اور ہر موڑ پر ہارن دیتی۔

ہم ایک جگہ پہنچے جہاں نشیب میں ایک ٹنل سا تھا۔

"ریل اس ٹنل میں سے آتی ہے۔ یہ انگریزوں کا بنایا ہوا عجیب و غریب ٹنل ہے۔ عجائبات میں سے ہے۔" مسٹرلیس نے کہا

پھر اور چکر لگا کر ہم پہاڑی سے نیچے اترنے لگے۔ اب ہم کو زیادہ سے زیادہ گرمی محسوس ہونے لگی۔ جوں جوں میں نیچے اترتی گئی وہ گرمی بڑھتی گئی۔ آخر کو ہم چمن پہونچے اور ایک اسکول میں جو کافی اچھا بنا ہوا تھا اترے۔

یہاں کے ہال میں دسترخوان بچھایا گیا اور ہم سب نے کھانا کھایا

کچھ دیر آرام کے بعد سب نے کہا "اب بستی چل کر دیکھیں"

"ہمیں بہت سی چیزیں خریدنا ہیں۔ یہاں سستی ملیں گی"

ہم لوگ بستی کی مرکزی سڑک پر آئے۔ ہر طرف برتنوں کی اور کپڑوں کی دوکانیں تھیں۔ مسٹرس اور لڑکیاں ان میں سے ایک دوسری سے دوکان بھی جاتی رہیں اور کپڑوں وغیرہ کو دیکھتی رہیں۔

مسٹرس نے کہا "مجھے کچھ نہیں لینا ہے" اور مرکزی سڑک پر بستی کے آخر تک چلتی ہوئی وہ میرے ساتھ گئیں اور دور سے اشارہ کرتے ہوئے بولیں "یہاں پاکستان کی حد ختم ہے۔ ادھر افغانستان ہے۔ یہ ڈونڈرلائن ہے"

میں نے دیکھا کہ کچھ گدھے اور آدمی ادھر سے ادھر آ رہے تھے۔ میں نے پوچھا "ان لوگوں کو ادھر پاسپورٹ سے آنا چاہیے"

"ہاں" مسٹرس نے کہا "مگر سب چلتا ہے۔ یہ گدھے والے اور پیدل یوں ہی کراس کر لیتے ہیں۔ کوئی نہیں پوچھتا"

ہم لوگ واپس ہوئے تو ایک ریستوران بائیں کو نظر آیا۔ ہم سب نے اس میں بیٹھ کر چائے پی۔ وہاں کافی گرمی تھی اور اس لیے پنکھا چلا لیا گیا تھا۔ لڑکیاں اور وہ دو مرد جو ہمارے ساتھ تھے ان چیزوں کی قیمتوں کے بابت باتیں کرتے رہے جو لڑکیوں نے خریدی تھیں۔

کوئی دو گھنٹے کے بعد ہم ڈگری کالج کے پاس گزرتے ہوئے جو بہت ہی معمولی سی بلڈنگ میں تھا اسکول میں آئے۔

"اس کالج میں آرٹس اور سائنس دونوں کی پڑھائی ہوتی ہے اور کل ۱۵ لڑکے ہوں گے"

"اور ٹیچرز کو دو گھنٹوں سے زیادہ روز نہیں پڑھانا ہوتے"

"کون پڑھتا ہے اور کون پڑھاتا ہے"

"مگر حکومت کو تعلیم دینا ہے۔ آمدنی اور خرچے سے کوئی سروکار نہیں"

"مرکزی حکومت یہاں دس کروڑ خرچ کرتی ہے جب کہ یہاں پورے صوبے کی آمدنی چار کروڑ ہوگی"

"یہ فضول خرچی ہوئی"

"نہیں یہ ضروری ہے۔ آخر صوبے کو اور صوبوں کے برابر لانا ہے"

"اتنے میں کالج سے نکل کر ایک صاحبزادے آئے اور بگ ٹٹ چلتے ہوئے مسٹرس کے پاس پہونچے۔ مسٹرس ان کو دیکھ کر کھل گئی اور بولیں "تم یہیں رہتے ہو؟"

"یہیں ایک کمرہ ہے۔ اس میں ہم چار آدمی رہ رہے ہیں"

"بہت دنوں سے کوئٹہ نہیں آئے"

"آج چلوں گا آپ کے ساتھ آپ کی وین میں"

"جاؤ اپنا اسباب لے کر اسکول کے پاس آؤ۔ ہم لوگ چائے پی کر جانے والے ہیں"

"آپ کے یہاں جگہ ہے"

"تمہارے لیے جگہ ہو جائے گی مگر جلدی آؤ"

جس اسکول میں ہم ٹھہرے تھے وہاں کے ہیڈ ماسٹر بھی آ گئے تھے وہ پاجامہ اور کرتا پہنے اور رنگ روپ سے پٹھان معلوم ہوتے تھے مگر وہ اردو صاف بول رہے تھے اور کہنے لگے "میں یوپی کا ہوں مگر یہاں سب لوگ مجھے پنجابی سمجھتے ہیں۔ میں نے یہاں کی زبان بھی خوب سیکھ لی ہے"

آخر کو ہم سب وہاں سے چلے اور شام ہو چکی تھی جب کوئٹہ کی روشنیاں دکھائی دیں۔ اب مجھے مسٹرس کا چہرہ نہیں دکھائی دے رہا تھا اور میرا دھیان بجلی کی روشنیوں کے جال پر لگا ہوا تھا جو کوئٹہ کے شہر کی نشان دہی کر رہا تھا۔ مجھے مولانا روم کا یہ شعر یاد آتا رہا

می کنی جزو زمیں را آسمان - می فضائی در جہان جو اختراں

اور ہم کینٹ کے علاقہ میں داخل ہو گئے۔ مسٹرس کے اسکول کے احاطہ میں سب اتر گئے سوائے میرے اور پروفیسر صاحب کے۔ مسٹرس نے کہا

"ان لوگوں کو ان کے گھروں پر اتار آؤ"

"اب میں اور پروفیسر مائکرو میں اکیلے تھے پروفیسر بولے "آپ کو بھی شاعری کا ذوق ہے"

"جی ہاں ہے تو ضرور"

تو ہم ایک روز اپنے یہاں مشاعرہ کریں گے۔ آپ بھی آئیں گے"

"میں ضرور آؤنگا اور ویسے بھی آیا کرونگا۔ میں یہاں پر مان کی گلی میں سرکاری مکان میں رہتا ہوں"

مائکرو پروفیسر کے گھر پہونچ گئی اور پھر وہاں سے میرے گھر کی طرف چلی۔ کچھ ہی دیر میں وہ میرے گھر کے سامنے رک گئی۔ میں اترا اور دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ در سو گئی تھی۔ مگر بہت دیر کے بعد اٹھی اور دروازہ کھولا۔

"مجھے بہت بھوک لگی ہے۔ کھانا ہے"

"ہم نے کھا لیا۔ ہم سمجھا تم نہیں آؤ گے۔ ابھی تمہارے لیے چپاتی پکائے گا۔ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ مگر پھر بھی سب طرف سے گھر بند کر کے سو گیا۔"

"سو گئی کہو"

وہ مسکرا کر بولی "سو گئی" اور میں نے اس کا منہ چوم لیا

(۹)

پروفیسر صاحب نے ایک دن اپنے گھر پر مشاعرہ کیا۔ شام کے سات بجے سے مشاعرہ تھا اور صبح تک چلنے والا تھا۔ اس لیے میں نے در کو اس کے ماں باپ کے گھر پہونچا دیا اور خود گھر کو مقفل کر کے پروفیسر صاحب کے گھر آ گیا۔ یہاں پہ مسٹرس اور ان کے ساتھ کی چار اور لڑکیاں پہلے ہی موجود تھیں۔ پروفیسر مجرد آدمی تھے اور شادی کو آوٹ آف ڈیٹ چیز بتایا کرتے تھے۔ اس لیے آج کی تقریب میں ان کا گھر ہیڈ مسٹرس اور ان کی ساتھیوں نے سنبھال لیا تھا۔ بنگلے کے خاص کمرے میں زمین کا فرش تھا اور ایک طرف بڑا عمدہ قالین شعراء کے لیے بچھا تھا۔ میرے آنے کے بعد ہی سے شعراء آتے گئے اور ہیڈ مسٹرس ان سے کھل کھل کر باتیں کرنے لگتیں۔ ہیڈ مسٹرس نے آج بڑے شوخ رنگوں کے کپڑے پہنے تھے اور بڑے خاص طور پر تنی ہوئی کبھی گھر کے اندر جاتیں کبھی باہر آتی۔ ان کے ساتھ بھی لڑکیاں چائے کی بھری ہوئی پیالیاں لا لا کر سب لوگوں کے سامنے رکھتی جاتی۔

مشاعرہ شروع ہوا۔ پروفیسر صاحب میر مشاعرہ ہوئے۔ انھوں نے نظم شروع کی پہلا مصرعہ تھا

اجنتاالورہ کے بت

اور بہت سے آزاد مصرعے ایک کے بعد دوسرے آتے گئے۔ مجھے یاد نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ ان میں ہندوستان کے دریاؤں کے جیسے گنگا جمنا۔ مہاندی گوداوری کے نام تھے۔ ہر مصرعے پر واہ وا ہوتی رہی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ شاعری کیا ہوئی پھر ایک صاحب نے نثری نظم پڑھی جس کا ایک جملہ تھا۔

ہواؤں کے گھوڑوں پر تیر رہا تھا

پھر کچھ پرانے قسم کے شاعر غزلیں سناتے رہے اور واہ وا ہوتی رہی۔ میں الگ دیوار سے لگا بیٹھا تھا۔ ہیڈ مسٹرس کبھی آتیں اور کبھی چلی جاتیں اور تھوڑی دیر جہاں جی چاہتا بیٹھ جاتی۔ اتفاق سے وہ میرے پاس بھی آکر بیٹھ گئیں۔ کچھ دیر بعد بولیں "کیسا اچھا مشاعرہ ہورہا ہے"

"بہت اچھا" میں نے بھی کہا

"کیا بج گیا ہوگا" اور یہ کہہ کر اس نے گھڑی دیکھی اور میں بھی اپنی گھڑی دیکھنے لگا

"کیسا دلچسپ مشاعرہ ہے۔ دس بج گئے اور ہمیں معلوم ہی نہ ہوا"

یہ کہہ کر وہ میرے پاس سے اٹھ گئیں۔ پھر آئیں تو ان کے ساتھ ایک لڑکی پلیٹیں لیے ہوئے تھی اور ہر شخص کو ایک ایک پلیٹ پکڑا دیتی مجھے بھی اس نے ایک پلیٹ دے دی۔ پہلے پلاؤ پھر سالن اور روٹیاں آتی رہیں اور ہم سب کھاتے رہے۔ ہیڈ مسٹرس کے ساتھ کی لڑکیاں پانی پلاتی رہیں۔ آخر میں کھیر کا ایک ایک پیالہ بھی دیا گیا۔ حالاں کہ زیادہ آدمی نہیں تھے اور نہ زیادہ کھانا تھا مگر کھانے میں بارہ سے زیادہ بج گئے۔

اب پھر مشاعرہ شروع ہوا۔ پروفیسر نے ایک اور آزاد نظم پڑھی جس کا ایک مصرعہ بھی میرے پلے نہ پڑا۔

پھر ہیڈ مسٹرس سے التجا کی گئی کہ وہ بھی کچھ پڑھیں۔ انھوں نے کافی دیر تک عذر کیا۔ مگر آخر میں بڑی خاص دھن کے ساتھ ایک غزل سنائی جس کے ہر ہر شعر پر تعریفیں ہوتیں اور مکرر اور مکرر کی آوازیں اٹھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ غزل تو کچھ نہیں تھی مگر گانے کا انداز اور آواز کی اٹھان بہت ہی اچھی تھی۔ بجلی کی روشنی میں ان کی صورت اور بھی زیادہ اچھی معلوم ہوئی حالاں کہ اس کا خاص رنگوں کا لباس ولگر لگا۔

بہرحال مشاعرہ ہوتا رہا اور میں زیادہ سے زیادہ بور ہوتا گیا۔ ہیڈ مسٹرس کئی دفعہ میرے پاس آکر بیٹھی مگر ہر بار وہ مجھے زیادہ سے زیادہ بری لگتی گئیں اور مجھے اپنی در یاد آتی گئی۔

صبح ہوتے ہوتے پروفیسر نے ایک اور نظم سنائی اور ہیڈ مسٹرس نے ایک اور راگ الاپا۔ اس کے بعد چائے چلی اور ہم سب اٹھنے لگے۔ ہیڈ مسٹرس کی گاڑی کئی کئی کھیپوں میں دوسرے لوگوں کو پہونچاتی رہی۔ آخر میں میری باری آئی۔

"تم اپنے گھر جاؤ گے وہاں پہونچا دوں؟" مسٹرس نے پوچھا

"نہیں ذرا آگے در کے باپ کا گھر ہے۔ اس کو کل وہاں بھجوا دیا تھا۔ وہاں چھوڑ دو تو اچھا ہو"

"تو تم اس کو لے کر گھر آؤ گے؟"

"ہاں"

"ہم اسے لے کر تم دونوں کو گھر اتار دیں گے"

"یہ تو بہت ہی اچھا ہوگا"

"وہ کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ ان کی کھل کھلاہٹ مجھے بہت ہی اچھی لگا کرتی تھی مگر اس وقت نہ معلوم کیوں ایسی بری لگی کہ میرا جی چاہا کہ اس کے منہ پر تھپڑ مار دوں

غرض در کو اس کے باپ کے گھر سے لے کر ہم اپنے گھر پہونچ گئے۔ اترتے وقت مسٹرس نے در کو چمٹایا اور پیار کیا۔

گھر میں آکر در نے پوچھا "رات بھر اسی کے ساتھ رہے"

"نہیں مشاعرہ تھا۔ بہت سے لوگ تھے۔ سب شعر سناتے رہے"

"یہ مشاعرہ کیا۔ شعر کیا" وہ تعجب سے اور شبہہ کے ساتھ پوچھتی رہی۔

میں نے اسے بہت سمجھایا مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ آخر کو وہ اور میں دونوں سو گئے۔

(۱۰)

میں نے در کو بھی سمجھا دیا کہ مجھے ہیڈ مسٹرس سے نفرت ہوگئی ہے اور اب میں ان کے یہاں کبھی نہ جاؤنگا مگر میں دفتر سے نکل کر گھر آرہا تھا اور اپنے گھر کے پھاٹک سے کوئی چار گز پر ہوں گا کہ ایک مائکرو میرے پاس سے گزر کر میرے گھر کے پھاٹک پر رکی۔ میں پھاٹک پر پہونچا ہی تھا کہ ہیڈ مسٹرس ایک اور لڑکی کے ساتھ اتر چکی تھیں۔

وہ بولیں "پہلے ان سے ملو یہ قلات میں ہیڈ مسٹرس ہیں۔ یہاں آئی ہیں۔ کل ہم ہڑک اور حنا جارہے ہیں۔ میں نے کہا کہ تم بھی ساتھ چلو تو اچھا ہوگا۔ یہ کہنے کے لیے ہی تمہارے دفتر تک گئی۔ وہاں معلوم ہوا کہ تم ابھی گھر گئے ہو"

میں نے قلات والی ہیڈ مسٹرس کو غور سے دیکھا اور مجھے انکار کرتے نہ بنا بلکہ میں نے وعدہ کیا "میں ضرور چلوں گا"

"تو کل صبح آٹھ بجے میرے گھر آجانا"

"ضرور آؤں گا"

وہ پھر اپنی مائکرو میں بیٹھ گئیں

میں گھر کے اندر آیا در نے کھانا لگایا اور ہم دونوں کھانا کھاتے رہے۔ قلات والی ہیڈ مسٹرس جس کا مجھے نام بھی نہیں بتایا گیا تھا۔ ہیڈ مسٹرس سے کہیں زیادہ جوان تھیں۔ اس کا رنگ بھی سیاہ تھا مگر ناک نقشہ بڑا ہی اچھا تھا۔ ایسا اچھا کہ وہ میرے ذہن پر جم گیا تھا اور میں ان کے ساتھ دن بھر گزارنے کے لیے پٹنا اور ہڑک جانا چاہتا تھا

"کیا سوچ رہے ہو میاں"

"کچھ نہیں کل اتوار ہے۔ مگر دفتر کے کام سے جانا ہے آٹھ بجے"

"اور آؤ گئے کب"

"شام تک آؤں گا"

اس رات میں در کے پاس لیٹا تو رہا مگر تمام وقت قلات والی مسٹرس کا خیال رہا۔ صبح کو آنکھ جلدی ہی کھل گئی۔ میں نے در کو اٹھا کر ناشتہ تیار کرنے پر لگا دیا۔ جتنی دیر وہ ناشتہ تیار کرتی رہی میں کپڑے بدلتا رہا۔ میں نے اپنا بہترین نفیس بش شرٹ پہنا اور خوب اچھی طرح شیو کیا۔

اتنی دیر میں ناشتہ تیار ہوگیا اور میں نے در کے ساتھ ناشتہ کر کے جلد جلد مسٹرس کے گھر کی راہ لی۔ ویسے ہیڈ مسٹرس کے گھر کا راستہ میرے گھر سے ۳۵ منٹ میں طے ہوا کرتا تھا مگر آج میں نے اسے ۲۵ منٹ میں ہی طے کر لیا۔ پھاٹک پر پہونچ کر میں نے ابھی اندر کی طرف بڑا قفل لگا دیکھا اور پھر اپنی گھڑی کو دیکھا تو ابھی پونے سات ہی بجے تھے۔

کمالِ گرمئ شوقِ تلاش دید نہ پوچھ
مثالِ خار مرے آئینہ سے جوہر کھینچ

میں غالب کا شعر پڑھنے لگا۔ مگر خیال ہوا کہ گھنٹہ سے پہلے اس پھاٹک کا کھلنا ناممکن ہے اس لیے میں نے کوہ مردار کا رخ کیا اور روانہ ہوگیا۔ کوئی میل بھر جاکر خیال آیا کہ کوہ مردار نہ ہوگا تو کوئی تین میل تو ضرور ہوگا اور مجھے ابھی کافی چلنا ہوگا اس لیے ایک پتھر پر رومال بچھا کر بیٹھ گیا۔ آج غالب کے شعر آتے ہی چلے جارہے تھے۔ شعر یاد آیا۔

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

مجھے اپنے سب ہی عشق یاد آتے رہے۔ وہ سب ناکامیاب رہے تھے۔ در نے خود اس سے میرے عشق کو کامیاب بنایا اور یہ اس نے اپنی معصومیت میں کیا۔ اس کے بعد میں ہیڈمسٹرس کے ساتھ بھی کامیاب ہوا۔ اور اب یہ دوسری ہیڈمسٹرس سامنے تھی۔ مجھے محسوس ہوگیا تھا کہ یہ عجیب پینترے سے آرہی تھی۔ اس کا مقصد مجھے پھانس لینا ضرور تھا۔ ممکن تھا کہ میں در کو چھوڑ کر اس کا ہو رہوں مگر میں در کو ہرگز چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ بہت دیر تک میں الٹا سیدھا سوچتا رہا پھر میں نے گھڑی دیکھی تو ساڑھے سات بج چکے تھے۔

اب تو پھاٹک ضرور کھل گیا ہوگا یہ کہتا ہوا میں کافی تیزی سے ہیڈمسٹرس کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ گھر کے پاس پہونچا تو ہانپ گیا تھا مگر پھاٹک کو پاٹوں پاٹ کھلا دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ پھاٹک پر آیا تو دیکھا کہ وین آکر بنگلے کے اندر کھڑی ہوچکی تھی اور بنگلے کے عمارت کا صدر دروازہ بھی کھلا تھا۔ میں اس پر پہونچا تو چپراسی نے کہا "مس صاحبان تیار ہو کر ناشتہ کررہی ہیں اور آپ کے بابت انہیں فکر تھی کہ ابھی تک نہیں آئے"

"میں اندر جاؤں"

"جی ہاں۔ انھوں نے کہا جیسے ہی آئیں کھانے کے کمرے میں پہنچا دینا"

میں کھانے کے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ دونوں ہیڈمسٹرس اور چار اور میز پر بیٹھی تھیں اور چائے پی رہی تھیں۔ ان میں سے ایک نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا" آیئے آپ یہاں بیٹھ جایئے"

"تم ناشتہ تو کیا کر کے آئے ہوگے"

"آپ جانتی ہیں میرے گھر میں مشین ہے جو ہر کام وقت پر کر دیتی ہے"

"مشین؟"

"یوں ہی سمجھئے۔ ہر کام جو اس نے سیکھ لیا ہے وہ اشارہ پاتے ہی کرنے لگتی ہے"

"مگر مشین ہی ہے روبوٹ"

"جی ہاں کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ انسانوں کی وہ باتیں جو آپ لوگوں میں ہیں اس میں آنے کے لیے اسے کئی جنم ملنا چاہیے"

"اچھا تو تم ایک پیالی چائے تو پی ہی لو"

"یہاں چائے سے ویسے ہی انکاری نہیں ہوسکتا جیسے اور شہروں میں پانی سے"

کچھ ہی دیر بعد ہم سب چائے پی کر اٹھے۔ باتوں میں مجھے اس دوسری ہیڈمسٹرس کا نام بھی معلوم ہوگیا تھا۔ مسرت افزا پورا نام تھا اور ہیڈمسٹرس اس کو خالی مسرت کہہ رہی تھیں اور دوسری لڑکیاں مسرت باجی کے نام سے متوجہ کرتیں۔

غرض ہم سب مائکرو میں بیٹھ کر چلے۔ مسرت نہایت بیباکی سے اسی سیٹ پر بیٹھ گئی جس پر میں بیٹھا تھا۔ آگے ڈرائیور کے پاس ایک تو ہیڈمسٹرس کے کلرک بیٹھے اور ایک کوئی اور صاحب تھے جنھیں میں نہیں جانتا تھا۔

میں مسرت کو دیکھتا رہا جو بڑے مزے میں مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ فضا میں کوئی چیز دیکھنے کی ہی نہیں تھی۔ ہم لوگ ہڑک پہونچ گئے۔ پیڑوں کے درمیان کی سڑک پر ہوتے ہوئے ابھی پھاٹک پر پہونچے جو بند رہتا تھا۔ یہاں وین کو چھوڑا اور کلرک کے پرمٹ دکھانے پر ہم لوگ پھاٹک کے اندر گئے۔ کافی دور تک بڑی پتھریلی ریت پر چلتے ہوئے اس جگہ آئے جہاں پہاڑوں پر برسنے والے پانی کی ایک نالی چل رہی تھی اور اس کے پاس جگہ خالی تھی۔ منشی جی نے اسی جگہ پر ایک دری بچھا دی اور سب لوگ اسی پر بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد مسرت نے کہا "یہاں بیٹھنے تھوڑی آئے ہیں" اور اٹھ کھڑی ہوئی

ہم دونوں آگے آگے اور لڑکیاں پیچھے پیچھے اسی جگہ پر پہونچے جہاں بہت بڑا حوض تھا۔ اس میں نیلے رنگ کا پانی بھرا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ حوض بہت ہی اتھلا ہے۔

میں اور مسرت اس کے پاس کھڑے ہوئے اور مسرت نے ایک پتھر کا ٹکڑا اس میں پھینک کر کہا "دیکھئے کتنا گہرا ہے"

میں نے دیکھا کہ پتھر کا ٹکڑا کافی دیر تک گرتا رہا اور آخر میں زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے بڑے پیار سے مسرت کو دیکھا۔ ہیڈ مسٹرس نے اپنا کیمرہ دکھاتے ہوئے کہا "تم دونوں ادھر کھڑے ہو میں ادھر سے تم دونوں کی تصویر لوں گی۔ یہ لیک بیک گراونڈ بھی رہے"

"یہ تو بہت اچھا ہوگا۔ یادگار تصویر ہوگی"

مسرت بالکل مجھ سے مل کر کھڑی ہوئی۔ میں نے اپنی داہنی ٹانگ پر اس کو محسوس کیا۔ ہم دونوں تن کر کھڑے ہوئے اور ہیڈ مسٹرس نے تصویر کھینچ لی۔

اس کے بعد اٹھے ہوئے کنارے پر بیٹھتے ہوئے مسٹرس نے کہا "ہم تھوڑی دیر یہاں بیٹھیں گے"

مسرت نے کافی اونچائی پر ایک دیوار کو دکھاتے ہوئے کہا "ہم وہاں اوپر چلیں گے" اور لپک کر وہ اس اونچائی پر چڑھنے لگی جو اس دیوار تک جاتی تھی جس میں بڑے بڑے پرنالے بنے ہوئے تھے۔

"چڑھائی پر چڑھتے ہوئے وہ ایک جگہ لڑکھڑائی بلکہ قریب قریب گرنے لگی تو میں نے بڑھ کر اسے سنبھالا۔ وہ مجھ سے چمٹ گئی اور میرے سہارے اترتی آئی۔ ایک گڑھے کو پار کرتے وقت وہ ایسی تلملاتی کہ میرا منہ اس کے منہ سے لڑ گیا اور میں نے اس کے ہونٹوں پر پیار کر لیا۔ وہ مچل گئی اور میں اسے ہاتھوں پر اٹھاتے ہوئے لیک کے پاس پہونچا۔

ہم سب گھوم کر تھک چکے تھے اور وہاں آکر بیٹھ گئے جہاں فرش بچھا تھا۔ یہاں ایک طرف چولہا بنا لیا گیا تھا اور ہمارے ساتھ جو لڑکیاں آئی تھیں وہ کھانا گرم کرنے میں مصروف تھیں۔ ہم لوگ دری پر بیٹھ گئے۔ مجھے مسرت کے جسم کی سنسنی کا اثر محسوس ہو رہا تھا اور میں اس کے جسم کا غور سے جائزہ لے رہا تھا۔ کمر پتلی۔ سینے زیادہ ابھرے نہیں اور پیٹ ذرا بھی نکلا ہوا نہیں۔ سیاہ رنگ ایسا چمکدار تو نہیں تھا جیسا ہیڈ مسٹرس کا مگر ہونٹوں پر کھلتی ہوئی مسکراہٹ نے اس میں وہ دلکش چمک پیدا کر دی تھی کہ میں اسے ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھے جا رہا تھا۔

"ہمارے منشی جی کو پامسٹری میں بڑا دخل ہے۔ مسرت انھیں اپنا ہاتھ دکھاؤ" ہیڈ مسٹرس کی آواز آئی

مسرت نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا

"اس کی کتنی شادیاں ہوں گی اور کب ہوں گی"

"ہے تو ایک ہی اور کچھ ہی عرصہ میں ہو جائے گی"

"اچھا عارف کا بھی ہاتھ دیکھو"

منشی جی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "خزانے کا خانہ بھرا ہے۔ روپیہ کافی ہے اور رہے گا جائداد کی صورت میں"

"اور شادیاں؟" مسرت نے پوچھا

منشی جی نے دائیں ہاتھ کے کنارے دو ' ایاں لکیروں کو دکھاتے ہوئے کہا "بیویوں کی یہ دو لکیریں بالکل صاف صاف ہیں۔ دو ہیں ممکن ہے کہ ایک قانونی اور شرعی رہے اور ایک سے لگاؤ رہے۔ اصل میں لکیریں فطرت بتاتی ہیں۔کیرو کی یہی رائے ہے کہ لکیروں سے کردار کا پتہ چلتا ہے۔ قسمت کا پتہ بتانا تو ہم Superstition ہے۔ آپ کی فطرت ہے کہ ایک کی طرف دھیان نہیں جم سکے گا ہمیشہ دو کی طرف دھیان رہے گا۔ ممکن ہے کہ دو سے شادی بھی ہوجائے اور پھران دونوں سے ہٹ کر کوئی تیسری دھیان میں رہا کرے"۔

"خوب خوب منشی جی۔ آپ پامسٹ ہی نہیں بلکہ بڑے سائیکالوجسٹ بھی ہیں"

ایسی باتوں میں ایک کا وقت ہوگیا اور اب کھانا ہوا اور اس کے بعد پھل اور چائے ہوتی رہی ۔ ریڑی نالی میں جو پانی بہ رہا تھا اس میں سے ایک لڑکی نے پانی لیکر دوسری کو بھگو دیا۔ وہ چیخی "میرے اندر تک کپڑے بھیگ گئے مجھے بخار آجائے گا"

اب سب طرف پانی اچھلنا شروع ہوا۔ ہیڈ مسٹرس نے مجھے بھی بھگویا اور میں نے انہیں بھی

منشی جی بولے "اب سب کو بخار آئے گا"

ہر ایک نے الگ الگ جاکر اپنے کپڑے نچوڑے اور پھر پہن لیے سب نے کہا "اب گرمی ہے ہوا سے خشک ہوجائیں گے"

چار بج چکے تھے جب ہم وہاں سے روانہ ہوئے اور تنا لیک پر پہونچے

یہاں کنارے پر اتر کر مسرت نے کہا "ہم ناؤ پر بیٹھیں گے"

میں اور مسرت زینے اترتے ہوئے کنارے آئے اور ناؤ والے کو پکارا۔ اس نے کنارے ناؤ لگائی۔ ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھے اور ناؤ بیچ میں بنی ہوئی بارہ دری تک گئی۔ وہاں ہم دونوں اتر کر زینوں پر چڑھے اور بارہ دری میں بھی وہی ہوا۔ یہاں کے سفید پتھر پر مسرت کا پیر پھسلا اور میں نے اسے سنبھالتے ہوئے چمٹا لیا وہ بھی چمٹ گئی اور میں نے اس کے منہ پر جی بھر کے پیار کئے۔

ہم پھر ناؤ میں آکر بیٹھے اور کنارے آگئے۔

مسرت نے کہا "ایک دفعہ اور"

ناؤ والا پلٹا اور پھر ہم بارہ دری یا برجی تک پہونچے اس کے اندر جاکر ہم کھڑے رہے اور جھیل کی وسعت اور پانی کی گہرائی پر نظر جماتے رہے۔

کوئی آدھے گھنٹے کے بعد واپس ہوئے تو کنارے پر ہیڈ مسٹرس کچھ غصہ میں کہنے لگیں "یہ کیا ہے۔ بار بار آتے ہو اور جاتے ہو" اور پھر ہم دونوں کو نہایت درجہ سنجیدہ دیکھ کر خوب کھل کھلا کر ہنسنے لگیں۔

ہم سب نے کنارے پر بنے ہوئے ریسٹورنٹ میں چائے پی اور پھر واپس ہوئے۔

مسرت کی یہ بات مجھے یاد رہی کہ "میں ابکی نہیں تو اسکے بعد کی اتوار کو پھر آوں گی۔ میں یہاں تبادلہ کرانے کی کوشش کررہی ہوں۔ اب میں نے ایم۔اے بھی کرلیا ہے۔ پولیٹیکل سائنس میں۔ اگر گرلز کالج میں ہو جاؤں تو اچھا ہے"

سورج کوہ چھلتان کے پیچھے چلا گیا تھا اور کوہ مردار کی الگ الگ پہاڑیوں کا مجموعہ نظر آرہا تھا۔ جب ما نگرد میں مجھے میرے گھر پہونچا گئی۔

(۱۱)

اب میرے ذہن میں دو صورتیں ساتھ ساتھ کھیلنے لگی تھیں اور گھر میں آکر درکو دیکھ کر آنکھیں بند کرتا تو مسرت کی تصویر سامنے آجاتی۔ در میرے ساتھ رہ کر اور بھی زیادہ گوری ہوتی گئی تھی اور کھانے پینے کی فراوانی کی وجہ سے موٹی بھی ہوتی جارہی تھی۔ اس کے گالوں کی ہڈیاں چھپ گئی تھیں اور کلے خوب بھر گئے تھے۔ جسم کا گوشت سخت ہوتا جارہا تھا۔ وہ بالکل بے فکری سے دن رات زیادہ تر

سو کر گزارتی تھی مگر میرے کاموں کے وقت بڑی مستعد ہوجاتی تھی۔ میرے کام کھانے کھلانے سے تعلق رکھتے اور بھوکی رہنے کے بعد اسے جو بے غل و غش کھانے کو ملا تھا تو وہ قدرتی طور پر کھانے کے وقتوں کی مجھ سے زیادہ پابند ہوگئی تھی۔

اسے مجھ سے محبت تھی؟ کہہ نہیں سکتا۔ کیوں کہ محبت اور لگاؤ کے اظہار کے جو طریقہ بھی اس سے ظاہر ہوئے وہ محض جسمانی اور مادی تھے۔ اس کے پہلے میاں کا ذکر آجاتا تو کہتی "وہ بات بات پر مارا کرتا تھا" اور پیٹھ پر ایک نشان دکھا کر کہتی "یہ دیکھو اس نے پتھر مارا تھا۔ زخم ہوگیا بہت دن میں اچھا ہوا"

"میں نے تو تمھیں نہیں مارا۔ اگر تمہارا جی چاہتا ہو تو میں ماروں"

"میرا جی چاہتا ہے کہ تم کو ماروں" اور یہ کہہ کر مجھ سے چمٹ جاتی اور اکثر میرے شانے پر ایسے دانت گڑا دیتی کہ میں ہاے کر کے اس کو ہٹا دیتا اور اکثر منہ پر پیار کے ساتھ ایک تھپڑ بھی ماردیتا۔

وہ کہتی "اس میں تو درد ہی نہیں ہے" اور خوب کھل کھلا کر ہنستی اور مجھے چمٹ کر میرے منہ پر پیار کرنے لگتی اکثر وہ افسردہ بھی نظر آتی اور میں پوچھتا "سوچ کا ہے کی ہے"

"کیا میرے یہاں بچہ نہیں ہوسکتا۔ کیوں نہیں ہوتا"

"تمہارے لوگ ہی کہتے ہیں تم بانجھ ہو۔ اس جگہ بانجھ عورتیں دوسری جگہ سے زیادہ ہیں"

"سنا ہے کراچی میں علاج ہوجاتا ہے اور بچہ ہوجاتا ہے"

"ہاں وہاں ڈاکٹروں کو دکھایا جائے تو معلوم ہو"

"تم کراچی کب جاؤ گے"

"جب تم کہو اور تمھیں بھی ساتھ لے چلوں گا"

"بہت دور ہے"

"تم نے ریل دیکھی ہے؟"

"ادھر پٹری ہے اس پر آتی ہے۔ انجن کوکو کرتا ہے ریل چھک چھک کرتی ہے"

"جب کہو اسی پر کراچی چلیں۔ وہاں مجھے کئی کام ہیں اور تمھیں ڈاکٹرنی کو بھی دکھادوں گا۔ وہ جو علاج کرے گی وہ ہوجائے گا اور تمہارے ہاں بھی بچہ ہوجائے گا"

"یہ بہت اچھا ہوگا۔ بس اب چلو"

چنانچہ ہم کوئٹہ کے اسٹیشن پر ریل میں آکر بیٹھے۔ میں نے اسے کھڑکی کے پاس والی سیٹ پر بیٹھا دیا تھا اور میں خود اس کے بعد بیٹھا تھا۔ سیکنڈ کلاس کا درجہ مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ عورتیں اور مرد پاس پاس بیٹھی ہوئیں تھیں۔ سب در کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے کہ وہ کوئی عجوبہ چیز ہو میں نے اس سے کہا کہ چادر' اتار دے کیوں کہ مجھے بڑی گرمی لگ رہی تھی۔ مگر اس کو بڑی شرم آرہی تھی وہ بار بار چادر سے منہ بھی ڈھانک لیتی۔

گاڑی چلی۔ سرآب پھاٹک سے سرآب روڈ پر بنی ہوئی عمارتیں دکھائی دینے لگیں۔ وہاں عمارتوں کو پہچان کر مجھے دکھاتے ہوئے خوش ہوتی گئی۔ ہماری کالونی کے پاس سے بھی گاڑی گزری اور وہ اب اس قدر خوشی میں آگئی تھی کہ "وہ دیکھو۔ ہمارا گھر" کافی روز روز سے کہنے لگی۔

گاڑی تیز ہوئی۔ وہ بولی "لاری موٹر اتنا تیز نہیں چلتا"

پھر سرنگیں آنا شروع ہوئیں۔ پہلی سرنگ پر اندھیرا ہوا وہ گھبرا کر بولی "یہ کیا زمین میں گھس گیا"

مجھے ہنسی آئی اور پاس بیٹھے ہوئے کئی مسافر بھی ہنسنے لگے

تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد گاڑی سرنگوں سے نکلتی رہی اور ہر سرنگ پر وہ گھبرا جاتی اور یہی کچھ سمجھتی کہ گاڑی زمین کے اندر جا نکلی رہی ہے۔

میں اس کے بھرے بھرے گورے گورے چہرہ کو دیکھتا رہا جس پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک رنگ جاتا تھا۔

ہے۔ اگر زمین میں پھنس جائے تو کون نکالے گا"

جن مسافروں نے یہ بات سنی وہ ہنسنے لگے

اس نے اپنا منہ ڈھانپ لیا اور شاید سوگئی۔ سبی سے آگے بہت گرمی تھی۔ وہ گرمی کے مارے کبھی چادر اتار دیتی کبھی اوڑھ لیتی۔ جس اسٹیشن پر گاڑی رکتی تو وہ پسینے پسینے ہوجاتی مگر رات کے لئے ٹھنڈک ہوتی اور وہ سو جاتی۔ آدھی رات کو گاڑی سکھر پہونچی اور ہم ویٹنگ روم میں آکر لیٹ رہے۔

دن نکل آیا تھا جب ہم چائے پی کر تانگے پر پرانے سکھر چلے۔ ادھر سے مڑے۔ اس پہاڑی کے اوپر ایک دفتر بنا ہوا ہے۔

یہاں پہاڑی پر بھی مکان ہیں!" در بڑے تعجب میں آکر بولی

مجھے خیال آیا کہ بلوچستان کی پہاڑیاں آتش فشاں ہونے کی وجہ سے ان پر لوگ کیا جانور تک نہیں بیٹھے دکھائی دیتے ہمارا تانگہ مہران ہوٹل کے پاس سے مڑ کر اس سڑک پر مڑا جو پہاڑی کے اوپر چلی جاتی ہے۔ اس کے کنارے ایک نوگزے کی قبر ہے۔ در نے اسے دیکھ کر تعجب سے کہا "اتنا بڑا قبر اس میں جو آدمی دفن ہوگا وہ بھی اتنا بڑا ہوگا"

بات تو معقول تھی مگر مجھے ہنسی آگئی اور میں نے کہا" یہاں ایسی ہی بڑی قبریں ہوتی ہیں"

آگر کو چڑھائی چڑھتے ہوئے ہم وکیل صاحب کے بنگلے پر پہونچ گئے۔ وکیل صاحب کے آدمی نے ہم سے نام دریافت کیا اور پھر اندر چلا گیا۔ وکیل صاحب کی کافی بڑی کوٹھی کے ایک کمرے میں جس سے دریائے سندھ دکھائی دیتا تھا ہمارا اسباب رکھا گیا۔ در کو گھر کے اندر پہونچا دیا گیا۔ وکیل صاحب نے ناشتے چائے منگانے کو کہا تو میں نے جواب دیا"ہم لوگ جی بھر کر ناشتہ کر کے آئے ہیں"

قریب نو بجے میں اور وکیل صاحب گھر میں گئے اور وہاں میں نے اپنے حسن چوک کے مکان کا بیع نامہ ان کے نام مکمل کر دیا۔ ایک بجے کے قریب وکیل صاحب کی بیوی بچے اور ہم لوگ کھانے کی میز پر بیٹھے۔ وکیل صاحب کی بیوی پڑھی لکھی صاحبہ تھیں اور سکھر کے کالج میں لکچرار تھیں۔ وہ بولیں "آپ کی بیوی بڑی سگھڑ ہے۔ کھانے پکانے کے سب کام میں بڑے شوق سے لگی رہی"

پھر بولیں "کیا بلوچستان میں دریا نہیں ہوتے"

"بالکل نہیں"

"اسی سے یہ ادھر سندھ دریا کو دیکھ کر کچھ تعجب میں آگئی۔ کاریز اتنا بڑا کاریز کہتی رہی۔ یہ کاریز کیا ہوتا ہے"

"بلوچستان میں زمین کے نیچے سوتے بنتے ہیں۔ انھیں کاریز کہتے ہیں۔ یہ سمجھ رہی ہے کہ یہ بہت ہی بڑا کاریز ہے"

"برمان میں حوض ہے مگر یہ تو بہت بہت بہت بڑا ہے" در نے کہا

"میں نے وضاحت کی" سرآب روڈ پر ایک جگہ ایک حوض سا بنا لیا گیا ہے جس میں سوتے سے پانی آتا ہے اور وہ ہر وقت بھرا رہتا ہے"

در نے بات میں اضافہ کیا" مگر یہاں تو اتنا۔ اتنا۔ اتنا بڑا ہے"

"اور یہ بہتا بھی ہے" ایک بچے نے ہنستے ہوئے کہا

"یہ کہتی ہیں بہتا ہوا نہیں معلوم ہوتا" ایک اور بچے نے خوب ہنستے ہوئے کہا

سیپ کراچی ---۵۸

وکیل صاحب کی بیوی بولیں "اس کی یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے یہ کراچی تک بہتا ہوا چلا گیا ہے"
شام کے وقت وکیل صاحب کے بیوی بچے سیر کو جانے لگے تو در نے کہا "میں نہیں جاؤں گی اور باورچی خانہ میں کام کرنے لگی رات میں جب میرے پاس لیٹی تو برابر ڈر ڈر کر کاریز یا دریا کا ذکر کرتی رہی اور پوچھتی رہی "رات میں وہ بڑھ کر ادھر تو نہیں آجائے گا۔"
"یہاں لوگ رہتے ہیں۔ یہ کوٹھیاں بنی ہیں۔ کیا حماقت کی باتیں کرتی ہے"
کوئی ایک بجے رات کو وہ چونک کر اٹھ بیٹھی اور مجھے بھی اٹھا دیا "وہ دریا مجھے دکھائی دیا کہ ادھر آگیا اور ہم سب پانی میں ڈوب رہے ہیں میری آنکھ کھل گئی"
مجھے اس کے اس خوف پر پہلے غصہ آیا مگر اس کی سہمی ہوئی صورت پر ہنسی آنے لگی۔ صبح کو ناشتے پر میں نے یہ سب کے سامنے بیان کیا تو بچے خاص طور پر ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ گئے۔
وکیل صاحب نے ہمیں اپنی موٹر پر روہڑی بھجوانے کا انتظام کر دیا تھا۔ ہماری موٹر سندھ کے پل پر سے گزری تو در کو اور بھی تعجب ہوا۔
"یہ وہی کاریز ہے۔ اتنی بڑی ہے"
"یہ دریا ہے۔ کراچی تک بہتا جاتا ہے۔ حیدر آباد کے قریب پھر دکھائی دیگا" اس کے چہرہ پر تعجب کے اور بھی آثار نمایاں ہوئے اور معلوم ہوا کہ روہڑی پہونچتے پہونچے وہ سو جائے گی مگر اس کی آنکھیں برابر کھلی رہیں اور ہم کو روہڑی کے اسٹیشن پر پہونچ کر زینے اور پل پار کر کے اسی پلیٹ فارم پر آئے جہاں تیزرو آنے والی تھی۔
گاڑی آئی اور ہم دونوں کو آرام سے بیٹھنے کی سیٹ مل گئی۔ در کو میں نے کھڑکی کے پاس بیٹھا کر خود اس کے ادھر بیٹھا۔ گاڑی چلی اور شاداب حصہ سے گزرنے لگی جہاں شاداب کھیت تھے اور ہر طرف ہریالی پھیلی ہوئے تھی۔
"یہاں سب زمین برابر برابر ہے" در نے تعجب سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا
"برابر نہیں ہے۔ دور پر دیکھو پہاڑیاں بھی نظر آتی ہیں" میں نے کہا
"مگر اتنی دور دور تک برابر زمین میں نے نہیں دیکھی" اور وہ بڑے غور سے نگاہ جماتے ہوئے ساری فضا کو کافی دیر تک دیکھتی رہی اور پھر اسکی آنکھیں بند ہونے لگیں اور وہ بیٹھے بیٹھے ہی سوگئی۔
میں گاڑی کے باہر فضا کو اور اس کے سیٹ کی نشست سے لگے ہوئے جسم کو دیکھتا رہا۔ شروع شروع میں' میں ماضی کی یادوں میں گم ہو جایا کرتا تھا وہ سب صورتیں یاد آنے لگتی تھیں جو جاذب نظر ہوئی تھیں اور ان سب کے ساتھ ناکامیابی کے تصورات مجھے ہلا دیا کرتے تھے اور مجھے اپنے پر اعتماد جاتا رہتا تھا۔ مگر اب در نے مجھے موجودہ زندگی کا احساس شدت کے ساتھ دے دیا تھا۔ سکھر میں بھی میں کئی عورتوں سے متاثر ہوا تھا مگر اب ان کا خیال نہیں آرہا تھا بلکہ نگاہوں کے سامنے وہ تین عورتیں تھیں جو کوئٹہ سے تعلق رکھتی تھی۔ ہیڈ مسٹرس بار بار اپنے تمام کرتوتوں کے ساتھ سامنے آتی مگر اس سے زیادہ مسرت کا تصور قائم ہوتا جو میری رائے کے مطابق مجھ سے شادی کر لینے کے لیے تیار تھی۔ در اور وہ دونوں ساتھ رہ سکتی تھیں۔ بلوچستان کی عورتوں کو سوتوں کے ساتھ رہنے کی کافی عادت ہے۔ مگر در کچھ ان سے الگ ہے اسے جلدی ہی رقابت محسوس ہونے لگی ہے۔ وہ کہہ چکی ہے "ہم اسے شہید کر دیگا"
اور پھر عصمت بھی یاد آتی جو کافی گوری ہے۔ در کا گورہ پن پہاڑوں کی طرح مٹیلا ہے حالاں کہ اب کھانے پینے سے اور میری ہمراہی سے یہ کھل گیا ہے۔ مگر عصمت کا گورہ پن اور ہی چیز ہے۔ یہ گنگا جمنا کے میدانوں کی یاد دلاتا ہے۔ اس کے بائیں گال پر ایک نشان ہے مگر پوڈر میں وہ چھپ جاتا ہے۔ زیادہ قریب سے صاف نظر آتا۔ کیا برا لگتا ہے؟ نہیں ہرگز برا نہیں لگتا۔ اس کے جسم میں ایک نزاکت ہے ایک لوچ ہے جو در کے جسم میں نہیں۔ مجھے وہ مسرت سے زیادہ بھاتی ہے۔ اگر میں انکا تو نواسی سے انکوں گا مسرت

سے نہیں مگر دونوں اپنی اپنی جگہ پر دلکش ہیں ان دونوں سے شادی کیوں نہ کی جائے اور در بھی ہے۔ آخر چار کی اجازت ہے۔ چوتھی کون ہوگی کراچی میں چوتھی بھی مل جائے گی۔ یہ پڑھی لکھی فیشن ایبل ہو۔ گلیمر گرل۔ جدھر جائے ایک چمک پیدا ہوجائے۔ سارے لوگ تکنے لگیں۔ اب تک کوئی بھی ایسی سامنے نہیں آئی۔ ہاں حیدر آباد میں رقیہ ایسی تھی۔ وہ مخصوص رنگ جو سندھی لڑکیوں ہی کا ہوتا ہے اور پھر ناک نقشہ ہر طرح سے درست۔ بھرا بھرا جسم' یہ جسم ہی مجھے کس قدر ہلا دیا کرتا تھا۔ اس میں کیا کیف تھا۔ میری فطرت اب سندھی ہوگئی ہے۔ رقیہ کے قسم کی عورت عجیب طرح بیتاب کر دیتی ہے۔ اور وہ بے باک بھی تھی حالاں کہ وہ بڑے اونچے درجہ سے تعلق رکھتی تھی اور میرے ایسے غریب آدمی کی اس تک پہنچ ممکن نہیں تھی۔ وہ آئیڈل ہے۔

وہ بیاہی تہائی عورتیں جن کے میاں انہیں میرے۔ سر پر تھوپتے پھرے۔ جن کا لباس مجھے بالکل بے حسن کردیتا تھا اچھا ہے اب ان سے پیچھا چھوٹا۔ حیدر آباد میں کراچی میں اب وہ یادیں پھر سامنے آئیں یہ میرا Mother Fixtion تھا۔ ہاں مگر نہیں در نے مجھے اس سے نکال لیا۔

میں نے غور سے در کے سیٹ کی نشست سے لگے ہوئے چہرہ کو دیکھا جس پر اب چادرہ گر گیا تھا جو گہری نیند میں محو تھا "یہ بت سب بتوں سے بہتر ہے۔ اسی نے مجھے تذبذب سے نکال کر نہایت معصومی کے ساتھ راہ پر لگایا۔ یہ ہر اس عورت سے زیادہ خوبصورت ہے جو کبھی بھی میرے سامنے آئی۔ رقیہ سے بھی زیادہ خوبصورت' ہندوستان میں جو عورتیں سامنے آتی رہی انھیں بھول بھی گیا۔ یہاں جو ابھر ابھر کر سامنے آتی ہیں وہ کوئی بھی اس کے مقابلے کی نہیں ہوسکتیں۔ نہیں۔ نہیں

گاڑی کی تیز اسپیڈ' فضا کا اسی رفتار سے بھاگنا اور پھر در کا معصوم خوبصورت چہرہ بھی اتنے دن سے اس کے ساتھ تھا۔ ہر رات اسی کے پاس سوتا تھا۔ وہ الگ سونا چاہتی بھی نہیں تھی۔ میرا ذہن اس کے علاوہ بھی اوروں کی طرف بھٹکتا پھرا۔ یہ سڑی ہوئی ہیڈ مسٹرس۔ اس کی ہنسی کیا بہت اچھی ہے۔ وہ بالکل بیباک ہے۔ اپنے کو مرد کہتی ہے۔ مردانی۔ نہیں۔ یہ سب پوز ہے۔ وہ عورت ہی ہے عورت جوان سب اصولوں سے بالاتر ہوگئی ہے جن پر عورت کی زندگی مبنی سمجھی جاتی ہے۔ مگر وہ عورت ہی ہے۔ ڈھلی ہوئی عورت جو اپنے ڈھیلے پن سے لوگوں کو اٹریکٹ کرتی ہے اور پھر وہ دوسری عورتوں سے بھی اٹکی ہوئی ہے اور یہ دوسری عورتیں مردوں کی تلاش میں ہیں۔ وہ کہتی تھی "یہ تم کو چھوڑ کر بھاگ جائے گی۔" کیا بھاگ جائے گی۔ اگر میں مسرت سے شادی کرلوں تو یہ اسے مار ڈالے گی۔ وائلڈ عورت۔۔۔۔

وہ چونکی اور اک دم سے بولی "کراچی آگیا؟"

اپنی گھڑی میں دیکھو کتنے بجے ہیں" میں نے کہا

اس نے گھڑی دیکھ کر کہا "ابھی ایک بھی نہیں بجا"

"ابھی چار گھنٹے ہیں" اور وہ اٹھ کر باتھ روم میں گئی اور منہ دھو کر آئی۔ نواب شاہ پاس سے نکل گیا

اس نے منہ پونچھا اور کہنے لگی "بھوک لگی ہے۔ تم کو بھوک نہیں لگی"

ہم لوگ جو کھانا ساتھ لائے تھے کھاتے رہے۔ حیدر آباد آگیا اور چلا بھی گیا۔ وہ کھڑکی سے سر نکالے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اسی کوٹری کا پل دکھائی دیا اس نے مجھ سے کہا "یہ کیا ہے؟"

"یہ ایسا ہی پل ہے جیسا تم نے سکھر میں دیکھا تھا۔ اسی دریا کا جو سکھر میں تھا"

"وہ یہاں کیسے آگیا؟"

میرے لیے اسے سمجھانا مشکل تھا۔

گاڑی سندھ دریا کو پار کرنے لگی۔ وہ کھڑی ہوگئی اور کھڑکی سے آدھا دھڑ باہر نکال کر دیکھنے لگی "اف۔ اف۔ اتنا پانی اور ایسا بہہ رہا

ہے!!"

میں اس کے تعجب پر ہنسنے لگا

"یہ کراچی سے آگے تک بہتا ہوا جاتا ہے"

"مجھے تو بہتا ہوا نہیں معلوم ہوتا"

اس نے ڈبہ کے دوسرے دروازے میں سے بھی دیکھا اور بولی "یہ ادھر سے ادھر تک ہے اور دونوں طرف آسمان تک"

جیسے تمہاری کاریز میں پانی بہتا ہے ویسے یہ بھی بہہ رہا ہے"

"معلوم نہیں ہوتا"

اتنی دیر میں گاڑی پل پار کر گئی۔ کوٹری کے اسٹیشن پر بہت دیر رکی رہی۔ لوگ باہر اتر کر گئے۔ میں بھی اترنے لگا تو وہ بولی

"تم نہ جاؤ۔ گاڑی چھوٹ جائے گا تو ہم کیا کرے گا"

مجھے مسٹرس کی وہ سب لڑکیاں یاد آئیں اور میں نے دل میں کہا" وہ لوگ ایسی بات نہ کہتیں"

کوٹری سے ایک نہایت درجہ کالی عورت بنی ٹھنی ہوئی ایک مرد کے ساتھ آکر ہمارے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گئی میں سمجھ گیا کہ وہ رنڈی تھی۔ اس نے در کو غور سے دیکھا۔ در سہم گئی وہ ہنسنے لگی۔ گاڑی چلی تو اس کے ساتھ کے مرد نے مجھ سے پوچھا" یہ آپ کی بیوی ہیں؟"

"جی ہاں" میں نے کہا

یہ تو یہیں کہیں کی معلوم ہوتی ہیں آپ ہماری طرف یعنی ادھر ہندوستان کے ہیں"

"میں اب بلوچستان کا ہوگیا ہوں اور یہ خاص الخاص پاکستانی ہے۔ میرا اس سے نکاح ہوگیا۔ بچہ نہیں ہوتا۔ علاج کے لیے کراچی جارہا ہوں۔"

"آپ کا گھر تو کراچی میں ہی ہوگا"

"جی ہاں۔ مگر اب دو سال سے زیادہ ہوئے کوئٹہ میں ملازم ہوں۔ اور کراچی کا مکان بیچ کر وہیں مکان بنا لینا چاہتا ہوں" جب میں اس مرد سے بات کر رہا تھا تو کالی موٹی عورت بری طرح در کو اور در بڑے تعجب سے اسے گھور رہی تھیں

"ہم کراچی جائے گا۔ تم بھی وہیں جائے گا" در کی میرے کان میں آواز آئی

"کراچی میں کہاں" کالی موٹی عورت نے کہا

در کو معلوم ہی نہیں تھا کہ ہم کراچی میں کہاں جائیں گے۔ وہ کراچی کو بھی سرآب روڈ کے علاقے کی طرح سمجھتی تھی "کراچی میں ہمارے میاں کا گھر ہے۔ ابھی جائے گا۔ پھر کوئٹہ واپس آجائے گا"

کالی موٹی عورت اسی بات پر ہنسنے لگی

"میرا گھر ناظم آباد نمبر ایک میں ہے" میں نے کہا

میں اٹھ کر مرد کے پاس اور وہ اٹھ کر در کے پاس بیٹھ گئی۔ اور ہم لوگ باتیں کرتے رہے

لانڈھی نکل جانے کے بعد سے میں اور در بھی پاس پاس بیٹھ گئے۔ عمارتیں پاس سے گزرتی رہیں۔ وہ ہر ایک کو دیکھ کر کہتی "اتنی بڑی۔ اتنی اونچی ہیں کون رہتا ہے؟"

کراچی کینٹ کے اسٹیشن پر ہم اتر کر باہر آئے۔ اس نے سر سے چادرہ اوڑھ لیا تھا۔ مگر ہر طرف دیکھ کر کہتی جاتی تھی "ایسا وڈا شہر"

ہم لوگ رکشا میں بیٹھ کر صدر سے گزرے۔ یہاں کی رونق دیکھ کر اور اونچی اونچی عمارتیں دیکھ کر وہ کہہ اٹھتی "ایسا بڑا شہر۔ ایسی بڑی بڑی عمارتاں"

قائد اعظم کے مزار کے پاس گزرتے ہوئے اس نے پوچھا" یہ کیا ہے"

"قائد اعظم کا نام کبھی سنا ہے"

"کبھی نہیں"

"انھوں نے پاکستان بنایا"

"یہ پاکستان ہے' اسے بنایا۔"

"نہیں یہ انکا مقبرہ ہے"

"اتنا بڑا قبر۔ وہ بہت بڑا آدمی تھا؟"

میں اس کی حماقت زدہ باتیں سن سن کر ہنستا رہا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اسے پاکستان' قائد اعظم اور کراچی کے بابت جو چیزیں اس کے لیے عجائبات تھی انہیں سمجھایا جاسکے۔

آخر کو ہم اپنے گھر پہونچے جس کا اوپر کا ایک کمرہ اور اس کے ساتھ بنے ہوئے باورچی خانہ اور پخانہ میں نے الگ کر لیا تھا۔ میں اسباب اتارا' اور زینے چڑھ کر اس حصے میں آگیا۔

"یہ تمھارا ہے"

"میرا نہیں تمھارا ہے۔ تم میری بیوی ہو نا"

"ہمارا ہے۔ ہم یہیں رہیں گا۔ یہاں بڑا اچھا لگتا ہے"

(۴)

رات میں شہر کی آوازوں سے وہ چونک کر پوچھتی "یہ کیا ہے"

"یہ بسوں کے چلنے کی آواز ہے"

دوسرے دن سویرے ہی سے اسے سارا شہر دیکھنے کا شوق ہوا۔ ہم ایک بس میں آکر بیٹھے اور کیماڑی کا ٹکٹ لیا۔ مجھے معلوم نہیں وہ کیا کیا اثر لیتی رہی مگر جب ہم کیماڑی پر اترے تو کہنے لگی "یہ بڑی عمارتیں ان میں کون رہتا ہے"

"ان کے الگ الگ حصے ہیں' "واپسی پر دکھاؤں گا"

ہم سمندر کے پاس جاکر کھڑے ہوئے اور میں نے اسے بتایا کہ یہ سمندر کی کھاڑی ہے۔ ایک جگہ سے اس نے دور پر جہاز اور سمندر کا پانی دیکھا اور بولی "یہ اتنا بڑا ہے" میں نے کہا "ہم ناؤ پر بیٹھ کر ادھر متوڑا چلیں؟"

"ہمیں ڈر لگتا ہے۔ ہم گر جائے گا۔ ڈوب جائے گا"

ہم دونوں کلفٹن پہونچے اور سمندر کے کنارے کھڑے ہوئے۔ وہ لہروں کو اٹھتے ہوئے اور ساحل سے ٹکراتے ہوئے دیکھتی رہی اور معلوم ہو رہا تھا کہ وہ حد سے زیادہ ڈر رہی ہے۔ ساحل پر لگی ہوئی دوکانوں سے اس نے بہت سی کھانے کی چیزیں خریدیں اور کھا کر بولی "ہمارا سر چکر کھاتا ہے" اور رونے لگی اور بولی "گھر چلو ہمیں بڑا ڈر لگ رہا ہے" راستے میں اس کو کئی جگہ ابکائی آئی۔

ہم صدر کے بس اسٹینڈ پر اترے اور میں اسے تمام دکانیں دکھاتا پھرا۔ اس کو کوئی چیز اچھی ہی نہیں لگتی تھی اور اونچی عمارتوں کے پاس وہ ڈر کر کہتی "یہ ہمارے اوپر گر پڑے گا"

ایک بڑی عمارت میں بھی لفٹ تک گیا۔ وہ بھی میرے ساتھ لفٹ میں بیٹھ کر سب سے اوپر والی منزل پر گئی۔ وہاں سے شہر کی فضا کو دیکھ کر بہت گھبرائی اور بولی "ہم یہاں سے کود پڑے گا"

ہم گز بر جھالے میں گئے۔ اسے کچھ سستی سستی چیزیں پسند آئیں اور میں نے اسے خرید دیں۔ پورا شہر گھوم کر جب ہم گھر آکر آرام سے لیٹے "وہ بہت چکرا رہی تھی اور بولی" ہم یہاں کیسے رہے گا۔ "واپس چلو"

"ڈاکٹرنی کو نہیں دکھاؤں گی بچہ ہونے کے لیے"

وہ پھر خوش ہوگئی اور کھل کھلا کر ہنسنے لگی۔

دوسرے دن میں اسے ناظم آباد کی ایک کلینک میں لے گیا۔ میں نے اسے ڈاکٹرنی کے ساتھ جانے دیا تو وہ بولی "تم بھی چلو یہ ہمیں مار ڈالے گا۔ کیسے دیکھتا ہے"

ڈاکٹرنی ہنس کر اسے دلاسا دیا

باہر نکل کر ڈاکٹرنی بولی " بڑا مشکل کیس ہے۔ ہر بات میں ضد کرتی ہے اور سہم جاتی ہے۔ مگر میں نے دیکھ لیا۔ یہ کتنے برس کی ہوگئی؟"

"مجھے نہیں معلوم"

"اسکی شادی کب ہوئی"

"میری ساتھ تو دو برس سے ہے۔ اس کا پہلے ایک شوہر تھا جس سے شاید آٹھ برس کی عمر ہی میں شادی ہوگئی تھی"

"اچھا تو یہی وجہ ہے۔ میں نے بلوچستان کے کیس دیکھے ہیں۔ کچھ کے دس بارہ برس کے سن سے بچے ہونے لگتے ہیں اور ہر سال ہوتے رہتے ہیں۔ کچھ بالکل بیکار ہو جاتی ہیں۔ یہ بیکار ہوگئی"

"کوئی ترکیب نہیں ہے۔ اس کے ٹھیک ہونے کی"

"آپریشن ہو پھر دیکھا جائے کہ کیا کیا جاسکتا ہے"

ڈاکٹرنی نے گولیاں دیتے ہوئے کہا "یہ کھلا کر دیکھیے۔ چربی چھنٹ جائے تو شاید کچھ ہو مگر آخر میں تو آپریشن ہی ہوگا۔" میں نے در کو آپریشن سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ ڈری ہوئی تو تھی ہی اور بھی کانپنے لگی اور بولی" یہاں سے چلو"

اس رات بھر میں اسے خوب خوب سمجھاتا رہا کہ آپریشن کیسے ہوگا اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا ہر بات پر کہتی "سی سی ہم مرجائیں گے"

دوا کھانے سے اسے انکار نہ تھا حالاں کہ دوا کھاتے وقت بھی وہ کہتی "کہیں ہمیں مار تو نہیں ڈالے گا یہ ڈاکٹرنی کا دوا"

آخری ہفتہ بھی وہ میرے ساتھ باہر نہیں گئی۔ کمرے ہی میں پڑی رہتی یا نیچے کرایہ داروں کے پاس جاکر بیٹھتی۔ مجھے کراچی سے خاص لگاؤ تھا۔

وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی تھی

ایک صبح میں گھر سے نکل کر پیدل چلا۔ ناظم آباد میں بہت سے نئے مکان بنتے نظر آئے۔ بڑی بڑی عمارتوں میں نیچے دوکانیں اور اوپر فلیٹ تھے۔ ہر گھر سے موٹر نکلتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ میں سرسید گرلز کالج تک پہونچا۔ یہ اب بہت بڑی بلڈنگ والا ہوگیا تھا۔ پہلے ایک بنگلہ میں کرایہ پر تھا۔ اسی کے سامنے چورنگی والی یعنی بسوں والی سڑک پر اسی کو کور کرتا ہو ایک گورنمنٹ گرلز کالج بھی بن گیا تھا۔ دونوں گرلز کالج چورنگی پار کرتے وقت میں نے دیکھا کہ لڑکیوں کے گروہ پر گروہ آکر دونوں کالجوں میں جارہے ہیں۔ کراچی عورتوں کا شہر ہے۔ میں کسی طرح سڑک پار کر کے حبیب بنک کی اس بڑی عمارت کے سامنے آیا جس میں پہلی منزل پر بہت بڑی بڑی دوکانیں تھیں اور اوپر قسم قسم کے دفتر تھے۔ اسی کے سامنے بس اسٹینڈ تھا۔ فٹ پاتھ پر عورتیں ہی عورتیں کچھ برقعہ اوڑھے مگر زیادہ تر بغیر برقعے کی

بھیڑ لگائے ہوئے تھیں۔ بسیں ہی بسیں آ آ کر رکتی رہی اور یہ عورتیں ان میں بیٹھ کر جاتی رہیں۔ عورتوں کی اسی بھیڑ میں مجھے کوئی ایسی عورت نہیں دکھائی دی جو ڈر کے مقابلہ کی ہو۔ ۸۰ فی صدی صاف ڈھلی ہوئی تھیں حالاں کہ سنگھار میں اپنا ڈھیلا پن چھپائے ہوئے تھیں۔

میں سڑک پار کر کے جانے والی بسوں کے اسٹینڈ پر آگیا۔ بسیں آتیں لوگ گروہ میں اس کی طرف دوڑتے اور ایک ہی گھس مل کر بیٹھ پاتا۔ بس سے جانا ناممکن تھا اور میں تو پیدل چلنے کے لیے آیا تھا۔ میں فٹ پاتھ پر روانہ ہوگیا۔ دوکانیں وہی پرانی تھیں جن میں ایسا سامان تھا جس کی طرف میں نے کبھی دھیان نہیں دیا۔ گولی مار ایک گولی مار دو کے بس اسٹینڈوں پر بھی یہی دیکھا کہ زیادہ تر بلکہ تمام تر بھیڑ عورتوں کی ہے۔

گولی مار کا پل پار کیا۔ اس کے نیچے لیاری دریا میں اب کافی پانی نظر آیا۔ پورے نہر کا پانی یہیں گرتا ہے۔ دریا نہیں بڑے سائے کا نالہ کہو۔ لسبیلا پر بھیڑ کی حد نہیں تھی۔ ہر طرف کی بسیں اور پرائیویٹ کاریں قطار میں کھڑی تھیں کہ رستہ ملے تو آگے بڑھیں۔ جدھر رستہ نکلنے کی کوشش کرتا کوئی نہ کوئی عورت سامنے آجاتی۔ میں نے دیکھا کہ اکثر مرد عورتوں کو اور عورتیں مردوں کو دھکا دیتی ہوئی نکلی جارہی ہیں۔ میں سوچنے لگا ڈر اس بھیڑ میں کیا کرتی۔ نہ معلوم کتنی عورتیں نگاہوں کے سامنے سے گزر چکی تھیں کہ مجھے خیال آیا "ڈر سے کوئی بھی اچھی نہیں ہے"

پٹیل روڈ پر فٹ پاتھ پر چلتا ہوا گرومندر کے چوراہے پر پہونچا۔ یہ بہت ہی بڑا بسوں کا اڈا! کسی طرح سڑک پار کرکے فٹ پاتھ پر آیا جس پر بسیں رک رہی تھیں۔ یہاں محسوس ہوا کہ عورتوں کی بوچھاڑ کر دی گئی ہے۔ مرد اس کے درمیان سے نکل رہے تھے۔ میں نے بھی نکل کر دو سڑکیں' پارکیں اور فٹ پاتھ پر قائد اعظم کے مزار کی طرف روانہ ہوگیا۔ یہ فٹ پاتھ کافی خالی تھا حالانکہ بنگلوں کے دروازوں پر ایک آدھ مرد یا عورت کھڑے تھے۔

مزار کے سامنے والے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ ڈر کی سمجھ میں آنا ناممکن ہے کہ یہ قبر ہے۔ پھر عمارت کی شان اور قائد اعظم کی ہستی کے خیال نے مجھے گم کردیا۔ سڑکوں کو پار کرتا ہوا اور دل میں سوچتا ہوا وہاں پہونچا جہاں صدر کو جانے والی بسیں مڑتی ہیں۔ سامنے بڑا میدان خالی پڑا تھا مگر اب اس میں مکانات بن گئے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ یہیں میرے دوست انصاری رہا کرتے تھے۔ میں نے کہا "چلو پوچھ لوں کہ ہیں"

کئی دروازوں پر کھٹکھٹانے کے بعد انصاری صاحب کا پتہ ملا اور میں ان کے یہاں ایک اوپری فلیٹ پر ڈرائنگ روم میں جاکر بیٹھا۔ پہلی بات جو میں نے کی وہ یہ تھی "یہاں تو سب خالی زمینیں تھیں اور تمہارا گھر تو زمین پر تھا۔ چھتیں بھی نہیں تھیں بس ٹین پڑے ہوتے تھے۔"

"ہاں مجھے تجارت میں لاکھوں کے فائدے ہوئے۔ اب میں نے یہ سب بنوالیا ہے۔ زمین سب کی سب میرے قبضے میں تھی ہی تم جانتے ہو وہ لیز پر اور لوگوں کو دیدی اور یہ حصہ اپنے لیے رکھا"

"شادی بھی کرلی ہوگی"

"مدت کی۔ بیوی کالج چلاتی ہے۔ صبح ہی سے چلی جاتی ہے۔ بچے آیا پر چھوڑ کر۔ تو نے بھی شادی کی؟"

"میں نے بلوچستان کی ایک لڑکی سے نکاح کرلیا ہے۔ وہ یہاں ساتھ بھی آئی ہے۔ مگر گھبرا گئی اس لیے گھر پر رہ گئی۔ یہاں کی سڑکوں پر اسے چکر آجاتا ہے اور اوکنے لگتی ہے"

"یہ تو تو نے بڑا اچھا کیا۔ کاش میں بھی ایسی ہی سے شادی کرلیتا"

"ہاں گھر کے اندر کے ہر کام کے لیے بھی اچھی ہے۔ مگر وہ بات نہیں ہے جو پڑھی لکھی میں ہوتی ہے"

"تو کوئی پڑھی لکھی بھی تیرے پیچھے لگی ہوگی"

"ایک نہیں دو دو ہیں اور ایک تو یوں ہی اکی ہے۔ ہیڈ مسٹرس ہے۔ شادی کرنے کے دور سے گزر چکی ہے"

"ابے تو ان سے پھنس نہ جانا۔ زندگی عذاب ہو جائے گی۔ جیسی میری ہوگئی ہے۔ ہر وقت کی دانا کل کل، گھر کے سب کام میں کرتا ہوں۔ میں تیرے یہاں کوئٹہ آؤں رہنے بھر کی جگہ ہے"

"ضرور آؤ۔ جلد آؤ۔ آجکل ہی تو لوگ وہاں آتے ہیں"

"مگر دیکھ میں تجھ سے کہتا ہوں کہ اپنی سیدھی سادھی کامیدہ بیوی بلوچن کو چھوڑ کر کہیں کسی اور سے نہ پھنس جانا۔ زندگی غذاب ہو جائے گی۔"

"اچھا میں ہی کوشش کرونگا۔ کوئٹہ میں ہی رہ بسوں گا"

"اپنا یہاں کا مکان بیچ ڈال۔ تین لاکھ میں بک جائے گا اور وہاں اتنے میں محل بن جائے گا"

"زمین تو وہاں سستی ہے۔ مگر بنوائی بہت مہنگی ہے"

"ٹھہر میں ناشتے اور چائے کا انتظام تو کرلوں" اور یہ کہ کر وہ اندر کی طرف چلے گئے

تین لاکھ میں میرا مکان بک جائے گا۔ میں تعجب میں آگیا تھا اور اسی پر سردھن رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں انصاری کی آواز آئی "ادھر آجا بھائی یہاں اسی کمرے میں"

میں اٹھ کر ایک تنگ بیچ میں داخل ہوا اور دیکھا کہ کمرے کے دروازہ پر انصاری کھڑا ہے۔ میں کمرے میں گیا تو ایک بڑی میز پر ہر ہر طرح کا سامان لگا دیکھا۔

ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ایک آدمی چائے بناتا گیا اور ہم کھانے اور چائے پینے میں مصروف ہوگئے۔

"اچھا تو اپنا مکان بیچتا ہے کہ نہیں؟"

"تین لاکھ کا تو مجھے کبھی خیال بھی نہیں آیا۔ اگر یہ بنک میں رکھ دیئے جائیں تو کتنا سود ملے گا"

"دس پرسنٹ پر رکھ دے تو سال کا تیس ہزار ہوجائے۔ قریب تین ہزار روپیہ مہینے کی آمنی"

"یہ تو ہمارے کنٹرول کو بھی نہیں ملتے"

"تیرے لیے بہتر یہ ہے کہ ایک لاکھ کا وہیں کوئٹہ میں کوئی مکان لے لے۔ اپنی تنخواہ اور پھر دو ہزار بنک کے سود پر ٹھاٹھ سے رہ بیوی بھی سیدھی سی ہے مزے کر۔ راوی چین ہی چین لکھتا ہے"

مگر بیوی بانجھ ہے"

"یہ تو اور بھی اچھا۔ راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ بچے لے کے کیا کرے گا مصیبت"

"مگر وہ چاہتی ہے کہ اس کے بچہ ہو۔ یہاں ڈاکٹرنیوں نے بھی دیکھا۔ کہتی ہیں آپریشن کرالو"

"بے ایمان تجھ کو ٹھگ لیں گی اور شاید اسے مار ڈالیں تو ایسے ہی چلنے دے۔ ابھی بڑی عمر ہے اور وہ تو ابھی بیس کی بھی نہ ہوگی تیرے کہنے کے مطابق۔ ابھی جلدی کیا ہے"

میں اب اننیےمس کا ہوجاؤنگا"

"تو مجھ سے دو برس چھوٹا ہے۔ ابھی سے بچوں کی لادی کیا لادے گا۔ اگر گھر بیچنا ہے تو مجھ سے آکر بتا جانا یا اگر کچھ دیر لگے تو مجھے لکھنا میں اپنا کارڈ تجھے دیتا ہوں"

ہم اٹھ کر بیٹھک میں آگئے۔ انصاری نے مجھے اپنا کارڈ دیا اور بولے "تجھے کہاں جانا ہے۔ میں اپنے موٹر پر پہونچا دوں"

"مجھے کہیں جانا نہیں ہے۔ یوں ہی کراچی کا چکر لگانا ہے"
"مجھے ٹاور جانا ہے۔ میں تجھے وہاں چھوڑ سکتا ہوں"
"ہاں میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ ٹاور سے صدر آجاؤنگا"

(۱۳)

ٹاور سے میکلوڈ روڈ کے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے میں نے پولیس آفس کی گھڑی سے اپنی گھڑی ملائی اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ حبیب بنک کی اونچی بلڈنگ تک آیا اور اس کی اونچائی پر نظر کرتا رہا۔ ورنے یہ دیکھی ہی نہیں۔ اسے یہ دکھاؤں۔ کیا ضرورت ہے۔ وہ ڈر کر بے ہوش ہوجائے گی۔ ڈر ڈر۔ ڈر۔ ڈر۔ ڈر۔ ڈر۔ ڈر - ور کی خاص صفت ڈر ہی ہے۔ کوئٹہ میں وہ کیسی نڈری کے ساتھ میرے پاس آکر لیٹ گئی تھی۔ کیسی نڈری سے سرآب روڈ پر چلتی رہی تھی۔ یہاں ہر چیز سے سہمی جاتی ہے۔ وہ بچہ ہونے کی دوا ملنے کے شوق میں یہاں آئی۔ یہاں نہ رہ سکے گی۔ میں بھی یہاں نہ رہونگا۔ یہاں کیا ہے۔ کون ہے میرا؟

پوسٹ آفس کے پاس کی سڑک پر پولیس مین ٹریفک روک رہا تھا۔ میں برنس روڈ کی طرف مڑا۔ ایس۔ ایم کالج۔ یہیں سے میں نے انٹر اور بی۔اے کیا تھا۔ یہاں پڑھتا بھی تھا اور نوکری بھی کرتا تھا۔ میرا جی چاہ رہا ہے کہ کالج کے اندر جاکر دیکھوں مگر نہیں کیا کرونگا۔ آگے بڑھتا ہی رہوں۔

"میں روڈ کی بھیڑ میں سے گزرتا ہوا۔ آخر صدر آہی گیا۔ اب مجھے عورتیں دکھائی دیں۔ ان میں سے ایک نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا "آپ عارف صاحب ہیں۔ کوئٹہ سے کب آئے"

میں نے غور سے دیکھتے ہوئے کہا "پروین۔ تم اچھی تو ہو۔ یہاں کہاں"

"آیئے۔ تھوڑی دیر اسی ریستوران میں بیٹھیں" اور اپنے ساتھ ہی چار لڑکیوں کی طرف مڑ کر کہا "آؤ ریستوران میں چلیں"

ریستوران میں ایک طرف اور پانچوں لڑکیاں میرے سامنے بیٹھیں

"آپ کو یہاں سے گئے ہوئے کوئی دو ہی برس ہوئے ہیں اور آپ کراچی کو بھول گئے"

"کہاں بھولا۔ کراچی کی محبت ہی تھی جو یہاں لائی اور آج وہی مجھے تمام شہر میں ٹہلا رہی ہے۔ مگر میں کراچی کو بھول جانا چاہتا ہوں۔ یہاں سے قطع تعلق کرلونگا۔ گھر بیچ ڈالونگا اور وہیں گھر لے لونگا"

"شادی بھی وہیں کرلیں گے"

"شادی کر بھی لی۔ وہیں کی ایک لڑکی سے"

سب لڑکیوں نے مجھے تعجب سے دیکھا اور پروین کے منہ سے عجیب آواز میں "آئیں" نکل گئی۔

"وہ یہاں ہے تو ہم سب اسے دیکھیں گے آپ کے گھر میں تو کرایہ دار ہے"

"اوپر کا ایک کمرہ میں نے کرایہ پر نہیں دیا تھا۔ آکر ٹھہرا ہوں اور آج بیوی کو وہیں چھوڑ آیا ہوں"

"اس کو کیوں ساتھ نہیں لائے؟"

"وہ جنگلی عورت شہر سے گھبراتی ہے۔ ہروقت واپس چلنے کی دھن ہے"

"تو اب کوئٹہ ہی بسائیں گے"

"تم لوگ بھی وہاں آجاؤ۔ وہاں اب لوگ بہت جارہے ہیں۔ ملازمتیں بھی بہت خالی ہیں۔ اسکولوں میں بہت جگہیں ہیں اور اسکول اور کالج بن رہے ہیں"

"میں نے وہاں کی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں عرضی دی ہے" ایک لڑکی بولی

"شام کو آپ گھر پر ہوں گے ہم لوگ آئیں گے"

"شام تک گھر ضرور پہونچ جاؤنگا۔ ضرور آنا۔ انتظار کرونگا۔ میری بیوی کو دیکھو۔"

میں پروین کو اس کے ساتھ کی پانچوں لڑکیوں کو غور سے دیکھتا رہا۔ سب میرے برابر ہوں گی۔ سب ہی اچھی خاصی کہی جاسکتیں تھیں۔ پروین تو میرے لیے بڑے خاص طور پر حسین رہی تھی مگر مسیح الدین نے کہا تھا "وہ کوئی بڑا بک کرے گی" اور میں نے اس سے دور ہی دور رہنا بہتر سمجھا تھا۔ مگر اب وہ خود ہی میرے پیچھے آئی تھی۔ اب تک کوئی بھی بک نہ کرسکی تھی۔

"مجھے وہاں یونیورسٹی میں جگہ مل جائے تو وہیں آجاؤں"

"ہم سب اس کراچی سے عاجز آگئے ہیں" ایک اور لڑکی نے کہا

"آج ہی میرے مکان بکنے کی بات ہوئی ہے۔ اگر بک گیا تو میں وہیں مکان بنا لونگا۔ سرآب میں کوہ مردار کے پاس ایک کالونی آباد ہورہی ہے پلاٹ بک رہے ہیں تین روپیہ فٹ۔ اسی میں سے ایک پلاٹ لے کر ایک مکان بنا لونگا"

"سنتے ہیں وہاں بجلی اور پانی کی بڑی تکلیف ہے میرے ایک کزن یونی ورسٹی میں کہتے ہیں۔ پانی وقت سے آتا ہے اور اکثر انجن فیل ہوجاتا ہے۔ تو ٹرک پر آتا ہے۔ لوگ بالٹیاں لے لے کر دوڑتے ہیں اور بجلی کا یہ عالم ہے کہ کھانے بیٹھے اور بجلی غائب۔ ہروقت موم کی بتیاں اور لالٹینیں تیار رکھنا پڑتا ہے۔ ٹارچ تکیہ کے نیچے رکھی رہتی ہے"

"ہاں یہ بڑی تکلیف ہے۔ مگر رفتہ رفتہ دور ہوجائے گی"

اچھا آج شام کو آپ کے یہاں آئیں گے"

میں وہاں سے اٹھ کر سمرسٹ اسٹریٹ پر آیا اور کلفٹن کی بس میں بیٹھ گیا۔ بیٹھنے کی جگہ نہیں ملی۔ کھڑے کھڑے ہی کلفٹن پہونچا۔ برج سے بیچز تک جانے میں کافی دیر لگی۔ مگر بیچز پر سب سے الگ ایک جگہ پر بیٹھ گیا اور سمندر کی لہروں کو اٹھتا ہوا اور کنارے پر آتا جاتا دیکھتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ دور پر کب بلبلہ اٹھتا اور پھیل کر لہر ہوجاتا اور یہ لہر ساحل کی طرف بڑھتی آتی اور اپنی حد تک پھیل کر واپس ہوجاتی۔ میں نے سوچا کہ انسانی زندگی کا بھی یہی حال ہے اجتماعی زندگی یوں ہی بڑھتی اور گھٹتی رہتی ہے۔ میں سمندر کی یہ حرکت دیکھ کر ہمیشہ بہت متاثر ہواکرتا تھا اور اسی کو شوق سے دیکھنے آج بھی آیا تھا۔ یہ دیکھتے دیکھتے محو ہو جاتا اور عالم وجد میں پہونچ جاتا۔ کراچی میں روز نہیں تو ہر ہفتہ میں اس عالم میں آجانے کی کوشش کرتا۔ اب دو سال کے بعد پھر اس کیف میں آیا تھا معلوم نہیں کتنی دیر تک محو رہا۔

شام ہونے والی تھی کہ میرے سامنے سے ایک صاحب گزرے جنھوں نے مجھے دیکھ کر کہا"ارے عارف تم!یہاں!کب آئے" میں نے انہیں پہچانا نہیں مگر بڑھ کر گلے ملا اور پوچھنے لگا "آپ یہاں کہاں اور ہیں کہا عرصے کے بعد دیکھا" پھر کہنے لگے "میں انگلینڈ امریکہ سارا یورپ گھوم آیا اور پھر آیا تو یہاں۔ تم کہاں ہو؟"

"میں کوئٹہ میں ہوں۔ وہاں کی ایک مقامی لڑکی سے شادی کرلی ہے۔ اب سوچ رہا ہوں یہاں کا مکان بیچ وہیں رہ بسوں"

"مقامی لڑکی سے شادی کرلی یہ تو بہت اچھا کیا۔ میں یہاں کی لڑکیوں میں بیوی تلاش کرتا رہا۔ کوئی مناسب نہ ملی۔ ہر دوست کو دیکھا کہ شادی کیے ہوئے ہے مگر بیوی اس پر سوار ہے۔ most obedient husband ہو رہا ہے۔ تم تو اس لڑکی کے اس طرح کے شوہر نہ ہوگے"

"وہ میری most obedent wife ہے گھر کے سب کام کرتی ہے۔ مجھے دیوتا سمجھتی ہے"

"مگر تم کو آجکل کی لڑکیاں بھی گھیرتی ہونگی"

"ایک نہیں تین تین پیچھے لگی ہیں۔ ایک شادی سے بالاتر ہوگئی ہے مگر لگائے رکھنا چاہتی ہے اور دو شادی کے لیے کوشش میں امید کر رہی ہیں کہ میں ور کو چھوڑ دونگا یا پھر یہ کہ وہ بھی رہے نوکرانی کی طرح اور یہ بیوی بن کر بیٹھ جائیں۔ یا حکم چلاتی رہیں نا کام کرتی رہیں"

"اگر تم ان سے پھنسے تو زندگی سے عاجز آجاؤ گے۔ میں تجربے کی بات کہتا ہوں"

"میرا کراچی کا گھر ایک صاحب خرید رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اسے بیچ کر بلوچستان میں گھر بنا لوں۔ وہاں سستے میں بن جائے گا فی روپیہ بنک میں رہے گا جس کا سود ملتا رہے گا"

"یہ حرکت ہرگز نہ کرنا تم ابھی جوان ہو۔ ایسا تو بوڑھوں کو سوچنا چاہیے۔ یہ ریٹائرڈ لائف کے منصوبے نہیں۔ میں مکان ہرگز نہ اس کے بہانے یہاں ضرور آجایا کرو گے بلکہ یہ کوشش کرو کہ یہاں کا تبادلہ ہوجائے"

"مگر ور تو یہاں ایک ہفتہ کے اندر گھبرا گئی"

"ابھی نئی ہے۔ جب یہاں رہنا پڑیگا تو عادی ہو جائے گی۔ چلو میں بھی بااثر لوگوں کو جانتا ہوں۔ کوشش کرونگا کہ تمہارا تبادلہ ئے"

"تم نے میری زندگی ہی الٹ کر رکھ دی۔ میں تذبذب میں تھا وہ صبح کو انصاری سے بات ہونے پر یہ طے کر لیا تھا کہ مکان اس کے بیچ ڈالونگا اور کوئٹہ کی سرآب روڈ پر رہ بسوں گا"

"انصاری۔ انصاری۔ ارے وہ بزنس مین۔ وہ بالکل کراچائٹ ہوگیا ہے۔ اس کی بات بالکل نہ مانو۔ اگر مانو تو میری مانو کوئٹہ چھوڑ دو اس کی طرح بزنس کرتے پھرو۔ مکان بیچ کر بنک سے آمدنی پر بسر کرنے لگو گے تو مفلوج ہوجاؤ گے۔ یہ فرار کی زندگی ہے۔ اس سے نہ ملے گا۔ تمہاری جاہل الھڑ بیوی اور بھی کاہل بنادے گی۔ وہ ہر طرح ہو جانے کے لیے تیار ضرور ہوگی۔ یہاں رہے گی تو یہاں سے ada کرے گی۔ کوئی بچہ ہے؟"

"بس اسے بچے کا شوق ہے۔ میں نے ڈاکٹرنی کو دکھا کر دوا لی ہے وہ استعمال کر رہی ہے"

"بچے کی جلدی کیا ہے۔ کبھی نہ کبھی ہو رہے گا۔ اس کا ارمان نکل جائے گا۔ تمہارا وارث ہو جائے گا۔ انصاری نے تمہیں بہکا دیا تم میری بات مانو۔ کاش تمہاری ایسی عورت مجھے بھی مل جاتی میں تو اب تک پڑھی لکھی عورتوں کی غلامی میں پھنسا ہوں یا ان سے رہا ہوں۔ کوئی دن نہیں کہتی تم اپنی بنی بنائی زندگی میں ان کو نہ گھسیٹو تم بڑے خوش قسمت ہو"

(۴)

کلفٹن سے میں پیدل چلتا ہوا صدر پہونچا۔ وہاں کسی بس میں جگہ ملنے کا تو سوال نہیں تھا۔ کسی منی بس میں بھی جگہ نہ ملنے کی وجہ ے ایک گھنٹے تک ادھر آتا اور ادھر جاتا رہا۔ آخر کو میں نے طے کیا کہ پیدل ہی گھر جاؤنگا۔ بندر روڈ تک پیدل آیا مگر موڑ پر ایک منی رکی اور اس کے کنڈیکٹر سے بات کرنے پر معلوم ہوا کہ زمین پر بیٹھنے کی ایک جگہ ہے۔ میں اس میں بیٹھ گیا اور پٹرول پمپ پر اتر ا۔ یہاں سے پھر پیدل چلتا ہوا گھر پہنچا تو ور نے کہا "کئی لڑکیاں آئیں تھیں بہت دیر بیٹھی رہیں چلی گئیں۔ صبح کو پھر آئیں گی"

ور نے کافی صاف اردو بولی تھی مگر آخر میں لڑکھڑا گئی تھی میں نے اسے صحیح کرنے ہوئے کہا "صبح کو پھر آئیں گی"

"آئیں گی ۔ آئیں......" وہ کئی بار کہتی رہی

"اچھا مجھے بڑی دیر ہوگئی تمہارا دل تو نہیں گھبرایا؟"

"میں نیچے کرایہ دار کے یہاں رہی۔ بہت سے لڑکیاں آتی رہیں۔ میں ان سے ملتی رہی۔ وہ سب مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں۔ اور

کہتی ہے کہ یہیں رہو۔ کوئٹہ نہ جاؤ"

"تو تم نے کیا کہا"

"میں نے کہا ہمارے میاں کی وہاں نوکری ہے۔ ہم وہیں رہیں گے۔ وہ خوب ہنستی رہیں اور ہر ایک نے میرے بوسہ کیا۔"

"بوسہ کیا۔ بلکہ کہو کہ پیار کیا"

کچھ دیر کے بعد میں نے کہا "اب کوئٹہ واپس ہونے کے دن آرہے ہیں۔ ہم چھٹی ختم ہونے سے پہلے ہی چلے جائیں گے"

"مجھے کچھ پرواہ نہیں۔ کل ہی چلے چلو"

میں نے کہا "تم نے تو کھانا کھا لیا ہوگا۔ مجھے بھوک لگی ہے۔ جلدی کھانا لاؤ"

"نہیں میں نے کھانا نہیں کھایا۔ یہاں عورتیں کہتی ہے کہ کھانا میاں کے ساتھ کھایا کرو اس سے محبت بڑھتی ہے"

"خیر کھانا ساتھ کھاؤ یا نہ کھاؤ۔ میری تم سے محبت بہت بڑھ گئی ہے"

"بڑھ گئی یا گھٹ گئی یہاں ہر وقت لڑکیاں ساتھ ہیں"

"اسی وجہ سے ان سے نفرت بڑھتی جارہی ہے۔ وہ ایسی اچھی نہیں ہیں جیسی تم ہو۔ تم اور بھی زیادہ اچھی لگنے لگی ہو۔ ابھی تو کوئی چودہ برس ہی کی ہو۔ ابھی بہت وقت ہے تمہارے بچہ بھی ہوجائے گا۔ دوا تو کھا رہی ہو"

"یہ کرایہ دار جو ہیں وہ مجھ سے پوچھنے لگے تم کو کلمہ آتا ہے۔ میں نے کہا کلمہ کیا ہوتا۔ پھر بولے جب تمہارے میاں آئیں تو مجھ سے کہنا میں ان سے بات کروں گا"

"وہ کیا بات کریں گے میں آگیا ہوں"

"ہم جاتے ہیں ان سے کہہ دیں گے" اور یہ کہہ کر وہ نیچے چلی گئی

تھوڑی دیر کے بعد کرایہ دار اوپر آئے صاحب سلامت کے بعد بولے "یہ آپ نے کیا جانور پال رکھا ہے۔ اس سے نکاح بھی ہوا ہے کہ یوں ہی پکڑ لائے ہیں"

"جی میرا اس سے باقاعدہ نکاح ہوا۔ ایک عالم مولوی نے پڑھایا۔ آپ لوگ مہر ٹال جاتے ہیں۔ میں نے منہ مانگا مہر اس کے باپ کو ادا کیا"

"مگر یہ مسلمان تو ہے نہیں۔ اسے کلمہ تک تو آتا ہی نہیں"

"ان لوگوں کے مذہب کا عجیب عالم ہے۔ اس کے باپ سے میں نے پوچھا تو بتاتا ہے کہ ہم مسلمان ہے کیوں کہ ہمارا سردار مسلمان ہے اور کلمہ تو جانتا ہے مگر نماز کے بابت کہتا ہے کہ ہمارا سردار جب عید بقر عید نماز پڑھاتا ہے تو ہم بھی اس کے پیچھے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ روزوں کے زمانہ میں روزے ضرور رکھتے ہیں مگر نماز نہیں پڑھتے اور عورتیں تو نہایت درجہ گندی ہوتی ہیں۔ سال بھر میں ایک دفعہ نہاتی ہیں اور ایک ہی جوڑہ کپڑے پہنتے رہتی ہیں۔"

"خیر آپ نے اس سے نکاح کیا ہے تو اسے کلمہ نماز روزہ تو سکھایا ہوتا۔ یہ آپ کیا غضب کر رہے ہیں کہ ایمان کی طرف دھیان ہی نہیں دیا"

"یہ آپ کی پڑھی لکھی لڑکیاں تو ایمان کا بڑا خیال رکھتی ہیں بلکہ وہ تو ایمان کے خلاف ہیں یعنی مخالفت کرتی ہیں"

"اسے جانے دیجئے آپ اپنے کو دیکھئے"

"اسے جب اور جتنے ایمان کی ضرورت ہوگی اتنا سیکھ لے گی۔ ابھی اسے اس سے بے نیاز ہی چلنے دیجئے"

وہ بگڑ کر چلے گئے کہتے گئے "اچھا جیسے آپ ہیں ویسا اسے بنایا۔ قیامت قریب ہے"

در واپس آئی تو کہنے لگی "اب ہم اس کے یہاں نہیں جائے گا۔ یہ ہم کو کافر کہتا ہے"
میں ہنسنے لگا اور وہ بھی ہنس پڑی۔ پھر ہم دونوں سو گئے
صبح کو ناشتہ کر ہی چکا تھا کہ پروین اور اس کے ساتھ چار لڑکیاں آگئیں۔ میں نے ان سے پوچھا "تم تو مذہبی عوامل کی پابند ہو کہ نہیں؟"
ان میں سے ایک جھٹ سے بولی "ہم نے سب دیکھ لیا کچھ بھی نہیں ہے"
"یہ آپ کیا لے بیٹھے" پروین نے کہا "ہمیں مذہب کی طرف توجہ کا وقت ہی نہیں ملا"
"تم مذہب سے بالاتر ہوگئی ہو اور اگر یہ میرے بیوی مذہب تک آئی ہی نہیں تو کیا فرق پڑتا ہے"
"یہ ہم سے اچھی ہے" سب لڑکیوں نے کہا
"یہ آج آپ پر مذہب کیسا سوار ہوگیا؟" ایک نے پوچھا
"یہ ہمارے کرایہ دار کل شام سے مذہب چڑھا گئے ہیں۔ در پر اعتراض کرتے ہوئے آئے اور مجھ پر غصہ کرتے ہوئے چلے گئے"
"اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو" ایک لڑکی نے غالب کا یہ مصرع پڑھا اور کہا "یہ سب چھوڑیئے۔ ہم آپ سے دریافت کرنے آئے ہیں کہ ہمارے وہاں کیا پراپکٹس ہے؟"
"بڑی پراپکٹس ہر طرف پراسپکٹ ہی پراسپکٹ ہے" میں نے کہا "میری بیوی کو دیکھ کر اپنے کو ناپ لو۔ وہاں کے لوگ ابھی کتنے پیچھے ہیں سب علمی کام تمہارے ہی ہاتھوں میں ہیں۔ ادھر کی لڑکیاں سب اداروں میں خاص طور سے تعلیمی اداروں میں کام کر رہی ہیں۔ آکر دیکھ جاؤ۔ جاکر دیکھ لو میرا گھر تمہارے لیے حاضر ہے۔ میری بیوی کو تمھیں کھانا پکا کر کھلانے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ میرے کہنے سے بہتر یہ ہے کہ خود مطالعہ کر جاؤ۔ مجھ سے جو مدد ہوسکے گی کرونگا"
اسی طرح کی باتوں سے وہ سب مطمئن ہو کر چلی گئیں
در نے کہا "اب تمہاری چھٹی تو ختم ہوگیا ہوگا"
"چھٹی ختم ہوجائے گی۔ کوئی چار دن اور ہیں"
"اب چلو۔ یہاں دل نہیں لگتا۔ اسی ڈاکٹرنی کو ایک دفعہ اور دکھا لو"
"کیا ڈاکٹرنی کی دوا سے تم کو کچھ محسوس ہو رہا ہے"
"ہاں۔ کوئی دوا ایسی لے لو جو کوئٹہ میں کھاتی رہوں مجھے معلوم ہورہا ہے کہ اب کچھ ہوجائے گا"
"اچھا ابھی چلو۔ آج صدر میں ایک ڈاکٹرنی ہے اسے دکھائیں گے۔ تم اس کے یہاں ٹھہرنا۔ میں ایک اور دوست سے ملنے چلا جاؤں گا"
"وہ کاٹ تو نہیں ڈالے گی"
"کاٹنا اتنا جلدی نہیں ہوتا۔ ہاں وہ دو تین گھنٹے بیٹھائے گی اور غور سے دیکھے گی۔ میں لپک کر میرے ایک دوست میں ان کے پاس ہو آؤنگا"
غرض میں اسے اسپتال میں چھوڑ کر یہ اپنے دوست کے یہاں پہنچا۔
دوست نے اور باتوں کے بعد یہ کہا "تم وقت میں عقیدہ نہیں رکھتے تم نے جو کتابیں پڑھی ہیں وہ ارسطو۔ افلاطون اور سقراط کے فلسفہ پر مبنی ہیں۔ وقت' وقت خاص چیز ہے آج کل کی دنیا میں رفتار سب سے اہم ہوگئی ہے chronos دیوتا سب پر حاوی ہوگیا ہے۔ وقت تمہارے سب کام ٹھیک کر دیگا۔ ہمارے پاس بہت وقت ہے۔ تم ابھی تیس کے لگ بھگ ہو۔ تم ابھی سے تھک کر بیٹھ جانا چاہتے

ہو۔ لڑکیوں کے فراق میں پھرتے تھے مگر کچھ نہیں ہوتا تھا۔ چکر چکر چکر۔ اسی لڑکی نے تمہیں راہ پر لگایا۔ اب اوروں کی طرف سے توجہ ہٹالو۔ اوروں کے ساتھ ناکامیاب رہے ہو۔ آگے بھی ناکامیاب ہوگے۔ ایک امرت کی ڈلی مل گئی ہے۔ تمام جنسی توجہ اس پر لگا دو۔ گھر سے اطمینان ہو جائے گا۔ ویرانے میں رہتے ہو ویرانے میں پھرا کرو تمہارے لیے بڑے بڑے انکشافات کی گنجائش ہے۔ ایک روٹین بنالو۔"

"آپ بنا دیجئے میں اسپر عمل کرونگا"

"صبح اٹھ کر باہر نکل جایا کرو پہاڑوں تک ٹہلتے ہوئے۔ درِ گھر کا کام کرتی رہے گی۔ پھر آکر کھانا کھاؤ اور دفتر چلے جاؤ۔ گھر آکر کھانا کھاؤ کتابیں پڑھتے رہو۔ سہ پہر سے پھر ٹہلنے نکل جاؤ۔ شہر میں نہیں ویرانے میں۔" رات تمہاری ہے اور بیوی تمہاری ہے۔ اس سے ہر طرح جنسی تفریح لو اور سو جاؤ۔ پھر کسی عورت کے پیچھے پھرنے کو جی نہیں چاہے گا۔ سب کو بھول جاؤ گے اور پھر بہت سی باتیں سمجھ میں آئیں گی۔ ہاں نماز پانچوں وقت استقلال سے پڑھا کرو اور اسے ذہن کا غسل سمجھ لو۔ ولیم جیمس کی Psychology of religious experience آج ہی خرید لو اور اس کا مطالعہ کرو۔ نماز کے معنے بھی سمجھ میں آجائیں گے اور نفس میں توازن بھی آجائے گا۔ تین مہینے کے بعد پھر یہاں آنا میں دیکھونگا کہ کہاں تک پہونچے"

"آپ کو خط نہ لکھتا رہوں"

"ضرور ضرور۔ ہر ہفتہ ضرور"

"اچھا اب ڈاکٹرنی نے دیکھ لیا ہوگا میں در کو لے کر گھر جاؤنگا"

(۱۳)

جب بولان میل میں سوار ہو کر ہم دونوں کوئٹہ واپس ہو رہے تھے تو مجھے محسوس ہوا کہ کراچی ایک اعراف ہے۔ تین ہفتے کی مدت میں میری روحانی صفائی اور در کی روحانی صفائی ہوتی رہی۔ دوست جن کو میں دوست کے علاوہ کسی اور نام سے نہیں یاد کرنا چاہتا میری روحانی صفائی کرتے رہے اور صدر کی کلینک میں در کی جسمانی صفائی ہوتی رہی۔ بلوچستان کے محض بہائی طریقوں کی وجہ سے اس کا جسم خراب ہوگیا تھا۔ وہ کراچی کی ڈاکٹرنیوں نے ٹھیک کر کے مجھ سے کہا "اب اس کے بچہ ضرور ہوگا" اور دوست نے مجھے کائنات کے اس راز سے آگاہ کر دیا تھا جس سے نامانوس ہونے کی وجہ سے میں جنسی تعلقات کے الجھاؤں میں الجھ رہا تھا۔ دونوں کو ماحول نے غلط راہ پر کر دیا تھا اور دونوں کراچی سے صحیح راہ پر لگ کر واپس جارہے تھے۔

در نے اپنے بہن بھائیوں کے لئے، ماں باپ کے لیے کافی سامان خرید لیا تھا اور ایک الگ پیٹی میں رکھ لیا تھا اور وہ بہت خوش تھی۔ ریل چلی کراچی گزرتی رہی۔ میں نے کراچی سے کچھ کتابیں لے لی تھیں انھیں پڑھتا رہا۔ در گزرتی ہوئی بلڈنگوں کو دیکھتی رہی اور سوگئی۔

راستے بھر کوئی خاص بات نہیں ہوئی مگر سرآب آتے ہی در کے اندر عجیب تبدیلی نظر آئی۔ اس کا چہرہ چمک اٹھا۔ اس نے کہا "ہم یہاں اتر جائیں۔ آنی کے پاس جائیں"

میں اسکی چونچالی دیکھ کر ہنس دیا اور کہنے لگا "احمق ہوئی ہے۔ ریل سے کود جائے گی تو ہاتھ پیر ٹوٹ جائے گا"

وہ کھڑکی سے باہر سر نکالے ہوئے عجیب محویت سے دیکھتی رہی۔ ریل کے پاس کی سب عمارتیں نکلتی گئیں میں بھی محسوس کر رہا تھا کہ یہ بدل گئی بلکہ تمام عالم وہی ہے مگر بدلا ہوا ہے۔ مجھے اقبال کا شعر یاد آیا

نوع دیگر ہیں جہاں دیگر شود
ایں زمین و آسماں دیگر شود

اسٹیشن آگیا اور ہم اتر کر ایک تانگے میں بیٹھے کیوں کہ ہمارے پاس سامان کافی تھا۔ سرآب روڈ پر ہر چیز بدلی ہوئی نظر آرہی تھی۔ یونی ورسٹی کے پروفیسر یاد آئے۔ وہ ہر چیز سے نالاں تھے۔ قابل ہونے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے "knowledge is most dangerous Little" مجھے پروفیسر ہونے کا شوق تھا مگر اچھا ہوا کہ میں یہ نہ ہوسکا۔ میں کلرک ہوں۔ کلرک بالکل مشین ہوتا ہے مگر دوست نے کہا تھا کہ کلرکی کو ہی اگر پورے دل سے انجام دو تو دل کو اطمینان ملے گا۔ میں یہیں سے بالا تر ہوگیا تھا۔ مثبت بالکل مثبت انداز فکر' یہ اس کیمونزم سے نہیں مل سکتا جس کے پرچار کر پروفیسر ہیں

دوسرے دن میں ہیڈ مسٹرس کے یہاں گیا۔ اس کے پاس وہ دو لڑکیاں بھی تھیں جن کے فراق بھی بیتاب رہ چکا تھا

"تم مجھ سے بغیر ملے چلے گئے" ہیڈ مسٹرس نے کہا

"ہم لوگ بھی کچھ چیزیں منگاتے" اس کے ساتھ کی دونوں لڑکیوں نے کہا

"میں عورتوں کی چیزیں کبھی نہیں لایا کرتا۔ لاتا تو مین میخ نکالتیں۔ اچھا ہوا کہ بغیر ملے چلا گیا"

دونوں لڑکیاں مجھ سے بگڑ گئیں مگر ہیڈ مسٹرس کے چہرہ سے ناراضگی نمایاں نہ ہوئی

"اچھا کیا کر آئے؟"

"سکھر کا مکان بیچ آیا"

"تو یہاں کی زمین لے لو"

"ابھی جلدی کیا ہے دیکھا جائے گا۔ کیا معلوم یہاں سے بھی جانا ہو تو مکان کہاں لیے پھرونگا۔ ہاں میں ایک خاص مطلب سے آپ کے پاس آیا ہوں۔ مجھے ایک ایسی استانی دلادیجئے جو در کو وہ حسب معمول درس دے سکے جو ابتدا میں لڑکیوں کو دیا جاتا ہے"

دونوں لڑکیوں نے مجھے آنکھیں پھیر کر دیکھا اور اٹھ کر چلی گئیں

ہیڈ مسٹرس بولیں۔ "یہاں ایک صاحبہ رہتی ہیں۔ بڑھی ہیں بیوہ ہیں۔ وہ بچوں کو قرآن شریف پڑھ لینے کے لیے قاعدہ وغیرہ پڑھاتی ہیں"

"اور نماز وغیرہ تو ضرور سکھاتی ہوں گی"

"یہی ان کا کام ہے"

"میں اس کو در کے لیے ملازم رکھ لونگا۔ جو مانگیں گی دونگا"

ہیڈ مسٹرس نے ان استانی کو بلوایا اور میرے ساتھ کردیا۔ میں نے چلتے وقت ہیڈ مسٹرس سے کہا "میں بہت کچھ بدل گیا ہوں اور بدلتا رہونگا۔ کراچی ایک اعراف ہے جو مذبذب لوگوں کو یا جنتی بناتا ہے یا دوزخی"

تو تم جنتی ہوگئے ہو؟"

"معلوم نہیں۔ مگر وہ نفرت جو ہر شخص سے مجھے ہوجاتی تھی جانے لگی ہے۔ امکان ہے کچھ عرصے کے بعد میں غصہ اور ضلالت سے بالکل بالا تر ہوجاؤں اور یہی جنت ہے۔ یہی جنت ہے"

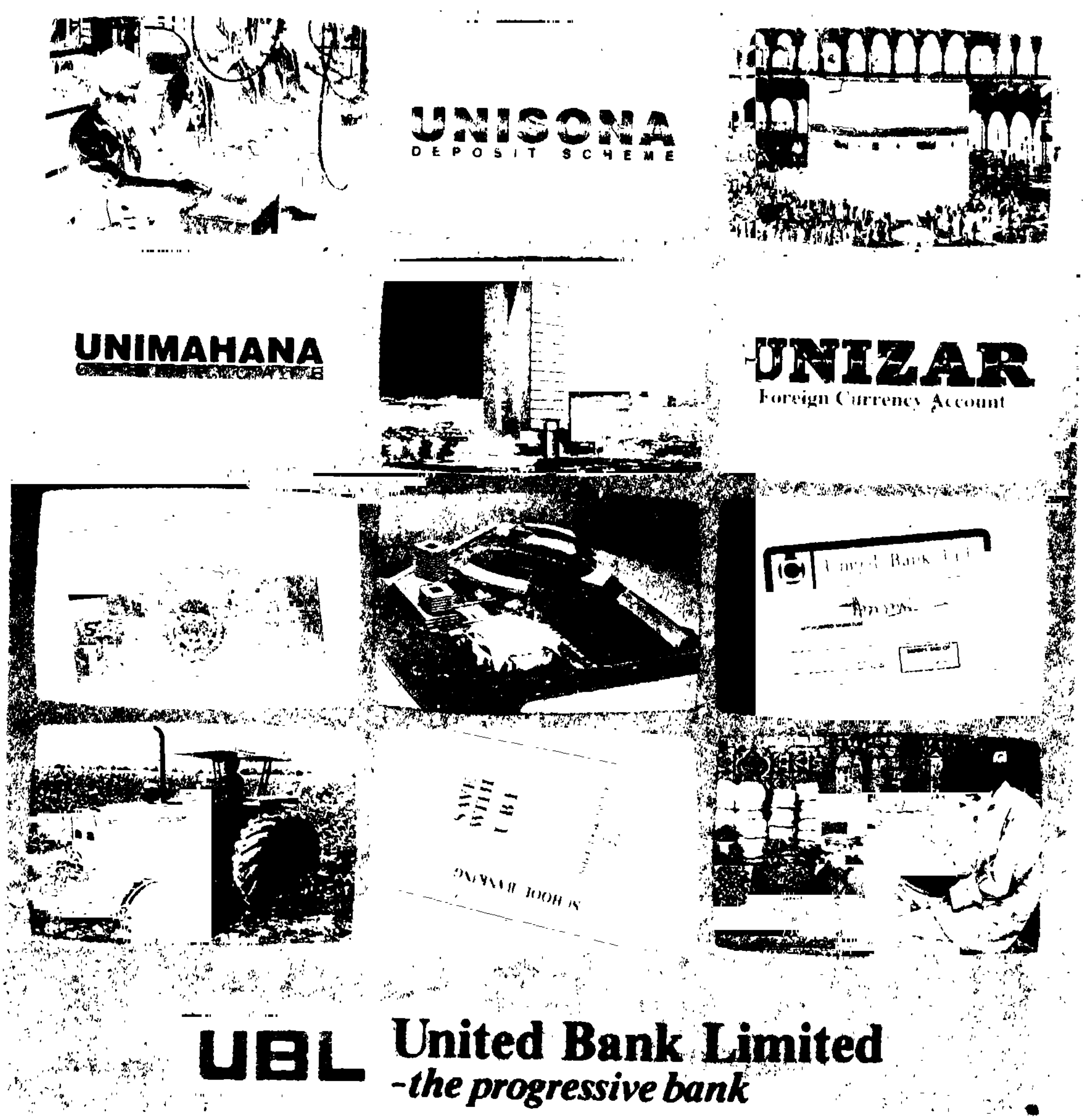
وہ غور میں ڈوب گئی اور میں چلا آیا

اب میرا ایک خاص روٹین ہوگیا تھا۔ صبح ہی اٹھ کر میں نماز پڑھتا۔ در کو اٹھاتا۔ وہ بھی نماز پڑھ کر ناشتہ تیار کرنے لگتی۔ میں ناشتہ کرکے نکل جاتا کبھی کوہ مردار کی طرف کبھی کوہ چھلتان کی طرف اور سامنے کے منظر میں گم ہوجاتا۔ یہاں تک کہ سورج نکل آتا اور گھر واپس آتا۔ استانی در کو مختلف قسم کا درس دیتی ہوتیں اور میں دفتر چلا جاتا۔ دفتر سے آکر کھانا کھاتا اور لیٹ کر کتابیں پڑھتا رہتا۔ جن کتابوں کو دوست سے پڑھنے لے گیا تھا وہ اور اسی قسم کی کتابیں مجھے پبلک لائبریری سے یا یونی ورسٹی لائبریری سے مل جاتیں۔ چائے کے

وقت در اٹھ کر چائے بناتی اور اس کے بعد پھر میں کبھی اکیلے اور کبھی اس کے ساتھ پھر پہاڑوں کی طرف نکل جاتا۔
کچھ عرصے کے بعد اس کی ماں نے اسے بتایا کہ وہ پیٹ سے ہے اور اس نے بڑی خوشی سے مجھے اس بات کی اطلاع دی۔ میں نے ڈاکٹرنی کو بھی دکھایا اور اس نے بھی اس بات کی تصدیق کی۔ وہ بچہ کی امید میں روز خوشی سے خوشتر ہوتی جارہی ہے اور میں اس شعر پر عمل کرنے میں بڑھ رہا ہوں

کار خود گر بخدا باز گزاری حافظ
اے بسا عیش کہ بابخت خدا دارہ گئی

دوست کا خط آتا رہتا ہے۔ وہ ہر بار لکھتے ہیں
"ابھی تمہارا سن ہی کیا ہے۔ ابھی بہت دور جانا ہے"


UNISONA
DEPOSIT SCHEME
UNIMAHANA
UNIZAR
Foreign Currency Account
UBL
United Bank Limited
-the progressive bank

ASIATIC





- دردِ شکم میں نئی کارمینا کی دو ٹکیاں نیم گرم پانی کے ساتھ استعمال کریں۔
- بدہضمی، قے یا متلی کی شکایت میں نئی کارمینا کی دو ٹکیاں چوسیں۔
- نئی کارمینا کی دو سے چار ٹکیاں باقاعدگی کے ساتھ رات کو سوتے وقت نیم گرم پانی سے استعمال کی جائیں تو دائمی قبض سے نجات مل جاتی ہے۔
- بھوک کی کمی کی شکایت میں صبح ناشتے سے پہلے، دوپہر اور رات کے کھانے سے قبل نئی کارمینا کی دو ٹکیاں چوسیے۔
- بچوں کو حسبِ عمر آدھی یا ایک ٹکیہ نئی کارمینا دیجیے۔

خوش ذائقہ **نئی کارمینا** ہمدرد

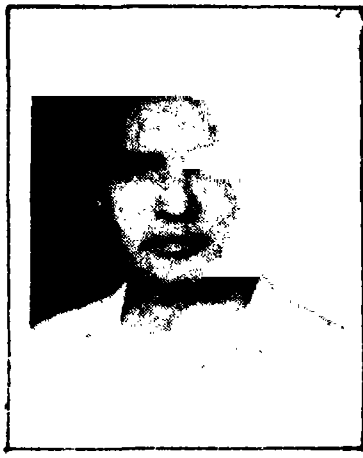
ہر گھر کی اہم ضرورت — ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں

تحقیق، رُوحِ تخلیق ہے

حفیظ احسن

پورٹریٹ کی تکمیل

سیپ کراچی --۷۶



"وہ تو جی خوب اپ ٹو ڈیٹ تھا' ویل انفارمڈ۔۔ متلاشی آنکھوں والا یونی' ایسا اسمارٹ۔۔ ایسا اسمارٹ!" اور چناں نے آنکھیں بھر کر رونی کی طرف دیکھا اور اگلا جملہ رونی کے حلق میں پھنس گیا پہلے تو اس نے چناں کا اشارہ سمجھنے اور فالو کرنے کی کوشش کی پھر جیسے اس کی آنکھوں میں جرأت اور بغاوت کا فلش امڈ آیا۔ "اب رہنے بھی دو۔ آنٹی سے بھلا کیا کیا چھپاؤ گی۔۔ اور پھر آخری فیصلہ تو ان کی رضامندی سے ہوگا۔۔ لو اور سنو آنٹی! دور ڈیٹھی مجھ پر ٹھیماں پھینک رہی ہے کہ زبان بند رکھو' پر میں کہتی ہوں زبان بند کر کے بھی کوئی مسئلہ سلجھا ہے اس دنیا میں' پارسال دیکھا تھا ہم دونوں نے یونی میاں کو۔۔ ہڈیوں پر نمدہ کسا ہوا تھا۔ سلیٹی رنگ تھا ان دنوں اور کلوں کی ہڈیاں شلغم کی طرح ابھری ہوئی تھیں' اس وقت جچا نہ تھا نظروں میں چناں بی کے۔۔ کہتی تھیں یہ تو مزے آرٹسٹ ہی نکلے۔ کسی نایاب قسم کے آئل کلر کا عکس پڑگیا ہے ان کی صورت پر خدا جانے کیسی تصوریں بناتے ہیں' کوئی ایک دیکھوں تو ان کے آرٹ کے بارے میں کوئی رائے قائم کروں اور یونی میاں تھے کہ ان کے چہرے کو دیئے کی لاٹ کی طرح ساکت کھڑے دیکھے جا رہے تھے۔ آخر بولے تو صرف یہ کہ آپ کی ناک کا یہ کرو Curve مجھے Renunciation کی یاد دلاتا ہے' اور بالوں کا یہ گھنگھراف توبہ کوئی تھن مھتنا بچہ نہیں ہے ادھر کوئی' آپ کے پہلو میں کرشن مہاراج کی طرح ہاتھوں کے بل بیٹھا دوں' اور آنٹی میں آپ کو کیا بتاؤں' چناں کی آنکھوں میں اس وقت کیسی خیرہ کن چمک تھی' ہر نظر کے ساتھ ستارے اتر رہے تھے' اور یہ دونوں آمنے سامنے کھڑے مہاتما بدھ کی طرح گیان دھیان میں مصروف ہوگئے اور میری تو خاک بھی سمجھ میں نہ آیا' بعد میں چناں نے بتایا کہ یونی ڈیونسی DA-VINCI کی ایک مشہور پینٹنگ کا حوالہ ہندو دیومالا کے حوالے سے دے رہے تھے۔ ورنہ میں تو بچے کی تلاش کے حوالے سے چکر میں ہی پڑ گئی تھی اور سنو۔۔!"

عین اسی لمحے چناں نے آکر طوفان برپا کر دیا "ممی! آپ اس جھوٹی چڑیل کی فسانہ طرازی سنیں گی یا مجھے بھی کچھ کہنے کا موقع دیں گی!" اور آنٹی راحیلہ تو جیسے رونی کی باتوں میں ڈوبی غرق ہوئی جارہی تھیں۔ خدا جانے جوانی کا کوئی کھویا سا لمحہ ان کے دماغ کی کھلی کھڑکی پا کر اندر چلا آیا تھا اور اس نے اس ایوان کی بتیاں ایک ایک کر کے روشن کر دی تھیں۔

"چناں تو چل بیٹی کمرے میں ۔۔ مجھے سننے دے' ہیں! تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے کیا دیکھ رہی ہے۔ ماں ہوں میں تیری' چل بیٹھ جا' آخر کو یہاں تیری موجودگی بھی ضروری ہے' میں تیری صورت دیکھ کر ہی کوئی فیصلہ کرونگی' ہاں تو آگے بول رونی!" اور چناں زنجیر میں

جکڑی بیٹھ گئی۔۔

"تو آنٹی!" روبی کے منہ سے ایک زور دار قہقہہ نکل گیا اور چناں نے چڑ کر اپنے خیالات کے جسم سے لپٹی ہوئی زنجیر اتاری اور فرش پر پاؤں پٹختے ہوئے' اپنے کمرے کی طرف چلی گئی اور آنٹی راحیلہ نے پوپٹے سکیڑ کر بیٹی کی طرف دیکھا "میں ابھی تک نہیں سمجھ سکی ان چھوکریوں کو۔۔ سارے زمانے کی اللہ ماری شرم ماؤں کے حصے میں ہی آتی ہے یوں چاہے سارے زمانے میں زبان کے چھلکے اتارتی پھریں ماں کے سامنے آئیں گی تو ایسے نظر آئیں گی جیسے پیدائش کے وقت سے منہ میں زبان نہیں تھی!" پھر انھوں نے روبی کو آنکھ بھر کر اپنی پتلی میں سمیٹتے ہوئے پوچھا "تو بھی سچ سچ بتا کیا اسی طرح ماں کے سامنے موتیے کی بند کلی بن جاتی ہے!"

"اے واہ آنٹی کیا بات کہدی کیا میں واقعی تمہیں موتیے کی بند کلی معلوم ہوتی ہوں!" آنٹی بخیل نہ تھیں خود بھی پیٹ بھر خوبصورت تھیں' اب وقت نے چہرے سے جوانی کی رعنائیاں چھین لی تھیں تو کیا ہوا' اب بھی عورتوں کے جمگھٹے میں بیٹھی رائل فیملی کی فرد معلوم ہوتی تھیں "اے تو میری بیٹی روبی کیا کسی سے کم ہے چندے آفتاب چندے ماہتاب!"

"پر چناں تو مجھ چڑیل کہتی ہے!" اس کے منہ سے ایسے ہی نکل گیا

"تجھ سے خار کھاتی ہے۔۔ تیرے سوا کوئی ہے جو نہیں اس کے مقابلے کی!" پھر آنٹی راحیلہ چھالیہ پھانکتے ہوئے سوچ کے جنگل میں روپوش ہو گئیں' اور روبی ٹکر ٹکر انھیں دیکھتی ان کے دوبارہ ظاہر ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

"اے تو کیا یہ سچ ہے کہ چناں اور یونی دو گھنٹے تک باتیں کرتے رہے!" روبی نے دیکھا آنٹی سوچ کے جھٹپٹے میں سے تیز رفتار پرندے کی طرح باہر نکلیں لیکن روبی نے ان کی بات کو بڑے ہلکے موڈ میں لیا "آنٹی تو اس میں ہرج ہی کیا ہے' مجھے تو یونی اور چناں کا جوڑا بڑا آئیڈیل نظر آرہا ہے"

"ہوں!" وہ بولیں "مجھے بھی یہ آئیڈیل ہی نہیں رومانٹیکل نظر آرہا ہے' لیکن روف بیٹی شاید تمہیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ چناں اپنے خاندان میں کہی ہوئی ہے' میری بڑی بہن کے بیٹے تازی سے ۔۔ اور یہ لڑکا ۔۔۔!"

"وہ تو مجھے معلوم ہے آنٹی کہا ہی ہوا ہے' کوئی منگنی دگنی تو نہیں ہوئی' آج کل یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے' سب ویل ٹو ڈو ۔۔ انڈر اسٹینڈنگ والے لوگ ہیں"

"لیکن بیٹی روشن خیال تو میں بھی ہوں لیکن فیملی اور اس سے بندھی ہوئی روایتوں سے جان چھڑانا مجھے بھی نہیں آتا' اوپر سے ستم یہ ہے کہ چناں کے ابا' ہی از سو یوزڈ ٹو ہز اون ویز"

"کوئی بات نہیں' ماں باپ کے نزدیک اولاد کی خوشی سب سے مقدم چیز ہوتی ہے آنٹی!" پر آنٹی نے ایکدم جھرجھری سی لی' "اے تو تو ایسے کہہ رہی ہے جیسے چناں اور یونی کے درمیان کوئی باقاعدہ افیئر پروان چڑھ رہا ہو' ابھی سے میں بھی کیوں سوچوں میں الجھ گئی چل بھاگ یہاں سے ۔۔ سچ ہی تو کہتی ہے چناں تجھے چڑیل" اور آنٹی لباس کی شکنیں درست کرتی ہوئی اٹھ کر برآمدے میں چلی گئیں۔

اور چناں بھی جو اپنے کمرے کے وارڈ روب سے لپٹی اس نشست کی برخاست کی منتظر تھی' باہر نکل کر پائیں باغ کے اندھیرے میں گم ہو گئی یہ بلا روبی اب ٹل ہی جائے' پھر رات کو تاروں بھرے آسمان کے نیچے ٹھنڈی یخ ہوا کے تھپیڑوں میں وہ دیر تک پانی کے ٹینک کے اوپر پھیلے ہوئے پتوں میں کینر کے پھول تلاش کرتی رہی' چاند ابھی درختوں کی چوٹیاں سر نہیں کر سکا تھا اور ہوا میں ایک بڑی رازدارانہ سی سرگوشیانہ سی کیفیت تھی' جیسے اسے کہہ رہی ہو مجھ سے باتیں کرو' لیکن اس کے پاس تو کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا' سامنے ٹینک کے پانی پر شاخوں اور پھولوں کی کشتیاں تیر رہی تھیں' وہ کافی دیر تک بیٹھی اس ننھے سے بحر کو تکتی رہی' جس کی سطح پر ہوا کے تھپیڑے روپہلی چپواروں کی طرح پتوں اور پھولوں کی کشتیاں کھیتے نظر آرہے تھے' جیسے سمندر کی سطح پر دو بحری بیڑے گھمسان کے رن میں ایک دوسرے میں الجھ گئے ہوں' ہوا کے بادبان اس کے سامنے ہر لمحے اس میدان کارزار کا ایک نیا نقشہ ترتیب دے رہے تھے اور

پھر چاند بھی جیسے کسی خوبصورت بچے کی طرح مہک کر ٹینک کے پہلو میں ابھر آیا۔ اسے یہ نقشہ بڑا بھلا لگا' بڑا سبک سا' حالاں کہ اس میں لہروں اور پتوں نے مل کر ایک مہیب سی ہلچل مچا رکھی تھی' وہ سوچنے لگی خوف' خوشی' رنج اور افسردگی کے دھارے انسان کے اندر سے ہی پھوٹتے ہیں۔ اگر واقعی اس ٹینک کی جگہ یہاں جنگ کا میدان ہوتا اور ہوا کی سیٹیوں کے بجائے توپوں اور گولوں کی گھن گرج ہوتی تو اس کے خیالات کا عالم کیا ہوتا! پھر اسے خیال آیا' آخر اس نے پانی سے بھرے ہوئے ٹینک میں ایک بحر کو کیسے دیکھ لیا' کیا یہ ابنارمل سوچ کا نتیجہ نہیں ہے! کچھ دنوں سے اس کی سوچیں واقعی غیر معمولی مراحل سے گزر رہی تھیں۔ بستر پر لیٹے ہوئے اسے چھت کے ڈسٹمپر پر پھیلی ہوئی روشنی کے شیڈز میں بھی ایسے ہی چھوٹے چھوٹے مناظر نظر آیا کرتے اور کچھ دنوں سے تو اسے ان شیڈز میں ایک بڑا ہی وجیہہ بانکی چتون والا نوجوان نظر آتا تھا' اور ٹیوب کی روشنی میں ہلکے گلابی رنگ کی لہریں اس نوجوان کے بالوں کو ہر دم پریشان کرتی نظر آتی تھیں' پھر وہ کمرے کی بتی بجھا کر ٹیبل لیمپ روشن کرتی اور بالکل ایک نئی نظر اور ایک نئے زاویے سے اس تصویر کو دیکھتی جس کے چہرے کا تاثر ہی بدل جاتا' پہلے شیڈ میں اس کے چہرے پر مسکان ہوتی تو دوسرے منظر میں ایک عجیب قسم کی سوگوار کیفیت اس چہرے کا احاطہ کیے ہوئے ہوتی' پھر اسے اس کا ایک ایک نقش ازبر ہوگیا' اور وہ چہرہ اسے ایک خوبصورت نظم کی طرح از بر ہوگیا' ہاں—— وہ چہرہ جو اس کی تنہائیوں کا مونس تھا' جب رات کے سناٹے میں ہر چیز سکوت کی تہہ میں سوجاتی تو اس کی خواب گاہ کے آسمان پر یہ چہرہ چاند کی طرح طلوع ہوتا اور پھر..... ہوا کے تھپیڑے ٹینک کے پانی کی سطح پر بھنور بنا رہے تھے' اور پتوں کے جہاز آپس میں ٹکرا رہے تھے' چکرا رہے تھے' چاند کی کرنیں ان کشتیوں کے نیچے ایسے چمک رہی تھیں جیسے وہاں بہت سے دیئے جلا کر پانی میں چھوڑ دیئے گئے ہوں اور وہ ہوا کے جھونکوں میں ہجوم کی افراتفری میں ڈھل گئے ہوں' اس شام اسے راشدہ کے ذریعے ہی پیغام ملا تھا' یونی کی تصویروں کی نمائش ایک معروف آرٹ سوسائٹی کے توسط سے ہورہی تھی' راشدہ اس نمائش کی منتظمہ تھی' خود بھی ایک اچھی ناقد تھی' یونی کو یوں تو اس نے کئی برس پہلے پنڈی کے ایک عروسی اجتماع میں دیکھا تھا وہ اور راشدہ اس شادی میں شریک ہوئے تھے' وہ ان کی برادری کے ایک معروف حلقے سے تعلق رکھتے تھے لیکن گھروں میں اتنا آنا جانا نہ تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ابھی انھوں نے کچی عمر کو عبور نہیں کیا تھا' دونوں طالب علم تھے' پھر جب یونی تعلیم سے فارغ ہوا تو اس نے نہ صرف اپنے خاندان اور برادری میں بلکہ آرٹ کے قدردان حلقوں میں بھی ایک منفرد نقاش کی حیثیت سے اچھا خاصا تعارف حاصل کرلیا۔ یہ باتیں اسے راشدہ کے توسط سے معلوم ہوتی رہتی تھیں' پھر کئی سال بیت گئے اور وہ خود بھی تعلیم سے فارغ ہوگئی' ادب اور آرٹ سے اس کی دلچسپی بس مطالعے کی حد تک ہی تھی' موزونیِ طبع کے باوجود اس نے کبھی موقلم ہاتھوں میں لینے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن وہ اچھے امپریشن (IMPRESSION) کی اچھی مبصر ضرور تھی اور راشدہ کبھی کبھی تو اس کی اس صلاحیت کو دیکھ کر حیران رہ جاتی وہ یوں ہی ایک دو منٹوں میں کوئی صورت بنا کر اس کے سامنے رکھ دیتی اور اسے اس کی وضاحت کرنے کے لیے کہتی' وہ ایک نظر اس تاثر پر ڈالتی اور منٹوں میں اس کی تشریح کر دیتی' اور راشدہ حیرت سے اس کی طرف دیکھتی' اس تاثر کی اس مکمل تشریح تو اس کے ذہن میں بھی نہیں تھی' وہ تو ایسے ہی بلا تصور چند لائنیں کھینچ کر ایک شبیہ کے خطوط ابھار دیتی تھی لیکن چناں ایک ایک خط کو اپنی غیر معمولی فہم سے معانی کا جامہ پہنا دیتی اور ذوق و شوق کی یہی قدر مشترک ان کے درمیان باہمی دوستی کے فروغ کی وجہ بنی—— اور اس کے توسط سے اسے پچھلے سال اسلام آباد میں یونی سے ملنے کا موقعہ ملا' رونی بھی اس کے ساتھ تھی' اس وقت تک وہ یونی کی کچھ تصویریں بھی دیکھ چکی تھی جو راشدہ اپنے ہمراہ لائی تھی' لیکن اسے یونی سے مل کر اتنی خوشی نہ ہوئی کیوں کہ وہ بہت کمزور تھا' اس کے خدوخال میں ایک باوقار اور خوبصورت انسان کی تمام معنوی خوبیاں نظر آتی تھیں لیکن ان کے ظاہری رنگ ماند پڑ چکے تھے' راشدہ نے بتایا تھا کہ یونی چند ماہ سے بیمار ہے' کثرت مطالعہ اور روز و شب کے بے ترتیب معمولات نے اس کی صحت کو نقصان پہنچایا تھا اس لیے وہ اتنا لاغر اور کمزور نظر آرہا تھا' اپنی کسی تصویر کی طرح جس میں ابھی شیڈ نامکمل ہوں یا غلطی سے ناموافق موسم کے اثرات نے اس کے حسن کو ماند کر دیا ہو۔

وہ یونی سے بس ایک ادھوری سی ملاقات ہی کر سکی تھی' دوسری ملاقات کا پروگرام نہ بن سکا کہ اس شام اسے گھر لوٹنا تھا' پھر سال بھر اس کی ملاقات راشدہ سے ہوئی نہ یونی سے' لیکن اس نے ان دونوں کے بارے میں بہت سوچا تھا۔ راشدہ یونی کے بڑے بھائی میجر کمال سے منسوب تھی' اور میجر کسی غیر ملک میں تین ماہ کی ٹریننگ کے لیے گئے ہوئے تھے' ان کے واپس آنے کے بعد ان کی شادی ہونی تھی' اس طرح سے راشدہ ان کے گھر کی ایک فرد بن چکی تھی' اور یونس ابھی اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا' وہ ایک تعمیراتی کمپنی کا سرپرست تھا' اس میں اس کا شیئر بھی تھا' تھوڑا بہت وقت ادھر دیتا تھا اور باقی اوقات اپنے شوق اور فن کی نذر کر رہا تھا' چناں نے بے دھڑک راشدہ سے یونی کے بارے میں متعدد سوال پوچھے اور اس نے بھی اسے یونی کے بارے میں تفصیل سے بتایا اور اپنی طرف سے گفتگو کے تفصیل طلب نکات کی تشریح بھی کرتی چلی گئی۔ اس طرح یونی کا ایک مکمل نہیں تو ایک اطمینان بخش پورٹریچر اس کے سامنے آگیا۔ یونی میں اس کی غیر معمولی دلچسپی نے اسے ذہنی طور پر کچھ نہ کچھ اس کے قریب کردیا۔ اس طرح دن گزرتے گئے اور اسے راشدہ کی طرف آئے ہوئے چند ایک خطوط کے ذریعے اتنا پتہ چلتا رہا کہ یونی اب خاصا معروف ہوگیا ہے۔ وہ خاصا بلیغ اور سیر چشم ہے' محنت کرتا ہے' اور اب اس کی صحت میں تندرستی اور توانائی کے رنگ بھی نظر آرہے ہیں' پھر اس نمائش سے ایک روز پہلے اس کی ملاقات یونی سے ہوئی راشدہ اور رونی بھی ان کے ہمراہ تھیں' اس ملاقات کا پروگرام توکئی دنوں سے بن رہا تھا لیکن یونی اپنی تصویروں کی نمائش کے سلسلے میں خاصا معروف تھا اور اس کام میں راشدہ اس کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ تاہم ان کی ملاقات کا اہتمام اس اسد بلڈنگ کی آخری منزل پر ہوا جہاں یونی ٹھہرا تھا' رونی اور چناں کی باقاعدہ دعوت کے باوجود وہ ان کے یہاں صرف اس عذر کی بنا پر نہ ٹھہرا تھا کہ ان دنوں میں اسے کافی مصروف رہنا تھا اور وہ اور راشدہ ان لوگوں کے آرام میں مخل نہ ہونا چاہتے تھے خیر یہ تو ان کی اپنی منشا تھی ورنہ اگر وہ چناں کے ہاں بھی ٹھہر جاتے تو اس سے زیادہ خوشی کی اور بات اس کے لیے کیا ہوسکتی تھی' اس طرح وہ عملی طور پر خود بھی ان کی سرگرمیوں اور مصروفیات میں شریک ہوکر روحانی طمانیت محسوس کرتی لیکن راشدہ نے اتنے قریب ہونے کے باوجود یہ ضروری نہ سمجھا' چناں کو چند ایک مرتبہ اس کا احساس بھی ہوا لیکن پھر وہ یہ سوچ کر کہ ممکن ہے ان کے نزدیک گھر کا ماحول ان کی مصروفیات کے لیے سازگار ثابت نہ ہوسکتا اس نے اسے دوسرے پہلو سے نہ لیا۔ پھر بھی جب اسد بلڈنگ کی چھت پر ان کی ملاقات ہوئی تو اسے ایک عجیب سی حیرت اور مسرت کا احساس ہوا' وہ اس سے پہلے سوچتی رہی تھی کہ شاید راشدہ اور یونی اسے گھر آکر ملیں گے یا کسی باغ یا پارک میں ان کی ملاقات ہوگی۔ راشدہ نے جمعہ کے روز چند گھنٹوں کے لیے دریا پر جانے کا پروگرام بھی بنایا تھا لیکن پھر یہ پروگرام بھی التوا میں پڑ گیا۔ اور اس وقت اسد بلڈنگ کی آخری منزل کے لیے لفٹ میں سوار ہونے سے پہلے اسے گھٹن کا احساس بھی ہوا کہ یہ کیا جگہ ہوئی' پھر اسے اپنے اس خیال پر قدرے خفت کا احساس بھی ہوا کہ وہ یونہی بلا وجہ یونی کے لیے ایک غیر محسوساتی قسم کی ایجمنٹ کے بخار میں مبتلا ہوتی جارہی ہے' یہ ایک روایتی اور کرٹسی (Courtesy) وزٹ تھا' اس سے زیادہ اس کے بارے میں سوچنا قرین معقولیت نہیں ہے' لیکن رونی پرجوش تھی اور ایسے موقعوں پر وہ اس قسم کی تھرلز محسوس کیا ہی کرتی ہے' وہ بہت زیادہ باتونی تھی اپنے سے زیادہ اسے دوسروں کی فکر رہتی تھی یا پھر دل کی کہیں بڑی ہی عمیق گہرائیوں میں وہ اپنے لیے مناسب تعارف اور معاشرتی رابطے کی خواہاں تھی' بہرحال اس کے بارے میں اس نے اس سے زیادہ کبھی نہیں سوچا تھا۔

بس ایسے ہی ملے جلے خیالات کے ساتھ وہ یونی کے سامنے آئی۔ دسمبر کے دنوں کی کنکنی دھوپ نے اس منظر کو اس طرح نکھار دیا تھا کہ اسے اچانک اور غیر متوقع طور پر اس میں ایک غیر معمولی حسن محسوس ہوا' نیچے سڑکوں پر ٹریفک کا شور آخری منزل تک پہنچتے پہنچتے ایک دھمک کی مسلسل گونج میں بدل گیا تھا' تیز دھوپ نے خنکی کو اپنا وجود سمیٹنے پر مجبور کردیا تھا' دور دور نظر تک بلند و بالا عمارتوں کے ہجوم میں کہیں کہیں لوگ ایسے چلتے پھرتے نظر آتے تھے جیسے کسی خاموش فلم کے کردار۔۔ آسمان کا نیلا شامیانہ دھوپ کی چادر اوڑھے جھکا ہوا تھا اور اس لو دیتی ہوئی دھوپ کے فرش پر وہ اکھٹے ہوئے تو وہ یونی کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کی شخصیت' حسن اور وجاہت کے

ایک بالکل نئے سانچے میں ڈھل چکی تھی' یہ دھوپ یوں بھی خوبصورت چہروں کو شعلہ جوالا بنا دیتی ہے اور اس وقت ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں یونی کے چہرے کے نقوش دھوپ میں چمکتے ہوئے فطرت کے کینوس پر ایک بڑا ہی حسین اور دلاویز امپریشن (Impression) پیش کر رہے تھے اور اس وقت اسے یکدم اپنے ذہن میں ایک بڑی ہی عجیب اور پر اسرار قسم کی آہٹ کا احساس ہوا' یہ صورت تو اس کی بہت ہی جانی پہچانی ہے۔ بے شک وہ صورت اس کی جانی پہچانی تھی سال بھر پہلے اس نے اسے پنڈی میں دیکھا تھا' اب یونی کے چہرے کے نامکمل خدوخال اپنی جمالیاتی تکمیل کے مراحل طے کر کے زیادہ دلاویز اور حسین ہوگئے تھے' لیکن چناں کے اندر سے آنے والے اس جواب سے اس کی تشفی نہ ہو سکی۔ پھر ایک مرتبہ اور اسے اپنے ذہن کی وسعتوں میں ایک گونج اور عجیب سی آہٹ کا احساس ہوا اور اس کی نظریں آسمان کی وسعتوں میں محو پرواز پرندوں کی طرف اٹھ گئیں جو اس بلند و بالا عمارت کی آخری منزل کی کھلی چھت پر تنہا اس ملاقات کو دلچسپی اور شوق کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی چناں کا دھیان اپنے کمرے کی چھت کی طرف پلٹ گیا اور وہ پوٹریٹ اس کی آنکھوں کے سامنے پوری تفصیل کے ساتھ آگئی جس میں زندگی اور حرکت کا ایک عجیب تاثر اس نے دیکھا تھا' وہ پوٹریٹ ہو بہو یونی کی صورت سے مشابہہ تھی کیا اس کے تصور نے سال بھر پہلے دیکھے ہوئے یونی کے چہرے کو اپنے خیالات کے حسن اور صحت سے مکمل کیا تھا جو اس لمحے اس کے چہرے پر نظر آرہی تھی! چند لمحوں کے لیے اس کی دھڑکن کے چند بیٹ الجھ گئے' پھر ایک خوشگوار حیرت نے اس کے ذہن کو اپنی لپیٹ میں لے لیا' عجیب اتفاق تھا' یہ اتفاقات بھی ستاروں کی سی بازی گری دکھاتے ہیں' پھر اس نے یونی کے چہرے پر مسرت کے خمار میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ دیکھی اور اس کے ساتھ ہی اس کی آواز سنائی دی

"یہ کون ہیں"؟ اس کا اشارہ رونی کی طرف تھا۔ یہ سوال چناں کے لیے بالکل غیر متوقع تھا اس نے قریب ہی کھڑی راشدہ کو خیر سگالی کا جسچر دیتے ہوئے رونی کی طرف "دیکھا آپ شاید پہلے ان سے مل بھی چکے۔ہیں' جی وہ آپ نے اخباروں کے ضمیمے اور سپلیمنٹ دیکھے ہوں گے' اگر نہیں دیکھے تو پر تکلف دعوتوں میں سویٹ ڈشیز ضرور دیکھی ہوں گی بلکہ چکھی ہوں گی انھیں بس اسی قبیل کی کوئی چیز فرض کر لیں" یونی اس طرح ہنسا کہ بس ایک لمحے کے لیے اس کے ہونٹ کھلے پھر مسلسل مسکراتے ہوئے بولا" یہ فرض کر لینے والی بات تو نامکمل ہے۔۔ ہم تو یقین کر لینے پر ایمان رکھتے ہیں' یاد آگیا' یہ ان دونوں خاصی دبلی تھیں"

"آپ بھی تو ان دنوں اب سے آدھے تھے" رونی کو بھی بروقت جواب سوجھ گیا اور چاروں نے بیک وقت ایک گندھا ہوا گلدستہ نما قہقہہ لگایا جس میں ان کی انفرادی مسرت آفریں آوازوں کے رنگ بکھرے ہوئے تھے "آپ نے ٹھیک کہا ان دنوں میں فارم میں تھا' اب کچھ فربہی کا شکار ہوگیا ہوں!"

"آپ کے نزدیک خدا معلوم فارم اور اسمارٹنیس کا تصور کیا ہے؟" رونی نے کہا

"یہ شاید کہنا چاہتے ہیں کہ ان دنوں ایک ہی نظر میں پہچانے جاتے تھے کہ یہ آرٹسٹ ہیں' اب نوخیز سے ایتھلیٹ دکھائی دیتے ہیں" چناں نے کہا۔

"کیا ایتھلیٹ آرٹسٹ نہیں ہوتے؟" رونی نے راشدہ کو بولنے کا موقع نہ دیا جو کچھ کہنے کے لیے پر تول رہی تھی۔

"ہوتے ہیں مگر فنون لطیفہ کے نہیں!" چناں نے ایک لمحے کے لیے رونی کو بہت ہلکا اور مختلف سا تاثر دیا جو اس کے سر کے اوپر سے گزر گیا۔

"آپ کا خیال کسی حد تک درست ہے' اگر انسان روزانہ اپنا چہرہ آئینے میں دیکھنے پر مجبور نہ ہوتا تو غیر ضروری فربہی اس کے لیے اتنی ناپسندیدہ چیز نہ ہوتی' موٹاپا انسان کے خدوخال سے ان کی لطافت اور تیکھا پن چھین لیتا ہے"

"آپ کا مطلب ہے ایک آرٹسٹ کے جسم کو گوشت سے زیادہ پوست سے سروکار رکھنا چاہیے!" رونی کی بات پر پھر ایک مشترکہ قہقہہ گونجا جس پر یونی کی تیرتی ہوئی آواز سنائی دی "مگر اتنا بھی نہیں!" اور چناں نے صاف طور پر دیکھا' یونی کی آنکھیں بالکل واضح طور

پر چناں کے چہرے کے نقوش میں اپنے پسندیدہ خطوط کو تحیر وارفتگی سے دیکھ رہی تھیں۔

"لیکن جی آپ پالرک کو تو بھول ہی گئے۔ ان کی جسامت، وزن اور خوراک کے بارے میں حقائق جان کر آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ فنون لطیفہ کا قربی سے کتنا گہرا تعلق ہے" راشدہ نے کہا' پھر ان تمہیدی اور غیر مقدی مکالمات کے بعد جانے وہ کس وقت بکھر گئے۔ راشدہ نے روفی کو اپنے ساتھ تصویری فریموں کی پالش اور صفائی کے لیے اچک لیا اور وہ دونوں تنہا چھت کے وسط میں کھڑے آرٹ اور ادب کے بارے میں فکر خیز باتوں میں الجھ گئے۔ چناں تجریدی ابلاغ کی بے حد مداح تھی' لیکن یونی آرٹ کے زیادہ سے زیادہ اسالیب کو موضوع فکر بنانے کو ایک ناگزیر ضرورت سمجھتا تھا۔ بصورت دیگر آرٹ کو ایک محدود کینوس کے پنجرے میں محبوس کرنے والی بات تھی۔

"لیکن تجریدی ابلاغ آرٹ کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ شعبہ ہے' ایک ناگزیر اسلوب ہے اس کے صحیح سیاق و سباق میں نہیں سمجھا گیا' خصوصاً مشرقی ممالک میں۔۔ اس کے سینکڑوں' لاکھوں' ذیلی اسالیب پر کام کیا جاسکتا ہے' سائنس کے علاوہ اس کے ان گنت پہلوؤں کی زبردست اہمیت کو ابلاغ میں منعکس کرنے کی اشد ضرورت ہے"

"لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس اسلوب کو اپنانے والے سچے اور نیک نیت ہوں اور محض Distortion کو ہی اپنے فن کی امتیازی خصوصیت بنانے پر مصر نہ ہوں' کسی بھی آرٹسٹ کا ہمیشہ ایک موڑ یا ایک نظریہ نہیں ہوتا' یا برقرار نہیں رہتا کیوں کہ زندگی مثبت اور منفی عناصر کا ایک مجموعہ ہے' ایک وقت پر یہ کسی چیز کا اثبات کرتی ہے تو دوسرے وقت اسی قسم کی conditions میں اسکی نفی بھی کردیتی ہے۔ ہمیں صرف ایک ہی رخ سے دیکھنے پر اصرار نہیں کرنا چاہیے اور پھر جمالیاتی اقدار کے انعکاس کی کچھ بنیادی اور ناگزیر ضروریات ہیں جنھیں نظرانداز کرنا فائن آرٹس سے انصاف نہ کرنے کے مترادف ہے"

اور چناں تجریدی ابلاغ کی اہمیت کو موجودہ عہد کی عدم توازنیت۔۔ ہمہ گیر پراگندگی کے تناظر میں دیکھتے ہوئے اس بات پر مصر رہی کہ ایک منفرد تجرید کار ملکوں اور معاشروں کے انتہائی گھناؤنے مکروہات کو ایک زندہ نقش میں سمو سکتا ہے اور اسے کیمونیکیٹ بھی کرسکتا ہے اور اس غیر منصفانہ احتساب سے بھی محفوظ رہ سکتا ہے۔ جو بلا واسطہ اپروچ کی صورت میں اسے گردن زدنی قرار دے سکتا ہے' بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کے برعکس وہ معاشرے سے خراج تحسین وصول کرنے کا مستحق بھی ٹھہر سکتا ہے

"لیکن زندگی محض مکروہات سے عبارت نہیں' اس کے سینکڑوں ہزاروں صحت مند اور خوبصورت پہلو بھی ہیں جنھیں ابلاغی حسن کی ضرورت ہے اور انھیں عصری ادوار کے حوالے سے محفوظ کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ دوسرے پہلوؤں کو۔۔۔۔" یونی نے کہا اور دونوں بالآخر اس مقام پر آپہنچے کہ چناں کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ ہر آرٹسٹ کو اپنے اپنے اسلوب پر کام کرنے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کا حق ہے۔ وہ اپنے اسلوب کا ماہر ہوسکتا ہے' اس میں تحقیق و ابلاغ کی نئی سے نئی راہیں تراش سکتا ہے' وہ متعصب نہیں ہوسکتا اور اپنے اسلوب کے دفاع میں دوسرے اسالیب کو مسترد کرنے کا استحقاق ہرگز نہیں رکھتا البتہ انفرادی طور پر وہ کسی تخلیق کو اختلافی نقطہ نظر سے دیکھتے ہوئے اس کے معیار ابلاغ کو تنقید کا نشانہ بنا سکتا ہے"

"اور پھر یونی نے اسے ونسی کی Renunciation کی یاد دلائی اور وہ ابھی چناں کے خطوط کا اس لازوال نقوش کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تصویر سے موازنہ کر ہی رہا تھا کہ راشدہ اور روفی ان کے بالکل قریب ہی آکھڑی ہوئیں۔ چناں کے لیے اس لمحے اپنے ذہن کو مختلف قسم کے خیالات سے خالی کرنا ممکن تھا اس لیے خاموش ہوگئی۔ البتہ تھوڑی دیر کے بعد اسے یقیناً یہ محسوس ہوا کہ یونی نے اس مختصر وقت کی رفاقت میں اسے جو پہنچانا تھا' پہنچا دیا ہے' وہ دونوں نمائش میں آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوئیں۔

اور پھر چند ہی ملاقاتوں میں وہ اتنے قریب آگئے کہ یونی نے اسے اپنی زندگی کا ابدی حصہ قرار دیتے ہوئے اسے مستقل رفاقت کی پیشکش کی' جس کا جواب نہ تو چناں کے پاس تھا اور نہ ہی آنٹی راحیلہ کے پاس' اور یہ گیند تازی کی صوابدید کے کورٹ میں تھی' یہ بات سب کو معلوم تھی' خود یونی کو بھی' لیکن اس نے آنٹی راحیلہ کو یہ ضرور کہا کہ شادی بیاہ کا مسئلہ گھر بسانے اور اولاد پیدا کرنے کا مسئلہ

نہیں ہوتا' اس کے ساتھ ساتھ خیالات اور اعتقادات کی ہم آہنگی' ایک جیسے جذبے' ایک جیسے موڈ اور ایک جیسے رویے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور عورت اور مرد کی باہمی رفاقت میں دراصل انہی باتوں کو اولیت حاصل ہونی چاہیے' لیکن یہ استدلال روایتی اور فرسودہ تھا' خاندان کی مستقل اور طے شدہ اقدار کے سامنے اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی' پھر یہ بات پھیلتے پھیلتے برادری کے چند قریبی گھرانوں تک پہنچ گئی' اور ممتاز تک بھی' تازی یوں تو اسی شہر میں تھا لیکن اپنے کاروبار کے سلسلے میں مختلف شہروں کے دورے کرنا اس کا معمول تھا اس لیے اسے آنٹی راحیلہ کے یہاں آنا بس ایک دورے کی طرح لگتا تھا' بس چند منٹ کے لیے آیا اور چلا گیا اور ابھی تھوڑی دیر پہلے چناں اور آنٹی کو فون پر اطلاع ملی تھی کہ صبح تازی میاں آئیں گے اور ان کے ساتھ ان کی والدہ اور بہنیں بھی ہوں گی...

اور ٹینک میں پتے اور پھول ہوا کے تھپیڑوں کی مار کھاتے کھاتے کناروں سے چپک رہے تھے' ان میں سے بہت سارے ڈوب کر ٹینک کی تہہ میں بیٹھ گئے تھے' پانی کی سطح کا وسطی حصہ خالی ہو گیا تھا' اور اب اس میں چاند کا عکس اس طرح ڈول رہا تھا' جیسے پارے کی طرح کا وجود ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہا ہو اور کسی مقناطیسی کشش سے دوبارہ سالمیت اختیار کر کے پھر ٹکڑے ٹکڑے ہوا جارہا ہو' چناں نے ٹوٹے شکستہ پتوں کو دیکھا جو بھیگ کر سہمے ہوئے جانداروں کی طرح ٹینک کے کناروں سے لپٹ لپٹ کر رو رہے تھے' اسی لمحے اس نے اپنے عقب میں گھاس پر پھیلے ہوئے خشک پتوں کے چرچرانے کی آواز سنی' اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا' تازی کھڑا تھا' چناں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن تازی نے اسے منع کر دیا۔ پھر ٹینک کے کنارے مرمری سل پر فراغت سے بیٹھتے ہوئے بولا

"میں نے آنا تو صبح تھا لیکن تھوڑی دیر پہلے گھر میں میرے اور تمھارے بارے میں چند ایسی باتیں ہوئیں جن کی وجہ سے میں نے کل امی کے ساتھ آنے کا ارادہ فی الحال ملتوی کر دی' پھر سوچا اس سے کوئی غیر یقینی فضا نہیں پیدا ہونی چاہیے اس لیے چلا آیا۔۔ میرے گھر والوں کو ہی نہیں اب سب کو تمھارے اور یونی کے افیئر کا علم ہو چکا ہے.... میں تمھیں صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ ان خبروں سے میری حوصلہ شکنی ہرگز نہیں ہوئی!"

"کیوں؟" چناں نے اپنا ہاتھ پانی میں ڈال دیا" میرا تو یہ خیال تھا کہ تازی تم کوئی فیصلہ کن بات کرنے کے لیے آ رہے ہو!"

"لیکن میری اور تمھاری قسمت کا فیصلہ تو مدت ہوئی ہو چکا ہے' اور پچھلے پندرہ بیس سالوں میں آنٹی اور انکل کے علاوہ تمھاری زبان سے بھی میں نے ابتک یہ نہیں سنا کہ تمھیں یہ رشتہ منظور نہیں ہے' البتہ آنٹی کی طرف سے کئی بار شادی کے دن رکھنے پر ضرور اصرار ہوتا رہا ہے جس کے جواب میں انہیں تاخیر کی معقول وجہ بتائی جاتی رہی ہے اور اب اگر آپ لوگوں کی طرف سے بریچ آف ٹرسٹ ہوتا ہے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی میں اپنے فیصلے پر قائم ہوں اور ہمیشہ رہوں گا"

"یہ جان لینے کے بعد بھی کہ میں نے یونی کو اپنا لائف پارٹنر چن لیا ہے"

"کیا میں تم سے یہ پوچھ سکتا ہوں کہ ایک شریف انسان سے منسوب ہونے کے بعد آپ نے یک طرفہ طور پر یہ فیصلہ کیسے کر لیا!"

"میری اور تمھاری باقاعدہ منگنی تو نہیں ہوئی تازی۔۔ اور پھر اگر کوئی ایسی بات ہوئی بھی ہے تو مجھے تم پر اعتماد تھا کہ اپنے خاندان کا فرد ہونے کی حیثیت سے تم میرا فیصلہ قبول کر لو گے۔ جب ہمارے راستے مختلف ہیں' خیالات اور پسند ناپسند کے معیاروں میں بھی کوئی یکسانیت نہیں تو پھر ہم اکٹھے زندگی کیسے گزار سکتے ہیں"

"اس حقیقت کا انکشاف تو ابھی مجھ پر ہوا ہے' اس سے پہلے تو کسی نے مجھ سے یہ نہیں کہا کہ اپنا فیصلہ بدل دو اور پھر یہ میرا فیصلہ کب ہے' بزرگوں کا ہے۔۔"

"لیکن اگر بزرگ اس زبردستی کے بندھن کو ختم کرنے پر رضامند ہو جائیں تو کیا تم اسے قبول کر لوگے!"

"ہرگز نہیں' میں اس مفروضے کی بنا پر کہ تم اور یونی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اپنا فیصلہ بدلنے کے لیے تیار نہیں ہوں کیوں کہ تم میری منگیتر ہو' منگنی اور بیاہ ایک عہد ہی تو ہوتا ہے' اسے کسی عملی رسم میں تول دیا جائے یا زبانی بات کہہ دی جائے اس کا ایک

ہی مفہوم ہوتا ہے"

"یہ آپ نے عہد عہد کی کیا رٹ لگا رکھی ہے' یہ کوئی وار پیکٹ نہیں ہے' چند رسمی ملاقاتوں کے سوا میرے یا تمھارے لیے ایک دوسرے کو قبول کرنے کے لیے اور کچھ بھی تو نہیں ہے' میں ہمیشہ تمھارے اور اپنے درمیان ایک عجیب قسم کا ذہنی بعد محسوس کرتی رہی ہوں' رہی ممی کی بات تو آجتک میرے اور ان کے درمیان کسی پوائنٹ پر اتفاق رائے نہیں ہوا' یوں وہ ماں ہیں جو چاہے فیصلہ کرسکتی ہیں لیکن میں تمھیں صاف صاف بتا دینا چاہتی ہوں تازی' میرے اور تمھارے درمیان ازدواجی زندگی کے باہمی اشتراک کی کوئی قدر مشترک نہیں ہے!" تازی جو ابتک کچھ دبا دبا محسوس کر رہا تھا' ایک دم واضح ہوگیا "میرے بارے میں تم نے یہ رائے اس لیے قائم کی ہے کہ میں نے تم سے اظہار محبت نہیں کیا۔ تمھاری شان میں رومانی شاعروں کے حوالے سے خوبصورت جملے نہیں کہے' چناں میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں ایک پریکٹیکل آدمی ہوں' عملی زندگی کے میدان میں قدم رکھنے سے پہلے میں نے بھی عشق اور محبت' ادب اور آرٹ کی دنیا کی ہواؤں کا ذائقہ چکھا تھا' لیکن جلد ہی مجھے محسوس ہوا کہ ان تمام مشاغل میں ایک خمار آلود دلکشی تو ضرور ہے لیکن اس کی تہہ میں کچھ بھی نہیں ہے زندگی صرف خوبصورت باتوں اور خوابوں سے عبارت نہیں' اس کا لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے بڑے ٹھوس فیصلے کرنے پڑتے ہیں"

"تم نے خود ہی اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ تم زندگی کو تجارتی نقطہ نظر سے دیکھتے ہو!"

"تو کیا کوئی شخص زندگی کے اس پہلو سے جو دراصل زندگی کا سب سے اہم اور مثبت پہلو ہے انکار کر سکتا ہے!"

"یقیناً ایسا شخص انکار نہیں کرسکتا جسے کوئی اقتصادی یا معاشی مسئلہ درپیش ہو۔ یوں ان لوگوں کو تو یہ مسئلہ درپیش رہتا ہی ہے جو اپنی زندگی کو پیسے کی دھوپ چھاؤں میں بسر کرنے کے عادی ہوتے ہیں' ان کی ہوس زر کبھی ختم نہیں ہوتی' وہ نازک سے نازک جذبے اور رشتے کو زر کے ترازو میں تولتے ہیں' خود اعتمادی سے عاری اور عدم تحفظ کے خوف میں مبتلا ایسے لوگ میرے نزدیک زندگی کے دشمن ہیں' ایسے لوگوں کے درمیان چل پھر کر میرا دم گھٹنے لگتا ہے"

وہ بڑی گہری نظروں سے کھڑا اسے دیکھتا رہا' پھر مسکرا دیا' چناں نے اس کی مسکراہٹ کو بڑی حیرت سے دیکھا' لیکن خاموش رہی' پھر وہ یکلخت سنجیدہ ہوگیا "چناں تم نے ایک ہی جملے میں یونس سے محبت کا اقرار تو کر لیا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ تمھیں یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اس لفظ کا صحیح مفہوم کیا ہے!"

"شکریہ' مجھے اس کا مفہوم سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے!"

"لیکن میں تم سے اس کا مفہوم سمجھنا چاہتا ہوں اور یہ میرا حق ہے کیوں کہ تم نے ایک عہد نامے کو معطل کیا ہے"

"آپ تو الہامی کتابوں کی زبان بول رہے ہیں" وہ بیزار سی ہوگئی' "ویسے آپ کی اطلاع کے عرض کررہی ہوں کہ یہ عہد نامہ جس میں میری اخلاقی رضامندی شامل نہیں تھی میرے نزدیک تو Valid ہی نہیں تھا۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا"

"یہی بات میں اپنے بارے میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ اس عہد نامے کا ایک فریق ہونے کے باوجود مجھ سے اسکی تصدیق حاصل نہیں کی گئی۔ یہ دو خاندانوں کا عہد نامہ تھا جس کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہوئے بھی ہم دونوں کئی برس تک خاموش رہے جس کا مطلب یہ تھا کہ ہم دونوں نے اسے انڈورس Endorse کر دیا ہے' اس سے پیشتر کہ یہ دونوں خاندانوں کے درمیان وجہ نزاع بنے ہم دونوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اپنے طور پر اس پر تبادلہ خیال کر کے کسی حتمی نتیجے پر پہنچ جائیں' اگر ہم دونوں نفی یا اثبات کے کسی مقام پر اتفاق رائے کرلیں تو ہمارے بزرگ ایک بہت بڑے صدمے یا بحران کا سامنا کرنے سے بچ جائیں گے"

"پہلے آپ الہامی زبان میں بات کر رہے تھے اب آپ قانون دان بننے کی کوشش کر رہے ہیں' حالانکہ بات سیدھی سی ہے کہ ایک ایسی زبانی کلامی نسبت کو جس میں میری رضا مندی شامل نہیں تھی اور کسی حد تک آپ کو بھی اس معاملے میں رائے دینے سے محروم

رکھا گیا تھا بدلے ہوئے صحیح حالات کے آئینے میں دیکھتے ہوئے Null and void قرار دے رہی ہوں، میں سمجھتی ہوں کہ یہ فیصلہ کرتے ہوئے میں اپنے آپ سے ہی نہیں آپ کے ساتھ بھی پورا پورا انصاف کر رہی ہوں، اب رہی محبت کے مفہوم کی بات تو میں آپ کو بتادوں کہ مجھے یونی سے جناتی قسم کی محبت نہیں ہے، نہ وہ رومیو ہے اور نہ ہی میں جولیٹ، بس میوچل انڈر اسٹینڈنگ کی بات ہے یہ کوئی جرم نہیں ہے!"

"ماڈرن لوگ محبت کو میوچل انڈر اسٹینڈنگ ہی کہتے ہیں لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یونی سے ذہنی وابستگی کے بعد اگر آپ کسی تیسرے شخص سے متاثر ہو کر میوچل انڈر اسٹینڈنگ پر مجبور ہو گئیں تو اپنی ناموس کا کیا بنے گا؟ آپ کی طبیعت کو دیکھتے ہوئے ایسے امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا!" چناں کانوں تک سرخ ہوگئی "تازی تم میری انسلٹ کر رہے ہو، میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ یونی کو اپنے خیالات میں ایک مخصوص مقام دینے سے پہلے میں نے کسی اور مرد کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا، میں تمہارے بارے میں کبھی سیریس نہیں تھی"

"تو تم نے اس کا اظہار کیوں نہیں کیا؟"۔

"یہ ضروری نہیں تھا اور خاص طور پر ایک مخصوص قسم کے ذہنی اور جذباتی تجربے سے گزرنے سے قبل تو ہرگز نہیں تھا، اگر بقول خود تم میرے بارے میں اتنے ہی سنجیدہ تھے تو تم نے مجھے اپروچ کیوں نہیں کیا، میری ذات میں دلچسپی لینے کی کوشش کیوں نہیں کی، تم نے مجھے اپنے سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت کو کیوں نظر انداز کیا، میں ایک گائے تو نہیں تھی کہ جب کوئی چاہے میرے گلے میں رسہ ڈال کر گھسیٹتا ہوئے لے جائے اگر تم واقعی مجھے اپنی منسوب تصور کرتے تھے تو تم نے میری حفاظت کیوں نہیں کی؟"

"چناں تم مجھے بچہ نہ سمجھو۔۔ مجھ سے منسوب ہونے کے بعد تمہیں کسی جنگل میں نہیں چھوڑ دیا گیا تھا کہ میں تمہارے پیچھے رسہ لیکر بھاگا پھرتا، تم اپنے خاندان، اپنے والدین کی پناہ میں تھیں، اور میں نے بارہا دیکھا تھا کہ یہ زبان جو آج میرے سامنے قینچی کی طرح چل رہی ہے آنٹی راحیلہ کے سامنے اس طرح خاموش ہوتی تھی جیسے تمہارے منہ میں اس کا کہیں وجود ہی نہ ہو، ان حالات میں اور کیا سوچ سکتا تھا، یہی نا کہ تم مشرقی روایات کی پروردہ لڑکی ہو، میری شرم نے اس کو گوارا نہیں کیا کہ تمہیں چوروں کی طرح ملتا۔۔ خاص طور پر ان حالات میں جب کہ تم میرے لیے کوئی غیر نہ تھیں، اپنے ہی خاندان کی ایک فرد ہو، اور میں اس محبت۔۔ معاف کرنا میوچل انڈر اسٹینڈنگ کو دائمی رفاقت کی بنیادی ضرورت نہیں سمجھتا خاص طور پر ان حالات میں جب دو خاندانوں کے بزرگوں نے بقائمی ہوش و حواس اسے Arrange کیا ہو، وہ لوگ اپنی اولاد کے دشمن نہیں ہوسکتے، ان حالات میں میرا صرف یہ فرض تھا کہ اپنی ازدواجی زندگی کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ وسائل مہیا کروں، اپنے اور تمہارے مستقبل کو تحفظ فراہم کروں، اس کے لیے میں نے دن رات کام کیا، اس جدوجہد کے دوران تم کسی لمحے میرے خیالات سے اوجھل نہیں ہوئیں میں نے جب بھی دنیوی آرام و آسائش کے کسی نئے زینے کی طرف قدم بڑھائے تمہارے قدموں کی چاپ میرے قدموں کی آواز میں شامل تھی، آج جب میں اپنی محنت اور جدوجہد کے خوبصورت ایوان کے سامنے کھڑا تمہاری تحسین آفرین مسکراہٹ کا منتظر ہوں تم میرے چہرے پر ایک سنکی، واہموں کے پرستار نام نہاد آرٹسٹ کا سیاہی میں لتھڑا ہوا برش پھیر کر اسے مسخ کر دینا چاہتی ہو، آئی ڈونٹ بی لیو ان I dont belive in love —— کتابوں نے مجھے بتایا ہے کہ محبت ایک مستقل جذبہ ہوتا ہے، لیکن میں نے ایسا محسوس نہیں کیا، اور کوئی بھی شخص جو اپنی ذہنی اور جذباتی کیفیات کا تجزیہ کرنے پر قادر ہو، روایتی قسم کی محبت کو غیر معمولی اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں ہوسکتا۔ میرے نزدیک محبت گھریلو زندگی کی آرائش تکمیل، تعمیر اور متعلقہ انسانوں کی خوشیوں اور مسرتوں سے عبارت ہے، محبت دو انسانوں کے درمیان خوبصورت اور خیالی باتوں کے تبادلے میں حاصل کیے ہوئے ناپائیدار خوابوں کا نام نہیں، محبت کا چراغ آنسوؤں یا نشین تمنّاؤں سے روشن نہیں ہوتا اسے جلانے کے لیے انتھک جدوجہد اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے، زندگی کی آرائش خوشحالی سے

ہوتی ہے' اور خوشحالی اور مستقبل کا تحفظ حاصل کرنے کے لیے انسان کو سنگلاخ حقائق سے آنکھیں دوچار کرنی پڑتی ہیں اور یہ کوئی آسان کام نہیں ہے!" وہ خاموش ہوگیا' لیکن ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے باقی ماندہ خیالات اس کے جسم میں اتر گئے ہیں اور وہ انھیں بھوئی اور وجدان کے کانٹوں کے ساتھ مچھلیوں کی طرح شکار کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

"کیا تم نے اپنی بات ختم کر لی ہے تازی؟"

"نہیں' میں اس کے آغاز کے لیے موزوں الفاظ سوچ رہا ہوں' اور میں تمھیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اب مجھے تمھارے جواب سے بھی کوئی سروکار نہیں ہے کیوں کہ میں تمھارے خیالات کی گہرائیوں تک رسائی حاصل کر چکا ہوں' اور پورے یقین کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تمھارے جیسی لڑکی کو مجھ ایسے پریکٹیکل مرد کی ضرورت ہے۔ دوسری صورت میں تمھارے بھٹکنے اور بکھرنے کے صد فیصد چانسز ہیں' اپنے اور تمھارے لیے میں نے جو ایوان تعمیر کیا ہے میں اس میں آرٹ اور ادب کی کتابوں پر مشتمل ایک نایاب لائبریری کا اضافہ کروں گا' میں جانتا ہوں کہ تم آرٹ کی قدردان ہو' میں تمھیں دوسروں کی بنائی ہوئی تصاویر کی پرستش کرنے کی اجازت دینے کے بجائے خود تمھارے ہاتھ میں موقلم دوں گا اور تمھارے ذوق کے کینوس کے لیے قوس قزاح کے رنگ مہیا کروں گا' اس لئے نہیں کہ میں تمھارا عاشق ہوں یا تم میری محبوبہ ہو' بلکہ اس لیے کہ تم میری شریک حیات ہو جس کے لیے سوسائٹی اور گھر میں عزت' وقار اور پاکیزگی کی دولت مہیا کرنا میری اپنی عزت اور سربلندی کے مترادف ہے میں نے خدا کی کسی نعمت کے لیے دوسروں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے نہیں دیکھا' بلکہ ہمیشہ یہ سوچا ہے کہ میری تدبیر میرے لیے یہ نعمت مہیا کیوں نہیں کرسکتی۔۔ اور بالآخر میں اس نعمت کو حاصل کر لیتا ہوں' ان حالات میں' میں کبھی سوچ ہی نہیں سکتا کہ میرے دائرہ اختیار میں پڑی ہوئی کسی چیز کو کوئی انسان میلی نظر سے دیکھنے کی جرات بھی کر سکے تاوقتیکہ وہ کردار و عمل میں مجھ پر ناقابل شکست فوقیت نہ رکھتا ہو' یہ خالی میری ذات یا دونوں خاندانوں کی ناموس کا سوال ہی نہیں ہے' میرے لیے ایک چیلنج بھی ہے۔۔ ان حالات میں اگر تمھارے پاس یونی کے حوالے سے باہمی افہام و تفہیم یا ذاتی پسند ناپسند جیسے فرسودہ الفاظ پر مشتمل جملوں کے علاوہ کوئی بات ہے تو وہ میں سننے کے لیے تیار ہوں' لیکن بات پائیدار ہونی چاہیے میرا آخری جملہ یہ ہے کہ میں نے اپنے اور تمھارے چہرے کے نقوش کو مدغم کر کے ایک بڑا خوبصورت پورٹریٹ تخلیق کیا ہے' جس میں تمھاری حیثیت Colours کی ہے' اس کا عنوان ازدواجی زندگی ہے' یہ نام حسین نہیں' پرانا فرسودہ نام معلوم ہوتا ہے لیکن ہماری جیتی جاگتی ازدواجی زندگی خوابوں سے کہیں زیادہ حسین ہوگی"

چناں یہ جانتی تھی کہ تازی سے جان چھڑانی اتنی آسان نہیں ہوگی' وہ اس کے بارے میں کافی کچھ جانتی تھی اور خصوصاً یہ بات اس کے علم میں تھی کہ دونوں خاندانوں کے بزرگ اس کی زبردست قوت استدلال کے قائل تھے' آج سے پہلے اسے کبھی تازی سے ایسی تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں ملا تھا' آج اس نے اپنے کانوں سے اس کی باتیں سن لی تھیں اور اب وہ سوچ رہی تھی کہ اس کی باتوں کے جواب میں اس کے پاس کہنے کے لیے واقعی کوئی ٹھوس بات نہیں تھی۔ اگر وہ اس سے منسوب نہ ہوتی اور وہ اس کے اپنے خاندان کا فرد نہ ہوتا تو وہ اسے لمحوں میں جھٹک کر الگ کر دیتی لیکن اب اسے یہ بات اتنی آسان نظر نہیں آرہی تھی' اس کے ساتھ ہی اسے اپنے جسم میں سنسنی سی محسوس ہوئی' وہ خود کو شکست خوردہ سی محسوس کر رہی تھی اس سے پہلے وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تازی اس کے راستے کی کوئی ایسی دیوار ثابت ہو سکتا ہے جسے گرانا یا پھلانگنا اس کے بس کی بات نہ ہوگی۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ کسی حیلے بہانے سے اسے ٹرخا دے' وہ یہ سمجھتی تھی کہ وقتی طور پر لاینحل نظر آنے والے مسائل کو جوں کا توں رہنے دیا جائے تو وقت خود بخود اپنے فطری بندوبست سے ان کا کوئی ممکنہ حل سامنے لے آتا ہے یا کم از کم سمجھا دیتا ہے لیکن پھر اس نے سوچا کہ وہ تازی کو اگر ابھی اور اسی لمحے سیدھے ٹریک پر نہ ڈال سکی تو اس کا حوصلہ بلند ہوجائے گا' وہ خود کو کارنرڈ (Cornered) سی محسوس کر رہی تھی اور اسی بات نے اسے اندر ہی اندر کھولا دیا۔

"میں تم سے کہہ چکی ہوں تازی کہ یہ اپنی اپنی پسند کی بات ہے۔۔۔ زبردستی کی بات نہیں ہے۔۔۔ میں تمہیں صاف صاف بتا دینا چاہتی ہوں کہ اس طرح میرے اعصاب پر سوار ہو کر تم مجھے خوف زدہ نہیں کرسکتے اور نہ ہی مجھے اپنا فیصلہ واپس لینے پر مجبور کر سکتے ہو"

"اگر تم اسے میری زبردستی کہتی ہو تو میں تمہاری اس عہد شکنی اور ہٹ دھرمی کو کیا نام دوں جس کا تمہارے پاس کوئی جواز نہیں ہے"

یہ سن کر وہ بھڑک اٹھی اگر یہ ضد ہے تو پھر ضد ہی سہی' مجھے تم سے کوئی سروکار نہیں ہے مہربانی کر کے آئندہ تم مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

"اچھا۔۔ اگر یہ ضد ہے۔۔ محض ضد۔۔ تو میں اسے رضا مندی میں بدلنے پر نہ صرف قادر ہوں بلکہ اس کا استحقاق بھی رکھتا ہوں" اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا' چند لمحے تالاب کی سطح پر رقص کرتی ہوئی چاندنی کے مضطرب ٹکڑوں کو دیکھتا رہا پھر پائیں باغ کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا' چند منٹ بعد گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ غیر ارادی طور پر چناں کا ہاتھ ٹینک کے مرمریں چبوترے کے اوپر رکھے ہوئے ایک آرائشی پیالے سے ٹکرایا' جو ٹینک میں گر گیا۔ چند لمحے پانی کی سطح پر طوفان سا بپا رہا پھر سوکھے پتوں کی کشتیاں ہلکورے کھاتی کناروں کی طرف بڑھنے لگیں' وہ دائروں میں بٹی ہوئی لہروں کو غور سے دیکھتی رہی' دیکھتی رہی اور اس دوران ایک نیند میں بوجھل بھاری آواز اسے سنائی دی۔

"تم اتنی رات گئے یہاں کیا کر رہی ہو۔۔؟"

اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا' اس کی ممی اسے حیرت بھری نظروں سے تک رہی تھیں

یونی کی تصویروں کو بہت سراہا گیا تھا اور اخباروں میں بھی اس کا کافی چرچا ہوا تھا' اس نمائش کے لیے اس نے عجلت میں بھی چند بڑے خیالات کو کینوس پر اتارا تھا' اس لیے اب وہ ایگزاسٹ سا' تھکا تھکا سا لگ رہا تھا لیکن چناں نے دیکھا کہ اس کا مورال بلند تھا بلکہ پہلے سے بھی بلند ہوگیا تھا' اب اس میں بھرپور خود اعتمادی اور ذمہ داری کے احساسات نمایاں تھے۔ اس روز راشدہ نے بطور خاص انھیں چنبیلی پارک میں تنہائی میں ملنے کا موقعہ دیا تھا' وہ ضروری کام کا بہانہ کر کے چلی گئی تھی' نہر کے کنارے گھنے درختوں کے نیچے بیٹھے وہ بہت دیر تک شفاف پانی میں ڈبکیاں لگاتی ہوئی رنگین چڑیوں کا نظارہ کرتے رہے' چاروں اور سبزے اور بارش کی خوشبو بسی ہوئی تھی' بارش بہت دنوں سے ہوئی تو نہیں تھی' لیکن آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا رہتا تھا۔ تقریبا روزانہ ہی ہواؤں میں بارش کا خاموش سا پیغام ملتا' لیکن پھر نہ جانے بادل کس طرف کو نکل جاتے اور خالی ہو کر سبک ریشم کے ڈھیروں کی شکل میں آسمان پر اڑے پھرتے آج وہ یونی کو اس بحران کے بارے میں بتانا چاہتی تھی جو تازی کی باتوں نے پوری خاندانی زندگی میں پیدا کر دیا تھا' وہ سمجھتی تھی کہ تازی اتنی آسانی سے ہار تسلیم کرنے والا آدمی نہیں تھا' وہ یونی سے مشورہ کرنا چاہتی تھی لیکن یہ سوچ کر اس کا دل دہلا جارہا تھا کہ یونی ان فرسودہ باتوں کی کتنی ناپسندیدگی سے دیکھے گا۔ یہ زندگی کا حصہ تو تھیں' پر وہ ان مشکلات ومسائل کا تذکرہ کر کے اس کے سوچوں اور خیالوں کے آبگینے کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتی تھی' پھر اس نے سوچا کوئی کب تک ان باتوں سے دامن بچا سکتا ہے' آخر ایک روز تو ان مسائل کو سامنے آنا ہے' اس نے دیکھا یونی کتنا خوش تھا' اس کامیابی نے اس کے تاثرات میں کتنی تابندگی اور خود اعتمادی بھر دی تھی۔ وہ دونوں کتنے خوش تھے لیکن یونی کو یہ خبر نہ تھی کہ چناں کی مسکراہٹ کی تہہ میں تفکرات اور اندیشوں کا کتنا بڑا دریا موجیں مار رہا تھا۔ بادلوں کے دل کے دل ان کے سروں پر سے گزر رہے تھا اور ٹھنڈی ہواؤں کے مشکبار تھپیڑوں نے ان کی راتوں کو کس قدر سبک بنا دیا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو یونی!" اس نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

"سوچ رہا ہوں' شہرت حاصل کر لینا بھی ایک مسئلہ ہوتا ہے' انسان اس کے لیے کتنی محنت اور عرق ریزی کرتا ہے لیکن جب یہ مل جاتی ہے تو اس خمار میں یہ بھولنے لگتا ہے کہ اس کو قائم رکھنا دراصل آرٹسٹ کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ ہوتا ہے' میں کئی دنوں سے

ذہنی طور پر کچھ خطوط پر کام کر رہا ہوں' لیکن انھیں کینوس پر اتارنے کے لیے کچھ تاخیر ہو رہی ہے۔۔ پہلے یہ بات نہیں تھی"

"ہاں بھئی" وہ ہنس دی "آخر ایک آرٹسٹ کو تحسین و آفرین سے لطف اندوز ہونے کا بھی حق ہے اور پھر آرٹسٹ کوئی مشین تو نہیں ہوتا' یاد ہے ایک روز تم نے خود ہی تو مجھے بتایا تھا کہ بعض Ideas صدیوں میں ابلاغ کی منزلیں طے کرتے ہیں اور میں نے اسے ایک عامیانہ سی بات کہہ کر اڑا دیا تھا کہ یہ بات تو آجکل ہر تیرا نام نہاد آرٹسٹ کہتا ہے اور فلموں میں بھی ایسے مصرعے سننے کو ملتے ہیں کہ میں صدیوں سے تمھیں پیار کر رہا ہوں' بھلا کوئی صدیوں اپنی محبوبہ سے کیوں کر پیار کر سکتا ہے جب کہ عملی طور پر یہ ممکن ہی نہیں' لیکن تم نے میری اس بات کو بڑی سنجیدگی سے لیا تھا کہ صدیوں کی محبت سے مراد دراصل ماضی کی محبتوں کی روایت ہے' اس دنیا میں خدا معلوم کتنے دل شکست ہو جاتے ہیں ٹوٹ جاتے ہیں۔ ان کی آہوں کا سوزو گداز ہواؤں کے دوش پر تیرتا رہتا ہے' ہم وفائیں بھی ان سے مستعار لیتے ہیں لیکن ان سے رابطہ قائم کرنا بے حد مشکل ہوتا ہے' ایک خاص قسم کی پاکیزگی اور جذباتی عظمت Attain کیے بغیر ہم ان جذبوں اور ان کے سوز و گداز سے رابطہ قائم نہیں کرسکتے' اور اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو سمجھ لو کہ ہم نے صدیوں کی اس روایت کو تسخیر کر لیا اور محبت کے استھان پر اپنے جذبے کے پھولوں کا نذرانہ پیش کر دیا" یہ سنکر یونی مسکرا دیا اور حیرت سے چناں کی طرف دیکھنے لگا۔

"تم ہر بات کو کتنے قرینے سے اپنے خیالات میں بسا لیتی ہو!"

"ٹھیک ہی تو کہتی ہوں" اس نے شوخی سے یونی کی طرف دیکھا اور اس کے پل اوور کے کنارے میں چھپے ہوئے کالر کی سُٹ نوک کو باہر نکالتے ہوئے بولی۔ "آئیڈیاز Ideas کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے' اس کے لیے بھی آپ کو ماضی کی عظیم روایتوں سے ناطہ جوڑنا پڑتا ہے' ایک آرٹسٹ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ماضی میں کیا کچھ ہوتا رہا ہے۔ وہ روائتیں ان گنت ذہنوں سے ٹکراتی ہیں کیوں اس دنیا میں کوئی Achievment بھی مرتی نہیں' انسان کا جسد خاکی مرجاتا ہے' لیکن اس کے عظیم کارنامے زندہ لمحوں کی طرح ہواؤں میں بکھر جاتے ہیں' یہ جلا وطن شاہکار بے گھر ہو کر نئے ٹھکانوں کے متلاشی ہوتے ہیں' وہ بے شمار ذہنوں کے بند دروازوں کے سامنے آکر رکتے ہیں کہ کوئی انھیں اپنی پناہ میں لے لے لیکن انھیں لبیک کہنے اور ان کے لیے اپنے ذہنوں کے دروازے کھولنا ہر انسان کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اس لیے وجدان اور ادراک کو ایک خاص شکتی کی ضرورت ہوتی ہے جو علم اور ریاضت سے پیدا ہوتی ہے اور اس دنیا میں فی الوقت آرٹسٹوں میں اسی بات کی کمی ہے اس لیے وہ ان شاہکاروں کی عظمت کو اسیر نہیں کرسکتے عظمت کی تسخیر آج کے آرٹسٹ کا مسئلہ ہے۔۔ اور تم بھی اسی مسئلے سے دو چار ہو' ان دنوں میں تمھیں پوری یکسوئی سے مطالعہ کرنا چاہیے"

وہ محمود نظروں سے اسے دیکھتا رہا' "چناں! میں ان دنوں زبردست مطالعے کے سنگلاخ اور جانگسل مراحل سے گزر رہا ہوں' میں ایک ایسی کتاب کے مطالعے میں مصروف ہوں جس کے ایک ایک حرف پر مجھے پہروں سر دھننا پڑتا ہے"

"اچھا!" چناں کے گلابی ہونٹ اسطرح کھلے جیسے ہوا کا ایک ننھا سا جھونکا پھول کی پتیوں کو چومتا ہوا گزر جائے "کونسی کتاب ہے وہ۔۔ ذرا مجھے اس کا نام تو بتاؤ' ممکن ہے میں نے بھی پڑھی ہو"۔

"چناں!" وہ مسکراتے ہوئے اس کے قریب سرک آیا

"کیا۔۔ کیا۔۔ اس نام کی کوئی کتاب ....." پھر وہ قہقہہ مار کر ہنس دی'

"کیا یہ کتاب!..." یونی اس کی تھوڑی کے خم پر اپنی انگلی رکھتے ہوئے بولا "کیا یہ کتاب کسی باب العلم سے کم ہے....؟"

"چناں چند لمحے خاموش رہی' پھر زیر لب مسکراتے ہوئے بولی "واہ جی واہ -- اب سے چند منٹ پہلے اپنے انمل بے جوڑ خیالات پیش کرتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہیں چھوٹا منہ بڑی بات تو نہیں کہہ رہا -- میں تو آپ کو اپنے سے میلوں آگے سمجھ رہی تھی اور آپ ادراک کے معاملے میں مجھے اپنا آئیڈیل قرار دے رہے ہیں' پھر تو بن چکے آپ آرٹسٹ۔۔ اور میں بھی باز آئی ایسی محبت سے۔۔

میں تو محبت کے معاملے میں دیوتاؤں جیسا آدرش رکھتی ہوں میرا مطلب ہے میری Destiny کسی ایسے دیوتا کا استھان ہے جو اپنے آدرش کی عظمت میری روح میں نفوذ کر چکا ہو' وہ سب کچھ مجھے Communicate کر چکا ہو جس کے لیے وجدان اپنے تمام تر عجز کے ساتھ گردن جھکا دیتا ہے' اگر تم مجھے ایک کتاب کے بجائے ایک مجسمے یا خوبصورت منظر سے تشبیہ دیتے تو میں خوش ہوتی لیکن میں علم کا مجسمہ ہرگز نہیں ہوں اور نہ ہی یہ کہلوانا پسند کرتی ہوں" دونوں ہنسنے لگے۔

"مجھے تمھاری یہی خوبی پسند ہے' تم میں Reasonal Power ہے' جو بعض وقت تم سے بڑی دلچسپ باتیں کہلواتی ہے' اگرچہ کبھی کبھی ان میں کچھ باتیں خام بھی ہوتی ہیں لیکن بحیثیت مجموعی تم کافی Inspiring ہو"

یہ سن کر وہ تقریباً اچھل پڑی "آخر کو مرد نکلے نا ابھی حساب برابر کر دیا' حضرت میری باتیں اتنے تناسب سے بھی خام نہیں ہوتیں جس حساب سے آپ فرما رہے ہیں' ممکن ہے وہ آپ کی کم نگاہی کے پاؤں تلے پس جاتی ہوں" یونی اپنا قہقہہ ضبط نہ کرسکا۔

"رہ گیا نا آپ کا عجز دہرے کا دھرا' کسی طرف سے گزرنے کا راستہ تو دیں' یا تو مجھے اپنا آئیڈیل بنا لیں یا پھر مجھے ریاضت کا گیان لینے دیں"

"گیان دھیان لینا ہے تو کسی پتھر کو اپنے سامنے رکھ لیں اور مصروف ہوجائیں کیوں کہ اس کا تعلق انسان کے اپنے اندر سے ہوتا ہے اور معاف کیجئے گا یہ مراحل آپ کو موقلم ہاتھ میں لینے سے پہلے طے کرنا چاہئیں تھے۔ خیر اب بھی آپ کو اس سے منع نہیں کیا جاسکتا کہ انسان کی محسوساتی کیفیات ہمیشہ ایک سطح پر نہیں رہتیں' بعض اوقات بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ بالکل خالی ہے۔۔ جو Spirits اس نے کشید کی تھیں وہ قطرہ قطرہ اس کے وجود کے مساموں میں جذب ہوچکی ہیں اسے انھیں از سر نو اپنے وجدان کے آبگینے میں مجتمع کرنے کے لیے کسی سنگ میل رفتہ کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے"

"وہ خاموش اسے دیکھتا رہا ان باتوں میں انھیں اس بات کا دھیان ہی نہ رہا کہ آسمان کے وسطی حصے میں جہاں تھوڑی دیر پہلے نیلے بادلوں کے پربت بن رہے تھے اب صاف ہوکر شفاف چمکتی دھوپ کے لیے راستہ چھوڑ چکے ہیں۔

"چھوڑو ان بے ربط باتوں میں تو ایک عمر بیت جائے گی' آؤ وہ سامنے اس ٹیلے پر دھوپ میں بیٹھیں" وہ اٹھتے ہوئے بولا چناں بھی اس کے ساتھ اٹھتے ہوئے بولی۔

"کیوں جناب بے ربط کیسے ہوگئیں یہ باتیں!"

"پہلے اپنے لہجے کی اجنبیت تو دور کرو۔۔ تم نے تو آداب گفتگو کے انبار لگا دیئے ہیں"

"خدا کا شکر ہے کہ آپ اس انبار تلے دبے نہیں ہیں بلکہ ان بے ربط باتوں نے آپ کے لب و لہجے کو زیادہ تیکھا اور متوازن بنا دیا ہے"

"میں مانتا ہو"

"تو پھر یہ بھی مانو کہ ربط اور توازن بے ربطی اور عدم توازن کی جوان اولاد کی طرح ہوتا ہے' ان ان پڑھ دیہاتی والدین کی طرح جن کا بچہ پی ایچ ڈی کر کے ڈاکٹر بن جاتا ہے" وہ دونوں سرخ پتھر کے ٹیلے پر سنگی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ دور حد نظر تک ہریاول کے تختے اور پھول نظر آرہے تھے۔

"یہ تم نے بہت ٹھیک بات کی۔۔ ایک آرٹسٹ کا منصب بھی تو یہی ہوتا ہے کہ اپنے گردو پیش میں بکھری ہوئی نامکمل' غیر متوازن اور منتشر چیزوں کو سمیٹ کر ایک مکمل پیکر عطا کر دے"

"لیکن یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ انسان کی بصارت اور فہم کا کینوس بہت محدود ہے جن چیزوں کو وہ غیر متوازن نامکمل اور منتشر دیکھتا ہے وہ اپنے وجود کی کائنات میں بھرپور متوازن اور مکمل ہوتی ہیں۔ آرٹسٹ اسے بقدر ظرف نامکمل سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے"

"یہ تو ایک الگ موضوع ہے"

"فکر کے تمام موضوعات نقشے کی لکیروں کی طرح ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے گزرتے ہیں یا آپس میں مل جاتے ہیں"

"یہ بھی الگ موضوع ہے" وہ بولا

"تو پھر اپنے اصل موضوع کی طرف رجوع کرنا چاہیے" وہ گردن کو خم دیکر دھیمی سی ہنسی میں اسے دیکھ کر بولی اور یونی نے اپنی سانس روک لی' وہ کچھ دیر بالکل ساکت نظروں سے اسے دیکھتا رہا "چناں!" وہ گداز سنجیدگی سے بولا" ہم دونوں ایک دوسرے کی منزل ہیں' ایک دوسرے کا آئیڈل ہیں تمھاری باتیں سن کر مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے تم میرے دل' میرے ذہن کے اندر سے بول رہی ہو میں اتنا بڑا دعوے تو نہیں کرسکتا کہ میں تمھاری تزئین کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ تم خود خدا کی حسین تر تخلیق ہو لیکن مجھے اپنی تکمیل کے لیے تمھاری ضرورت ہے' میری طرف دیکھو...." یونی نے اپنے ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ دیئے اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا

"شاید تم اسے خود غرضی کہو کہ میں اپنی ذات کی تکمیل کے لیے تم سے تحرک و تحریک کی قوتیں حاصل کرنا چاہتا ہوں' تمھاری انفرادیت کے حسن کو اپنی ذات میں سمولینا چاہتا ہوں' یا تمھیں اپنی ذات میں مدغم کر کے اسے اپنا تابع مہمل بنا لینا چاہتا ہوں' لیکن یہ حقیقت ہے کہ تم میری ذات کے لیے وہی اہمیت رکھتی ہو جو صحرا کے وسط میں ایک سحر کے لیے پانی کی اہمیت ہوتی ہے!" چناں نے دیکھا یونی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اس نے اپنے وجود میں ایک عجیب لہر سی محسوس کی جو اس کے روئیں روئیں میں سے برق کی چمکتی ہوئی لکیر کی طرح گزر گئی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے لیکن کوئی لفظ اس کی زبان سے نہ نکل سکا۔ اس کے جذبات میں اچانک پیدا ہونے والی ناقابل بیان سی تبدیلی نے جیسے اسے یقین دلا دیا کہ یونی جو کچھ کہہ رہا ہے سچ کہہ رہا ہے کیوں کہ اس کی روح نے جیسے ایک یقینی اور تائیدی آواز سن لی تھی' یونی چند لمحے اس کے جواب کا منتظر رہا پھر اس کی خاموشی کو تجزیانہ نظروں میں تولتے ہوئے بولا "یہ ایک احسان ہوگا۔۔ ایک ایسی نوازش جس کا کوئی بدل نہیں انسان اپنے لیے تو جیتا ہی ہے' اگر دوسرے کے لیے متحرک قوت بن کر جیئے تو اس کی انسانیت آفاق کے کناروں تک سربلند ہی نہیں سرخرو بھی ہوجاتی ہے" اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ چناں خود پر ضبط نہ کرسکی' اس نے یونی کے گرم گرم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے "میری بے ربط باتوں سے اتنا متاثر ہوگئے! لیکن یونی تمھیں یہ سب کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی کیوں کہ تمھیں حاصل کرنا میرے لیے ایک اعزاز سے کم نہیں' اول تو مجھ میں اتنی اہلیت ہی نہیں ہے کہ میں کسی کے کام آسکوں کیوں کہ ابھی خود میری ذات نا مکمل ہے' پھر میں کسی کا آدرش کیسے بن سکتی ہوں۔ اور ایسے انسان کا آدرش جو خود اپنی ذات میں آدرش کی عظمتوں کا ایک مکمل نمونہ ہوں اگر تمھاری بات کو تسلیم کر بھی لوں' تو تعمیر و تزئین کا منصب تو ایک خدائی منصب ہے' اگر کوئی انسان اس منصب کا اہل ثابت ہو سکے تو اسے خدا کے سامنے سجدۂ شکر بجا لانا چاہیے' میں زندگی کے ہر قدم پر تمھارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں' میں اپنی آنکھوں کا ایک ایک ذرہ' بصارت کی ایک ایک کرن تمھاری نظروں میں شامل کر دونگی اپنے انفاس کی ایک ایک کروٹ اور دل کی ہر دھڑکن تمھارے وجود کی تکمیل کے لیے پیش کر دونگی۔۔ یہ تو خدائی صفت ہے جو اس نے اپنے بندوں کو ایک بیش بہا تحفے کی صورت میں دی ہے' تخلیق کائنات کے لیے پروردگار نے بھی تو اپنے وجود کو فنا کر دیا ہے یا بقائے دوام دیدیا ہے' جب ہی تو ہم خدا کو نہیں دیکھ سکتے کیوں کہ اس نے اس کائنات کی تزئین میں اپنے وجود کا ذرہ ذرہ صرف کر دیا ہے اور اس کا حسن ہم کائنات کے ذرے ذرے میں سانسیں لیتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ میں بھی اسی طرح تمھاری تزئین و تکمیل میں اپنے وجود کو بقائے دوام بخشوں گی' کیوں انسان کا اصل منصب یہی ہے' وہ کوئی عظیم کارنامہ سرانجام دے کر ہی عظیم بنتا ہے"

وہ بہت دیر تک خاموش بیٹھے ایک دوسرے کو تکتے رہے' سورج افق کے کناروں تک آپہنچا اور دھوپ کا رنگ روپہلی سے آتشیں ہوگیا' آسمان کے وسط میں پھر بادل جمع ہونے لگے جس کے نیچے نارنجی دھوپ کی الوداعی کرنیں زرتاب چادر کے ستاروں کی طرح چمک

رہی تھیں' وہ دونوں اٹھ کر پارک کے دروازے کی طرف بڑھنے لگے' قدم سے قدم ملائے چلتے ہوئے وہ ایسے نظر آرہے تھے جیسے صدیوں سے زندگی کے سفر میں اسی طرح رواں دواں ہوں' چناں سر جھکائے خاموش تھی۔

پارکنگ پلیس سے تھوڑے فاصلے پر چناں ایک دم رک گئی۔ اب تک اسے یہی بات پریشان کر رہی تھی کہ وہ آج ذہن میں جو سب سے اہم بات لیکر گھر سے نکلی تھی اس کے بارے میں تو یونی کو کچھ بتا ہی نہ سکی تھی' اس نے سوچا پھر جانے کب اس بات کے لیے کوئی موزوں وقت ہاتھ آئے اس لیے اسے آج یونی کو سب حالات سے مختصراً آگاہ کر ہی دینا چاہیے۔

"رک کیوں گئیں؟" یونی ٹھہرتے ہوئے بولا

"کچھ نہیں' میں تازی کے بارے میں چند باتیں کہنا چاہتی تھی' تمہیں میری اور اس کی غیر رسمی نسبت کے بارے میں علم تو ہے ہی' ان دنوں میں وہ کچھ پریشان ہیں اور مجھے بھی پریشان کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن میں نے ان سے صاف صاف باتیں کی ہیں"

"ہاں راشدہ کی زبانی بھی مجھے کچھ باتیں معلوم ہوئی ہیں' تمہارے انکار کے باوجود بھی وہ مصر ہیں"

"ہوں ---"

"یہ ایک المیہ ہے کہ اس دور میں بھی ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے' اگر تم اجازت دو تو میں خود ان سے مل لوں!"

"فی الحال اس کی ضرورت نہیں' امید تو ہے کہ میں خود ہی "ان سے نمٹ لوں گی" اور وہ دونوں گاڑی میں سوار ہوگئے' سورج غروب ہوچکا تھا' شام کے ہلکے ہلکے اندھیرے میں یونی کی گاڑی تیز رفتاری سے شاہراہ کی طرف بڑھ رہی تھی اور اس کے پیچھے کچھ فاصلے پر ایک اور گاڑی دھیمی رفتار سے ایک دوسری ذیلی سڑک کو کاٹ کر شاہراہ کے لامبے اور گھنے درختوں میں اوجھل ہو رہی تھی۔

روفی اچانک اپنے سامنے تازی کو پاکر بدحواس سی ہوگئی' اتفاق سے اس وقت گھر میں بھی کوئی دوسرا آدمی موجود نہ تھا' سوائے نوکروں اور چند بچوں کے پھر بھی وہ یہ سوچ کر سہم گئی کہ رات کے وقت تازی کا ان کے گھر آنا بغیر کسی خاص وجہ کے نہیں ہوسکتا' تازی اس وقت اپنے خیالات کے تار وپو میں اس حد تک الجھا ہوا دکھائی دے رہا تھا کہ اس نے گھر کے دیگر افراد کے بارے میں بھی نہیں پوچھا آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ روفی کے بارے میں سب کو معلوم تھا کہ وہ چناں کی سب سے قریبی دوست ہے اور گھر کے افراد یہ بھی جانتے تھے کہ وہ چناں اور یونی کے لیے راستہ ہموار کر رہی ہے۔ خاص طور پر وہ آنٹی راحیلہ پر تو اٹھتے بیٹھتے زور دیتی تھی کہ بزرگوں کی مخالفت کو نظر انداز کر کے یونی اور چناں کو ازدواجی بندھن میں باندھ دیا جائے' لیکن اس کا یہ حوصلہ اندرون خانہ عورتوں تک ہی محدود تھا اب اس نے تازی کو اپنے سامنے دیکھا تو اس کے پسینے چھوٹ گئے اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ مختلف وسوسے اور اندیشے اس کے ذہن میں کوندنے لگے' وہ سوچ رہی تھی' شاید تازی کو اس کے مخالفانہ رویئے کا علم ہوگیا ہے اس لیے وہ اظہار برہمی کے لیے اس کے یا اس کے والدین کے پاس آیا ہے۔ یوں تو وہ پہلے بھی چناں کے خاندان کے چند مردوں کے ساتھ مختلف تقاریب پر ان کے گھر آچکا تھا اور روفی کے ساتھ اس کا اچھا خاصا شناسانہ تعارف تھا اور اس نے چناں کی معیت میں بھی اسے کئی مرتبہ دیکھا تھا لیکن آج کی طرح بالکل تنہائی میں تازی سے ملاقات اور گفتگو کا یہ پہلا موقع تھا۔

"روفی --- عزیزہ' میں ایک الجھن کے سلسلے میں تم سے ملنے آیا ہوں' اور اس وقت مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے!" روفی نے اس کے لہجے میں اعتدال کی رو محسوس کر کے اطمینان کا سانس لیا "فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتی ہوں"

"سب سے پہلے تو میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے اس بات کا اچھی طرح علم ہے کہ تم چناں کی عزیز ترین سہیلی ہو اور چناں ان دنوں اپنی اور میری نسبت کو منسوخ کرانے کے جس خام خیال میں مبتلا ہے اس میں اسے تمہاری ہمدردیاں حاصل ہیں۔ میں اس

بات سے ہرگز پریشان نہیں ہوں' میں اپنی الجھنوں پر قابو پانا جانتا ہوں' تمھیں یہ بھی معلوم ہے کہ چناں نے مجھ سے اس منگنی کو منسوخ کرنے کی درخواست کی ہے بلکہ اس پر زور دیتے ہوئے یہ دھمکی بھی دی ہے کہ وہ کسی صورت میں میری شریک حیات بننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کے اس فیصلے نے ہمارے بزرگوں کو وقتی طور پر پریشان کر دیا ہے"

"تو آپ ہی اس کے فیصلے کو تسلیم کر لیں۔ آپ پڑھے لکھے لوگ ہیں' آپ کے درمیان ایسی چپقلش بے معنی سی دکھائی دیتی ہے"
اس کے جواب میں تازی نے مختصراً اسے اپنے موقف کے بارے میں وہی باتیں بتائیں جو وہ چناں سے کر چکا تھا اور جو روفی شاید خود بھی چناں کی زبانی سن چکی تھی۔

"فی الحال تو میں یونس کے بارے میں کچھ معلومات جمع کر رہا ہوں' یوں تو وہ میرے لیے بالکل اجنبی نہیں ہے لیکن اس سے پہلے میرا اس سے کوئی سروکار نہیں تھا اس لیے میں نے اس کی ذات میں دلچسپی لینا غیر ضروری سمجھا اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ اسد بلڈنگ میں اس کے ہمراہ ایک لڑکی راشدہ بھی ٹھہری ہوئی ہے جو اس کی ہونے والی بھابی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ یہ لڑکی سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتی ہے"

"جی آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔ راشدہ یونی کے بڑے بھائی کمال سے منسوب ہے جو ان دنوں لندن میں ہیں' اب وہ واپس آنے ہی والے ہیں۔ پھر ان کی شادی ہوگی"

"لیکن رشتہ چاہے کتنا بھی قریبی کیوں نہ ہو دونوں ایک دوسرے کے لیے نامحرم ہیں اور ابھی راشدہ باقاعدہ اس کے بھائی کے نکاح میں بھی نہیں آئی۔ پھر دونوں کا شب و روز ایک کمرے میں رہنا ایک بڑی معیوب بلکہ شرمناک سی بات معلوم ہوتی ہے"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تازی میاں" روفی ایک لمحے کے لیے لرز گئی "میں یونی کو اچھی طرح جانتی ہوں وہ ایک عظیم انسان ہے' میں تو ان کے بارے میں ایسا تصور بھی نہیں کر سکتی"

"ممکن ہے وہ ایک عظیم انسان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک آرٹسٹ ... میرا مطلب ہے ایک عظیم آرٹسٹ بھی ہو لیکن میں اپنے اور چناں کے مستقبل کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کے چال چلن کے بارے میں پوری چھان بین کر لینا چاہتا ہوں"

"تو آپ کو کون روکتا ہے آپ جس طرح چاہیں اپنا اطمینان کر لیں"

"اس سلسلے میں مجھے تمھاری مدد کی ضرورت ہے روفی... میرا خیال ہے تم چناں کے ساتھ ساتھ مجھے بھی اچھی طرح جانتی ہو اور شاید تمھیں یہ بھی اندازہ ہوگا کہ ہمارے خاندان کی ایک ایسی لڑکی کو جس کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے کوئی پتے والا مرد ہی اچک کر لیجا سکتا ہے یہ ہماری آن اور ہمارے وقار کا مسئلہ ہے۔ اگر اس مسئلے نے کوئی ناعاقبت اندیشانہ قسم کی پیچیدہ صورت اختیار کی تو وہ انتہائی قریبی خاندانوں کے درمیان دشمنی کی ایسی آگ بھڑک اٹھے گی جس میں پتہ نہیں کتنے انسانوں کا سکون جل کر خاک ہو جائے گا اور نتیجہ اس کا وہی نکلتا ہے جو قرین انصاف ہے"

"انصاف سے آپ کی کیا مراد ہے؟" روفی نے پوچھا "ایک ایسی لڑکی سے جو آپ سے شادی کرنے کی خواہشمند نہیں ہے آپ زبردستی شادی کریں؟"

"میں اس مسئلے پر بحث کرنے نہیں آیا۔ تمھارے اس سوال کا جواب تو میں پہلے ہی دے چکا ہوں فی الحال مجھے تمھاری مدد کی ضرورت ہے۔ میں آج رات اسد بلڈنگ کے اس کمرے میں ٹھہر کر جو یونس اور راشدہ کے کمرے کے ساتھ ہے ان کی گفتگو اور نقل و حرکت کا جائزہ لینا چاہتا ہوں تم چوں کہ چناں کی سب سے قریبی سہیلی ہو اس لیے تمھیں بطور گواہ اپنے ساتھ لیجانا چاہتا ہوں تاکہ تم خود اپنے کانوں سے سب باتیں سنو اور آنکھوں سے دیکھو اور اگر یونی اور راشدہ کے بارے میں میرے خدشات درست ثابت ہوتے ہیں تو چناں کو راہ راست پر لانے کے لیے مجھے تمھاری ہمدردیاں حاصل ہو جائیں"

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں نازی میاں، میں تنہا آپ کے ساتھ رات کے وقت ایک ہوٹل میں کیسے جاسکتی ہوں، خدانخواستہ میں آپ کے کردار پر شک نہیں کررہی، آپ میرے بھائیوں کی طرح ہیں لیکن پھر بھی، یہ میرے لیے ناممکن ہے!"

"روبی! میرا خاندان اس وقت ایک فضول سے بحران کا شکار ہوا پڑا ہے، ہمارے پاس ایسی باتوں کے لیے وقت ہے اور نہ ہم کبھی ان بیکار باتوں پر توجہ دیتے ہیں، میں خالہ جان کی رضا مندی کے ساتھ تمھیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ یہی فیصلہ کر کے میں یہاں آیا ہوں، تمھیں میرے ساتھ چلنا پڑے گا، فکر نہ کرو میں بڑے کھلے ذہن کا انسان ہوں، یونی اور راشدہ کے بارے میں صرف حقائق جاننے کا خواہشمند ہوں اگر اس چھان بین کے بعد میں نے دیانتداری سے یہ محسوس کیا کہ یونی، چناں کا مجھ سے زیادہ حقدار ہے تو میں اس کے راستے سے ہٹ جاؤں گا، لیکن اس کے لیے یونی کو مجھے یہ یقین دلانا ہوگا کہ وہ ذہنی، جسمانی، روحانی اور سماجی مرتبے کے اعتبار سے نسبتا مجھ سے اعلیٰ اور برتر ہے"

"کیا اس کے لیے محض یہی ایک دلیل کافی نہیں کہ یہ چناں کی اپنی پسند ہے ہر انسان اپنی پسند ناپسند کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کا بہرحال اختیار رکھتا ہے"

"روبی یہ زخموں پر نمک چھڑکنے والی بات ہے اگر چناں مجھ سے منسوب نہ ہوتی تو میں اس بات کو کبھی اپنے وقار کا مسئلہ نہ بناتا اور پھر گزشتہ پانچ برس سے اس کے والدین ہمیں شادی کے دن رکھنے کے لیے کہتے آرہے ہیں۔ کیا چناں اس وقت اپنے والدین کو نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ مجھ سے شادی کرنے کی خواہش مند نہیں ہے۔ آج اس نے اچانک اور بالکل غیر متوقع طور پر مجھے ایک دوسرے شخص کے مقابل لاکھڑا کیا ہے۔ اس کا مطلب تو یہی ہے کہ وہ برادری میں ہمارے خاندان کو ایک شرمناک صورت حال سے دوچار کرنے کے درپے ہے خاص طور پر ان حالات میں جب کہ اس کے والدین بھی اس نسبت کو منسوخ کرنے کے حق میں نہیں ہیں"

اتنے میں روبی کی امی اور ابا بھی کمرے میں آگئے۔ چند رسمی قسم کی باتوں کے بعد روبی کے ڈیڈی بولے۔

"ہم نے تمھاری سب باتیں سن لی ہیں۔ ہمیں ان باتوں کا پہلے بھی علم ہے"

"تو آپ روبی کو میرے ساتھ جانے کی اجازت دیں اور اگر مناسب سمجھتے ہیں تو آپ خود بھی ہمارے ساتھ چلیں"

"نہیں بیٹا ہم تمھارے مسئلے کو سمجھتے ہیں، تم پر پورا بھروسہ ہے، روبی بیٹی تمھارے ساتھ چلی جائے گی"

نازی کی نظریں بالکنی میں کھلنے والے دروازے پر گڑی ہوئی تھیں، اس کے ساتھ ہی روبی کھڑی تھی اندر بالکل چند فٹ کے فاصلے پر راشدہ پلنگ پر بیٹھی ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی کہ یونی کمرے میں داخل ہوا، راشدہ نے چونک کر یونی کی طرف دیکھا" اتنی دیر۔۔ آخر آپ اتنی دیر تک کہاں گھومتے رہتے ہیں؟"

"بس ایسے ہی، چناں سے ملنے کے بعد طبیعت یہی چاہ رہی تھی کہ کچھ وقت بالکل تنہائی میں گزار دوں۔"

"اسی لیے تو میں نے آپ دونوں کو تنہا چھوڑ دیا تھا"

"مجھے معلوم ہے!" وہ پلنگ پر بیٹھ کر موزے اتارتے ہوئے بولا "راشدہ میں تمھاری کن کن باتوں کا شکریہ ادا کروں، چناں اور تمھیں دیکھ کر تو میرا جی چاہتا ہے کہ عورت کی عظمت کے سامنے سر جھکا دوں۔۔۔۔!"

"آپ اپنے سر کو اونچا رکھئے پلیز۔ عورت چاہے بیوی کی شکل میں ہو یا بہن کی شکل میں، ماں کی صورت میں ہو یا بھاوج کی صورت میں مرد کا سربلند دیکھنے کی آرزو مند ہوتی ہے اور پھر ایسے مرد جو کسی مقصد کے لیے جیتے ہیں"

"کیا ہماری زندگی اور کیا ہمارا مقصد۔۔ راشی، تم لوگوں نے کچھ زیادہ ہی مجھے بانس پر چڑھا دیا ہے حالاں کہ مجھ جیسے فنکار اس ملک میں سینکڑوں کے حساب سے ملتے ہیں جو اپنی ہوا باندھنے میں ضرور کامیاب ہوجاتے ہیں لیکن لوح جہاں پر کوئی قابل ذکر نقش چھوڑے بغیر

اس دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں' آرٹ اور فن کا میدان--- میدان کار زار کی طرح ہوتا ہے' اس میدان میں سپاہ ایک دوسرے سے برسرپیکار ہوتی ہیں' اس میدان میں فنکار اپنے آپ سے نبرد آزما ہوتا ہے اور ساری زندگی اپنے خیالی اجسام کے سرا تار تا رہتا ہے' وہ دنیا کو جس زاویہ نظر سے دیکھتا ہے وہ دنیا کے لیے اتنا اجنبی ہوتا ہے کہ وہ اسے اس سیاق و سباق میں پیش کرنے کی جرات بھی نہیں کرسکتا کبھی کبھی تو مجھے ایسے لگتا ہے جیسے میں خود سے جھوٹ بول رہا ہوں ساری دنیا سے جھوٹ بھل رہا ہوں' اور جھوٹ کو چاہے کتنے خوشنما رنگوں سے مزین کرکے پیش کیا جائے وہ جھوٹ ہی رہتا ہے"

"کیا جھوٹ ہماری زندگی کا ایک حصہ نہیں' حصہ ہی نہیں بنی نوع انسان کی زندگی کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے"

"تم نے بالکل ٹھیک کہا مسئلے کے ساتھ ساتھ اسے تم زندگی کا سب سے بڑا المیہ بھی کہہ سکتی ہو!"

"اس طرح یہ آپ کو فنی کاوشوں کے لیے ایک نظریہ فراہم نہیں کر دیتا؟--- آپ اپنی تصویروں میں جھوٹ کے حوالے سے جو تاثرات پیش کرتے ہیں وہ زندگی کا حصہ بن جاتے ہیں یوں آپ زندگی کے عکاس بن جاتے ہیں"

"بات تو تمھاری ٹھیک ہے لیکن ہم جھوٹ بھی تو پوری سچائی سے نہیں بولتے۔ اس طرح نہ سچائی کو فن کے پورے سیاق و سباق میں پیش کرسکتے ہیں اور نہ جھوٹ کو---"

"ہر آرٹسٹ کی زندگی میں نظریاتی غیر یقینی کے ایسے ادوار آیا کرتے ہیں' وہ اس Mess کو اتھل پتھل کر کے اپنے لیے اس طرح نظریات کے کرسٹل چنا کرتا ہے جس طرح ملاح بحر کی گہرائیوں سے سچے موتیوں کی سیپیاں نکالتا ہے"

"سچے موتیوں کی سیپیاں رنگوں اور چہروں کے لیے آرائش کے سامان تو مہیا کرتی ہیں لیکن ہمارے ملک میں ایک آرٹسٹ کی تصویر کا المیہ یہ ہے کہ اسے معدودے چند لوگوں کے سوا کسی کی دید ہی میسر نہیں آتی--- اسٹروکریٹ طبقہ اسے عجوبے کے طور پر ملاحظہ کرتا ہے اس میں پیش کیے گئے تاثرات کے Terror' Horror یا Glamouy کو اپنی معاشرتی ذات کے حوالے سے نہیں پہچانتا ہمارے یہاں ایسی کوئی روایت ہی نہیں ہے' حالاں کہ ایک ایسا نقش جو قومی معاشرتی اور ثقافتی المیوں کی روح سے ہم آہنگ ہو لاکھوں کروڑوں انسانوں میں فلیش کیا جانا چاہیے' میرا ایمان ہے ایک آرٹسٹ معاشرے میں انقلابی سیاستدانوں اور عظیم مدبروں سے زیادہ با مقصد اور تعمیری کردار ادا کرسکتا ہے بشرطیکہ اس کے دل میں قوم و ملک کے ساتھ ساتھ پوری بنی نوع انسان کے لیے تڑپ ہو وہ دنیا کو بتا سکتا ہے کہ زندگی کیا ہے؟ اور اسے کیا ہونا چاہیے"

"لیکن اس کے لیے روایت کی ایک تاریخ ہوتی ہے' اگر ہمارے پاس اس موضوع پر ریکارڈ کے کچھ اوراق پریشان ہیں تو ان کی اثر آفرینی بھی ایک مخصوص حلقے تک محدود رہی ہے کیا آپ دیکھ نہیں رہے کہ گزشتہ ربع صدی میں ہمارے ملک کے آرٹسٹوں نے آرٹ کی جدید تاریخ میں کتنے شاندار ابواب کا اضافہ کیا ہے' وہ بین الاقوامی سطح پر بھی پہچانے گئے ہیں اور ان کے تعارف کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے' آرٹسٹ کی بنیادی صفت صبر اور قوت برداشت ہوتی ہے' وہ ہر حال میں اپنے آرٹ کو مونس و رفیق سمجھتا ہے' کسی بھی قسم کی سطحی Temptation اس کے فن کو روبہ زوال کردیتی ہے اور پھر آرٹ کے شاہکار آرٹسٹ کی زندگی میں بہت کم اپنی صحیح قدروقیمت کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ عصری چشمکیں اور تعصبات نئی بات یا بڑی بات کہنے والوں کو حیرت اور تمسخر سے دیکھتے ہیں' نقاد اور مبصر بھی اپنے اپنے مفادات کے دائرے کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں۔ البتہ مستقبل کا محقق اور ناقد غیر جانبدار ہوتا ہے"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بڑی' سچی اور کھری بات اپنے عہد کے لیے نہیں ہوتی--- کم از کم آرٹسٹ کی ذات کے حوالے سے؟"

"جی بالکل آرٹسٹ کو وقت پر اس کی داد و تحسین نہیں ملتی لیکن سینہ بہ سینہ چشم بہ چشم ذہن بہ ذہن اس کی تخلیق سفر کرتی ہے اور پورے عہد کو متاثر کرتی ہے' وہ لوگ جو اس آرٹسٹ کو تسلیم نہیں کرتے اپنے خیالوں اور تخلیقی پیکروں میں اس کے خطوں اور رنگوں کو' اس کے اسٹائل کو اپنے ذاتی امپریشن کے اضافے کے ساتھ اپناتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس آرٹسٹ کی عظمت سے بھی انکار

کرتے جاتے ہیں لیکن مستقبل کے محقق ان اثرات کا کھوج لگا لیتے ہیں اور اس کے اجتہاد اور Pioneering effects کے رشتے عصری تخلیقات سے صحیح صحیح استوار کر کے ان کی نشاندہی کر دیتے ہیں"

کچھ دیر خاموشی رہی' پھر جیسے یونی اس گفتگو سے اکتا گیا'

"بہت دنوں سے بھیا کا خط نہیں آیا" وہ بولا

"میں نے انھیں کچھ کلاسیکی پرنٹس کے بارے میں لکھا تھا' وہ بھی انھوں نے نہیں بھجوائے"

"شاید خود ہی آ رہے ہوں"

"خدا کرے آپ کی زبان مبارک ہو' میں انھیں اس لیے پیش کر رہی ہوں کہ وہ زندگی کا ابلتا ہوا چشمہ ہیں۔ جس ماحول میں ہوتے ہیں اس میں زندگی کی لہر دوڑا دیتے ہیں' کسی کو مایوسی کا شکار نہیں ہونے دیتے"

"یہ تو ٹھیک ہے ہم جیسے پژمردہ لوگوں میں بھیا جیسے لوگوں کا دم غنیمت ہے"

"کیا آپ کے خیال میں چناں بھی ہم جیسے پژمردہ لوگوں کی صفت میں آتی ہے!"

"نہیں --- وہ بہت مختلف ہے---"

"کس لحاظ سے --- میں نے بھی اسے سمجھنے کی کوشش کی ہے' دیکھوں تو آپ کے اور میرے مشاہدے میں کتنی مطابقت ہے!"

"بس یوں سمجھ لو کہ ہم اگر ٹھہری ہوئی جھیلیں ہیں تو وہ بہتی ہوئی ندی ہے"

"اور گنگناتی ہوئی بھی--- ایسی ندی جس کا نظارہ چاندنی رات میں دیدنی ہوتا ہے"

"لیکن چاندنی کی راہ میں بادلوں کے کچھ پہاڑ ہیں' میں نے سنا ہے اس کے منگیتر نے اسے دھمکی دی ہے کہ وہ کسی حالت میں بھی اس سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہے"

"یہ بات تو میں نے بھی سنی ہے" راشدہ بولی "کیا وہ اس حقیقت کو محسوس نہیں کرتے کہ چناں کو اس کی پسند کے مطابق زندگی ساتھی منتخب کرنے کی اجازت نہ دی گئی تو یہ اس پر بہت بڑا ظلم ہوگا"

"ان باتوں کو وہ لوگ نہیں سمجھتے --- وہ اس لڑکی کو اپنی خاندانی روایات کی ملکیت سمجھتے ہیں"

"تو پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟"

میں سراپا سوچ بن گیا ہوں اس لیے کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر ممتاز سے ملنے کا قصد کرتا ہوں تو یہ خیال آتا ہے کہ ممکن ہے زندگی کے بارے میں ان کے اور میرے تصورات اور اقدار میں بہت زیادہ اختلاف ہونے کی وجہ سے اسے قائل نہ کرسکوں اور بات کا بھی امکان ہے کہ وہ مشتعل ہوجائے۔ آخر اس کو میرے اور چناں کے ملنے جلنے کا علم تو ہے ہی"

"میرا مشورہ مانئے آپ اس معاملے کو ذرا زیادہ سنجیدگی سے لیجئے اور جو کچھ بھی کرنا ہے جلد کر ڈالئے' اس میں غیر ضروری تاخیر آپ اور چناں کے حق میں مضر ثابت ہوسکتی ہے۔"

"میں بہت تھک گیا ہوں آج رات کو --- یہی سوچتے سوچتے --- میں نے آج پوری دیانتداری سے محسوس کیا ہے کہ چناں میری ذات کا ایک حصہ ہے' میں اس کے حصول کے لیے جو کچھ بھی مجھ سے ہوسکا کروں گا---"

پھر خاموشی چھاگئی۔ شاید یونی سوگیا تھا' کمرے کی لائٹ روشن تھی۔

رونی اور تازی سحر تک اپنی جگہوں پر کھڑے رہے' رونی نے دیکھا--- تازی بالکل بت بنا کھڑا تھا' رونی نے اسے ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کیا اور وہ دونوں دوسری منزل کی راہداری کی طرف بڑھ گئے۔ جس وقت وہ زینے سے اتر رہے تھے انھوں نے دیکھا چناں نیچے استقبالیہ کاونٹر کے پاس کھڑی تھی تازی اسے ناقابل یقین نظروں سے دیکھتا ہوا باہر نکل گیا اور رونی آہستہ آہستہ معصو

قدم اٹھائی' ہوائیاں لیتی چناں کی طرف بڑھنے لگی۔

چناں نے سب باتیں روفی سے سن لیں۔ روفی شب بیداری سے ٹوٹی ہوئی تھی' اپنے خیال کے مطابق اس نے صلاح مشورے کے لیے یونی کو ملنے کا ایک بہت ہی محفوظ وقت نکالا تھا' رات ممی اور ڈیڈی کے درمیان تازی اور اس کے بارے میں بڑی تفصیلی گفتگو ہوئی تھی کوشش کے باوجود وہ ان کے درمیان ہونے والی بہت سی باتیں نہیں سن سکی تھی اس لیے اس نے مناسب یہی سمجھا کہ علی الصبح یونی سے مل کر کسی فیصلہ کن اقدام کے بارے میں تبادلہ خیال کر لے لیکن یہ بات تو اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی کہ تازی' روفی کو لیکر اسد ہوٹل پہنچ جائے گا۔ اسے غصہ تو بہت آیا لیکن وہ اپنے حواس قائم رکھنا چاہتی تھی اور پھر وہ تازی کو بہرحال اس بحران میں ایک فریق سمجھتی تھی اس لیے اس کی طرف سے ایسے شدید رد عمل کی اسے توقع بھی تھی' روفی کو اس کے گھر چھوڑتے ہوئے وہ انہی خیالوں میں غرق تھی' تازی جس عجلت اور تیز رفتاری سے اس معاملے میں پیش قدمی کر رہا تھا اور جس طرح ذہنی طور پر مستعد تھا یہ بات اس کے لیے خلاف توقع تو نہیں تھی لیکن اس نے اسے پریشان ضرور کر دیا تھا اسے یہ بھی علم تھا کہ شکست سے بچنے کے لیے اسے کس قدر جذباتی اعتدال اور اعصابی سکون کی ضرورت تھی۔ اپنی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے اس وقت یونی سے ملاقات کا پروگرام منسوخ کر دیا اور روفی کو اس کے گھر چھوڑ کر واپس کوٹھی چلی آئی۔ اس کے اسد بلڈنگ سے گھر تک پہنچنے میں بمشکل نصف گھنٹہ صرف ہوا ہوگا لیکن کوٹھی کے اندر لان کے کنارے تازی کی گاڑی دیکھ کر چند لمحوں کے لیے تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے' اندر پہنچ کر اس نے دیکھا تازی اور ممی' ڈیڈی کے کمرے میں تھے۔ اسے ایک لمحے کے لیے بھرپور اطمینان کا احساس بھی ہوا' اب تک اسے یہ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ اس موضوع پر تازی اور ڈیڈی کے درمیان کوئی بات ہوئی بھی ہے یا نہیں' آج قدرت نے ڈیڈی کے خیالات سمجھنے کے لیے ایک اچھا موقع فراہم کر دیا تھا۔ وہ تازی کی مستعدی پر حیران بھی تھی اور ڈیڈی کے خیالات سمجھنے کے لیے ایک اچھا موقع فراہم کر دیا تھا۔ وہ تازی کی مستعدی پر حیران بھی تھی اور ڈیڈی کی خاموشی پر بھی اسے معلوم تھا کہ گھر میں ہونے والی باتوں سے ڈیڈی بے خبر نہ تھے۔ وہ کبھی بے تعلق رہ بھی نہیں سکتے تھے۔ چند لمحوں بعد تازی کی آواز سنائی دی۔

"انکل میں شکست سے نہیں گھبراتا کیوں کہ میرا ایمان ہے کہ ناکامی دراصل کسی اس سے بھی بڑی کامیابی کا پیش خیمہ ہوتی ہے' میں تجزیے اور عمل پر یقین رکھتا ہوں' لوگ شکست کے خوف سے پاؤں توڑ کر بیٹھ جاتے ہیں لیکن میں اس لفظ سے نئی قوت حاصل کر کے منزل پر پہنچنے پر یقین رکھتا ہوں' لیکن میں پھر عرض کروں گا کہ جسے آپ ناکامی کہتے ہیں' اس کا بھی کوئی معیار ہونا چاہیے کوئی جواز ہونا چاہیے۔ آخر اسی ایک خام دلیل پر کہ چناں نے نسبت کے بعد ایک دوسرے نوجوان کو پسند کر لیا ہے اور مجھے مسترد کر دیا ہے میں کیسے اپنی شکست تسلیم کر لوں۔ میری شکست کا سامان تو اس صورت میں ہو سکتا تھا اگر میری ذات میرے کردار میں کوئی کمی آتی یا میری زندگی میں کوئی ایسا بحران نمودار ہوتا جو مجھے ایک کمتر اور نااہل انسان ثابت کر دیتا---- اب تو میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ حالات اس کے برعکس ہیں' میرے صبر' میری ضبط سے ناجائز فائدہ اٹھایا جارہا ہے"

"میں تم سے متفق ہوں' میرے منہ سے لفظ شکست کا نکلنا دراصل میری اپنی مایوسی کو ظاہر کرتا ہے میں خود بھی یہ تصور نہیں کر سکتا تھا تازی کہ چناں اس طرح ایک ناقابل فہم قسم کی دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرے گی' لیکن تم جانتے ہو کہ خاندان اور گھر کی روایات کے بارے میں میری اپروچ کیا ہے' میں صدق دل سے اب بھی اس بات کا خواہاں ہوں کہ چناں تمہیں دل سے قبول کر لے لیکن موجودہ حالات میں اگر اس کے ذہن پر زیادہ دباؤ ڈالا گیا تو وہ نڈر اور بیباک ہوجائے گی۔ میں ایک باپ بھی ہوں' تم جانتے ہو ایک نہایت ذہین اور بالغ نظر بچی کو کسی ناشائستہ رویے اور نامعقول طرز عمل سے زندگی کے اہم ترین مسئلے پر مجبور کر کے رضا مند کرنا ایک باپ کو کسی حالت میں بھی زیب نہیں دیتا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلے کو پوری احتیاط اور آہستہ روی سے عقل و فہم کی تمام تر قوت کو بروئے کار لا

ر سلجھایا جائے"

"میں نے اس سے انکار تو نہیں کیا' میں خود بھی زبردستی زیادتی کا قائل نہیں ہوں' لیکن جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ چناں و۔ یونی عنقریب اپنی زندگی کے بارے میں کوئی فیصلہ کن قدم اٹھالیں گے۔ میرے پاس چناں کو اپنے حق میں ہموار کرنے کے لیے کوئی ِقت نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ میرے سامنے نظریں اٹھا چکی ہے اور اس کی نظروں اور لب و لہجے کی مہوتی اور بے حجابی نے مجھے یہ یقین ِلا دیا ہے کہ اگر میں نے اس موضوع پر اس کے ساتھ زیادہ الجھنے کی کوشش کی تو وہ رہی سہی شرم کو بھی خیرباد کہہ دے گی"

"تو اس صورت میں تمہارا فیصلہ کیا ہوگا!"

میرا فیصلہ تو وہی ہے جو پہلے تھا اور وہی رہیگا' تاوقتیکہ مجھے اس بات کا قائل کردیا جائے کہ میری طرف سے وہ کیا زیادتی ہوئی ہے جس کے جواب میں میرے ساتھ یہ سلوک کیا جارہا ہے۔"

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد برتن کھڑکنے کی آواز آئی' شاید ملازم چائے کے برتن سمیٹ رہا تھا۔ پھر ڈیڈی کی مایوسی میں دوبی ہوئی آواز سنائی دی' "اس آخری پانسے پر میں بہت مطمئن تھا اور سمجھ رہا تھا کہ یونی اور---- کیا نام ہے اس لڑکی کا---- راشدہ' ان دونوں کی ناقابل فہم وابستگی سے ہمیں اپنے مطلب کی کچھ چیزیں مل جائیں گی لیکن تمہاری باتیں سن کر مجھے مایوسی ہوئی ہے کہ دونوں کے تعلقات ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہیں"

"یہ بالکل درست ہے" تازی نے کہا" میں نے زندگی میں بے شمار لوگوں کو دیکھا ہے۔ میرا اپنا تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ ان دونوں کی باتیں سن کر میں صد فیصد اس فیصلے پر پہنچا ہوں کہ دونوں ایک پاکیزہ تعلق کے زیر سایہ ایک دوسرے کے ساتھ رہ رہے ہیں' اور یہ بات سمجھ میں بھی آتی ہے کیوں کہ راشدہ اس کی ہونے والی بھاوج ہے"

"لیکن عزیز' کچھ باتیں ایسی ہیں جو تم نہیں جانتے اور مجھے معلوم ہیں"

"انکل کیا آپ مجھے یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ یونی اور راشدہ کے درمیان کسی قسم کا قابل اعتراض تعلق ہے---- انکل میں آپ پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ حصول انصاف کی اس کشمکش میں جس میں میرا دامن ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہے کچھ ایسے گمرا کن مفروضوں کے سہارے آگے بڑھنے کی کوشش کروں جو میرا پنا کردار مسخ کردیں!"

"تم آخر کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ نہیں" تازی کی آواز میں ایک خفیف سا احتجاج تھا "صرف یہی کہ اس تمثیل میں مجھے دوسرے درجے کا کردار بنانے کی کوشش نہ کی جائے۔ یونی اور راشدہ کے کردار کی چھان بین بھی میرا مسئلہ نہ تھا لیکن آپ کے دیرینہ تجربے کی بنا پر میں نے اسے بھی گوارا کر لیا اگرچہ میں اسے پسند نہیں کرتا تھا اب جب کہ ان دونوں کے بارے میں میرا ذہن صاف ہوگیا ہے میں ان خطوط پر سوچنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ یونی کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے میں اس کے اور راشدہ کے کردار میں کیڑے نکالوں' یہ طرز عمل میرے تشخص اور انفرادیت کے منافی ہے"

"تو گویا دوسرے الفاظ میں تم مجھے یہ کہنے کی کوشش کر رہے ہو کہ میں تمہیں یونی اور راشدہ پر بہتان تراشی کے لیے اکسا رہا ہوں' بڑے افسوس کی بات ہے۔ کیا تم مجھ سے یہ توقع کرسکتے ہو؟"

"تو پھر یہ بات ہوگی کہ آپ میرے توسط سے یونی کے کردار کی جانچ پڑتال کرا کر مطمئن ہونا چاہتے ہیں کہ آیا وہ چناں کا ایک مثالی شریک حیات بننے کا اہل ہے؟ شاید ذہنی طور پر آپ نے اس فیصلے کو قبول کر لیا ہے کہ جلد یا بدیر آپ کو چناں کی ضد کے سامنے سرتسلیم خم کرنا پڑیگا"

"میں نے ابھی تک ایسا نہیں سوچا لیکن تمہاری بے سروپا باتیں یقیناً مجھے ایسے متبادل راستوں کی طرف لے جاری ہیں۔ میں سمجھتا

ہوں تم مایوسی اور فرار کی کیفیت کا شکار ہو چکے ہو' جب ہی تو شک و شبہات نے تمہارے ذہن کو پراگندہ کر دیا ہے۔"

تازی کے قہقہے کی آواز کے ساتھ ہی ڈیڈی کی آواز دوبارہ سنائی دی "تم آخر انسان ہو' میں سمجھتا ہوں ان حالات میں ایسی ذہنی کیفیت ایک قدرتی امر ہے لیکن تازی! حیرت تو مجھے اس بات کی ہے کہ مجھے اچھی طرح سمجھنے کے باوجود کہ خاندانی امور اور بنیادی رشتوں کے بارے میں میرے کیا خیالات ہیں تمہیں میری نیت پر شک کرنے کا خیال کیسے آیا؟"

"بخدا میں آپ کی نیت پر شک نہیں کر رہا لیکن حالات جس تیزی کے ساتھ ایک نیا رخ اختیار کر رہے ہیں اس کے بارے میں فکر مند ہوں خصوصاً ان حالات میں جب کہ آپ بھی کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانے سے گریز کر رہے ہیں۔ آخر آپ چناں سے کھل کر گفتگو کیوں نہیں کرتے۔ باپ کی حیثیت سے آپ کا یہ فرض ہے کہ اسے زمانے کی اونچ نیچ سمجھائیں آخر یہ ایک خاندانی مسئلہ ہے' صرف چناں یا میری پسند ناپسند کا سوال نہیں ہے"

"اگر میں نے براہ راست چناں سے بات کی تو مجھے معلوم ہے اس کا جواب کیا ہوگا۔ میں اس کا باپ ہوں اسے اچھی طرح سمجھتا ہوں' میں ہرگز اس پر کسی قسم کا ذہنی دباؤ ڈالنے کے لیے تیار نہیں ہوں' میں اس مسئلے کا کوئی ممکنہ حقیقت پسندانہ حل تلاش کرنے کا خواہاں ہوں۔"

"مثلاً"

"مثلاً اس طرح کہ حالات و واقعات کے آئینے میں اس بات کو ثابت کر دیا جائے کہ یونی' چناں کے لیے ایک مثالی شریک حیات ثابت نہیں ہو سکتا"

"اور اسی لیے آپ نے راشدہ اور یونی کے چال چلن کے بارے میں ایسی تحقیق کی ضرورت سمجھی؟ میں آپ کے انداز فکر کی نفی نہیں کرتا' اس سے کچھ نہ کچھ فائدہ حاصل ہو سکتا تھا۔۔۔ لیکن یہ کوشش ناکام ہوئی' لیکن میں پھر کہوں گا کہ اصل بات چناں کی ذہنی تبدیلی سے متعلق ہے' میرے خیال میں اس کے پاس اپنی ضد پر قائم رہنے کے لیے کوئی معقول جواز نہیں ہے!"

"تم بھول رہے ہو تازی' اس ڈرامے کا ایک اور اہم کردار عدیل آفندی بھی ہے۔۔۔ راشدہ کا منگیتر!"

"وہ تو یورپ میں ہے' شاید وہ عنقریب وطن واپس پہنچنے والا ہے اور اس کے بعد اس کی اور راشدہ کی شادی ہوگی"

"یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ وہ وطن واپس پہنچ رہا ہے یا نہیں میں نے جرمنی میں اس کے روز و شب کے بارے میں ایک مکمل رپورٹ حاصل کر لی ہے"

"لیکن اس کا چناں اور یونی پر کیا اثر پڑ سکتا ہے' میری سمجھ میں آپ کی یہ بات نہیں آئی"

" تمہیں فی الحال اس مسئلے پر زیادہ غور و فکر کی ضرورت بھی نہیں' جس قدر بھی ممکن ہو سکے خود کو نارمل رکھو۔۔۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میرے اپنے خاندان کا ایک لائق و فائق فرد ہونے کی حیثیت سے مجھے تم سے زیادہ کوئی عزیز نہیں ہے' تمہیں ایسی تشویش کی بھی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ چناں کا کوئی فیصلہ یک طرفہ طور پر تو پروان نہیں چڑھ سکتا اسے اپنا ہر فیصلہ منوانے کے لیے میری اور اپنی والدہ کی رضا مندی درکار ہوگی۔۔۔ اس کے علاوہ وہ کوئی اور قدم آزادانہ طور پر نہیں اٹھا سکتی' میں اپنی اولاد کی طبیعت اور ان کی حدود کو سمجھتا ہوں" پھر چند منٹ خاموشی طاری رہی' تھوڑی دیر کے بعد ڈیڈی اور تازی باہر برآمدے میں آئے اور سٹنگ روم میں چلے گئے۔ یہ کمرہ پورچ کے بالکل سامنے تھا اور آس پاس نوکروں کی آمدورفت تھی اس لیے چناں زیادہ دیر تک باہر برآمدے میں نہ ٹھہر سکی اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔

اس کا کمرہ کوریڈور سے ملحقہ اولین کمروں کے درمیان تھا جہاں دوپہر کے وقت بھی سورج کی موہوم سی روشنی پہنچ پاتی تھی اور اس

وقت تو صبح ہونے کی وجہ سے اندر مکمل تاریکی تھی وہ بستر پر لیٹ گئی تاریکی سے طبیعت گھبرائی تو اس نے دونوں دیواروں کا بلب اور ٹیوب روشن کر دیئے۔ چھت کی صاف شفاف سطح پر وہ تصویر ابھری--- دونوں طرف کے شیڈز نے تصویر کو کتنا واضح کر دیا تھا' روشنی کی لہروں میں اسے ایسے نظر آرہا تھا جیسے یونی کی آنکھیں حرکت کررہی ہیں اس کے ہونٹ لرز رہے ہیں۔ ٹیوب کی روشنی لہر در لہر اس کے بالوں پر پڑ رہی تھی اور ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے بال ہلکی ہلکی ہوا کے تھپیڑوں میں پریشان خیالات کے دھاگوں کی مانند الجھ رہے ہیں جیسے یونی کے سر پر اداسیوں کی فصل ہواؤں کے کربناک نوحوں میں سسک رہی ہو' کتنی روشنی تھی اس کی آنکھوں میں--- لیکن اس روشنی میں تاریکی کے کچھ ایسے دھبے بھی تھے جو بجھے ہوئے دل کے زخموں کی طرح سلگ رہے تھے ان کے وجود سے راکھ کی تہیں اتر رہی تھیں اور دھوئیں کی زہریلی لکیریں اٹھ رہی تھیں پھر اس نے دیکھا یونی کے لبوں پر ایک بڑی پراسرار سی مسکراہٹ پیدا ہوئی' اس سے اس پوٹریٹ کا پورا کینوس جگمگا اٹھا' وہ سب کچھ بھول کر مسحور سی ہوگئی اور سوالیہ نظروں سے یونی کے لبوں کو تکنے لگی' شاید اس کربناک لمحے میں وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا' یا اس سے کوئی سوال کرنا چاہتا تھا' وہ بہت دیر تک یونی کے چہرے کو تکتی رہی لیکن اس کی مسکراہٹ نے اس سے کوئی سوال کیا اور نہ کوئی بات کہی--- وہ سوچنے لگی یہ مسکراہٹ تو خوش فطرتی کی ایک کرن ہے--- امید کا وہ روشن ستارہ یونی کے تشخص کی علامت ہے--- پھر--- پھر اسے ایسے محسوس ہوا جیسے کمرے میں روشنی کم ہورہی ہے--- روشنی بتدریج کم ہوتی چلی گئی حتیٰ کہ اس میں ظلمت کے پتنگے ناچنے لگے شاید یونی کی پوٹریٹ پر مسلسل نظریں جمائے رکھنے سے اس کی بصارت تعطل کا شکار ہو رہی تھی۔

"یہ تصویر--- یہ پوٹریٹ" وہ زیر لب بڑبڑانے لگی "شاید کینوس سے باہر آرہی ہے--- شاید وہ کسی روشن ستارے کی طرح آسمان سے زمین پر اترنا چاہتی تھی' پھر وہ تصویر بام کی سطح سے الگ ہوگئی--- لیکن فضا میں معلق ہوگئی--- تاریکیوں کے ہیولے اس کے گرد رقص کرنے لگے' روشنی کی تاریں ٹوٹ ٹوٹ کر آس پاس بکھرنے لگیں' اس کی آنکھوں کے گرد تاریکی کے دائرے بنتے چلے گئے اور اس نے بانہہ اپنی آنکھوں پر رکھ لی' روشنی کے دونوں بٹن دبا دیئے' شاید کمرے میں بالکل اندھیرا چھا گیا تھا لیکن اپنی بند آنکھوں کے دریچوں سے اس نے تا حد نظر روشنی کی فصلیں لہلہاتے ہوئی دیکھیں--- زمین و آسمان روشنی سے منور تھے' ہر چیز روشنی کی بنی ہوئی تھی' کیا اس روشنی کو کمرے کی اتھاہ تاریکی نے جنم دیا تھا؟ لیکن پوٹریٹ کہاں تھی--- یونی کہاں تھا؟

دروازے پر دستک ہوئی' خادمہ کمرے میں داخل ہوئی' "اوئی اللہ چناں بی آپ تو کمرے میں اندھیرا کیے بیٹھی ہیں" اس نے بلب روشن کیا "ناشتے کے لیے آپ نے پوچھا ہی نہیں!" اس نے ٹرے میز پر رکھدی اور غور سے چناں کی طرف دیکھنے لگی۔ چناں نے اٹھ کر آس پاس دیکھا' اپنے حواس مجتمع کرنے کے لیے کچھ وقت درکار تھا' پھر بھی اچانک اس کے منہ سے یہ جملہ نکل گیا۔

"تازی میاں چلے گئے؟"

"جی وہ تو بہت دیر پہلے صاحب کے ساتھ ہی چلے گئے--- پر آپ کو....."

"اچھا-- یہ ناشتہ تم لے جاؤ... میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں' ڈسٹرب نہیں کرنا ہاں---!"

"خادمہ کمرے سے باہر نکل گئی' اب اس کی ذہنی کیفیت اعتدال پر آگئی تھی' اسے ڈیڈی کے خیالات کا علم ہوگیا تھا' وہ پہلے بھی گھر کے افراد کے بارے میں ایسی پر امید نہیں تھی' لیکن پھر بھی دل کے کسی کونے کھدرے میں امید کی چند سسکتی ہوئی کرنیں اس کا حوصلہ بڑھایا کرتی تھیں کہ والدین جو اولاد کو جنم دیتے ہیں ان کی روحیں ضرور کسی نہ کسی واسطے سے اولاد کے جذبوں سے منسلک ہوتی ہیں' اگر بچے سچے جذبے اور نیک نیت کے ساتھ ان کو آواز دیں تو وہ ضرور موم ہوجاتی ہوں گی لیکن یہاں تو ایک پلان تھا۔ ایک اپریشن تھا جس کو پائیہ تکمیل تک پہنچایا جارہا تھا' دل کی اس ننھی سی کٹیا کو نذر آتش کرنے کے لیے کیا کیا کچھ کیا جارہا تھا' وہ سوچنے لگی اس معاشرے میں عورت کی کمزور ہستی کبھی کبھی فکر کی پوری آزادی کے ساتھ اپنی زندگی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکتی وہ کچھ بھی تو نہیں

کر سکتی' ڈیڈی کی باتیں اس کے ذہن میں گونجنے لگیں وہ اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن حالات کا رخ اس کے خلاف موڑ کر اسے شکست دینا چاہتے تھے' کس لیے ـــ؟ ـــ وہ معاشرے کی صدیوں کی ریت اور روایت بھانا چاہتے تھے جس کے مطابق نوجوان لڑکیاں اپنے بزرگوں کے دماغ سے سوچتی اور انہی کی آنکھوں سے دیکھتی ہیں' لیکن کیا ایک لڑکی سوچ اور قوت فیصلہ کے اعتبار سے اتنی حقیر اور بے وقعت ہوتی ہے کہ اس کے فیصلے کو بلاجواز مسترد کر دیا جائے۔ اس کے دل سے کوئی آواز اٹھ رہی تھی کہ والدین کبھی اولاد کے دشمن نہیں ہوتے۔ وہ کبھی اولاد کا برا نہیں چاہ سکتے۔ شاید وہ اپنی اولاد سے اس درجہ محبت کرتے ہیں کہ ہر دم اس خوف میں مبتلا رہتے ہیں کہ ان کے بچے کہیں عدم تحفظ کا شکار نہ ہو جائیں۔ بچے راستی اور ذہانت کی آخری حدود کو بھی چھولیں تو والدین انھیں اس نظر سے دیکھنا بند نہیں کرتے جس سے وہ انھیں پنگھوڑے میں انگوٹھا چوستے ہوئے دیکھتے ہیں شاید انھیں کبھی یقین نہیں آتا کہ ان کی اولاد جسمانی ہی نہیں ذہنی طور پر بھی بلوغت کی منزلیں طے کر چکی ہے اور یہ کہ ان کے بوڑھے ذہنوں سے کہیں زیادہ اس کے ذہن میں تازگی اور ندرت ہے۔ وہ سوچنے لگی' اگر ڈیڈی حالات کی تلوار کو صرف ایک بے معنی خاندانی روایت کے تحفظ کے لیے اس کے خلاف استعمال کرنے کے درپے ہیں تو وہ بھی اپنے دل و دماغ کو پوری قوت کے ساتھ ان حالات کا مقابلہ کرے گی وہ اور یونی کسی اعتبار سے بھی خام' کم فہم یا کمتر نہیں ہیں' ان کے دل سچی چاہتوں سے لبریز ہیں جن میں کسی کے لیے بغض' نفرت یا عناد نہیں ہے خود اعتمادی کی ایک نئی لہر نے اس کے دماغ کے تاریک گوشوں کو منور کر دیا۔ وہ سوچنے لگی ڈیڈی مجھ سے بات کرتے ہوئے گھبراتے ہیں تو اس کی وجہ محض یہی ہے کہ وہ یقین رکھتے ہیں کہ انھیں میری ریزن کے سامنے جھکنا پڑے گا' اور باپ ـــ خدا کے مثیل وہ ہستی جو اولاد کی پرورش کرتی ہے اسے زندگی کا شعور اور خود اعتمادی بخشتی ہے' وہ کبھی میری خوشیوں کے دشمن نہیں ہوسکتے ـــ اعتماد اور یقین کی لہریں اس کے خیالوں میں ستاروں کی طرح جگمگانے لگیں' وہ ایک غیر معمولی لڑکی تھی' اسے خود پر اعتماد تھا تو اپنے والدین پر بھی فخر تھا جنھوں نے اسے زندگی کا بھرپور شعور اور ادراک بخشا تھا' غم کا بوجھ کچھ ہلکا ہوگیا جذبات اعتدال پر آگئے اور اس کیفیت میں ایک بے ضرر اور ہلکے پھلکے تاثر نے جگہ لیکر اس کی ذہنی کیفیت کو نارمل کر دیا۔ وہ چند لمحوں کے لیے خود کو بالکل ایک بچی سی محسوس کرنے لگی جو ڈیڈی کی انگلی پکڑ کر باہر چمن کی روشوں پر سیر کے لیے جایا کرتی تھی۔ اسے یقین سا ہوگیا جیسے ماحول کی کوئی چیز اس کے خلاف حرکت نہیں کر سکتی جیسے روئے زمین پر کوئی اس کا دشمن اور مخالف نہیں تھا اور ماں باپ تو ہرگز نہیں تھے وہ سوچنے لگی' حالات کہاں تک اس کے خلاف جاسکتے ہیں۔ تازی کو بھی امکان بھر کوشش کرنے کی اجازت ملنی چاہیے۔ آخر وہ اس تنازعے کا ایک فریق ہے' وہ خود کو بہت معقول انسان خیال کرتا ہے۔ اسے اپنی معقولیت کے سارے گر آزما کر دیکھ لینے کا موقعہ ملنا چاہیے۔

یونی کا فون غیر متوقع نہیں تھا۔ اس شام اس نے راشدہ کے ساتھ ایک پارٹی میں جانا تھا' جہاں چند آرٹسٹوں نے اپنی کچھ منفرد تصویروں کی نمائش اور ایک مختصر سی تنقیدی نشست کا اہتمام کیا تھا' تاہم اس نے یہ ضرور محسوس کیا کہ یونی کی آواز میں وہ مسرت آگیں لہر نہیں تھی جو اس سے ہم کلام ہوتے ہوئے وہ ہمیشہ اس کے لب و لہجہ میں محسوس کرتی تھی' گیراج سے گاڑی باہر نکالتے ہوئے اس نے آسمان کی طرف دیکھا' سیاہ بادل جھکے ہوئے تھے اور فضا میں ایک عجیب قسم کی اداسی تھی۔ ہوا ساکن تھی' راستے میں اس نے ہجوم اور ٹریفک کے اژدہام میں بھی ایک منجمد سی کیفیت اور سکوت کا احساس کیا' شاید وہ ماحول میں پیدا ہوجانے والی عارضی سی اجنبیت سے خوف زدہ ہوگئی تھی' اس کے ذہن میں عجیب قسم کے اندیشے ابھرنے لگے' وہ کچھ دنوں سے گھر کے ماحول میں تنہا اور علیحدہ سی زندگی بسر کرنے کی عادی بن گئی تھی' شاید اس نے اسے اوہام پرست بنا دیا تھا انہی خیالات کے الجھے دھاگے سلجھاتے وہ اسد بلڈنگ پہنچی تو خلاف معمول باہر طویل پورچ کے سامنے مختصر سے پلاٹ میں یونی کو کھڑے ہوئے دیکھا' وہ گاڑی پارک کر کے وہاں پہنچی ـــ اور پھر ـــ وہ اسے دیکھتی رہ گئی' گھنگھور گھٹاؤں نے سہ پہر کے اجالے کو جیسے نگل لیا تھا' پھر ایک خوفناک کڑک کے ساتھ بجلی چمکی اور اس

کا دل ڈوبنے لگا' یونی کا چہرہ پیلے زرد پھول کی طرح بے آب دکھائی دے رہا تھا آنکھوں میں ویرانی' سرد ہوا کے تھپیڑوں میں اس کی گردن کے مسام ابھرے ہوئے خوف زدہ سے نظر رہے تھے۔

"کیا ہوا یونی--- کیا حالت بنا رکھی ہے! اس نے پوچھا یونی کچھ دیر خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا' پھر غور سے اسے دیکھنے لگا' چناں نے اس نظروں میں بے بسی کی ایک دل سوز کیفیت دیکھی تو وہ ضبط نہ کر سکی' "کیا بات ہوئی یونی؟" "وہ بولی "بتاتے کیوں نہیں؟" اور یونی نے اسے بتایا کہ رات سے راشدہ کی طبیعت سخت خراب ہے۔ اسے ہسٹریکل فٹس ہو رہے ہیں۔ تیز بخار میں بے ہوش پڑی ہے رات اس کے بھائی اور بہن بھی آگئے تھے' اسے ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا ہے

"لیکن پرسوں تو وہ اچھی بھلی تھیں"

"پرسوں شام سے ہی اس کی طبعیت خراب ہے' اسی شام گھر اطلاع کر دی گئی تھی"

"لیکن اتنی جلدی یہ کیوں کر ہوا--- کیا وہ پہلے سے ہی بیمار تھی؟"

"نہیں اس کی طبعیت اچانک خراب ہوئی ہے!" یونی بولا---

"حیرت ہے---!؟ وہ بولی "آؤ ہسپتال اسے دیکھنے چلیں"

لیکن یونی اس وقت ہسپتال کے لیے تیار نہ تھا' وہ اس وقت اپنے کمرے میں بھی جانے کے لیے تیار نہ تھا چناں نے دیکھا اس کا چہرہ ایک خوفناک تحیر کے بوجھ تلے پسا چلا جارہا تھا' ایسے معلوم ہوتا تھا وہ اس وقت اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔ ایک زور دار گرج کے ساتھ بارش کی بوندیں اتر آئیں پھر دیکھتے ہی دیکھتے بارش تیز ہوگئی لیکن یونی پلاٹ میں کھڑا رہا' بھیگتا رہا اور وہ بھی اس کے سامنے کھڑی بھیگتی رہی پھر اس نے یونی کو بازو سے پکڑا اور اسے تقریباً گھسیٹتی ہوئی بالائی منزل کی سیڑھیاں چڑھنے لگی' یونی کا جسم بھی آگ کی طرح تپ رہا تھا' شاید وہ بخار میں پھنک رہا تھا' اس نے جلدی سے اسے بستر میں لٹا دیا وہ ابھی تک کچھ بھی سمجھ نہ پائی تھی کہ ان اڑتالیس گھنٹوں میں یہ سب کچھ کیا ہوگیا تھا' وہ اس کے پلنگ کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔ "یونی--- مجھے بتاؤ نا--- کوئی ایسی بات ہوئی ضرور ہے جس نے تم دونوں کو اتنی زبردست تبدیلیوں سے دوچار کردیا ہے' بیمار ڈال دیا ہے" یونی کچھ دیر سر تھامے نیم دراز رہا پھر ہنسنے لگا' ہنستے ہنستے اس کا چہرہ ایک منجمد اور مردہ سی مسکراہٹ کی تصویر بن گیا۔

"چناں یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے کہ بھائی عدیل یورپ گئے ہوئے ہیں"

"ہاں معلوم ہے!"

"اور یہ بھی معلوم ہے کہ آئندہ ماہ عدیل بھائی اور راشدہ کی شادی ہونے والی تھی"

"تم بات بتاؤ مجھے سب معلوم ہے"

"میرا خیال ہے تمھیں شاید یہ معلوم نہیں کہ راشدہ عدیل کو کتنا چاہتی تھی' وہ ان پر جان دیتی تھی عدیل بھائی کی واپسی کے لیے اس نے پورا ایک سال آنکھوں میں کاٹ دیا۔ شدت انتظار میں اس نے اپنے بیقرار جذبوں کو خوبصورت تصویروں کے رنگوں میں اتار دیا۔ اس نے میری بھی اس لیے بے پناہ خدمت کی کہ اسے میرے انفاس اور میرے ملبوسات سے عدیل بھائی کی مہک آتی تھی۔ وہ اپنے اور عدیل بھائی کے تعلق کو محض ہونے والے میاں بیوی کے ناطے سے نہیں بلکہ دو روحوں کے ایک جسم میں سما جانے کا نام دیتی تھی۔

"مجھے اس کا کسی حد تک اندازہ ہے یونی' تم مجھے اصل بات بتاؤ"

"عدیل بھائی نے جرمنی میں شادی کر لی ہے' اب ان کا ارادہ بھی واپس وطن آنے کا نہیں ہے"

چناں سکتے میں رہ گئی اور یونی بولتا چلا گیا "عدیل نے راشدہ کو ایک طویل خط لکھا ہے۔ منگنی منسوخ کرنے پر معذرت کرتے ہوئے اس نے کچھ باتیں لکھی ہیں' لو تم بھی پڑھ لو---" اس نے تکیے کے نیچے سے خط نکال کر چناں کی طرف بڑھایا۔ عدیل نے لکھا تھا کہ ہم

مغربی تہذیب کو زیادہ پسندیدگی سے نہیں دیکھتے ہماری طبائع مغربی لوگوں کی ثقافت سے میل نہیں کھاتیں لیکن میں نے یہاں آکر کم از کم ایک بہت بڑا اثر اور ایک بہت بڑی بات قبول کی ہے اور وہ ہے اپنے ذہن اور دل کیساتھ پوری سچائی اور دیانتداری سے سوچنا یہاں پہنچنے کے بعد میں نے محسوس کیا جیسے میں ابتک ایک مصنوعی انسان تھا۔ جو کچھ بھی سوچتا تھا اور جو کچھ بھی کرتا تھا اس میں میرے حقیقی طبعی میلانات کا بہت کم دخل تھا' مجھے موسیقی اور سیر و سیاحت سے عشق تھا لیکن میں نے اپنے ماحول میں کسی بھی انسان کو اپنا ہم ذوق اور ہم خیال نہیں پایا۔ حتیٰ کہ راشدہ کو یک سنگی اور یاس پرست لڑکی کی حیثیت سے میں نے کبھی دل سے قبول نہیں کیا۔ میں اس کی خوش سیرتی سے متاثر ضرور رہا ہوں' اور اس سے شادی کرنے کے خاندانی فیصلے کے آگے بھی میں نے تکلفاً سر جھکا دیا تھا لیکن یہاں آکر میں نے سوچا اور پوری دیانتداری سے محسوس کیا کہ اگر میں نے راشدہ سے شادی کر لی تو میں اسے کوئی خوشی نہیں دے سکوں گا۔ بلکہ یہ ایک طرح سے اس پر ظلم ہوگا۔ کیوں کہ میرے اور اس کے درمیان باہمی دلچسپی' پسند ناپسند کی کوئی بات بھی تو ایسی نہیں ہے جو ہماری دائمی رفاقت کا جواز مہیا کر سکے۔ اس کے برعکس میں نے کھلے دل اور کھلے ذہن کے ساتھ یہ سوچا ہے کہ راشدہ کے لیے کوئی ایسا انسان ہی موزوں ثابت ہوسکتا ہے جو اس کی چوائس اور ٹیسٹ کے معیار پر صد فیصد پورا اترتا ہو' میں نہ راشدہ کو مجبور کر سکتا ہوں اور نہ یونس کو۔۔۔ بہرحال ان حالات میں دونوں اپنے اپنے بارے میں وہ کوئی بھی موزوں ترین فیصلہ کرنے میں آزاد ہیں جس کے لیے انھیں میری تائید و حمایت حاصل ہوگی۔ چوں کہ میں نے خاندانی روایت سے منحرف ہو کر ایک غیر متوقع فیصلہ کیا ہے جو میری اپنی زندگی کے لیے انتہائی خوشگوار ثابت ہوگا اس لیے میں فی الحال اپنے خاندان کے بزرگوں کا سامنا کرنا نہیں چاہتا۔ وہ خوش رہیں اور میں چاہتا ہوں کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

"چناں خط پڑھ چکی تو یونی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ شاید وہ چناں کا رد عمل جاننا چاہتا تھا

"یہ تو انتہائی خود غرضی اور صریح فریب ہے!" وہ بولی "راشدہ کے ذہن پر اس کے نہایت خوفناک اثرات مرتب ہوں گے"

"اس صدمے نے اس کی ناتواں زندگی کو کٹی ہوئی شاخ کی طرح زمین پر ڈھیر کر دیا ۔۔۔ چناں وہ ایک عظیم اور نہایت کومل جذبات رکھنے والی لڑکی ہے' وہ مرجائے گی!"

"مایوس نہیں ہونا چاہیے یونی۔۔۔ وقت بڑے بڑے زخم مندمل کر دیتا ہے' ایک ترقی یافتہ ذہن کی لڑکی کہاں تک ایک بیوفا مرد کی یادوں کو اپنی زندگی کا روگ بنا سکتی ہے' آخر ایک روز اسے اس فضول اور بے معنی صدمے کو اپنی روح سے جھٹک کر خود کو پہچاننا ہوگا' ہم اس کی مدد کریں گے یونی اس کے ذہن کو اس صدمہ عظیم سے بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے"

"عدیل نے ہمارے پورے خاندان کو ایک شرمناک احساس ندامت سے دوچار کر کے رکھ دیا ہے۔ میں تمھیں بتا نہیں سکتا کہ میں راشدہ اور اس کے خاندان کے سامنے کس قدر شرمندہ ہوں' عدیل کے اس جرم کی پاداش میں راشدہ کے خاندان سے ہمارا قطع تعلق ہوگیا ہے انھوں نے مجھے راشدہ کو دیکھنے اور ملنے کی اجازت بھی نہیں دی"

"اس میں تمھارا کیا قصور ہے بھلا یونی۔۔۔ وقتی طور پر چوں کہ انھیں تمھارے بھائی یا دوسرے معنی میں تمھارے خاندان سے سخت صدمہ پہنچا ہے اس لیے فی الحال وہ تمھارا سامنا نہیں کرنا چاہتے۔ راشدہ صحت یاب ہو جائے تو تمھارے بارے میں ان کے خیالات بدل جائیں گے"

لیکن راشدہ کی طبیعت بہتر نہ ہوسکی' ہسٹریائی دوروں نے اس کی ذہنی کیفیت مفلوج کر کے رکھ دی وہ ایک ماہ کے عرصے میں اس قدر کمزور ہوگئی کہ اس کمزوری کی وجہ سے اس کی ٹانگیں مفلوج ہوگئیں جسم میں تشنج کے دوروں کی وجہ سے وہ بستر پر حرکت کرنے سے بھی معذور ہوگئی جس کی وجہ سے پیٹھ پر زخم کا نشان ابھر آیا' ڈاکٹروں نے اسے لاعلاج قرار دے دیا۔ چند ایک نے یہ امید دلائی کہ اگر ہمدردی' پیار' محبت کے ساتھ ساتھ اسے جدید ترین علاج کی سہولتیں فراہم کی جائیں تو اس کی حالت کسی قدر بہتر ہوسکتی ہے۔ عدیل نے

راشدہ کے والدین کو یقین دلایا کہ وہ ایک انسان کی حیثیت سے ان کا ہمدرد و غم خوار ہے اور اسے پوری توجہ اور دیکھ بھال سے راشدہ کے علاج میں مدد دینے کی اجازت دی جائے۔ اس نے راشدہ کی تیمارداری اور علاج معالجے میں دن رات ایک کردیا۔ چند ماہ میں راشدہ کی کھوئی ہوئی جسمانی تندرستی تو کسی حد تک بحال ہوگئی لیکن اس کی ٹانگیں ہمیشہ کے لیے ناکارہ ہوگئیں۔

راشدہ کی بیماری کے دوران یونی اگرچہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا پھر بھی چناں کی طرف سے غافل نہیں رہا یہ دوسری بات تھی کہ چناں اس صورت حال کو انتہائی تشویشناک نظروں سے دیکھ رہی تھی' اسے راشدہ سے پوری پوری ہمدردی تھی لیکن یونی نے جس طرح اپنی ذات کو راشدہ کی دیکھ بھال اور علاج معالجے میں منتشر کر دیا تھا چناں کے لیے یہ بات بڑے دکھ کا باعث تھی۔ یونی کی شخصیت یکسر بدل گئی تھی' اس نے اپنی صحت بھی تباہ کرلی تھی' ادھر چناں کے گھر کے حالات روز بروز تشویشناک ہورہے تھے' پچھلے چند ماہ میں اس کی والدہ سخت بیمار ہوگئیں اور گھر کے معاملات میں اس قدر الجھی کہ زندگی کا پورا شیرازہ بکھرتا نظر آنے لگا' زندگی سے سکون پرور لمحات رخصت ہوگئے تھے۔ اس سے قبل چناں نے زندگی کے دکھوں کو اتنے قریب سے کبھی نہ دیکھا تھا' یونی کو دیکھ کر اسے اندازہ ہوا تھا کہ زندگی کے بکھرے ہوئے ملبے کی شیرازہ بندی کے لیے انسان کو اپنی روح پر کیسے کیسے زخم کھانے پڑتے ہیں' اس نے زندگی کی بے حسی کو بھی دیکھا۔ بیوفائی اور سنگ دلی کو بھی قریب سے محسوس کیا۔ پھر خود بھی ان تجربات سے گزری جہاں انسان دوسرے انسان کی ذات کا ناقابل علیحدہ حصہ بن جاتا ہے۔ اس نے بنیادی جذبوں کی تڑپ' حرارت اور تمازت کا بھی نئے ادراک اور نئے شعور کے ساتھ ذائقہ چکھا' اس نے یہ بھی دیکھا کہ اپنے راستے کے کانٹے چننے میں تو انسان اپنی عافیت اور تحفظ کا بندوبست کرتا ہے لیکن دوسروں کے دکھ درد اپنے سینے میں بسا کر انسان کس طرح اپنی اور خدا کی ذات پاک کے روبرو سرخرو ہوتا ہے۔

راشدہ چلنے پھرنے سے معذور ہوگئی تھی لیکن یونی کی مسلسل دیکھ بھال نے اس کے تن مردہ میں جان ڈال دی تھی اس کی کھوئی ہوئی صحت بھی بڑی حد تک بحال ہوگئی تھی' چناں دیکھ رہی تھی کہ یونی کے چہرے کی رونق بھی لوٹ آئی تھی' گزشتہ تین ماہ میں اس نے محسوس کیا تھا جیسے زندگی ایک بیزار کن مقام پر آکر ٹھہر گئی ہے انجماد کی کیفیت نے اس کے فکر کے سوتوں کو خشک کر کے رکھ دیا تھا' بہار کے دن آئے تو سوچوں اور جذبوں نے انگڑائی لیکر آنکھیں کھولیں' زندگی میں کچھ حرکت کا احساس ہوا' راشدہ کے بھائی تو جا چکے تھے لیکن اس کی بہن اس کی خبرگیری کے لیے اس کے ساتھ ہی رہنے لگی تھی' یونی اب اس گھر میں ایک مستقل فرد کی حیثیت رکھتا تھا' تاہم چناں کے ساتھ اس کا رابطہ کبھی منقطع نہ ہوا اگرچہ اس دوران میں چناں نے دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا جیسے آزمائش' دکھ اور اندوہ کے ان لمحوں نے اسے چیزوں کو دیکھنے اور پرکھنے کی ایک نئی کسوٹی' ایک نیا پیمانہ دیا ہے' ایک عجیب کیفیت اس کے دل و دماغ کا احاطہ کیے ہوئے تھی' جیسے اس کے چہار اطراف کی دنیا یا تو بالکل بدل گئی تھی' اس کے دل و دماغ نے نئی سمتوں کی طرف پرواز شروع کر دی تھی' زندگی سے والہانہ پیار کے وہ جذبے رخصت ہوگئے۔ کبھی کبھی اسے خود سے بھی کچھ اجنبیت کا احساس ہوتا۔ جیسے وہ سوچ رہی تھی کہ زندگی کا مفہوم وہ نہیں ہے جو وہ ابتک سمجھتی رہی ہے' ممی کی علالت کی وجہ سے گھر کی متحرک زندگی میں ایک مستقل ٹھہراؤ پیدا ہوگیا تھا' جمود سا طاری تھا' تازی بھی آتا تھا لیکن چند ماہ پہلے جو کشش تھی وہ اب کہیں نظر نہ آتی تھی' اسے ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے چند ماہ پہلے جو جذبے چیختے چلاتے سب کی نیندیں حرام کیے ہوئے تھے وہ سکون کی نیند سو گئے ہیں' رات بھر موسلادھار بارش ہوتی رہی تھی۔ دن بھر بھی آسمان پر بادل چھائے رہے لیکن چناں کی طبیعت کسی جگہ بھی قرار محسوس نہیں کر رہی تھی آج یونی نے اسے خاص طور پر مدعو کیا تھا' راشدہ نے اپنی کوٹھی میں بچوں کے لیے ایک اسکول قائم کیا تھا اس روز اس کا افتتاح تھا' اور راشدہ کے اصرار پر اس اسکول افتتاح یونی کے ہی ہاتھوں ہورہا تھا چناں نے اس تقریب میں شرکت کی' آج اس نے یونی کے چہرے پر پہلی مرتبہ ایک ایسی کیفیت دیکھی' جو کبھی روحانی مسرت کا آئینہ دار ہوتی ہے' لیکن ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے اس روحانی مسرت کے حصول کے لیے یونی نے اپنے دل کے

ٹکڑے کر دیئے ہیں' اپنی سوچوں کے مجسمے پاش پاش کر دیئے ہیں۔ وہ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس موقعے پر اپنی مسکراہٹ کی ایک ایک کرن روشن کرنے کے لیے وہ اپنے خون کی ایک ایک بوند جلا رہا ہے' اس کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی' آنکھوں میں زندگی کی جوت بجھی ہوئی تھی لیکن چہرے پر مسکراہٹ تھی' ایک ایسی مسکراہٹ جو جذبوں کی مقتول لاشوں کے نیچے دم گھٹ کر بھی زندہ رہتی اور حرکت کرتی ہے۔

وہ تقریب کے بعد چناں کو گھر چھوڑنے کے لیے اس کے ہمراہ کوٹھی آیا۔ چناں گاڑی سے اتری تو وہ اس کے ساتھ ہی پورچ تک چلا آیا۔ "ایک بات کہہ دوں چناں!" اس نے کہا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے سر جھکا لیا۔ "ہاں کیوں خاموش کیوں ہوگئے؟" وہ بولی

"میرا خیال ہے ہم زندگی کا مفہوم آج چند ماہ پہلے کی نسبت بہتر سمجھ رہے ہیں ایک دفعہ میں نے تم سے درخواست کی تھی کہ اپنی شخصیت کی تکمیل کے لیے مجھے تمہاری ضرورت ہے اور تم نے کہا تھا کہ کسی دوسرے انسان کی ذات کی تکمیل کرنا ایک خدائی صفت ہے۔ میں تمہارا ممنون ہوں چناں کہ تم نے میری ذات کی تکمیل کر دی' تمہاری محبت نے مجھے ایک ایسا انمول تحفہ دیا جس نے مجھے انسانیت کا دلنواز درد بخشا' یہ درد تو پہلے بھی میرے دل میں موجود تھا لیکن اس درد کی تزئین و آرائش کے لیے تم نے اپنے انمول جذبوں کا لہو میری ذات کی نذر کیا۔ آج میں اس چراغ سے ایک نیا چراغ روشن کر رہا ہوں۔ --- میں راشدہ سے شادی کر رہا ہوں آج مجھے اپنے کہے ہوئے ایک جملے کا صحیح مفہوم معلوم ہوا ہے' انسان اپنے لیے تو جیتا ہے' اگر دوسرے کے لیے متحرک قوت بن کر جیئے تو اس کی انسانیت آفاق کے کناروں تک سربلند ہی نہیں سرخرو بھی ہوجاتی ہے"چناں خاموش کھڑی اسے دیکھتی رہی' اس نے اپنے لب کھولنے کی کوشش کی لیکن کوئی حرف اس کے ہونٹوں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔

"بس ---!" یونی بولا "اگر میری اس بات کے جواب میں تم نے ایک لفظ بھی کہا تو میری آنکھوں سے آنسو نکل آئیں گے' اور میں یہ نہیں چاہتا --- میں یہ نہیں چاہتا چناں!" چناں نے اپنے ہونٹ اس طرح بھینچ لیے جیسے کسی غیر مرئی طاقت نے ان پر مہر لگا دی ہو' اس نے یونی کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر خون کی عارضی تمازت کی لہریں موجزن تھیں' اس کے چہرے پر ایک ہنستی ہوئی مسکراہٹ تھی' غیرارادی طور پر اس کے دونوں ہاتھ چناں کے بازوؤں کی طرف بڑھے لیکن کسی فوری خیال کے تحت اس نے اپنے ہاتھوں کو کھینچ کر بھنچی ہوئی مٹھیاں اپنے سینے سے لگا لیں' چناں اسے دیکھتی رہی۔ غور سے تکتی رہی' پھر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا گیٹ کی طرف بڑھنے لگا چناں نے محسوس کیا جیسے اس کے دل کے تمام جذبے' تمام سوچیں یونی کے ہمراہ ہوگئی ہیں اور وہ ان کے جلو میں ایسے چلا جارہا ہے جیسے کوئی بارات روشنیوں کے جلو میں رخصت ہوتی ہے۔ اس کا وجود خالی تھا' جذبات اور احساسات یونی کے ساتھ چلے گئے تھے۔ پھر گیٹ کے اندر گاڑی داخل ہونے کی آواز آئی۔ اس نے دیکھا تازی گاڑی سے اترا اور اس کے قریب آگیا۔شاید وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ "کھنڈروں میں بسیرا کرنے والوں کے پاس کیا ہوتا ہے تازی ---"

"کھنڈروں کو خوبصورت ایوانوں میں تبدیل کیا جاسکتا ہے چناں!"

زندگی کو کھنڈر سے تشبیہ دینا کفران نعمت ہے' زندگی تو خدائے بزرگ و برتر کی رحمت کی انتہا ہے ---!!"

وہ کوٹھی کے اندر چلا گیا' چناں نے نظریں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ گھٹائیں تلی کھڑی تھیں' بارش ہونے لگی' وہ چند منٹ بارش میں کھڑی بھیگتی رہی' پھر اپنے کمرے میں چلی آئی' پلنگ پر بیٹھ کر اس نے داہنی دیوار کی روشنی کا بٹن دبایا' چھت پر روشنی کی چکاچوند پیدا ہوئی۔ وہ پوٹریٹ ہلکے ہلکے اندھیرے میں سانس لے رہی تھی۔ چھت کے سینے سے پانی کے قطرے آنسوؤں کی طرح رس رس کر اس پوٹریٹ کی آنکھوں میں جمع ہو رہے تھے اور پھر --- چناں نے اپنی کھلی ہوئی ہتھیلی پر ان قطروں کو برستے ہوئے محسوس کیا --- "یہ کیا! تم تو کہتے تھے میری آنکھوں سے آنسو نہیں نکلیں گے ---؟" یونی کی پوٹریٹ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تو اپنی تکمیل پر خوشی کے آنسو بہا رہی تھی۔

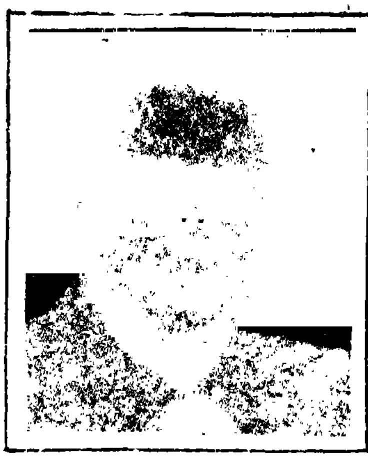



پاکستان کی واحد پروڈکٹ
ڈنٹونِک
جسے اعلیٰ ترین کوالٹی کی بنیاد پر "یورپین کوالٹی ایوارڈ" دیا گیا۔ واضح رہے کہ یہ بین الاقوامی اعزاز اب تک پاکستان میں صرف ڈنٹونِک کو ملا ہے۔ اس سے آپ خود ڈنٹونِک کی خوبیوں اور اسکی عالمگیر شہرت کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں۔
ڈنٹونِک
دُنیا کا مُفید ترین ٹوتھ پاؤڈر
EUROPEAN AWARD
ALA CHEMICALS
Dentonic
POWDER
ala
اعلیٰ کیمیکلز پوسٹ بکس 2110 کراچی 74600

ڈاکٹر ستیہ پال آنند

پُشتہا پُشت زہر پھُوٹے گی

• مُصنّف نے 'زہر' کو مؤنّث استعمال کیا ہے



''اور میں تمہارا خداوند
خدائے برتر
قہّار اور جبّار بھی ہوں
اور -------
باپ دادا کے گناہوں کی سزا
بیٹوں اور پوتوں تک کو دیتا ہوں''
-----مُقدّس انجیل (HOLY BIBLE)

''چکھ کر دیکھو شجرِ ممنوعہ
پُشت تہا پُشت زہر پھوٹے گی
نسل دَر نسل چکھّی جائے گی''
-----ابسن (IBSEN)

وہ پنجوں کے بل اکڑوں ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی نظر دور جھاڑی کے پیچھے مرکوز کردی' جہاں سرخ' سبز رنگوں والی ایک چنری کبھی لہرا جاتی' کبھی پل بھر کے لیے آنکھوں سے اوجھل ہوجاتی۔ اس کا سارا جسم ایک کمان کی طرح تن گیا۔ ہلکے ہلکے ٹھنڈے سانس گرمی سے شرابور ہو کر ابلنے لگے۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا' لیکن جہاں تک نظر جاتی تھی' بیری اور کیکر کی جھاڑیاں تھیں اور گرمی کی لہروں سے اٹھتی ہوئی بھاپ تھی جو گیلی مٹی سے سورج کی تمازت کی وجہ سے رونما ہو رہی تھی۔ گاؤں بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ بالکل اکیلا تھا۔

گرمی کی دہکتی ہوئی دوپہر میں کون تھا جو خواہ مخواہ گھر سے باہر نکل کر اس کا پیچھا کرتا اور پھر کسی کو پڑی بھی کیا تھی؟ پھر بھی گاؤں کی تنگ گلیوں کے بیچ وخم سے گزرتے ہوئے اس نے اس بات کا یقین کرلیا تھا کہ کوئی اس کی منزل کے بارے میں جان نہ جائے۔ راستے میں ایک جگہ اسے وہی شریر لڑکا غلدو ملا بھی تھا۔ بھینسوں کے لیے ٹوکے پر چارہ کترتے ہوئے اس نے یکایک آنکھ اٹھاکر دیکھ لیا تھا اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے اس نے پوچھ ہی لیا تھا۔

"کیوں دیئے' کہاں جارہے ہو؟"

اور جب اس نے کوئی جواب دیئے بغیر نکل جانے کی کوشش کی تھی تو غلدو نے دوسرا تیر چھوڑا تھا'

"دیئے جھلے' کیا بیوی کی تلاش میں جارہے ہو۔؟"

او میرے خدا' اس نے دل میں سوچا تھا' اسے ہر بات کا علم رہتا ہے! کیوں نہ ہو' کانا جو ٹھہرا! کہتے ہیں کانے کے دماغ میں ایک رگ زیادہ ہوتی ہے تو بھی اس نے سنبھل کر' پوری چالاکی سے کام لیتے ہوئے بغیر ایک قدم رکے جواب دیا تھا' "جھلا ہوگا تیرا باپ! ارے کانے! تو نے بھنگ تو نہیں پی رکھی؟ دوپہر میں کیا میں فضول کاموں کے لیے گھر سے باہر نکلوں گا؟"

اور وہ آگے نکل آیا تھا۔ گلی کا موڑ مڑتے ہوئے اس نے گھوم کر دیکھا تھا۔ غلدو اسی طرح چارہ کاٹ رہا تھا۔ تب اسے یقین ہوگیا تھا کہ اب اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں۔ اس نے جلدی جلدی پاؤں آگے بڑھائے اور گاؤں کے مشرقی کونے میں چماروں کے گھروں کی بو والی گلیاں گزرتا ہوا گاؤں سے باہر نکل آیا تھا۔ گامو نے ٹھیک ہی کہا تھا' "چاچا' جونہی بابے والے باندھ سے آگے نکلوگے' سامنے جھاڑیوں کے پیچھے جوگیوں کے اجڑے ہوئے ٹیلے کے پاس وہ بیٹھی ہوئی مل جائے گی.... بس کچھ نہ پوچھو اس کی بات! اتنی خوبصورت ہے کہ ذوالفقار جنجوعے کی چوتھی بیوی بھی اس کے مقابلے میں کچھ نہیں! ماں باپ مرگئے۔ صرف ایک اکیلی جان ہے۔ کہتی ہے کسی اچھے گھر کے آدمی سے شادی ہوجائے تو ساری عمر اسی کے ساتھ کاٹ دوں.... صرف بیس بائیس برس کی ہے...."

"لیکن...." وہ ہکلایا تھا اور اس کے منہ سے رال کی ایک پتلی لکیر نیچے کی طرف بہہ آئی تھی.... وہ مان بھی تو جائے گی نا؟"

"ارے دیو جھلے! تم اب اس بات کی فکر نہ کرو۔ تمہاری عمر ہی کیا ہے! بس چالیس کے قریب ہوگے.... اور ساری عمر ضبط نفس بھی تو تمہی نے کیا ہے!"

"ضبط نفس کیا ہوتا ہے؟" اس نے پوچھا تھا۔

"وہی جو تم کرتے رہے ہو.... یعنی عورت کے قریب نہ پھٹکنے کی عادت.... وہ ساری طاقت تو تم نے سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔ دادا جان پورے پندرہ سو روپیہ مہینہ تمہارے نام باندھ گئے ہیں۔ اب تو تم خود ہی یہ روپے بھابھی زینت کے حوالے کردیتے ہو اور گھر کی پکی پکائی کھالیتے ہو' لیکن جب تمہاری گھر والی آئے گی تو سب سنبھال لے گی!"

گامو لنڈورے نے صحیح ہی کہا تھا' اس نے اکڑوں بیٹھے ہوئے سوچا۔ وہ سامنے جوگیوں کا اجڑا ہو ٹیلہ ہے جھاڑیوں کے پیچھے لہراتی ہوئی چنری صاف دکھائی دے رہی ہے۔ کبھی پل بھر کے لیے نظروں سے اوجھل ہوجاتی ہے' تو کبھی پھر سامنے آجاتی ہے۔ شاید بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہے اور کھڑی ہوکر جھاڑیوں سے بیر توڑ رہی ہے۔ دائیں بائیں آگے پیچھے اور کوئی نہیں ہے۔

اس نے سوچا' اب اٹھنا ہی چاہیے کوئی نہیں دیکھ رہا۔ گھڑی بھر کے لیے رک کر تیز تیز قدموں سے آگے جانا چاہیے وہ اسے دیکھ کر شرمائے گی تو ضرور۔ شاید ویسے ہی جیسے کئی برس پہلے نئی نویلی دلہن بن کر آئی ہوئی اس کی بھابی زینت اسے دیکھ کر شرمائی تھی۔ اس وقت وہ بتیس برس کا تھا۔ اسے وہ واقعہ اچھی طرح یاد تھا۔ اس کے بھائی سرور خان کا نکاح ہوا اور بہو گھر میں آئی تو سب نے گھیر کر اسے اس بات پر راضی کرلیا کہ وہ چپکے سے پیچھے سے جاکر نئی بہو کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھے' میں کون ہوں؟ پہلے تو وہ بہت ہچکچایا۔ لیکن

ہم عمر نوجوانوں نے بلکہ عمر میں چھوٹے لڑکوں نے بھی اسے گھیر لیا اور کہا کہ یہ رسم بہت پرانی ہے۔ بھائی کی بیوی کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر یہ سوال کرنا اشد ضروری ہوتا ہے' کافی آنا کانی کے بعد وہ پہلے تو اس کی چارپائی کے سامنے پہنچا' جس پر اس کی نئی بھابی دلہن کے جوڑے میں ملبوس بجی سنوری ہوئی بیٹھی تھی پھر دھیرے دھیرے نظریں اٹھاکر اس نے دلہن کے چہرے پر شاید ایک پل کے لیے وہی روپ رنگ دیکھا' جو کبھی اس کی ماں کے چہرے پر تھا۔ اس کی ماں جو بہت مدت پہلے مرچکی تھی۔ اس سے اور تو کچھ بن نہ پڑا' آگے بڑھ کر اپنی بھابی سے لپٹ گیا۔ سبھی ششدر رہ گئے۔

اس کا بھائی محمد خان پہلے تو اپنی بیوی کو اس کی گرفت سے چھڑوانے کے لیے آگے بڑھا' لیکن جب اس نے دیکھا کہ وہ اس کی گود میں منہ چھپائے سسک سسک کر رو رہا ہے تو جیسے سبھی کے دل پسیج گئے۔ تب سے زینت بھابی سے اس کا وہی رشتہ قائم ہوگیا جو ماں اور بیٹے کا ہوتا ہے' حالانکہ وہ عمر میں اس سے ایک برس چھوٹی تھی۔ وہ زینت بھابی کے برتن صاف کرتا نہانے کے لئے کنوئیں سے پانی لادیتا۔ اس کے بچوں کو کھلاتا اور وقت آنے پر تھکے ہوئے بھائی کے پاؤں دبانے کے علاوہ بھابھی کے پاؤں دبانے سے بھی نہ ہچکچاتا۔ وہ نہ نہ کرتی رہتی اور دینو اس کی پائنتی بیٹھ کر پاؤں دباتا رہتا۔ جب تک کہ ساتھ کی چارپائی پر لیٹا ہوا اس کا بھائی نہ کہتا۔ "دینو' اب بس کرو' کافی خدمت ہوگئی بھابی جان کی!"

اور اس کی بھابی کہتی' "دینو' تم تو کوئی فرشتہ ہو۔ تمہیں جھلا کون کہتا ہے! میں تو سمجھتی ہوں۔ تمہارے بغیر میرا گھر ایک دن بھی نہیں چل سکتا!"

اس کے کمزور گھٹنے درد کرنے لگے تو وہ ایک پتھر کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سامنے جھاڑی کے پیچھے سے لہراتی ہوئی چنری سے اسے جیسے اپنی بھابی زینت کا بیس برس پہلے کا چہرہ ابھرتا ہوا نظر آیا' کھلا ہوا' تازہ شبنم سے گلاب کی طرح' وہ چند قدم آگے بڑھا بھربھری مٹی سے بنے ایک چیونٹیوں کے بل کے آس پاس بنے کنارے سے اس کا پاؤں پھسلا اور وہ گرتے گرتے بچا۔ تبھی جھاڑیوں میں کچھ سرسراہٹ سی ہوئی۔ وہ ٹھٹھک گیا کچھ لمحوں تک وہ سانس روکے ہوئے اسی طرح کھڑا رہا۔ سامنے والی جھاڑی کے پیچھے ہی وہ چنری پھڑپھڑا رہی تھی۔ بس صرف پچاس کے لگ بھگ قدم اور---! اس کا جی چاہا' وہ اسے آواز دے' "میری رانی!" لیکن اس نے اپنا گلا خشک محسوس کیا۔ اس کا بھائی اپنی بیوی کو "رانی" کہہ کر ہی بلاتا تھا۔ لیکن گلا تھا کہ منہ کے لعاب سے تر کرنے کے باوجود کوئی آواز نکالنے سے قاصر تھا۔ اس کے ڈھیلے ڈھالے نیم جان سے قدم آگے بڑھے۔ کیکر کی کانٹوں سے لدی ہوئی جھاڑیوں میں چھوٹے چھوٹے زرد پھندنے سے لٹک رہے تھے۔ تبھی دائیں طرف کی جھاڑیوں میں پھر کچھ کھٹکا ہوا۔ وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ مڑا۔ لیکن کوئی نہیں تھا۔ کسی کے وہاں ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ سب اس کے تصور کا وہم تھا۔ "دینو' تمہیں تو وہم ہوگیا ہے..." گاموں نے کہا تھا۔ "تم سمجھتے ہو اب تمہاری شادی ہو ہی نہیں سکتی۔ ارے تم کہو تو میں ڈاکخانے سے بیرنگ لفافے میں ولایت سے میم منگوادوں تمہیں!" اس کی آنکھیں حیرت سے چوڑی ہوگئی تھیں۔ گوری چٹی' بھورے بالوں والی' اونچی' لمبی میم' جیسے تصویروں میں ہوتی ہے۔ اس نے پوچھا تھا' "سب کے لیے آجاتی ہے کیا؟"

لیکن اس وقت تو اس کے سب خوابوں کی تعبیر اس کے سامنے تھی۔ بس اب کچھ ہی قدموں کا فاصلہ تھا۔ بڑی جھاڑی کے پاس پہنچ کر وہ کھنکارا۔ اسے محسوس ہوا جیسے کچھ سنسناہٹ سی ہوئی ہو۔ جیسے چوڑیاں کھنکی ہوں۔ اس کی پیشانی پسینے سے بھیگ گئی۔ آنکھوں کے سامنے کہرا سا چھانے لگا۔ اس کے دل کے ایک کونے سے جیسے صدیوں کی پیاس نے اسے پکار کر اپنے وجود کی یاد دہانی کروائی۔ دوسری طرف سے جیسے کوئی چور اس کے پاؤں میں رسی ڈال رہا تھا۔ اس نے دل کڑا کیا اور ایک بار پھر کھنکارا۔ پھر چوڑیاں کھنکنے کی آواز آئی۔ اب وہ جھاڑی کے گرد گھوم کر سامنے آگیا۔ پتھر پر اس کی طرف پشت کئے' سر نیچا کئے' عورتوں کی قمیض لیکن سفید مولانہ شوار میں ملبو.

کوئی شبیہہ نظر آئی۔ ایک چنری جھاڑی کے کانٹوں سے اڑی ہوئی پھڑپھڑا رہی تھی' جیسے خشک کرنے کے لیے ڈال دی گئی ہو۔ وہ پھر کھنکارا۔ اسے کوئی جواب نہ ملا۔ دھڑکتے ہوئے دل کو قابو میں رکھنے کے لیے' دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے' وہ وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔

تبھی چوڑیاں پھر کھنکیں۔ نسوانی کپڑوں کی سرسراہٹ نے جیسے آگے بڑھ کر اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ لیکن وہ تو نیم بے ہوش سا زمین پر بیٹھا تھا۔ اس کی نظر نے جیسے اٹھنے سے انکار کردیا۔ کسی نے پیچھے سے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے' پر اس کا سر ان ہاتھوں نے تھام لیا۔ اسے ان ہاتھوں کا لمس بہت اچھا لگا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے سر پر رکھی ہوئی میلی سی ٹوپی کھسک کر نیچے گر پڑی' تو بھی اسے پتہ نہ چلا۔ ہاتھ اس کے سر کے خشک اور میلے چکٹ بالوں کو سہلاتے ہوئے نیچے آگئے۔ گردن پر پہنچ کر آدھ منٹ وہیں رکے رہے۔ کسی کے تیز چلتے ہوئے گرم سانسوں کا احساس اسے اپنی گردن پر ہوا۔۔۔۔پھر انہی ہاتھوں نے پہلے آہستگی سے اور پھر ذرا مضبوطی سے اس کا گلا دبانا شروع کیا۔ احساس کی نیم بے ہوش رگ جیسے یکایک جاگ اٹھی۔ وہ چیخ کر اٹھ کھڑا ہوا اور غصے اور حیرت کے ملے جلے ذہنی جھٹکے نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔

سامنے گامو کھڑا تھا!

نسوانی کپڑے پہنے ہوئے' ہاتھوں سے کہنیوں تک کانچ کی چوڑیاں سجائے ہوئے' گامو ایک بھیانک سی چڑیل کی شکل بنائے ہوئے تھا۔ دینو کے منہ سے عجیب و غریب قسم کی آوازیں نکلیں۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرگئیں' اور وہ یہ بھی نہ دیکھ سکا کہ دائیں بائیں کی جھاڑیوں سے گاؤں کے شرارتی لڑکوں کا ایک گروہ پلک جھپکنے کی دیر میں ہی نکل آیا ہے۔ ان میں کالا تھا' شبو تھا۔ یونس تھا' خلیل احمد' جسے کھالا کہتے تھے' ناچ ناچ کر ہنسی سے بے دم ہورہا تھا۔ فضل کانا' جسے لڑکے پھلو کانا کہتے تھے' جھاڑی سے چنری اتار کر دینو کے سر پر اوڑھانے کی کوشش کررہا تھا۔

اسے کچھ بھائی' نہ دیا تو اس نے بھاگنے کی کوشش کی' لیکن اس کے کمزور' پلپلے گھٹنے جواب دے گئے اور وہ وہیں دھم سے بیٹھ گیا۔

"دینو جھلے کی جورو' تیری میری بھابھی" وہ مل کر گانے لگے۔

تبھی انہوں نے اس کا "ڈنڈا ڈولی" بنایا۔ ایک نے اس کی ٹانگیں پکڑیں اور دو تین مل کر اسے کندھوں سے اور سر سے اٹھائے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ پیچھے پیچھے گامو تھا' اپنے انہی زنانہ کپڑوں میں ملبوس' لمبا تڑنگا' سیاہ بھجنگ' غلام محمد جسے سب گامو کہتے تھے' اپنی چوڑیاں چھنکاتا ہوا انہیں تال دے رہا تھا۔

"دینو جھلے کی جورو' تیری میری بھابھی!"

تبھی انہوں نے اپنی سرتال بدلی۔ ایک نے ماتم کے لہجے میں پکار دی

"دینو جھلا مرگیا' گامو رنڈا کرگیا!"

لڑکے دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور ساتھ ہی زور زور سے ہنس بھی رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں گاؤں پہنچتے ہی دروازے کھلے اور کئی لڑکے باہر نکل آئے۔ اب یہ جلوس پوری ماتمی شکل اختیار کرگیا۔ تب کچھ منچلوں نے بین کوبی شروع کردی' جیسے جنازہ اٹھائے ہوئے ہوں۔ جب جلوس اس گلی کے موڑ پر پہنچا' جس میں اس کا گھر تھا' تو جیسے دینو کو یکدم ہوش آگیا۔ وہ تڑپ کر اچھلا' ان کے ہاتھوں سے زمین پر گرتے ہی اٹھا اور پیشتر اس کے وہ اسے دوبارہ پکڑ سکتے' سرپٹ بھاگنے لگا۔ اپنی ڈیوڑھی کے دروازے پر اس کے بھتیجے بھتیجیاں یہ

تماشہ دیکھنے کے لیے باہر نکل آئے تھے اور تالیاں پیٹ رہے تھے۔ تب ہی اس کی بھابھی باہر آگئی۔ وہ دوڑ کر بھابی کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ "دیکھ بھابی۔۔۔ بھابی!" وہ ہکلانے لگا۔

لیکن شرارتی لڑکے تو تب تک ہوا ہو چکے تھے۔

(۲)

بہت برس پہلے دادا زندہ تھے اور حاجی مقام الدین سے مقدمہ جیتنے کے بعد گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار گنے جانے لگے تھے۔ علاقے بھر میں ان کی دھاک تھی۔ تحصیلدار دورے پر آتا تو انہی کے مہمان خانے میں ٹھہرایا جاتا۔ دادی کب کی جنت نشین ہو چکی تھی اور دینو کے اپنے والد تو بس دائم المریض تھے۔ کبھی جگر کی بیماری زور پکڑ جاتی تو کبھی دل کے دورے پڑنے لگتے۔ کبھی دمہ گھیر لیتا تو کبھی خون کے ساتھ پیچش بھی ہو جاتی۔ دادا جان کا تو صرف ایک بیٹا تھا اور وہ بھی نہ ہونے کے برابر' لیکن بزرگوار اکثر کہا کرتے' "میرا لڑکا جان محمد نہ بھی رہے تو مجھے کوئی غم نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں اللہ مجھ پر مہربان ہے۔ میرے تین پوتے ہیں جو اور سب سے چھوٹا دین محمد تو میرا جگر ہے۔ میرا دل ہے۔ ابھی پانچ برس کا ہے' لیکن ایک دو برس کے بچے جیسی طبیعت ہے۔ اتنا بھولا بھالا' اتنا معصوم کہ لگتا ہے یہ بڑا ہو کر بھی ایسا ہی رہے گا۔ لیکن کوئی بڑی بات نہیں اگر سن بلوغ تک پہنچنے پر فوج میں کرنل ہی بن جائے۔۔۔ میں اسے لاہور تک پڑھاؤں گا!"

تب اس کے اپنے والد بہت سخت بیمار تھے۔ حکیم کا خیال تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ چھ ماہ اور زندہ رہ سکیں گے۔ چارپائی پر پڑے ہوئے وہ اتنے کمزور لگتے کہ کئی بار انہیں دیکھ کر خوف آتا۔ بڑھی ہوئی داڑھی' روکھے' سوکھے بال' مرجھایا ہوا زرد چہرہ' بڑی بڑی سونی آنکھیں اور بہت ہی کمزور جسم۔ ٹانگیں جیسے سوکھ کر دو ڈنٹھلیں جیسی رہ گئی تھیں۔ اتنے کمزور ہو چکے تھے کہ اس کی ماں' یعنی ان کی بیوی' نوکر کو بلائے بغیر انہیں اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر ایک چارپائی سے دوسری تک باآسانی لے جاتی تھی۔ روگی تو وہ شاید بچپن سے ہی تھے' لیکن اٹھارہ برس کی عمر میں جب دادا نے ان کی شادی کر دی تو جیسے اچانک ان کی صحت اچھی ہو گئی تھی۔ چہرے پر رنگ اور نکھار آگیا تھا۔ بیماری شاید پیچھا چھوڑ گئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر لاہور تک سیر کے لیے ہو آئے۔ ان کی صحت بالکل ٹھیک تھی۔ دادا جان بہت خوش تھے۔ پیر لکھے شاہ کی درگاہ پر پانچ بکرے دیئے اور بیس بھوکوں کو کھانا کھلایا۔ زمینداری چلتی تھی۔ اور خوب چلتی تھی۔ مزارعے بے شمار تھے اور بٹائی پر دی گئی زمینوں سے سینکڑوں من غلہ آتا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ کئی زمینیں ان کے پاس رہن تھیں اور آہستہ آہستہ ان کی ملکیت بنتی جا رہی تھیں۔ دادا جان کو بھی کئی برسوں کی بیماری سے نجات پانے کے بعد ہاتھ بٹانے والا ملا تو وہ بھی کام سے کچھ بے فکر ہو گئے۔ دادی کو جنت نشین ہوئے تو کئی برس ہو چکے تھے' اس لیے وہ اب اکیلے یا اپنے عمر کے دوستوں کے ساتھ رنگ رلیوں' میلوں تماشوں پر جانے لگے۔ اہلکاروں کے ساتھ علاقے میں گھومنے لگے۔ کہا جانے لگا کہ انہوں نے شراب بھی پینا شروع کر دی ہے تب دادا جان کا پہلا پوتا پیدا ہوا۔ خوب خوشیاں منائی گئیں۔ پھر دو برسوں کے بعد دوسرا پوتا پیدا ہو۔ محمد خان اور سرور خان کی جوڑی!

دادا کہتے تھے' "میرے گھر میں تو خوشیاں ہیں۔ دو لال جیسے پوتے اور ایک برخوردار بیٹا اور بہو بھی ہے تو جیسے گھر میں چاندنی چھٹک رہی ہو۔"

لیکن دوسرے بیٹے کے بعد جان محمد کی طبیعت بگڑنی شروع ہو گئی۔ وہ پھر بیمار رہنے لگے۔ آہستہ آہستہ صحت گرتی گئی۔ پہلے کھانسی شروع ہوئی۔ پھر خون کی پیچش آنے لگی۔ پھر آنتڑیوں میں درد شروع ہوا اور آخر میں حکیم نے یہ بھی کہہ دیا کہ انہیں دل کی بیماری بھی ہے۔ تین برس اسی طرح گزرے۔ دادا جان ایک بار پھر کام سنبھالنے لگے۔ ایک بار پھر ان کا زیادہ وقت گھر کے اندر گزرنے لگا۔ علاج میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی گئی۔ لاہور تک سے جرمن ادویات منگوائی گئیں۔ خیرات کے لیے تجوریاں کھول دی گئیں' لیکن جان محمد کی حالت دن بدن خراب ہوتی چلی گئی۔ تب ہی ایک اور لڑکا پیدا ہوا۔

گاؤں میں دادا جان کا بہت رعب تھا۔ لیکن پھر بھی گاؤں والوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ دیکھیے قدرت کے رنگ! جان محمد بستر سے اٹھنے کے ناقابل زندگی کی آخری سانسیں گن رہا ہے' لیکن اللہ نے اس کی بیوی کی گود ہری کی ہے۔ کیوں نہ ہو' اللہ جس پر مہربان ہو' اس کے تو وارے نیارے ہو جائیں' تو بھی یہ نعمت کیا کم ہے۔ صحت کی خوشی نہیں ہے جسم کا کچھ مصرف نہیں ہے' لیکن روح کی بالیدگی تو ہے۔ بیٹے کے پیدا ہونے کی مسرت تو ہے۔ دادا جان تو جیسے خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ انہی دنوں انہیں ایک بڑے مقدمے میں کامیابی ملی اور ساتھ ہی پانچ چھ لاکھ روپے کی زمین قبضے میں آگئی۔ "میرے دین محمد کی پیشانی پر دولت ہی دولت لکھی ہے۔" انہوں نے کہا۔ "دیکھو' پیدا ہوتے ہی اپنے ساتھ کیا لایا! یہ بچہ تو بہت خوش قسمت ہے!"

تب دادی نہیں تھی اور جان محمد تو بستر پر پڑے کھانستے ہی رہتے تھے۔ اس لیے سارا گھر دادا جان کی کوششوں سے ہی چل رہا تھا۔ اس کی ماں' دادا جان' یعنی اپنے سسر کے سامنے سر پر کپڑا لئے بیٹھ کر گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی۔ وہ ماں کے گھٹنوں کے ساتھ لگا بیٹھا رہتا۔ کبھی کبھی صبح صبح ہی منہ اندھیرے اٹھ کر ماں چکی پیسنے بیٹھ جاتی اور دادا جان کی آنکھ کھل جاتی تو وہ وہیں سے پکار کر کہتے' "بہو' تمہیں لاکھ بار کہا ہے کہ تو چکی مت پیسا کر۔ چار نوکرانیاں تو ہیں گھر میں تیرا ہاتھ بٹانے کے لیے! تجھے تو بیٹھ کر آرام سے حکم چلانا چاہیے!"

لیکن وہ خاموشی سے سر نیچا کئے چکی پیستی رہتی' جیسے یہ اس کے لیے کوئی سزا ہو۔ اور کئی بار تو دادا جان اپنے نواڑی پلنگ سے اٹھ کر اس کے سر پر آکھڑے ہوتے۔ "چل اٹھ' جاکر نہادھو۔ بچے کو سنبھال۔ دینو بستر پر پڑا رو رہا ہے۔ چکی پھر پیسی جائے گی!" اور وہ اسے بانہہ سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے اٹھاکر کھڑا کر دیتے۔ اس کی ماں چہرہ اٹھاکر ان کی طرف دیکھتی تو اس کی آنکھیں گیلی ہوتیں' جیسے چکی پیستے پیستے روتی رہی ہو۔ دادا جان ذرا غصے سے کہتے' "بہو' تمہیں دکھ کس بات کا ہے...." وہ کہنا شروع کرتے کہ اندر سے اس کے باپ جان محمد کے کھانسنے کی آواز آنے لگتی۔ وہ فوراً الٹے پاؤں لوٹ جاتے۔ اس کی ماں دھم سے پیڑھی پر بیٹھ جاتی اور دادا جان کہتے' "جا' جاکر جان محمد کو دیکھ' بے چارہ بری طرح کھانس رہا ہے۔"

ان دنوں دینو تو صرف پانچ برس کا ہی ہوا تھا' لیکن اس کے دونوں بڑے بھائی اسکول جاتے تھے۔ محمد خان دس برس کا تھا اور سرور خان آٹھ کا۔ گاؤں میں نیا نیا پرائمری اسکول کھلا تھا' مڈل اور میٹرک کرنے کے لیے لڑکوں کو تحصیل کے قصبے میں بھیجا جاتا تھا۔ اس کے دونوں بھائی اپنے قاعدے اور تختیاں لئے جب اسکول جاتے تو ماں انہیں لسی کے ساتھ پراٹھے کھانے کو دیتی۔ وہ بھی ساتھ بیٹھ جاتا۔ اس کی ماں پہلے اسکول جانے والے بچوں کو مکھن لگے پراٹھے دیتی تھی۔ پھر ایک "ہوگی" اس کے لیے بھی بناتی۔ اس کی پلیٹ میں رکھتی۔ لسی اور مکھن پینے کے لیے ایک چھوٹے سے گلاس پر دادا جان نے اس کا نام کھدوایا تھا' جو اس کے لیے مخصوص تھا۔ اگر وہ ضد کرتا کہ

وہ بھی بڑے بھائیوں کی طرح بڑے گلاس میں لسی لے گا' تو ماں کہتی' "نہیں' دادا جان غصے ہوں گے!" اور پراٹھے کے نوالے توڑ کر اسے اپنے ہاتھوں سے کھلانے لگتی۔ سر پر ہاتھ پھیرتی۔ پیار کرتی۔ لیکن یہ سب کچھ صرف اس وقت تک ہوتا جب تک دادا جان گھر پر رہتے۔ جونہی وہ مسواک دانتوں سے چباتے ہوئے رسی اور ڈول لے کر کنوئیں پر نہانے کے لیے ڈیوڑھی سے باہر نکلتے اور اس کے دونوں بھائی بوسکی کی دھاری والی قمیض اور سفید شلواریں پہن کر اسکول کے لیے روانہ ہوجاتے۔ اس کی ماں اسے وہیں چھوڑ کر اٹھ جاتی۔ وہ مچلتا' چیختا' چلاتا۔ اس کی گندی ناک بہہ کر ہونٹوں تک پہنچ جاتی۔ اس پر مکھیاں بھنبھنانے لگتیں۔ کوّے آکر اس کی روٹی چھین کر لے جاتے' لیکن اس کی ماں تو جیسے اس کے لیے بہری ہوجاتی۔ وہ صحن کی دوسری طرف اس کے ابا کی چارپائی پر بیٹھ کر اس کی ٹانگیں دبانے میں یا ہاتھ منہ دھلانے میں مصروف رہتی۔ ایک دو بار اس کی طرف دیکھتی بھی تو زہریلی نظروں سے۔ اس کے ابا کہتے بھی' "جا' دینو کی ناک پونچھ دے۔ دیکھ تو رو رو کر کیا حال کررہا ہے" لیکن وہ اسی طرح ان کے پاس بیٹھی رہتی۔ تب اگر یکایک دادا جان باہر سے آجاتے اور دینو ان کی طرف بانہیں کرکے ہکلاتا' "دا...دا...دا" تو وہ سب کچھ پھینک کر' لپک کر اس کے پاس پہنچتے' اس کی ناک صاف کرتے۔ اسے پچکارتے' پیار کرتے ڈنڈا لے کر کوّے اڑا اڑا کر اسے ہنسانے کی کوشش کرتے۔ پھر خود بیٹھ کر اسے کھلانا شروع کردیتے۔ تبھی اس کے ابا' اس کی ماں کے کانوں میں کچھ سرگوشی کرتے۔ ماں اٹھتی' لیکن بے دلی سے۔ سر پر دوپٹے کو مضبوطی سے جمائے وہ ان کے پاس جاتی' دینو کو اٹھالیتی اور خود پیڑھی پر بیٹھ کر اسے گود میں بٹھائے ہوئے کھلانے لگتی۔

پھر جب ایک دن اس نے ضد کی' کہ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ اسکول جائے گا تو ماں نے اسے جھڑک دیا۔ لیکن دادا جان خود اسے انگلی سے پکڑے اسکول لے گئے۔ راستے میں حلوائی سے انہوں نے دس روپے کا لڈو بیدانہ لیا۔ ایک دکان سے اردو کا قاعدہ اور تختی خریدی اور راستے میں جانے والے سب بچوں کو لڈو بانٹتے ہوئے استاد منشی کرامت علی کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ منشی صاحب انہیں دیکھ کر کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ بڑے احترام سے تکلیف فرمانے کی وجہ پوچھی۔ پھر رجسٹر میں بچے کا نام دین محمد لکھ کر والد کے نام کے خانے میں کچھ لکھنے سے پہلے ایک لمحے کا توقف کیا۔ پھر جان محمد کا نام باپ کے طور پر لکھ کر آگے تحریر کیا۔ "پسر خان صاحب اللہ داد۔" پیدائش کی تاریخ پوچھی۔ اس کا اندراج کیا اور دادا جان کے دستخط کروانے کے بعد انہوں نے چپڑاسی سے کہا کہ بچے کو استاد رستم خان کے پاس چھوڑ آئے۔ جب دینو نے دادا جان کو ساتھ لے کر چلنے پر ضد کی تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے' "بچہ ہے۔ ایک دو دنوں میں دوسروں کے ساتھ گھل مل جائے گا۔ اب میں اسے گھر لے چلتا ہوں!"

دوسری صبح وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ گیا۔ پھر وہ لگاتار ایک ماہ تک جاتا رہا۔ اس دوران میں دس بارہ قاعدے پھٹے۔ پانچ سات تختیاں گم ہوئیں' لیکن دینو ابجد نہ سیکھ سکا۔ تین بار غصے میں آکر منشی رستم خان نے اسے چانٹے بھی رسید کیے۔ وہ بہت رویا۔ اس کی ناک میں سے گندگی بہہ آئی تو وہ خود نہ پونچھ سکا۔ شرارتی لڑکے ازار بند کھینچ کر کھول دیتے تو وہ خود باندھ نہ سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ماہ میں ہی دادا جان نے اسے اسکول بھیجنا بند کردیا۔ اس کے بڑے بھائیوں کو جھڑکا' کہ وہ اس کا خیال نہیں رکھتے۔ پھر ڈاکخانے کے بابو اسلم میاں کو اڑھائی سو ماہانہ پر مقرر کیا کہ وہ ایک گھنٹہ روز اسے گھر پر پڑھائیں' لیکن بابو اسلم میاں آتے رہے۔ اور جاتے رہے۔ آتے رہے اور جاتے رہے۔ دینو پڑھائی میں تو کورا رہا ہی لیکن ان سے کچھ گالیاں ضرور سیکھ گیا جو وہ کبھی کبھار دہراتا رہتا اور کئی ہزار ہا مشق کرنے کے بعد اپنا نام لکھنا بھی سیکھ گیا۔ "دین محمد" اب اکثر اوقات کوئلے سے یا چاک سے وہ گھر کی دیواروں پر یہ نام لکھتا رہتا اور منع کرنے کے باوجود اپنے ہاتھوں' بانہوں' یہاں تک کہ کپڑوں پر بھی اپنا نام لکھ کر انہیں کالا کرتا رہتا۔ نو برس کی عمر میں جب اس نے دادا جان کے صندوق سے دو سو روپے کی چوری کرکے فضلو مراثی کو جادیئے تو انہیں پہلی بار یہ احساس ہوا کہ لڑکا دماغی طور پر تندرست

نہیں ہے۔

"تو نے روپے کیوں اٹھائے؟" انہوں نے جھڑکتے ہوئے پوچھا تھا۔

"فضلو نے کہا تھا!" ہونٹوں سے بہتی ہوئی رال کو زور سے واپس کھینچتے ہوئے اس نے جواب دیا تھا۔

"اسے کیوں دیئے؟ مجھے کیوں نہیں دیئے؟" دادا جان نے پوچھا۔

"فضلو مجھے اچھا لگتا ہے..." جواب ملا۔ "مجھے ڈھول بجانے دیتا ہے!"

دادا جان نے سر پیٹ لیا۔ ایک دو برس تک یہی چکر چلتا رہا۔ کبھی گھر سے بستر کی چادر گم' تو کبھی جوتے اور برتن گم۔ صوبے نے کہا کہ گھر سے ایک اچھا ریشم سے کڑھا ہوا ماں کا دوپٹہ لادو تو میں تمہیں گدھے کی پیٹھ پر بٹھا کر سواری کرواؤں گا تو اسی وقت ماں اور بھائیوں سے چھپ چھپا کر ماں کا ریشمی دوپٹہ صوبے کو دے آیا۔ خان محمد نے کہا کہ دادا جی کی پیتل کی موٹھ والی لاٹھی اٹھا لاؤ تو ایک دن وہ بھی گھر سے غائب۔ دادا جان نے جی توڑ کوشش کی لیکن دینو کچھ نہ سیکھ سکا۔ باہر سے شرارتی لڑکوں کی پڑھائی ہوئی پٹی کو گھر آکر یوں دہراتا کہ سبھی سر پیٹ کر رہ جاتے۔ بڑے بھائی اسے پیٹتے۔ ماں دور سے دھتکارتی۔ بیمار باپ کی چارپائی کے پاس تو کبھی وہ بھول کر بھی جانا پسند نہ کرتا۔ ایک دادا جان تھے جو اسے بیٹھک میں اپنے پاس بٹھا کر اس کی رال پونچھتے' گندی آنکھیں صاف کرتے۔ کپڑے بدلتے اور چوری چھپے گڑ' مٹھائی اور جلیبیاں بھی کھانے کے لیے منگوا دیتے۔

دینو سے دینو جھلا مشہور ہونے میں تین چار برس لگے' لیکن اس عرصے میں تو دادا جان کے گھر کی حالت ہی خراب ہوگئی۔ وہ دس برس کا تھا جب پورے تیرہ سال کی لمبی علالت کے بعد' اسے ایک صبح بتایا گیا' کہ اس کے ابا کی موت واقع ہوگئی ہے۔ جان محمد ایک رات روز کے معمول کی طرح دودھ کا ایک پیالہ پی کر سویا اور صبح نہ جاگا۔ جب چکی پیستی ہوئی دینو کی ماں دادا جان کے قدموں کی آواز قریب آنے سے پہلے اٹھ کر اپنے دائم المریض خاوند کی چارپائی کے پاس آئی تو اس نے سمجھا کہ گہری نیند میں سویا ہوا ہے۔ لیکن جب ہاتھ ہلانے کے بعد بھی وہ نہ جاگا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ تب اس کا ہاتھ چھوتے ہی وہ چیخ کر پیچھے ہٹ گئی۔ گھر میں ماتم شروع ہوا۔ لوگ اکٹھے ہوئے۔ دادا جان کا اکلوتا بیٹا تھا' اس لیے دور دور سے برادری اور قبیلے کے لوگ ماتم پرسی کے لیے آئے۔ دینو اور اس کے دونوں بھائی جنازے کے بعد سفید چادر پر بیٹھے لوگوں کے آنے جانے کا تماشہ دیکھتے رہے۔ پھر قبیلے کے رسم و رواج کے مطابق دستار بندی کی رسم ہوئی۔ دینو کے دونوں بھائیوں کو باپ کی ذمہ داریاں ملنے کے جواز میں پگڑیاں باندھی گئیں۔ جب دینو کی باری آئی تو وہ چیخ کر پرے ہٹ گیا۔ "میں نہیں باندھوں گا پگڑی وگڑی!" اس نے چیخ کر کہا۔

دادا جان نے کہا "کوئی بات نہیں' مولوی صاحب' اگر اس کی دستاربندی نہ بھی ہوئی تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ ویسے ہی بے چارہ سیدھا ہے' نا سمجھ ہے!" اور انہوں نے اس کی ماں کی طرف دیکھا جو عورتوں کے جھرمٹ میں گھری ہوئی بیٹھی تھی۔ آنسو تو ایک مدت سے ہی بہا رہی تھی' لیکن اب رو رو کر اور سر پیٹ پیٹ کر اس نے اپنا برا حال کرلیا تھا۔

کسی بزرگ نے آہستہ سے کہا بھی' "والد کی وفات کے بعد دستاربندی تو سب بیٹوں کی ہونی چاہیے!" لیکن جب دادا جان نے اس کی طرف گھور کر دیکھا تو وہ بھی خاموش ہوگیا۔

(۳)

دین محمد سے دینو اور دینو سے دینو جھلا!

وقت گزرتا رہا۔ دینو میں کچھ تبدیلیاں رونما ہوتی گئیں۔ پہلے تو بچہ سمجھ کر اس کی زیادتیوں اور اس کی نیم پاگل حرکتوں کو بھی برداشت کیا جاتا رہا تھا' لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا جب کوئی غلط کام کرنے کے عوض میں یا کسی بڑے نقصان کے بعد دادا جان اسے کمرے میں بند کرکے خوب پیٹتے۔ بھوکا پیاسا رکھتے۔ بارہ برس کی عمر میں جب دادا جان نے اس کے لئے ماں کے کمرے سے دور صحن

میں کچھ ہٹ کر ایک نیا کمرہ بنوایا اور کہہ دیا کہ اب دینو اپنی ماں کے ساتھ ایک بستر پر تو کیا' ایک کمرے میں بھی نہیں سوسکے گا' تو اس نے بغاوت کردی۔ آدھی آدھی رات کو اٹھ کر ماں کے کمرے میں جانے لگا۔ دروازہ بند ہوتا تو زور زور سے پیٹتا اور جب تک ماں اسے دروازہ کھول کر اندر نہ آنے دیتی' وہ وہیں دروازے کی چوکھٹ کے پاس بیٹھا رہتا۔ کبھی کبھی وہیں زمین پر سو جاتا۔ دادا جان کا رویہ بدلا تو ماں کی ممتا نے کروٹ لی۔ اب ماں اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھنے لگی۔ لیکن دادا جان کی مرضی کے بغیر تو گھر میں ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا تھا۔ اس لئے جب ایک رات دادا جان کی آنکھ کھل گئی اور کڑاکے کی سردی میں انہوں نے دینو کو ماں کے کمرے میں کے دروازے پر کھڑا دیکھا تو اپنا جوتا اٹھاکر وہیں اسی وقت اس پر تڑاتڑ برسانے لگے۔ اس کی ماں دینو کے چیخنے اور جوتے کی چوٹوں کی آواز سن کر ہڑبڑا کر اٹھی اور باہر آئی۔ اس نے آگے بڑھ کر دادا جان کا ہاتھ پکڑ لیا تو دینو نے اپنی زندگی میں پہلی بار ماں کی غصے سے لرزتی ہوئی آواز سنی۔ ہمیشہ خاموش رہنے والی عورت نے جلتی ہوئی آنکھوں سے اپنے سسر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا کرتے ہو جی؟ باہر سے تو کسی کا نہیں ہے!"

دادا جان اسے چھوڑ کر چلے گئے لیکن وہ کافی دیر تک ماں کے سینے سے لپٹا ہوا سسکتا رہا تھا۔ اس کی ماں بھی روتی رہی تھی۔ اس واقعے کے بعد اسے دادا جان سے مار تو نہ پڑی' لیکن یہ اجازت بھی نہ ملی کہ وہ ماں کے کمرے میں سوئے۔

اس کے دونوں بھائی اب پانچویں جماعت پاس کرکے مڈل اسکول کے لیے تحصیل کے قصبے میں چلے گئے تھے۔ کبھی کبھی چھٹیوں میں آتے تو گھر میں رونق ہوجاتی۔ ان کے لیے کھیر حلوہ بنتا۔ مرغے کاٹے جاتے اور بڑا گوشت منگوایا جاتا۔ دینو کو بھی اس کا حصہ ملتا۔ لیکن اس کے دونوں بھائی اس سے کتراتے۔ اگر کبھی وہ ان کے پاس بیٹھنے کی کوشش بھی کرتا تو اسے دھکوں' لاتوں اور مکوں سے ہٹا دیتے۔ لیکن جب اس نے انہیں خوش رکھنے کا ڈھنگ سیکھ لیا تو وہ اسے پیٹنے سے پرہیز کرنے لگے۔ وہ دادا جان کی صندوقچی سے دس پندرہ روپے اٹھا لاتا اور بڑے احترام کے ساتھ اپنے بڑے بھائیوں کو پیش کرتا۔ وہ روپے لے کر چکتے تو اسے شاباش دیتے۔ لیکن اب اس بات کا کیا علاج کہ انہیں اس کے کپڑوں سے بدبو آتی۔ اس کی ناک کا بہنا اور اس پر مکھیوں کا بھنبھنانا تو ایک عام بات تھی۔ ابھی تک وہ اپنے کپڑے خود نہیں پہن سکتا تھا۔ سب سے بڑے بھائی محمد خان کی نسبت منجھلے بھائی سرور خان کا پیار اس سے کچھ کچھ ضرور تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا۔

"کیا کریں ہم لوگ! آدھا انسان جو ٹھہرا۔ اس کا حساب کتاب تو ہم دونوں کو ہی ساری عمر رکھنا پڑے گا!"

اور بڑا بھائی کہتا' "تم رکھنا اس کا حساب کتاب! مجھے تو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ میرا بس چلے تو کنوئیں میں دھکیل دوں۔ زہر دے دوں اس کو!"

سرور خان مسکراتا۔ "ہاں ضرور! نیک کام میں دیر کس بات کی؟ دادا جان تمہیں جائیداد سے فارغ خطی دے دیں گے۔ اور پھر میں اکیلا ہی رہوں گا لاکھوں کی جائیداد کا مالک اور مختار!"

دادا جان کی حالت بھی اب آہستہ آہستہ پتلی ہوتی جارہی تھی۔ نئے قانون کے مطابق بہت سی رہن زمینیں ان کے ہاتھوں سے نکلتی جارہی تھیں۔ مزارعوں میں اب بھی اتنی ہی ساکھ تھی سرکار دربار میں اب بھی اتنی ہی عزت تھی' احترام تھا۔ خان بہادری قائم تھی' لیکن مالی حالت کمزور ہوچکی تھی۔ ان کا مزاج بھی اب چڑچڑا رہنے لگا تھا۔ یوں بھی وہ اب ساٹھ کے پیٹے میں تھے۔ دادی کی موت ہوئے اب بائیس برس ہوچکے تھے۔ جان محمد زندہ ہوتا تو اب پینتیس برس کا ہوتا۔ گھر کا سب کام کاج سنبھال لیتا اور دادا جان موڑھے پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑاتے ہوئے مزارعوں اور کسانوں کا دربار لگانے پر اکتفا کرتے۔ لیکن خدا کی مرضی یہ نہیں تھی۔ دونوں بڑے پوتے ایک دو برسوں میں اس قابل تو ہوہی جاتے کہ وہ دادا جان کا ہاتھ بٹاسکیں مگر جو بات بیٹے کرسکتے ہیں' پوتے کہاں کرسکتے ہیں۔

تبھی ایک دن ماں سخت بیمار پڑ گئی۔ دادا جان اس دن تحصیلدار کی کچہری میں کوئی تاریخ بھگتانے گاؤں سے پندرہ کوس دور قصبے میں

گئے ہوئے تھے۔ وہیں پر انہیں خبر ملی۔ انہی کی گھوڑی پر سوار ذیلدار فضل خان انہیں یہ خبر پہنچانے گیا تھا۔ فضل خان انہیں کچہری میں ہی ایک طرف لے جا کر بولا' "طبیعت بہت خراب ہے جی۔ کوئی عورتوں والی بیماری لگ گئی ہے اور خون بہت آرہا ہے۔ نوراں نائین اس کے پاس ہے۔ آپ جلدی چلیں جی!"

دادا جان سب کام چھوڑ کر انہی قدموں گھر لوٹ آئے۔ گھر میں سوائے دینو کے اور تھا ہی کون! حکیم جی اس دن شہر گئے ہوئے تھے۔ دادا جان نے خود ہی جو کچھ بھی بن پڑا' کیا' لیکن کچھ نہ بن سکا۔ رات پڑتے پڑتے دینو کی ماں کی موت ہوگئی۔ بچوں کی طرف آدمی دوڑایا گیا۔ وہ دوسری صبح جنازہ اٹھنے سے پہلے ہی پہنچ گئے۔ کہتے ہیں' دادا جان رات بھر لاش کے سرہانے بیٹھ کر قرآن خوانی کرتے رہے۔ صبح جنازہ اٹھا اور کفن دفن کے بعد جب لوگ گھر لوٹے تو انہوں نے دیکھا کہ دینو جو کہیں نظر نہیں آرہا تھا' ماں کے کمرے میں اسی کے بستر پر کمبل اوڑھے سو رہا ہے۔

(۴)

دین محمد سے دینو' اور دینو سے دینو جھلا!

اس کی داڑھی مونچھ اپنے دونوں بڑے بھائیوں سے پہلے پھوٹ پڑی تھی اور وہ اپنی بغلوں کے پسینے سے بھیگے ہوئے بال لوگوں کو دکھا دکھا کر خوش ہونے لگا تھا' تو ایک دن دادا جان کو دینو کے بارے میں پہلی شکایت پہنچی جو حیران کن بھی تھی' افسوس ناک بھی اور مضحکہ انگیز بھی۔ کریم خان نے آکر دادا جان کو بتایا کہ اس کی بیوی باندھ پر کپڑے دھو رہی تھی کہ دینو پانی میں ننگا نہاتے ہوئے باہر نکل آیا اور سب بچوں کے سامنے جو وہاں کھیل رہے تھے' اس سے پوچھنے لگا' "ماسی' کیا تمہارا نکاح ہوچکا ہے؟" جب اس کی بیوی نے اسے ڈانٹا تو اور بے شرمی سے کہنے لگا۔ "نہیں ہوا تو میرے ساتھ کرلو نا! پھر ہم بچے پیدا کریں گے۔ بہت سارے بچے پیدا کریں گے۔ شادی ہوجائے تو بچے پیدا ہوتے ہیں نا؟" کریم خان کا خیال تھا کہ دینو صرف اوپر سے پاگل نظر آتا ہے اور اسے ان سب باتوں کا علم ہے اور اب گاؤں کی بہو بیٹیوں کی عزت خطرے میں ہے' لیکن دادا جان کا خیال تھا کہ یہ سب باتیں غلط ہیں۔ گاؤں کے شرارتی لڑکے اسے بہکاتے ہیں اور ایسی باتیں سکھاتے ہیں' جو اس کی سمجھ سے باہر ہیں۔ پھر بھی انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ دینو کو سمجھائیں گے۔ آئندہ وہ ایسی حرکت کبھی نہیں کرے گا۔ لیکن ہوا یہ کہ ادھر دادا جان نے اس سے اس بارے میں پوچھا۔ ادھر اس نے الٹا دادا جان پر ہی اپنے جسم میں رونما ہوتی تبدیلیوں کے بارے میں سوالات کی بوچھاڑ شروع کردی۔ دادا جان کو خاموش ہوجانا پڑا۔

تب اس کے سب سے بڑے بھائی کی شادی ہوئی۔ گھر میں خوب رونق رہی۔ دور دور سے رشتہ دار آئے۔ ان میں بڑی بوڑھیاں بھی تھیں' جوان عورتیں بھی اور بچے بچیاں بھی۔ دینو کو تو جیسے منہ مانگی مراد مل گئی۔ وہ منہ کھولے' کبھی کبھی رال ٹپکائے' زبان باہر نکالے' ناک میں انگلی دیئے' بڑے بوڑھوں' اپنے ہم عمر' خود سے چھوٹے۔ سب کے آگے پیچھے گھومتا رہا۔ اور ان کی باتیں سنتا رہا۔ ایک بات جب اس کی ممانی نے ہنس کر کہا' "بڑوں کی شادیاں تو اب ہو ہی گئی سمجھو' لیکن اس جھلے کو اپنی لڑکی کون دے گا!" اور سبھی ہنس پڑے تو دادا جان نے سنجیدہ لہجے میں کہا' "ایک یہی کیا کم ہے گھر بھر میں! ہمارا تو نصیبہ پھوٹ گیا ہے اس کی شادی کردی تو پاگلوں کی فوج کھڑی ہوجائے گی.... مجھے تو فکر کھائے جارہا ہے کہ میرے بعد اس کا کیا ہوگا! میں تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں' آج نہیں تو کل' کل نہیں تو پرسوں!"

تبھی اس نے ٹھنک کر کہا تھا' "ہم تو شادی کریں گے ممانی! سرور کے بعد تو ہماری ہی شادی ہونی ہے.... ہاں' ہاں!"

"اسے کتنی سمجھ ہے اس بات کی!" اس کی ممانی نے پھر کہا تھا۔ "اسے پتہ ہے کہ بڑے کی شادی کے بعد مجھلے کی شادی ہوتی ہے اور پھر چھوٹے کی باری آتی ہے۔"

اور اسے شادی کا کتنا شوق بھی ہے!" کسی اور نے رائے پیش کی۔

بڑے بھائی کی شادی ہوگئی۔ بہو کو گھر میں آگئی۔ ڈیو کو گھیر گھار کر اس کے سامنے لایا گیا مگر وہ آنکھ نہ اٹھا سکا۔ شرم اور ڈر سے وہ کانپنے لگا۔ اس کے گھٹنے جواب دے گئے اور وہ دھم سے وہیں بیٹھ گیا۔ پھر موقع ملتے ہی ہاتھ چھوڑ کر بھاگ گیا اور اپنی کوٹھڑی کے اندر جاکر دروازہ بند کرلیا۔ شام کو جب اس نے دروازہ کھولا تو مہمان رخصت ہورہے تھے۔ اس کے بارے میں لوگ بھول چکے تھے۔ وہ اکیلا پھرتا رہا' لیکن بھائی یا بھابی کے سامنے نہ آیا۔ دوسرے دن سب کے چمکارنے' بہلانے پر دلہن کے قریب گیا بھی تو زمین کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر چپکے سے ایک پیڑھی پر بیٹھ گیا۔ بھابی نواڑی پلنگ پر سر نیوڑھائے بیٹھی تھی۔ اس کے پاؤں پر مہندی سے بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ وہ کچھ دیر انہیں دیکھتا رہا' پھر نہ جانے اسے کیا سوجھی' اس نے آگے بڑھ کر چارپائی سے سرکتے ہوئے بھابی کے مہندی کے نقش و نگار سے سجے ہوئے دونوں پاؤں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ پہلے تو سب نے سمجھا کہ وہ بھابی کے پاؤں چھو رہا ہے' لیکن جب اس نے اپنے رال بھرے منہ سے انہیں چومنا شروع کردیا تو بھابی نے "اوئی اللہ" کہہ کر پاؤں اوپر کھینچ لیے۔ اس کے بڑے بھائی نے ایک زور کا تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا۔ اور پھر لاتوں سے ایک دو ٹھوکریں بھی جمادیں۔ سبھی دیکھتے رہے۔ ڈیو نے تکلیف سے کراہتے ہوئے' آنسو بھری آنکھوں سے بڑے بھائی کی طرف دیکھا۔ پھر اپنی چوٹوں کو سہلاتے ہوئے اٹھا' اور آہستہ قدموں سے چلتا ہوا صحن کے پار بنی اپنی کوٹھڑی میں چلا گیا۔

اس دن کے بعد اسے اپنے بڑے بھائی اور بھابی سے نفرت سی ہوگئی۔ وہ ہمیشہ کوشش کرتا کہ ان کے قریب نہ جائے۔ کبھی بھابی باورچی خانے میں ہوتی تو پاس بھی نہ پھٹکتا۔ نوراں نائین' جو اس کی ماں کی وفات کے بعد اس کے لیے نوکرانی رکھ لی گئی تھی' اب اس کا خیال رکھتی تھی۔ وہی اس کے لیے لسی کا کٹورا' مسی روٹی اور مکھن لے کر اسے دے آتی۔ لیکن اگر بھابی باورچی خانے میں نہ ہوتی تو وہ چپکے سے گھس جاتا اور جو اس کے دل میں آتا' کھالیتا۔ دادا جان کا حکم تھا کہ اسے کھانے سے نہ روکا جائے۔ اور دادا جان کے حکم کو اب بھی گھر بھر میں کوئی نہیں ٹال سکتا تھا۔

پھر تین چار برسوں کے بعد اس کے منجھلے بھائی کی شادی بھی ہوگئی اور زینت ان کے گھر میں بہو بن کر آگئی۔ گورا گورا' بھرا بھرا چہرہ' سرخ سیبوں جیسے گال اور لمبے لمبے شانوں پر پڑتے ہوئے ریشم کی باریک تاروں جیسے بال' ہاتھوں اور پاؤں پر مہندی کے نقش و نگار' ہیر ہوئی سی' سرخ ریشم سے کاڑھے ہوئے باغ' کپڑے میں لپٹی لپٹائی' جیسے کوئی گڑیا ہو۔ اپنی نئی بھابی کے آتے ہی ڈیو نے اپنا سب رکا ہوا' دبا ہوا پیار اس پر نچھاور کردیا۔ سرور خان خود بھی اچھی طبیعت کا مالک تھا اور اپنے پاگل بھائی کی بے وقوفانہ حرکتوں کو اکثر و بیشتر ہنس کر ٹال دیا کرتا تھا۔ اپنی بیوی کے آنے پر اس نے اسے بھی یہی کہا' "بے چارے کا دماغ کمزور ہے۔ اب ماں نہیں ہے تو کون اس کا خیال رکھے۔"

زینت کی عمر ڈیو کے برابر ہی تھی' لیکن اپنے میکے میں اس نے چھ چھوٹے بہن بھائیوں کو پالا پوسا تھا۔ اس کے پاس ممتا سے بھرپور دل تھا' جس کا کچھ حصہ ڈیو کو بھی ملا تو وہ اسی کا ہوکر رہ گیا۔ نوراں نائین کی ضرورت نہ ڈیو کو رہی اور نہ ہی دلہن کو۔ ہر کام میں ڈیو اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ حتیٰ کہ وہ سارے کام جو نوراں نائین کرتی تھی' اب ڈیو خود خوبصورتی اور صفائی سے کرنے لگا۔ وہ اس چا بکدستی سے اپنی بھابی کا سر گوندھتا' چوٹی بناتا کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے۔ زینت بھی وقت پر اسے چھاچھ روٹی دے دیا کرتی۔ اپنے میاں کے ساتھ بٹھاکر کھانا کھلاتی۔ کبھی کبھی پانی بھی گرم کردیتی کہ وہ نہا دھوکر' صاف ہوجائے' اس کے میلے کپڑے تو نوراں نائین آکر دھو ہی جاتی تھی' کئی بار ایسا ہوا کہ وہ خود نہا دھو کر صاف کپڑے پہن کر' بھابی زینت کے پیچھے پلنگ پر ہی بیٹھ کر اس کے بالوں سے تیل چپڑ رہا ہوتا کہ اوپر سے دادا جان گھر میں وارد ہوئے۔ انہیں آتا دیکھ کر دلہن نے جلدی سے سر پر کپڑا اور منہ پر گھونگھٹ کھینچ لیا۔ دادا جان کھنکارے۔ ڈیو کی طرف انہوں نے عجیب سی نظروں سے دیکھا' پھر کہا۔ "ہاں خوب خدمت کر اپنی بھابی جان کی! اسی کا ثمر ملے گا تجھے! یہ بھی تیرا اتنا خیال رکھتی ہے' جتنا تیری ماں رکھتی تھی۔ خدا اس کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ مجھ گناہ گار کی دعا قبول ہو!"

ایک بار دادا جان باہر چلے گئے تو زینت نے کہا' "دینو' تمہاری ماں جی دادا جان کی اتنی خدمت کرتی تھی سسر ہونے کے ناطے سے اور وہ بھی اس کا خیال رکھتے تھے' لیکن تم تو میرے سسر نہیں ہو۔ دیور بھائی ہو نا؟

اور پھر جب اس کی بھابی کے ہاں پہلا بچہ ہوا تو بھی دادا جان زندہ تھے۔ لیکن اب ان کی صحت جواب دے چکی تھی اور وہ اپنی بیٹھک میں موڑھے پر بیٹھے ہوئے کھانستے رہتے تھے۔ کاروبار میں' زمینوں کے رہن' بیچ میں اور قرضوں کی وصولی میں اب بھی اسی طرح دلچسپی لیتے۔ محمد خان اور سرور خان کی کسی غلطی پر اب بھی اسی طرح تنبیہہ کرتے' جیسے پہلے کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی بیویوں کو گھر کے اندر خبر ہوجاتی کہ آج ان کے خاوندوں کو دادا جان نے جھاڑ پلائی ہے۔

بھابی کا بچہ ہوا' گول مٹول سا' نرم نرم سا' چندھی چندھی آنکھوں والا۔ جونہی زچگی کا پندرھواڑہ گزار کر وہ باہر آئی اور نوراں نائین نے بچے کو دادا جان کے پاؤں پر ایک لمحے کے لیے رکھنے کے بعد اسے دینو کے ہاتھوں میں دیا' کہ دینو نے اسے چوما اور بھاگ کر اپنی کوٹھڑی میں لے گیا۔ دادا جان اور سرور خان گھبرا گئے' لیکن پانچ منٹوں میں ہی دینو اسے واپس لے آیا۔ تو بچے کی پیشانی پر موٹی قلم اور سیاہی سے لکھا تھا' "دین محمد" یہی ایک لفظ تھا' جو اپنے اسکول کے دنوں میں وہ استاد سے لکھنا سیکھ سکا تھا۔ دادا جان ہنس پڑے۔ بولے' "کہتا ہے یہ بچہ میرا ہے!"

"تم نے لو!" سرور خان نے ہنس کر کہا۔ "دینو چاچا تو سب بچوں کا چاچا ہے نا؟" لیکن دینو نے تو کبھی بھول کر بھی بڑے بھائی کے بچوں سے پیار نہیں کیا تھا۔ اسے ان کی طرف دیکھنا تک اچھا نہیں لگتا تھا۔ اب زینت بھابی کے بچے کو وہ سارا دن کندھے پر اٹھائے رکھتا' چومتا' پیار کرتا۔ اس کے پھول جیسے گالوں کے ساتھ اپنی کھردری داڑھی رگڑتا۔ اس کی ماں بچے کو نہلا دھلا کر' صاف کپڑے پہنا کر' بالوں میں کنگھی کرکے' آنکھوں میں "سرمہ ڈال کر' دینو کو پکڑاتی اور تھوڑی دیر میں اپنے گندے ہاتھوں' تھوک اور سیاہی کے نقش و نگار سے گندا کرڈالتا۔ لیکن زینت فراخدل خاتون تھی۔ وہ بھی برا نہ مناتی۔

ایک دن وہ دادا جان کے پاس گیا۔ "دادا جان' مجھے ہزار روپے دوگے نا؟" دادا جان بھی کھاتہ کھولے بیٹھے تھے اور کوئی قرض مانگنے والا کسان زمین پر بیٹھا گڑگڑا رہا تھا انہیں اپنے خون سے بنے ہوئے اس گوشت پوست کے پتلے پر بہت ترس آیا۔ بولے۔ "ایک ہزار روپے کیا' میں تو تمہیں دو ہزار روپے بھی دے سکتا ہوں دینو' لیکن اپنے مرنے کے بعد!"

"تو آپ مریں گے کب دادا جان؟" اس نے پوچھا تھا۔

گڑگڑاتا ہوا کسان ہنسنے لگا تو دادا جان نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ دینو کی ایسی باتوں کو اکثر سن کر نظر انداز کردیا کرتے تھے۔ انہوں نے اس کے سنجیدہ چہرے کی طرف دیکھا' اور پوچھا' "لیکن تم اتنے روپوں کا کروگے کیا؟"

"گھر والی منگواؤں گا منی آرڈر سے!"

دادا جان نے پھر پوچھا تھا۔ "کس نے کہا ہے تم سے کہ گھر والی منی آرڈر سے آجاتی ہے!"

"ڈاک بابو نے۔۔۔" دینو نے جھجکتے ہوئے بتایا۔ "ڈاک بابو نے کہا تھا کہ دادا جان کو نہیں بتانا۔ نہیں تو مجھے نوکری سے نکلوادیں گے۔۔۔ آپ مجھے ہزار روپے دیں گے تو میں گھر والی منگواؤں گا!"

پھر تو یہ جیسے ایک معمول ہوگیا۔ دینو چاچے کی بہو ولایت سے ہوائی جہاز کے ذریعے پارسل سے منگوائی جارہی ہے۔ دینو جھلے کی بیوی پنڈی کیمپ سے بیرنگ لفافے میں آئی ہے اور ڈاکخانے میں بیٹھی ہے کہ اس کا خاوند اسے آکر لے جائے۔ دینو اب تو شادی کرہی لے گا کہ دادا جان نے لڑکی کو پانچ ہزار روپے میں راولپنڈی کے ہسپتال سے منگوایا ہے' جہاں وہ انہی دنوں پیدا ہوئی ہے۔ دینو اب گھر بسا کر بیٹھ ہی جائے گا' آخر اس کا بھی تو حق ہے کہ بھائیوں کی طرح گھر بسائے۔ وہ ہر بات بلاچوں چرااں کئے مان جاتا۔ ساری ساری رات پڑے بستر پر پڑے ہوئے اس تصور میں کاٹ دیتا کہ اس کی بیوی کیسی ہوگی' خدوخال کیسے ہوں گے۔ کانوں میں کانٹے پہنے گی یا بندے۔

گلے میں ہار ہوگا یا لاکٹ۔ جھومر پہنے گی یا نہیں۔ خوب مزہ آئے گا' جب وہ دہی بلوائے گی تو چھاچھ کے بڑے گلاس میں مکھن کی ڈلی ڈال کر اسے دے گی۔ جب اس کا سر دکھے گا تو وہ اس کے سر میں تیل کی مالش کرے گی۔ اس کے کپڑے دھوئے گی۔ سر کی جوئیں نکالے گی۔ ہاتھ منہ دھلائے گی اور کبھی کبھی صابن مل کر گرم پانی سے نہلائے گی۔ جیسے اس کی ماں نہلاتی تھی اور... اور کیا کرے گی وہ؟

اور اسے کچھ نہ سوجھتا۔ سوائے اس کے کہ بچے پیدا کرے گی۔ لیکن کیسے؟ جیسے زینت بھابی کے بچے پیدا ہوئے ہیں۔ ہر سال ایک ننھا منا' گول مٹول' نرم نرم بچہ' جو نوراں نائین اٹھا کر لاتی تھی۔ پہلے دادا جان کے پاؤں پر رکھتی اور پھر اسے تھما دیتی۔ وہ کتنا پیار کرتا تھا ان بچوں سے! بڑا تو اب چھ برس کا ہوچکا تھا۔ اس کے بعد ایک لڑکی تھی اور پھر دو لڑکے اور۔ چھوٹے چھوٹے توتلی باتیں کرتے ہوئے' ننھے منے کھلونے۔

"دیو نانا' دیو نانا!" بڑا کہتا

"دیو چاچا' دیو چاچا!" اس سے چھوٹی تتلاتی۔

چھوٹی تو بہت ہی اچھی لگتی تھی۔ ننھی منی' گول مٹول سی۔ وہ اس کے گلے میں جھول جاتی۔ اس کی ناک پکڑ کر مروڑ دیتی۔ پھر تالی بجا بجا کر کہتی' "آ... آ... دیو چاچے کی ناک گندی!"

وہ اپنی ناک پونچھنے کے لیے کرتے کا دامن اوپر کھینچ لیتا۔ ابھی ناک کے پاس لے جانے بھی نہ پاتا کہ وہ اس کا ازار بند کھینچنے کے لیے ہاتھ بڑھاتی۔ لیکن اب وہ اس کے بارے میں محتاط ہوچکا تھا۔ "موٹی بٹی... اڑھ گئی!" وہ کہتا "بے شری کی بات ہے۔ تمہاری اماں سے کہہ دوں گا!"

"تمہاری اماں سے کہہ دوں گا!" وہ زبان نکال کر اسے چڑاتی۔

لیکن وہ اسے اتنی اچھی لگتی تھی کہ فوراً بعد ہی سب کچھ بھول کر وہ اسے پھر گود میں اٹھا لیتا۔ "جانو میری بیٹی ہے نا؟"

"ہاں' ہوں!" وہ اس کی موچھ کھینچتے ہوئے کہتی۔

اس کی رال لٹک آتی' لیکن وہ بھتیجی کو چوم ہی لیتا۔ کرتے کے بازو سے اپنا گال پونچھتے ہوئے وہ کہتی۔ "چاچا گندا... چاچا گندا!"

ہاں' وہ سوچتا' اس کی گھر والی بھی بچے پیدا کرے گی۔ کیوں نہیں کرے گی؟ کیا محمد خان کے بچے نہیں ہیں؟ سرور خان کے نہیں ہیں؟ اس کی اپنی عمر کے سب لڑکوں کی شادیاں ہوچکی ہیں۔ سبھی بچوں کے باپ بن چکے ہیں۔ جب وہ اس سے اس کی شادی کے بارے میں بات کرتے تو اسے بہت اچھا لگتا۔ اب اس کی باری جو تھی! سرور خان کے بعد اسی کی باری تھی۔ کیا نہیں تھی؟

لیکن ایک دادا جان وفات پاگئے۔

وہ گھوڑی پر سوار ہوکر ساتھ گاؤں کے مزارعوں سے اناج کی وصولی کے لیے گئے تھے واپس آرہے تھے کہ سوکھے نالے کے کنارے بھربھری زمین میں گھوڑی کا پاؤں پھسلا اور وہ گر پڑے بس گرتے ہی مر گئے۔ ساری رات ان کی لاش وہیں پڑی رہی۔ صبح کے وقت جب خبر گاؤں پہنچی تو دونوں بھائیوں نے سر پیٹ لیا۔ گاؤں کے لوگ جوق در جوق وہاں پہنچے۔ وہاں سے لاش کو گھر لایا گیا اور پھر دفنانے کے لئے قبرستان کی طرف ماتم پرسی کے لیے تحصیل اور ضلع سے بڑے بڑے افسر پہنچے۔ ڈپٹی کمشنر نے خان بہادر کے پوتوں کو افسوس کا خط لکھا۔ گاؤں میں ماتمی جلسہ بھی ہوا' جس میں دیگر لوگوں کے علاوہ تحصیلدار صاحب کے سارے عملے' گرد آور' پٹواری اور محکمہ مال کے افسران نے شرکت کی۔ تھانے کا عملہ بھی حاضر تھا۔

کام کاج تو دونوں بھائی پہلے ہی سنبھال چکے تھے۔ حساب کتاب کے بارے میں انہیں بخوبی علم تھا۔ زمین' جائیداد' رہن' گروی' بیع' قرض' مقدموں اور ان سارے معاملات سے متعلقہ کاغذات ان کے پاس ہی تھے۔ پڑھے لکھے تھے' اور منشی قائم دین کی مدد کے بغیر بھی سارے معاملات سمجھ سکتے تھے۔ اس لیے انہیں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ چالیسویں کے دن جب قبیلے کے سبھی لوگ اکٹھے ہوئے تو

صوبیدار بحال خان نے اٹھ کر کہا' "خان بہادر کے ڈیڑھ لاکھ روپے امانت کے طور پر میری معرفت سابق فوجیوں کی کوآپریٹو سوسائٹی کے بانڈ اکاؤنٹ میں جمع ہیں۔ اس روپے کے سود کے طور پر پندرہ سو روپے ماہانہ تاحیات دین محمد یعنی دینو کو دینے کی ذمہ داری میری ہے۔ خان بہادر کی وصیت کے مطابق اصل روپیہ اس کے دونوں بھائیوں کا ہے۔ یعنی اس کی موت کی شکل میں یہ اصل روپیہ دونوں بھائیوں یا ان کی اولاد کا ہے۔" پھر انہوں نے وصیت کا تصدیق شدہ کاغذ پڑھ کر سب کو سنادیا۔ دونوں بھائیوں نے خود اسے پڑھ کر دیکھا۔ پھر کاغذ صوبیدار صاحب کو واپس کرتے ہوئے سرور خان بولا' دادا جان کا فیصلہ کون رد کرسکتا ہے۔ وہ تو عظیم انسان تھے۔ انہیں سب کا خیال تھا۔ لیکن دینو خود تو اکیلا رہنے کے قابل نہیں ہے۔ میرے خیال میں اسی سے پوچھ لینا چاہیے کہ وہ ہم دونوں میں سے کس کے پاس رہنا چاہتا ہے۔ اگر وہ اکیلا بھی رہنا چاہے' تو یہ اس کی مرضی۔"

اس نے مڑ کر دیکھا' جدھر دینو کھڑا تھا۔ اس نے سب کی توجہ اپنی طرف مرکوز پاکر بسورتی ہوئی آواز میں کہا' "اب میری شادی کون کرے گا؟"

کچھ لوگ ہنسے' کچھ مسکرائے۔ کچھ ایک نے رنج اور افسردگی سے آہ کی۔ پھر ایک بڑے بوڑھے نے کہا' "دینو' تو پہلے شادی کے قابل تو ہولے۔ پھر تیری شادی بھی ہوجائے گی! کمانے والا تو بن! پندرہ سو روپے تو ساری عمر کے لیے کافی نہیں ہوتے!"

(۵)

دینو جھلی کے جورو' تیری میری بھابی!

دادا جان کی موت کے دس برس بعد بھی یہ آواز گاؤں کے گلی کوچوں میں رہ رہ کر گونج اٹھی۔ چھ سات برس کے بچوں سے لے کر اپنی عمر کے آدمیوں تک سبھی اسے چھیڑتے۔ اب وہ چالیس کے قریب ہوچکا تھا تو بھی شادی کرنے اور بچے پیدا کرنے کی حرص اسی طرح قائم تھی۔ سر کے بال جھڑ کر باریک ہوگئے تھے۔ کبھی کبھی ان میں جوئیں پڑ جاتیں تو وہ نائی کے گھر جاکر سر پر مشین پھرواکر بالوں سے ہی فارغ ہوجاتا۔ چہرے پر تازگی تو پہلے بھی نہیں تھی' لیکن جو کچھ شروع جوانی میں نکھار آیا تھا' وہ بھی اب کب کا ختم ہوچلا تھا۔ رال اب بھی بہتی تھی۔ ازار بند اب بھی کھل کھل جاتا تھا۔ اگر کوئی لڑکا شرارت سے کھینچ کر کھول دیتا تو باندھنے میں سخت تکلیف پیش آئی تھی۔ پاؤں ننگے رہنے سے مڑ تڑ گئے تھے۔ پتلی ٹانگوں پر رگیں ابھر آئی تھیں اور گھٹنے کے ذرا نیچے تو ان کا ایک گچھا سا لٹک آیا تھا۔ پیلا کرتا اور نیلی شلوار پہنے وہ اب بھی گاؤں کی گلیوں میں بے کار گھومتا تھا۔ داڑھی میں کافی بال سفید ہوچکے تھے۔ لیکن کبھی کبھی اپنے بڑے بھائی سرور خان کا وسم مہندی جو ہر چرا کر لگانے کی کوشش کرتا تاکہ سیاہ نظر آئیں اور کئی بار تو واقعی وہ داڑھی سیاہ کرنے میں کامیاب بھی ہوجاتا۔

لڑکے تو چھیڑتے ہی تھے' کبھی کبھار بوڑھے لوگ بھی ٹھٹھا مخول کرنے سے باز نہ آتے۔ میاں یاور خان کہتا' "بھئی دینو۔ اب تم اپنے بھائی سے کیوں نہیں کہتے کہ وہ اپنی جورو کی شادی تم سے کردے! وہ اسے کافی برسوں تک بیوی بناچکا ہے!" اس کے جواب میں تو اس کے پاس صرف ایک فقرہ تھا' جو اس کی بھابی نے اسے سکھایا ہوا تھا کہ جب بھی کوئی یہ بات کہے' تم یہ فقرہ بول دیا کرو۔ "تم اپنے باپ سے کیوں نہیں کہتے کہ اپنی جورو کی شادی مجھ سے کردے!"

لیکن نشانہ چوک جاتا۔ میاں یار خان پھر کہتا' "ارے' میرے ماں باپ کو تو جنت نشین ہوئے چالیس برس ہوچکے ہیں!"

عبدل کہتا' "شادی تو تیری کروا دیں دینو۔ لیکن جب لڑکی والے تمہارے گھر میں بارات لے کر آئیں گے تو تم انہیں جہیز میں کیا دوگے؟"

وہ سوچ میں پڑ جاتا۔ سب چیزیں تو بڑے بھائی کی ہیں۔ اس کا کیا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں ہے! وہ کیا دے سکتا ہے لڑکی والوں کو جہیز میں؟ پھر دادا جان کی وصیت تو ہے' پندرہ سو روپے ہر ماہ تو ہیں!

ایک دن اس نے بھابی سے پوچھ ہی لیا۔ "زینت بھابی! عبدل کہتا ہے' لڑکی تو اس کی نظر میں ہے' پر جب لڑکی والے بارات لے کر آئیں گے تو میں انہی جہیز میں کیا دوں گا؟"

جانو' جو اب چودہ برس کی تھی' شادی کے بارے میں سب کچھ جانتی تھی' اچھل کر کہنے لگی "دینو چاچا' تم تو کاٹھ کے الو ہو۔ کیا لڑکی والے بارات لے کر آتے ہیں یا لڑکے والے بارات لے کر جاتے ہیں؟"

"وہ تو ٹھیک ہے... پر عبدل نے پوچھا تھا..." اس نے کہا۔

ایک بار کلیم نے رائے دی' "اب تیری بھتیجی جانو کی شادی ہوگی تو صاف کہہ دینا کہ بدلے میں تجھے اس کی ساس چاہیے۔ اگر دیں گے تو شادی ہوگی' نہیں تو نہیں ہوگی!"

"تو کیا وہ مان جائیں گے؟" وہ انتہائی سنجیدگی سے پوچھتا۔

"کیوں نہیں! تم کہہ کر دیکھنا تو سہی!"

وہ جھجکتا۔ کہتا' "پہلے میں زینت بھابی سے پوچھ لوں!"

"ہاں' ہاں' بے شک!" وہ اسے بڑھاوا دیتا۔ "پوچھنے میں حرج ہی کیا ہے؟" اور جب ایسی ہی کوئی بات پوچھنے پر نہ صرف اس کی بھابی نے بلکہ بھائی نے بھی اسے سخت برا بھلا کہا تھا' تو اس نے ایک دن بیٹھ کر یہ تہیہ کیا کہ اب وہ ایسی کوئی بات ان سے نہیں پوچھے گا۔

لڑکوں میں فضلو' خانو' مقبول' شوکت اور کئی دوسرے ایسے تھے' جو نت نئی شرارت سوچتے اور اس صفائی سے اس کے ساتھ عملی مذاق کرتے کہ سبھی گاؤں والے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوجاتے۔ خلدو نے ایک بار حد ہی کردی۔ وہ بج سجاکر' نئے نئے کپڑے پہن کر' اور گلی میں اسے اشارے سے اپنے پاس بلاکر رازدارانہ طریقے سے ایک طرف لے گیا' "بتانا کسی سے نہیں..." وہ مسکرا کر بولا' "بڑی گہری بات ہے اور تمہارے کام کی ہے۔ ڈھوک کے میلے پر جو نٹ نٹیاں آتی ہیں وہ کچھ روپے لے کر ساتھ آنے کو اور بیوی بن کر رہنے کو تیار ہوجاتی ہیں۔ ایک تو میں خود اپنے لیے لینے کو چلا ہوں... یہ' دیکھ' روپے..." اور اس نے جیب میں سے کچھ روپے اسے نکال کر دکھائے۔ "ساتھ لاؤں گا اور بڑے دھوم دھڑاکے سے اس کے ساتھ شادی کرکے اسے گھر میں ڈال لوں گا!"

دینو کی رال ٹپک آئی' "پر میرے پاس تو روپے نہیں ہیں!" وہ بولا اور پرامید نظروں سے خلدو کانے کی طرف دیکھا۔

"ارے صرف ایک سو روپے کی ہی تو بات ہے... بھابی کی پوٹلی سے نکال لا اور عیش کر! موقع چوک گیا تو ساری عمر افسوس کرو گے۔ میں تمہارا ٹیلے پر انتظار کروں گا۔ جلدی آنا!"

اس نے ذرا سا سوچا اور پھر خلدو کے کان کے پاس منہ لے جا کر پوچھا'

"بچے بھی پیدا کرے گی نا؟"

"ہاں ہاں' کیوں نہیں!" اس نے کہا' "بچے پیدا نہیں کرے گی تو جائے گی کہاں!"

نٹ نٹیوں کا تماشا دیکھتے ہوئے خلدو نے اس سے سو روپے کا نوٹ لے لیا اور بوری کے سائبان کے پیچھے چلا گیا تو دینو آنے والی خوشی کے انتظار میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ انتظار کرنے لگا۔ جب شام ہوگئی اور میلہ اجڑنے لگا تو اس خیال سے کہ خلدو نٹی کو لے کر گاؤں نہ چلا گیا ہو' وہ بھی واپس ہولیا۔ گھر پہنچا تو زینت بھابی نے گھر میں ادھم مچا رکھا تھا۔ اس نے جب یہ ساری بات بتائی تو اس کا بھائی خلدو کے گھر پہنچا' لیکن خلدو صاف مکر گیا' وہ تو میلے پر گیا ہی نہ تھا' وہ بولا' دینو جھوٹ بکتا ہے' اس نے روپے کہیں اور گنوادیے ہوں گے۔

شوکت' جسے سب شوکو کہتے تھے' ایک ہی کائیاں تھا۔ ایک دن کہنے لگا' "ڈھلیاں میں مسجد کے پچھواڑے ایک اچنبھے کی بات ہوئی

ہے۔ کنواں کھودا جارہا تھا کہ چھم چھم کرتی ہوئی پندرہ بیس لڑکیاں اندر سے نکل آئیں' بولیں کہ وہ آسمان کی حوریں ہیں' اور دنیا میں آکر بسنے آئی ہیں۔ کوئی اچھے مرد مل جائیں تو ان سے شادی کرلیں!"

جانگھو جانگلی نے کہا' "دینو' تم کیوں نہیں چلے جاتے ڈھلیاں؟"

"پر پر..." وہ بولا' "میرے ساتھ مان جائے گی کوئی شادی کے لیے؟"

"کیوں نہیں؟" اس نے کہا' "تم میں کیا کمی ہے؟"

وہ پھر کسی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر جی کڑا کر کے اس نے پوچھ ہی لیا۔ "کیا وہ بچے بھی جنتی ہیں؟"

"ارے' یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے!" سب نے یک زبان ہوکر کہا۔ "ہر عورت شادی کے بعد بچے پیدا کرتی ہے!"

اور دوسرے دن جب وہ پیدل پندرہ میل چل کر ڈھلیاں پہنچا اور مسجد کے پچھواڑے گیا تو سب نے پاگل سمجھ کر' یہ کہہ کر واپس بھیج دیا کہ جو حوریں کنوئیں سے برآمد ہوئی تھیں' واپس چلی گئی ہیں۔

منی آرڈر سے بیوی' بیرنگ لفافے میں آئی ہوئی بیوی' پارسل اور ریل سے آئی ہوئی بیوی' کنوئیں سے برآمد ہوئی بیوی... یا میلے سے خرید کر لائی ہوئی بیوی!

کوئی بیوی' کیسی بھی بیوی' زینت بھابی کی طرح گول گول چہرے اور بھرے بھرے کولھوں والی بیوی.... اور بچے پیدا کرنے والی بیوی!

دینو جھلے کی جورو! تیری میری بھابی!

جنت نشین' خان بہادر اللہ داد خان صاحب کا ایک ہی نام لیوا دین محمد.... دینو جھلا!

او میری دادی! تو جوانی میں ہی کیوں مرگئی!!

(۶)

جانو نے کہا' "اوں ہوں' ہم نہیں کھیلتے۔ دینو چاچا تمہاری آنکھوں پر سے انگلیاں ہٹاکر تمہیں دکھائی دیتا ہے کہ ہم کہیں پلنگ کے نیچے تو نہیں چھپے ہوئے ہیں۔!" اور وہ منہ پھلائے چارپائی کے پائنتی پر جاکر بیٹھ گئی۔

چودہ برس کی گول مٹول سی جانو اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ "لکن میٹی" کھیلتے ہوئے ناراض ہوکر الگ بیٹھ گئی تو دینو چاچا کو اس پر بہت پیار آیا۔

آجا میری میٹھی سی گڑیا۔ کھیل لے۔ تو' میں اب نہیں دکھاؤں گا ان کو کہ تم کہاں چھپی ہو!"

نہیں کھیلتی تو نہ کھیلے!" ایک بچے نے کہا۔

"تم سے کٹی! تم سے کٹی۔ اور تم سے بھی کٹی!" جانو نے سب کے ساتھ کٹی کردی۔ تب دینو نے بھی انگلی کے ناخن کو سامنے والے دانت کے نیچے پھنساکر کٹکٹاتے ہوئے اپنی بھتیجی کے ساتھ کٹی کردی۔ وہ چارپائی پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور پکڑے جانے والے بچے کی آنکھیں بند کرکے انہیں کھلا رہا تھا۔ رانی' بے بی' گڈی اور پپو نے جب اپنی بڑی بہن جانو' کے ساتھ کٹی کردی' تو وہ نتھنے پھلاتی' شوں شوں کرتی ہوئی' ہاتھوں سے شلوار کے پائنچے گھٹنوں تک اٹھائے' پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی ہوئی اندر چلی گئی' جہاں اس کی ماں کھڑی لیمپ جلا رہی تھی۔

"دو وقت مل رہے ہیں جانو' تو اب بچوں کے ساتھ مت کھیل! اتنی بڑی ہوگئی ہے۔ اب اندر جاکر ننھے کو سلا!" اس کی ماں نے کہا۔

لیکن اندھیرا خوب گہرا پڑنے پر اور کھانا کھانے کے بعد جب دن بھر کے تھکے ہارے زینت اور سرور خان اندر سونے کے لئے چلے گئے تو شام کی کٹی کو بھلاکر سبھی بچے طوفان کی طرح پھر دینو چاچے کے کمرے میں آگھسے۔

"چاچا لکن میٹی... لکن میٹی!" وہ سب چلا رہے ہے۔ "پہلی باری جانو کی!" جانو' پھوں پھوں کرتی' نتھنے پھلاتی' شلوار کے پائنچے دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھائے اس کی چارپائی پر چڑھ کر بیٹھ گئی اور جوں ہی دینو نے اس کی آنکھیں بند کیں' سب بچے بھاگ کر آنگن کے اندھیرے میں گھل مل گئے۔

"لک چھپ جانا! مکئی کا دانا! راجے کی بیٹی آئی ہے!" دینو نے زور سے کہا۔

"آجائے!" آنگن کے ایک کونے سے آواز آئی۔

"آجائے' آجائے!" کئی آوازیں ایک ساتھ آئیں۔

دینو نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔ جانو نے جلدی جلدی آنکھیں جھپکیں۔ آنکھوں پر ہاتھوں کا دباؤ پڑنے سے اس کی آنکھوں کے سامنے سبز پیلے طوطے ناچ رہے تھے۔ اس نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ پھر کہا "چاچا" تم تو اتنے زور سے دباتے کہ درد کردیتے ہو......" پھر اس نے آہستہ سے پوچھا۔ "پپو کہاں گیا' چاچا؟"

"ڈھونڈ لے جاکر!" اس نے کہا۔

"موئی چٹی! موئی' لنگڑی سوئی!" اس نے جواباً اس کے نام گنوائے

موئی' لنگڑی کہنے سے جانو بہت چڑتی تھی اور جب سے اس کی منگنی ہوئی تھی' اسے اس بات کا شدت سے احساس ہوچلا تھا کہ وہ دیگر بچوں سے بڑی ہے اور انہیں اس کا احترام کرنا چاہئے۔

"موا۔ چپا.....دینو جھلا مرگیا!" کہہ کر جانو' سیدھی ایندھن کی لکڑیوں کی کوٹھری میں پہنچی اور وہاں چھپے ہوئے پپو کو نکال لائی۔

"پکڑا گیا... پکڑا گیا!" اس نے کہا "چور پکڑا گیا!"

"لک چھپ جانا' مکئی کا دانا' راجے کا بیٹا آیا ہے!"

"آجائے!"

"چاچا بتادو نا' اچھا' ایک بھی لے لینا!"

وہ کان کے پاس منہ لے کر جاکر کہتا ہے "ڈیوڑھی میں سیڑھیوں کے پاس بڑے دروازے کے پیچھے گڑیا ہے!"

"اچھا جان گئی! خصماں نوں کھانی!" اور وہ اپنا گال چمی دینے کے لئے آگے کردیتی۔ جسے اپنے رال اور تھوک بھرے منہ سے دینو چوم لیتا۔ وہ اپنی چنری سے گال رگڑتی ہوئی چور پکڑنے کے لئے بھاگ جاتی۔ لیکن اگر دینو کہتا' "میں نہیں بتاتا' دھوکا دیں تو گناہ ہوتا ہے۔"

"گناہ ہوتا ہے" وہ منہ چڑاتی' نقل کرتی "جب گڑیا کو بتا دیتے ہو تو؟

"ڈھونڈلے جاکر۔" جانو نے زبان نکال کر اسے چڑایا "دینو جھلا !"

"میری مرضی! اچھا کرتا ہوں" وہ غصے میں آجاتا۔

"دینو جھلا!

"موئی چٹی۔ موئی' لنگڑی سوئی! " وہ کہتا۔

موئی ہوگی تیری ساس!"

"تیری ساس"

"تیری ساس"

جھگڑا بڑھ جاتا اور کھیل بند ہوجاتا تو سب بچے اپنے اپنے پوشیدہ کونوں سے نکل کا باہر آجاتے۔ "بھئی کھیلتے کیوں نہیں؟ جانو تو ہر

وقت لڑتی ہی رہتی ہے۔ لڑاکو کہیں کی!" اس سے چھوٹی گڑیا کہتی "چاچا" تم اس کے دولھے سے بولنا تک نہیں!"
دولھا کا نام آتے ہی جانو شرما جاتی۔ "چپ رہو گڑیا' کیا شرم نہیں آتی؟"
"مجھے کیوں شرم آئے!" گیارہ برس کی گڑیا کہتی "میں تو اس کا نام بھی لوں گی تو مجھے شرم نہیں آئے گی۔ میرا جیجا جو ٹھہرا!" اور وہ منہ بنا کر کہتی "خلیل خان' خلیل خان!"
جانو کا منہ سرخ ہوجاتا۔ وہ سیانی لڑکیوں کی طرح سر پر چنزی لپیٹ کر سرک کر چاچا کے قریب بیٹھ جاتی۔
"کھیل بند بھائی.....اب بجھارتیں بجھائیں گے!"
پہیلیوں کا نام آتے ہی پپو خوش ہوجاتا۔ "ہاں' پہلے جانو کی باری!"
وہ نئی نئی پہیلیوں سے ان کا دماغ خراب کر دیتی۔ نہ جانے کہاں کہاں سے پڑھ کر آتی تھی۔ جب سب زچ ہوجاتے تو بتا بھی دیتی۔
"اب دینو چاچا کی باری !" سب ہی کہتے۔
"ہری پال' سوکھی ڈال......"
ابھی وہ پہیلی پوری بھی نہ کرچکتا کہ سبھی کہتے "ہری مرچ!"
جانو کہتی "چاچا تم تو نرے بدھو ہو۔ تمہیں کوئی اپنی لڑکی کیسے دے گا! روز ہی تو تم یہی ایک پہیلی بجھاتے ہو۔ سب کو آتی ہے یہ!"

(۷)

"لک چھپ جانا' مکئی کا دانا' راجے کی بیٹی آئی ہے!"
"آجائے"
راجے کی بیٹی' جانو!
"تمہیں سہاگ کے گیت آتے ہیں گڑیا؟ آؤ گاؤ' وہی جن میں بابل سے کہا جاتا ہے کہ بیٹی کو اجنبی لوگوں کے ساتھ پردیس میں مت بھیجو"

اور جب سب بچے بڑی بوڑھیوں کی نقل کرتے ہوئے آدھے دائرے میں بیٹھ کر گلا پھاڑ پھاڑ کر سہاگ گیت گاتے اور دینو بھی ان کے ساتھ مل جاتا تو ننھے کے جاگنے کے ڈر سے زینت اندر سے ہی پکار کر کہتی "دینو اب بند کرو یہ شور شراب! ڈاڑھی سفید ہونے کو آئی ہے پر بچہ ہی ہے"
"بچوں میں بچہ ہے!" گڑیا چاچے کو چڑاتے ہوئے کہتی "دینو جھلا ہے!"
"تیرا چاچا ہے' مرجانی' رڑھ گئی لڑکی! اور تیرے دولھا کا چچا سسر لگے گا!"
"اور تیرے دولھے کا؟" گڑیا پوچھتی
جانو کی شادی میں صرف تین ماہ باقی رہ گئے۔ ابھی لڑکے کو شہر سے چھٹی نہیں ملی تھی۔ چھٹی اپریل میں ملے گی۔ اور ابھی تو جنوری کا مہینہ تھا۔ اس بات کا جانو کو بھی علم تھا۔ ایک رات جب سب بچے پیر خیراتی کی درگاہ کا مشعلوں والا جلوس دیکھنے کے لئے بھاگ کر گلی میں چلے گئے تو جانو نے پوچھا "چاچا' تمہیں پتہ ہے' شادی کے بعد کیا ہوتا ہے؟"
"ہاں پتہ ہے!" دینو نے سینہ پھلا کر کہا "شادی کے بعد دولھا دلہن کو اپنے گھر لے جاتا ہے!"
"ارے نہیں چاچا' وہ تو مجھے بھی پتہ ہے مگر یہ بتاؤ شادی کے بعد لڑکی کو کیا ہوتا ہے؟" جانو نے اپنی بڑی بڑی پلکیں جھپکا کر اپنی چنزی سے چہرے کو کس کر لپیٹتے ہوئے پوچھا۔ "تم تو بدھو ہو۔ میری تو کوئی سہیلی بھی نہیں۔ کس سے پوچھوں!"
دینو نے کچھ منٹ سوچا' پھر کہا "اچھا' تو چپ رہ' بھی دوگی نا؟ کل تمہیں بتاؤں گا۔ مجھے سب پتہ ہے!" اور جب وہ سمٹ سکڑ گئی تو

دینو نے اس کے گول مٹول گالوں کو سہلایا۔ "موٹی' لنگڑی سوئی! تم تو نری پری اپنی ماں ہو!" اس نے زینت بھابی کو اس کی بیٹی میں دیکھتے ہوئے کہا۔

آج جانو نے برا نہ مانا۔ "مجھے ڈر لگتا ہے چاچا!" وہ اور سمٹ گئی۔ دینو کو اس پر بہت پیار آیا۔ اس نے اسے اپنی گود میں لے کر پیار کیا اور پچکار کر کہا "اب جا' جا کر سو رہ' ڈرنے کی کوئی بات ہے؟ کوئی پیٹتا تو نہیں سسرال میں! اور پھر تیری تو ساس بھی نہیں ہے جو پیٹے گی!"

"تم تو جھلے ہو چاچا!" اس نے کھینچ کر کہا "سمجھتے کیوں نہیں۔ مار پیٹ کا تو کوئی ڈر نہیں ہوتا۔ بس مجھے یہ نہیں پتا کہ دولھا میرے ساتھ کیا....." اور وہ شرما گئی...پھر سسک سسک کر رونے لگی۔ اس نے چاچا کے سینے میں اپنا منہ چھپالیا۔

تبھی دینو کو کوئی بات یاد آگئی۔ اس نے کہا "تیری ماں یہاں شادی کے بعد آئی تھی تو کیا ہوا تھا؟ بس بچے پیدا کرتی گئی... آئے برس ایک بچہ....ایک' دو' تین' چار' پانچ' چھ بچے! تمھیں وہاں کیا ہو سکتا ہے؟"

وہ روتے روتے ہنس پڑی "تم تو خود ہی بچے ہو چاچا! نرے پرے جھلے ہو!"

"موٹی' لنگڑی سوئی!" اس نے پیار سے کہا۔

وہ خلدو کی ڈیوڑھی سے نکلا تو اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ خلدو نے جو پٹی پڑھائی تھی وہ ابھی اس کے دماغ میں تازہ تھی۔ جن باتوں کا نقشہ کھینچ کر اس نے دکھایا تھا۔ انہیں ٹھیک ڈھنگ سے' پوری تفصیل کے ساتھ وہ پہلے نہیں جانتا تھا لیکن اب انہیں خلدو جیسے باتونی سے سن کر تو ایسے لگتا تھا جیسے وہ ان باتوں کو برسوں سے جانتا ہو بلکہ خود بھی ان تجربوں سے گزر چکا ہو۔ اس نے گلی کو پار کیا۔ مڑ کر دیکھا تو خلدو اسے دروازے کی اوٹ سے دیکھ رہا تھا۔

وہ مسکرایا

"خلدو کوئی برا آدمی نہیں" اس نے سوچا۔ اب جتنی باتیں اس نے بتائی تھیں' اتنی تو شاید سرور خان بھی نہ جانتا ہو جو چھ بچوں کا باپ تھا اور جس کی شادی ہوئے سولہ برس ہو چکے تھے۔ اسے افسوس ہوا کہ یہ باتیں وہ پہلے سے کیوں نہیں جان پایا۔ اپنی بے نام خواہشات کو نام دینے کا شعور اس میں نہیں تھا تو بھی وہ ان خواہشات کو سمجھنے کی کوشش بھی نہ کرپایا تھا۔ اور اب چالیس برس کی عمر میں اسے پتا چلا بھی تو کس سے؟ خلدو کانے سے جسے وہ اپنا دشمن ہی سمجھتا رہا تھا اور جو کئی بار اسے پہلے دھوکا دے چکا تھا۔

"لک چھپ جانا' مکئی کا دانا' راجے کی بیٹی آئی ہے"

"آجائے!"

"تمھیں اب ڈر تو نہیں لگے گا نا جانو' میری بیٹی؟"

"نہیں چاچا...پر ______"

"لک چھپ جانا' مکئی کا دانا' راجے کی بیٹی آئی ہے"

"آجائے!"

"چاچا' تم تو کہتے ہو میرا دولھا بڑا تگڑا جوان ہے' تم تو بوڑھے ہو نا چاچا؟"

"ہاں' جانو!"

"چاچا کیا میرے دولھا کو ان سب باتوں کا پتا ہوگا؟"

"ہاں' جانو"

اپنی جگہوں سے نکل کر باہر آئے ہوئے بچے اودب کر بولے "چاچا تم اب جانو کی آنکھیں چھوڑو بھی نا! ہماری تو ٹانگیں تھک گئیں... نہیں تو کھیل ختم!"

"لک چھپ جانا' مکئی کا دانا' راجے کی بیٹی آئی ہے"
"آجائے!" صرف ایک آواز۔ باقی سب بچے سونے کے لئے چلے گئے تھے۔
"صرف گڑیا رہ گئی ہے"
"چلو بھئی کھیل ختم!"
"ختم تو ختم سہی... میں چلی سونے کو!" گڑیا بولی

"لک چھپ جانا' مکئی کا دانا' راجے کی بیٹی آئی ہے"
"کوئی جواب نہیں"
"سب چلے گئے چاچا! ———"
"ہاں' میری بیٹی!"

زینت بھابی نے اندر سے آواز دی "جانو' غضب خدا کا' بارہ بجنے کو آئے' اب اندر آکر سوجاؤ۔"

آدھ گھنٹے کے بعد زینت باہر نکلی تو دھک سے رہ گئی۔ "ارے غضب خدا کا! یہیں چاچے سے جڑ کر سوگئی! جوئیں چڑھ جائیں گی' تجھے چڑیل!" اور وہ جانو کو نیند سے اٹھا کر کھینچتی ہوئے اندر لے گئی۔

چپ چاپ' خاموشی... دور سے چوکیدار کی آواز... خبردار جاگتے رہو!

(۸)

"نہیں!" زور سے دھاڑ کر سرور خان اچھل کر کھڑا ہوگیا" میں مار ڈالوں گا حرام زادے کو! سگی بھتیجی کے ساتھ !"

"ماردو نا..." اس کی بیوی زینت نے برف کی سی سرد آواز میں کہا "تمہارا چاچا بھی ہے اور بھائی بھی... اور اب... اب اور بھی کچھ... تم نے تو اپنے دادا جان سے کچھ بھی نہیں سیکھا۔ خاموش رہو اور بچی کی شادی ہو جانے دو! پھر کوئی بات ہوئی تو سنبھال لیں گے۔ اب چار دنوں کی ہی تو بات ہے... شادی ہوجائے گی تو کسی کو کیا پتا چلے گا کہ کتنے دن"

سرور خان سر پکڑتے ہوئے دھم سے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ پھر نہ جانے اس کے دل میں کیا آیا۔ وہ اٹھا اور ڈینو کی کوٹھری کے پاس گیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے دروازے میں سے جھانک کر دیکھا۔

ننھے کے لئے کپڑے کی کترنیں لپیٹ لپیٹ کر جو گڈا ڈینو نے کئی دنوں کی محنت سے بنایا تھا وہ اس کی پیشانی پر کالے چاک سے صرف ایک لفظ لکھ رہا تھا ——— یعنی اپنا نام ———

خوشحالی کی منصوبہ بندی کیجئے



کراچی وسطی/غربی کے فلاحی مراکز
برائے مفت مشورہ اور خدمات

۱۔ غریب آباد	مکان نمبر ای۔ ۲۷/۲۹
۲۔ نیوکراچی	ریڈ کریسنٹ ڈسپنسری، سیکٹر ۱۱۔ ایف
۳۔ بلدیہ	پلاٹ ۳۰، ۲۱۹۴/۷ تنظیم روڈ بلدیہ
۴۔ نارتھ ناظم آباد	پلاٹ بی/۱۲۳ پہاڑ گنج، بلال آباد
۵۔ اورنگی سیکٹر نمبر ۱۱½	مکان نمبر ۱۲۹۴/۸ اورنگی ٹاؤن
۶۔ بفر زون	مکان نمبر آر ۱۵/۷۷، اے ۲۳ پہلی منزل
۷۔ اورنگی ٹاؤن	چیسٹ کلینک
۸۔ الاعظم	سندھ گورنمنٹ ہسپتال، لیاقت آباد
۹۔ فیڈرل بی ایریا	کے ایم سی میٹرنٹی ہوم
۱۰۔ لیاقت آباد	کے ایم سی ڈسپنسری و میٹرنٹی ہوم، نزد پولیس اسٹیشن
۱۱۔ موسیٰ کالونی	مکان نمبر ۷۔ اے/۱۱۳، ڈاکٹر ضیاء الدین روڈ
۱۲۔ گولیمار	مکان نمبر ۸۰/۴۴۴/۶-۱ کوارٹرز، گولیمار نمبر ۲
۱۳۔ پاک کالونی	مکان نمبر ڈی ۱۳، عیدگاہ کالونی (زبیری کالونی) منگھوپیر روڈ
۱۴۔ کے وی سائٹ	کلثوم بائی ولیکا ہسپتال
۱۵۔ یو پی سوسائٹی	سندھ گورنمنٹ ہسپتال، نیوکراچی
۱۶۔ بنارس کالونی	سوشل سیکورٹی میڈیکل سینٹر، بنارس چوک
۱۷۔ اورنگی سیکٹر	ریڈ کریسنٹ ہسپتال، اورنگی ۵
۱۸۔ اورنگی سیکٹر ۱۴ (قصبہ II)	نواب جھتاری کمیونٹی سینٹر، قصبہ کالونی
۱۹۔ قصبہ کالونی	مکان نمبر اے۔ ۱۲/۷، قصبہ کالونی
۲۰۔ منگھوپیر	نزد گرم چشمہ، منگھوپیر
۲۱۔ بلدیہ سعید آباد	پلاٹ ۳۱/۱۱۔ ایف ۲، سعید آباد، بلدیہ ٹاؤن
۲۲۔ شیر شاہ	سوشل سیکورٹی ہسپتال شیرشاہ، عقب حبیب بنک
۲۳۔ ناظم آباد	ایم سی ایچ سینٹر، نزد انکوائری آفس، ناظم آباد نمبر ۲
۲۴۔ فیڈرل گورنمنٹ ڈسپنسری	فیڈرل گورنمنٹ ڈسپنسری۔ ایف بی ایریا
۲۵۔ نیوکراچی	پلاٹ نمبر ایل/۱۷۸، سیکٹر ۵ ایم
۲۶۔ ماری پور	قسطم ہسپتال، ماری پور
۲۷۔ گلبہار	سوشل سیکورٹی ہسپتال، گلبہار نمبر ۱

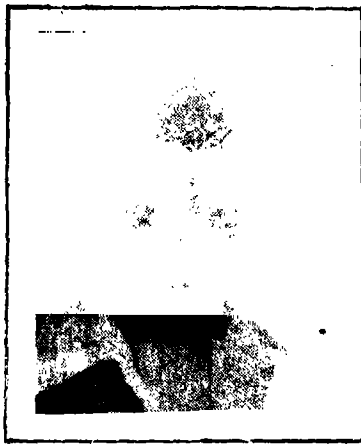
خاندانی منصوبہ بندی کے طریقے اپنائیے

محکمہ بہبود آبادی۔ حکومت سندھ

INF/KRY-5675/94

امراؤ طارق

عینائم کے تراہے پر تامار



مرنے سے صرف چند ساعتیں قبل اس نے کہا

"تم اس جوتے کی مانند ہو جو سرائے کی ڈیوڑھی کے باہر پڑا رہتا ہے اور جسے سرائے میں عارضی قیام کرنے والا ہر مسافر ضرورت کے تحت بغیر کسی پس و پیش کے استعمال کرتا ہے۔ گورے، کالے، گندے اور صاف ہر طرح کے پاؤں اسے پہنتے اور اتارتے رہتے ہیں اور بے دریغ استعمال سے اس کی سیون جگہ جگہ سے ادھڑ گئی ہے اور صورت اتنی بدل گئی ہے کہ اب اسے جوتا کہنا مشکل ہے۔"

حالانکہ ابھی تک اس کی سانس دھونکنی کی طرح چلتی سنائی دے رہی تھی۔ تنفس قابو میں نہ تھا اور وہ ہمیشہ کی طرح لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور بے لباس جسم پسینے سے بھیگا ہوا تھا لیکن وہ بولے جارہا تھا اور زہر سا اگل رہا تھا۔ جیسے اس نے جوتا پہلی بار دیکھا ہو، جیسے اسے کوئی رنج پہنچا ہو اور جیسے اس نے آج آخری بار ملنے کا فیصلہ کرلیا ہو۔ جیسے اسے میں نے ہمیشہ جیسی تسکین نہ دی ہو۔ تب میں نے بھی سوچا اور روح کی گہرائی تک تیر کی طرح پیوست ہوجانے والی اس تضحیک کا انتقام لے لیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب اسے اسی لمحے مرجانا چاہئے اسے اب اور زندہ نہیں رہنا چاہئے اور وہ مرگیا۔

فادر انتھونی ولکاکس نے اس کے خواب میں بولے گئے جملوں کی طرح یہ جملے سنے اور اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے یقین کرنا چاہتا ہو کہ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی وہ حالت بیداری میں کہہ رہی تھی یا عالم خواب میں بول رہی تھی اور کیا وہ اپنے جملوں کے مفہوم سے آشنا تھی یا یوں ہی بولے جارہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ اب تک ہل رہے تھے۔ وہ دونوں ابھی ابھی عبادت کے بڑے ہال سے اردو عبادت ختم کرکے چیپل میں داخل ہوئے تھے جہاں ایک ننھا سا بلب روشن تھا جس کی پھیلی کمزور سی روشنی اس کے چہرے کو پوری طرح واضح نہ کرسکتی تھی۔ اس نے بھی آج ہر قدم پر ایک تبدیلی محسوس کی تھی۔ وہ جب دبے پاؤں عبادت کے بڑے ہال میں داخل ہوئی تھی اس وقت وہاں مومی شمعیں جل رہی تھیں اور بہت سے روشن بلب دیکھے تھے اور پورا ہال روشنی اور عود کی خوشبو سے بھرا ہوا تھا اور پھر عبادت کے بڑے ہال سے چیپل میں آتے ہوئے سورج کی تیز کرنوں کی زرد میں آگئی تھی اور اب پھر چیپل میں ایک کمزور مدہم روشنی والا بلب اس کے سر پر تھا۔ وہ ان چند لمحوں میں کئی تضادات سے دوچار ہوئی تھی اور یہاں جب اس نے اس ننھے سے بلب کی کمزور زرد روشنی دیکھی تو اسے شدید احساس ہوا اور اس کی نگاہوں کے سامنے عبادت کے بڑے ہال کی مومی شمعیں جھلملائیں اور گل ہوگئیں۔ اسے اندھیرے کا احساس ہوا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ وہ روشنی میں تھی بلب

روشن تھا۔ اسے اندھیرے کے احساس پر ندامت سی ہوئی۔ بلب تو روشن تھا۔ پیلی کمزور روشنی تو اس کے ارد گرد بہرحال موجود تھی۔ تضادات اپنی جگہ مگر روشنی تو تھی اندھیرا شاید اس کے اندر پھیل چکا تھا۔

جب وہ ہال میں داخل ہوئی تھی اس وقت ہال عبادت میں شریک مردوں اور عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ اردو عبادت میں ہمیشہ ہال کھچا کھچ بھر جایا کرتا ہے۔ شہر کے متوسط اور نچلے طبقے کے لوگ اردو عبادت میں بڑے ذوق شوق سے شرکت کیا کرتے ہیں۔ یہ بات اسے کسی نے بہت پہلے بتادی تھی۔ کھچا کھچ بھرے ہال میں بجلی کے قمقموں کے ساتھ بہت سی موٹی شمعیں شمع دانوں میں جل رہی تھیں اور پگھلی ہوئی موم اونچی لمبی موم بتیوں کے سرے سے بہہ بہہ کر چپک گئی تھی۔ چاروں کونوں میں رکھے ہوئے عود دانوں سے اٹھتے ہوئے گاڑھے دھوئیں نے فضا کو بوجھل بنادیا تھا۔ چھت میں گھومتے ہوئے پنکھوں کے پر سرسرا رہے تھے اور پنکھوں کی آواز کے ساتھ گریہ کرنے والوں کی سسکیاں اور بوڑھوں کی گاہے گاہے بلند ہونے والی بلغمی کھانسی اور فادر انتھونی ولکاکس کی آواز کے علاوہ اور کوئی آواز نہ تھی اور یوں محسوس ہورہا تھا جیسے ان آوازوں میں ایک جانی پہچانی آواز خاموشی کی ہے اور خاموشی کی یہ آواز دوسری تمام آوازوں سے بلند اور صاف سنائی دے رہی تھی، عبادت گاہوں کی خاموشی اور خوف کی آواز اس نے ہر عبادت گاہ میں سنی تھی۔ ہر مقدس عمارت میں اس آواز نے اس کا تعاقب کیا تھا وہی آواز اسے یہاں بھی صاف سنائی دے رہی تھی، لیکن فادر انتھونی ولکاکس کی آواز خاموشی اور خوف کی تعاقب کرتی رہنے والی، آواز پر غالب آگئی اور فادر انتھونی ولکاکس کی آواز کا سحر اس کے خون کی گردش میں شامل ہوگیا اور اس کی رگ و پے میں سرایت کرگیا اور وہ اس آواز کے ارتعاش میں کھوگئی۔

فادر انتھونی ولکاکس کی آواز کا ارتعاش پنکھوں کے پروں میں اور موٹی شمعوں کی لوکی حرکت میں اور عود کے گاڑھے دھوئیں میں ہر جگہ سنائی دے رہا تھا۔

"اور اس وقت یوں ہوا کہ یہوداہ اپنے بھائیوں سے جدا ہوا اور ایک عدلامی شخص حیرہ نامی کے یہاں گیا اور یہوداہ نے وہاں شوع نامی ایک کنعانی مرد کی بیٹی کو دیکھا اور اسے بیاہا اور اس سے خلوت کی وہ حاملہ ہوئی اور اس سے بیٹا پیدا ہوا اور اس کا نام عیر رکھا اور اس سے پھر حمل ہوا اور بیٹا پیدا ہوا اور اس کا نام اونان رکھا اور وہ پھر حاملہ ہوئی اور اس سے بیٹا پیدا ہوا اور اس کا نام شیلہ رکھا اور اس کی پیدائش کے وقت وہ کزیب میں تھی اور یہوداہ نے اپنے پہلوٹھے عیر کے لئے ایک عورت بیاہی جس کا نام تمار تھا اور عیر یہوداہ کا پہلوٹھا خداوند کی نگاہ میں شریر تھا سو خداوند نے اسے مار دیا تب یہوداہ نے اونان سے کہا کہ اپنے بھائی کی بیوی کے پاس جا اور اس سے بیاہ کر اور اپنے بھائی کے لئے نسل قائم کر لیکن اونان نے جانا کہ یہ میری نسل نہ کہلائے گی۔ تو یوں ہوا کہ جب وہ اپنے بھائی کی بیوی سے خلوت کرتا تو نطفہ زمین پر ضائع کرتا۔ تا نہ ہو کہ اس کے بھائی کی نسل اس سے ہو۔ اور اس کا یہ کام خداوند کی نگاہ میں برا تھا، اس لئے اس نے اسے بھی مار دیا۔ تب یہوداہ نے اپنی بہو تمار سے کہا کہ اپنے باپ کے گھر میں بیٹھی رہ جب تک میرا بیٹا شیلہ بڑا ہو کیوں کہ اس نے کہا نہ ہو کہ وہ بھی اپنے بھائیوں کی طرح مرجائے۔ سو تمار جاکر اپنے باپ کے گھر میں رہنے لگی اور بہت دن گزر گئے تو شوع کی بیٹی یہوداہ کی بیوی مرگئی اور جب یہوداہ تسلی پذیر ہوا تو وہ اپنی بھیڑوں کی پشم کترنے والوں کے پاس تمنت میں اپنے دوست حیرہ عدلامی کے ساتھ گیا اور تمار کو خبر دی گئی اور کہا گیا کہ دیکھ تیرا خسر اپنی بھیڑوں کی پشم کترنے کے لئے تمنت کو جاتا ہے۔ تب اس نے اپنی بیوگی کے کپڑوں کو اتار کر اور برقعہ اوڑھ کر نقاب ڈالی اور عینائم کے تراہے میں جو تمنت کے راستے پر ہے جا بیٹھی کیونکہ اس نے دیکھا کہ شیلہ بڑا ہوا مجھے اس کی بیوی نہیں بنایا۔ یہوداہ نے اسے دیکھ کر سمجھا کہ کوئی فاحشہ ہے کیوں کہ وہ اپنا منہ چھپائے ہوئے تھی اور وہ راہ سے اس کی طرف پھرا اور اسے کہا کہ آ میرے ساتھ خلوت کر کیوں کہ اس نے نہ جانا کہ یہ میری بہو ہے۔ وہ بولی کہ خلوت کرنے کے لئے تو مجھے کیا دے گا وہ بولا میں گلے میں سے بکری کا ایک بچہ تجھے بھیجوں گا اس نے کہا جب تک اسے بھیجے مجھے کچھ گروی دے۔ وہ بولا میں تجھے کیا گروی دوں۔ وہ بولی اپنی خاتم اور ڈوری اور عصا جو تیرے ہاتھوں میں ہے اور اس نے وہ اسے دے دیں اور اس کے ساتھ

خلوت کی اور وہ اس سے حاملہ ہوئی۔ تب وہ اٹھی اور چلی گئی اور برقعہ اتار دیا اور بیوگی کے کپڑے پہن لئے اور یہودہ نے اپنے عدلامی دوست کے ہاتھ بکری کا بچہ بھیجا تاکہ اس عورت کے ہاتھ سے اپنا گروی واپس لے۔ مگر اس نے اس کو نہ پایا تب اس نے اس جگہ کے لوگوں سے پوچھا کہ وہ فاحشہ جو عینائم میں راستے پر ہوتی تھی کہاں ہے۔ وہ بولے یہاں کوئی فاحشہ ہرگز نہ تھی۔ تب وہ یہودہ کے پاس واپس آیا اور کہا کہ میں اسے پا نہیں سکا اور وہاں کے لوگ بھی کہتے ہیں کہ وہاں کوئی فاحشہ ہرگز نہ تھی۔ یہودہ بولا اب وہ بکری کا بچہ تو ہی رکھ ایسا نہ ہو کہ لوگ ہمارے ساتھ ٹھٹھا کریں کہ میں نے اپنا گروی فاحشہ سے نہ چھڑایا۔ دیکھ میں نے تو بکری کا بچہ بھیجا پر تو نے اسے نہ پایا۔ اور تقریباً تین مہینے گزرنے کے بعد یہودہ کو بتایا گیا کہ تیری بہو تامار نے زنا کیا اور دیکھ اسے زنا کا حمل ہے۔ یہودہ بولا کہ اسے باہر لاؤ تاکہ اسے جلایا جائے۔ جب وہ باہر نکالی گئی تو اس نے اپنے خسر کو کہلا بھیجا کہ جس شخص کی یہ چیزیں ہیں۔ میں اسی سے حاملہ ہوں اور کہا کہ دریافت کرو کہ یہ خاتم اور ڈوری اور عصا کس کا ہے۔ تب یہودہ نے اقرار کیا کہ وہ مجھ سے زیادہ صادق ہے۔"

فادر ولکاکس نے کتاب بند کردی اور اس طرح رک گیا جیسے اسے اچانک کچھ یاد آگیا ہو اور مردوں اور عورتوں سے بھرے ہال میں بیٹھے تمام مردوں اور عورتوں کو ایک ایک کرکے اس طرح دیکھنے لگا جیسے ان کے چہروں میں سے کسی ایک چہرے کی تلاش میں ہو جیسے انھیں پہچاننے کی کوشش کررہا ہو اور ان میں سے تامار کو ڈھونڈ نکالنا چاہتا ہو جانے کیوں اسے اس وقت ایسا لگا جیسے وہ تامار تو نہ ہو مگر عینائم کے تراہے پر بیٹھی فاحشہ ہو اور اس نے کئی خاتم' بہت سی ڈوریاں اور کئی عصا جمع کرلئے ہوں اور اس کے گرد بہت سے بکری کے بچے اپنے گلوں سے بچھڑ کر ممیا رہے ہوں اور وہ ان لوگوں پر دل ہی دل میں مسکرا رہی ہوں جو اس سے خلوت کرنے کے لئے اپنی انگوٹھیوں سے بچھڑ جاتے ہوں اور اپنے عصا بھول جاتے ہوں اور اپنی ڈوریوں سے دور ہوجاتے ہوں پھر اسے یقین آگیا کہ اس نے اپنے بارے میں اتنی سچائی سے پہلے کبھی نہ سوچا تھا اس پر عبادت گاہ کے تقدس' عود کی خوشبو اور کلام مقدس کا گہرا اثر ہوا اور اس پر برکتوں کے دروازے وا ہوگئے اور ہر طرف نور کی بارش ہونے لگی اس نے پادری ولکاکس کے چہرے کو غور سے دیکھا اور اس کے تیکھے نقوش ذہن میں محفوظ کرلئے اور آنکھیں موند لیں اور اس پر نیند اترنے لگی۔

وہ اکتوبر کی تیسری تاریخ تھی جب اس نے اس عبادت گاہ کے تقدس' عود کی خوشبو اور کلام تقدس سے متاثر ہوکر اپنا کنفشن دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے اور اپنے ضمیر پر پڑی گرد اتارنے اور دل پر لدے بوجھ سے آزاد ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسے جوتشی اور دست شناس ہمیشہ اچھے لگتے تھے۔ اسے اپنا مستقبل جان لینے کا بچپن سے شوق تھا' بھکتوں بھکشوؤں اور نیم برہنہ سادھوؤں کے سامنے وہ بغیر کسی تامل کے دوزانو ہوکر بیٹھ جایا کرتی تھی پھر اسے پیروں اور قبروں سے والہانہ شغف ہوگیا۔ وہ جمعرات کی راتوں کو مزاروں پر قوالیوں میں جانے لگی اور مسند نشینوں کے ہاتھوں کو بڑے عجز سے بوسے دینے لگی اور رات رات بھر ویرانوں میں مراقبے کرنے لگی اور آج اس نے فادر انتھونی ولکاکس کے سامنے اپنے گناہوں کے اعتراف کا فیصلہ کیا تھا۔

فادر ولکاکس نے کتاب کھولی اور پھر ان ہی اوراق میں گم ہوگیا اس نے تامار کی تلاش ترک کردی اور ہال میں کسی چہرے کو شناخت نہ کرسکا۔ ہال میں بیٹھی تامار اسے نظر نہ آئی اس کی آواز پھر آہستہ آہستہ بلند ہونے لگی۔ اسی لمحے اسے یہ آوازیں یوں سنائی دی جیسے کنویں میں پھینکے گئے پتھر کی آواز دیوار سے ٹکرانے اور پانی پر گرنے کے بعد سنائی دیتی ہے۔ وہ خود موجود لمحوں کی تامار اس ہال میں اپنی تنہائی کے آزار سے نجات حاصل کرنے آئی تھی اور فادر ولکاکس کے سہارے کلام مقدس کے صفحات میں موجود تامار کی شریک ہوگئی تھی اور اسے یہ دائمی تنہائی اسی کے بولے ہوئے جھوٹ نے دی تھی اس کی خود غرضی نے دی تھی' اس کی بغاوتوں نے دی تھی اس کی بے وفائیوں نے دی تھی اس کے تنہا لمحوں کے شریک عارضی دوستوں نے دی تھی اسے یوں لگا تھا جیسے وہ اپنے جھوٹ کی بے لباسی پر جواز کی کوئی بوسیدہ چادر اب نہ ڈال سکتی تھی۔ اس نے اپنی خود غرضی کو چھپانے کے لئے اپنے پیاروں پر جو بہتان لگائے تھے وہ سسک سسک کر دم توڑنے لگے تھے۔ سارے بہتان مر رہے تھے ان کی قوت کا سرچشمہ خالی ہوگیا تھا۔ ان پیاروں میں اس کی ماں تھی جو اپنی

تمام بیٹیوں کے سروں پر عصمت کی چادر پڑی دیکھنا چاہتی تھی' اس کا باپ تھا جو اسے ثابت قدم دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا شوہر تھا جو اسے مطمئن دیکھنا چاہتا تھا اس کا بیٹا تھا' اس کی بیٹی تھی اس کے دوست تھے۔ اس نے ایک ایک کرکے اپنی خود اعتمادی اور اپنے غرور کی تیز رفتاری میں سب کچھ پیچھے چھوڑ دیا۔ کون چلا گیا کون گر گیا۔ اس نے مڑ کر کبھی نہ دیکھا اس کی مفتوحہ اسٹریجی نے خود اس کے چہرے پر ایسی انمٹ خراشیں ڈال دیں جس کا اندمال اعتراف کے مرہم کے علاوہ کسی دوسرے علاج سے ممکن نہ تھا اور وہ اس ہال میں اپنے مرض کی تشخیص اور علاج کے لئے آگئی تھی اور شفا دعاؤں کی کھوج میں تھی اور اپنا کھویا ہوا کل واپس مانگنے آئی تھی اور فادر ولکاکس کی پناہ ڈھونڈی تھی جو اس کا کل اس کی جھولی میں ڈال دینے کا آخری سہارا تھا۔ مشرق بعید میں جب اسے اپنے موجود لمحے کی بے بسی نے گھیرا تھا اور وہ سڑک پر اس طرح چلی جارہی تھی جیسے اسے کچلے جانے کا خوف ہی نہ ہو تو ایک گزرتے ہوئے پادری نے اسے روک کر کہا تھا۔

"تم پریشان لگتی ہو۔ پریشانی کا علاج موت نہیں ہے۔ تم خوبصورت ہو' جوان ہو آؤ میرے ساتھ آؤ۔۔۔۔۔۔"

وہ اس کے ساتھ اس کے کمرے میں چلی گئی تھی

اسے فادر ولکاکس کی آواز پھر سنائی دی

"اور خداوند نے کہا کہ انسان کا اکیلا رہنا اچھا نہیں ہے ہم اس کے لئے ایک مددگار اس کی مانند بنائیں گے اور خداوند زمین کے سب جاندار اور آسمان کے سب پرندے مٹی سے بناکر انسان کے پاس لایا تاکہ دیکھے کہ وہ ان کے کیا نام رکھتا ہے پس آدم نے ہر ایک جاندار کو جو نام دیا وہی اس کا نام ہوا اور انسان نے سب چرندوں اور آسمان کے سب پرندوں اور زمین کے سب درندوں کا نام رکھا پر انسان کو اپنی مانند کوئی مددگار نہ ملا' تب خداوند نے انسان پر گہری نیند بھیجی اور جب وہ سوگیا اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس کی جگہ گوشت بھر دیا اور خداوند خدا نے اس پسلی سے جو اس نے انسان نکالی تھی ایک عورت بنائی اور اسے انسان کے پاس لایا اور انسان سے کہا اب یہ میری ہڈیوں میں سے ہڈی اور میرے گوشت میں سے گوشت ہے۔"

پادری ولکاکس نے کتاب بند کردی اور بولا۔

"اب میں یعنی فادر انتھونی ولکاکس جو تمہیں سیدھی راہ دکھانے کے لئے مقرر کیا گیا ہوں اور تمہاری روحوں پر گرنے والی خواہشوں اور نخوتوں کی گرد صاف کرنے والا ہوں اور جو تمہارے اعتراف سننے اور انھیں راز رکھنے والا امین ہوں اور تمہاری نجات کے لئے دعا کرنے کے عہدے پر فائز ہوں تمہیں اپنے تجربے' مشاہدے' اور علم سے بتاتا ہوں سنو۔"

فادر ولکاکس نے اپنی بات شروع کرنے سے پہلے ہال میں بیٹھے لوگوں کو اب کی بار اور زیادہ توجہ اور غور سے دیکھا اس نے تمام مردوں اور تمام عورتوں کے چہروں کو باری باری یوں دیکھا جیسے ان کا شمار بھی کررہا ہو اور ان کی شناخت بھی ہورہی ہو۔ ان مردوں کو بھی دیکھا جو درمیان میں کہیں کہیں تختوں پر گھٹنے ٹکائے اور سر ڈیسک پر رکھے گریہ کررہے تھے اور ان عورتوں پر بھی نگاہ ڈالی جو زیرلب دعا میں مصروف تھیں۔ فادر نے ہال میں موجود ہر چہرے کو دیکھ لیا۔ اس طویل وقفے میں مکمل خاموشی رہی۔ کبھی کوئی ہچکی اور کبھی کوئی دبی سی کھانسی اس سکوت میں کنکر کی طرح گرتی اور دائرے بناتی ارتعاش پیدا کرتی تحلیل ہوجاتی۔

"سنو۔۔۔" فادر ولکاکس کا لہجہ نرم مگر آواز قدرے بلند تھی۔ "دیکھو تم ان میں سے نہ ہونا کچھ ناریاں ایسی ہوں گی جو کسی کی نہ ہوسکیں گی' نہ اپنے مردوں کی نہ اپنی اولادوں کی اور نہ ان کی جنھوں نے انھیں اپنے خون سے بنایا اور اپنی کوکھ میں پالا اور پھر جنم دیا اور نہ ان کی جنھوں نے ان سے نیکی کی اور نہ ان کی جنھوں نے ان سے عشق کیا اور انھیں پیار دیا اور ان کے دکھ بانٹے۔ وہ تو کسی کی نہ ہوں گی وہ صرف اپنی خوشیوں اور خواہشوں کے لئے زندہ رہیں گی وہ اپنے شوہر میں عیب نکالیں گی اور ان عیبوں کی برملا تشہیر کریں گی تاکہ انھیں چھوڑ دیں۔ پھر اور شادیاں کریں گی اور ان سے بھی مطمئن نہ ہوں گی۔ وہ اپنی آوارگی کے لئے آزادی کی تلاش میں رہیں گی

ان کے بستر پر ان کے عارضی دوست قیام کریں گے۔ وہ ہمیشہ نئے اور تازہ دم دوستوں کی تلاش میں رہیں گی اور ہر نیا مرد اور نیا تجربہ ان کی بھوک میں اضافہ کرے گا۔ ان کی خواہش ہمیشہ ان کے سامنے کاسہ لئے فقیر کی طرح نئے سکے کے تقاضے کے ساتھ موجود رہے گی اور ان کی ناآسودگی ان کو چاٹتی رہے گی وہ ازلی ناآسودہ ہوں گی اور دائمی بیمار نارہاں ہوں گی۔ وہ نمفومینیا کی مریض ہوں گی۔ طبیب ان کا کوئی علاج نہ کر سکیں گے اور وہ ہمیشہ جنسی بھوک کی آگ میں سلگتی رہیں گی۔"

ہال میں موجود عورتوں نے خوفزدہ ہو کر سینوں پر فرضی لکیروں سے اشاروں میں صلیب بنائی اور مردوں نے اپنے ذہنوں میں سناٹا محسوس کیا اور ان کا جی چاہا کہ فادر ولکاکس ایسی عورتوں کی شناخت بتادے تاکہ وہ انھیں پہچان سکیں اور اسی وقت عبادت گاہ میں عود و عنبر کی خوشبو کی لپٹوں میں اور فادر ولکاکس کی موجودگی میں ان کو نمفو عورتوں سے گہری' شدید اور خوشگوار ہمدردی ہوگئی۔ اس نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے عورتوں کو اشاروں میں اپنے سینوں پر فرضی لکیر سے صلیب بناتے دیکھا اور مردوں کی نگاہیں اپنے جسم پر چبھتی محسوس کی اور فادر ولکاکس کی آواز کا ارتعاش بھی سنا اور ان لوگوں کو دیکھا جو سر ڈیسک پر لگائے اب تک گریہ و زاری میں مصروف تھے۔ اپنے گناہوں کی مغفرت کے لئے دعاگو تھے اپنے خوابوں کی تعبیر چاہتے تھے اور اپنے عذابوں سے پناہ کے خواہشمند تھے۔ فادر ولکاکس کے پیچھے دیوار پر مقدس مریم کی بہت بڑی اور بے انتہا خوبصورت پینٹنگ آویزاں تھی اور اسی قدر بڑی تصویر مصلوب کی تھی دونوں تصویریں ہال کی دیوار کے عرضی حصے کو نصف سے زیادہ ڈھانپے ہوئے تھیں اور تصویروں کے صندلی رنگ کے چوبی فریموں نے فادر ولکاکس کے سفید لباس کو اور بھی نمایاں کردیا تھا اور مومی شمعوں اور عود کی خوشبو میں فادر ولکاکس کی تقریر کا دباؤ دل پر محسوس ہو رہا تھا اور دعاؤں میں قبولیت کا یقین تھا۔

دعا کے بعد عبادت ختم ہونے کا گھنٹہ بجا۔

وہ اکتوبر کی تیسری تاریخ تھی عبادت گاہ کے باہر تیسرے پہر کی دھوپ دن بھر کے تھکے سورج کو الوداع کہہ رہی تھی اردو عبادت کا وقت ختم ہوتے ہی فادر ہٹیل میں چلا گیا۔ کنفشن کے لئے فادر کے سامنے لائی جانے والی وہ تیسری اور آخری عورت تھی۔ اسے کنفشن کے آداب معلوم نہ تھے اس نے فادر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور بے بسی سے مسکرادی۔

"مسیحی نہیں ہو"

"نہیں"

"نام تمہارا نام کیا ہے" فادر ولکاکس نے بے انتہا شفقت سے پوچھا۔

"میں اپنا نام نہیں بتانا چاہتی"

"کسی کو بھی نہیں"

"کسی کو بھی نہیں"

"فادر کو بھی نہیں"

"نہ۔ فادر کو بھی نہیں"

"یہاں کیوں آئی ہو"

"کنفشن کے لئے"

فادر انتھونی ولکاکس نے اس کو غور سے دیکھا اور شدید ذہنی الجھن میں مبتلا ہوگیا۔

"تم مسیحی نہیں ہو۔ تو پھر تمہارا تعلق کس مذہب سے ہے۔"

"میرا تعلق کسی مذہب سے نہیں ہے۔ میں نے اپنے ماں باپ کے دین کو اپنی عقل سے پرکھنے کی کوشش کی۔ پھر اس میں اپنی پسند

کی ترمیم کی۔ پھر میں نے اس آزادی سے فائدہ اٹھایا جو ہر فرد کو حاصل ہے اور میں نے اپنے آپ کو ہر پابندی سے آزاد کر لیا۔"
"اوہ"

"فادر انتھونی ولکاکس کے سامنے ایک ایسی عورت بیٹھی ہوئی تھی جو خوبصورت اور تعلیم یافتہ تھی جو اپنا نام نہیں بتانا چاہتی تھی۔ مذہب کے بارے میں صریحاً باغی خیالات رکھتی تھی اور اپنا کنفشن بھی دینا چاہتی تھی۔

"تم اپنا نام نہیں بتانا چاہتیں نہ سہی، تمہیں کسی مذہب پر یقین نہیں ہے۔ تم ان لوگوں میں ہو جو ہر مذہب کی نفی کرتے ہیں اور پھر بھی تم اپنا کنفشن دینے آگئی ہو۔ کنفشن تو خدا کو تسلیم کرنے سے ہوگا۔ میں تمہارا کنفشن نہیں لے سکتا۔ ہاں ایک انسان کے رشتے سے یہ دعا ضرور دے سکتا ہوں کہ خداوند تمہیں سیدھا راستہ دکھادے۔ اس لئے کہ مسیحی دین سارے دنیا کے انسانوں کے لئے بھلائی اور نیکی کی تعلیم دیتا ہے۔"

"میں اپنا نام بتائے بغیر اور مذہب کے بارے میں اپنا نظریہ بدلے بغیر کنفشن نہیں دے سکتی۔ تو پھر میں یہ سمجھوں کہ مذہب دو طرفہ معاہدہ ہے۔ خدا اسی کی سنتا ہے جو خدا کا حکم مانتا ہے تم یہی کہنا چاہتے ہو فادر۔"

"نا میں یہ ہرگز نہیں کہنا چاہتا۔ خدا تو ہر بندے سے پیار کرتا ہے۔ وہ اعمال دیکھے بغیر رزق عطا کرتا ہے۔ لیکن میرا تمہارے لئے مشورہ یہ ہے کہ تم اپنے دین کی طرف لوٹ جاؤ۔ تمہیں سکون ملے گا۔ مرکز سے ہٹ کر تم بے یقینی کا شکار ہوجاؤ گی۔ تم اپنے ماں باپ کے دین میں پناہ تلاش کرو ان کا حکم مانو اور ان کی طریقت اپناؤ تمہیں وہ سب کچھ مل جائے گا تم جس کی تلاش میں ہو۔ سارے راستے ایک ہی منزل کے ہیں۔ ہاں مسیحی دین کے طور طریقے مسیحیوں کے لئے ہیں۔ مسیحی دین کا فیضان اور برکتیں مسیحی دین اپنا لینے کے بعد ہی مل سکتی ہیں۔ یہ یقین کا آخری درجہ ہے یا تو درخت کو بھی اچھا کہو اور اس کے پھل کو بھی یا درخت کو برا کہو تو اس کے پھل کو بھی برا کہو کیوں کہ درخت پھل سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ سانپ کے بچے ہوکر اچھی باتیں کیوں کر کہہ سکتے ہیں کیوں کہ جو دل میں بھرا ہوتا ہے وہی منہ پر آتا ہے اچھا آدمی اچھے خزانے سے اچھی چیزیں نکالتا ہے اور برا آدمی برے خزانے سے بری چیزیں نکالتا ہے۔"

"فادر۔ میں گوشت پوست کے جیتے جاگتے ایک انسان کے سامنے اپنا ماضی بے کم و کاست بیان کرنا چاہتی ہوں تم اگر چاہو تو اسے کنفشن ہی کا نام دے سکتے ہو۔ میرا تعلق تمہارے اس کنفشن سے نہیں ہے جو تم عموماً سنتے ہو اور دعا کرتے ہو۔ میں نے مذہب کی پابندی سے اپنے آپ کو آزاد کر ہی لیا ہے۔ اس لئے میں خدا سے کسی مغفرت کی طلب گار نہیں ہوں۔ اس لئے کہ مغفرت اور نجات میرا مسئلہ نہیں ہے۔ مجھے اپنے گناہوں کو یاد کرنے اور پھر معذرت طلب کرنے کی خواہش نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اس پر کسی قسم کی پشیمانی محسوس نہیں کرتی، نیکی اور بدی کا میرا اپنا کوڈ ہے۔ میرا اپنا اختیار ہے میں جو کچھ صحیح سمجھتی ہوں میرے نزدیک وہی نیکی ہے۔ میں نے جو کچھ کیا ہے پورے علم اور پورے یقین سے کیا ہے۔ میں نے گناہ پوری لذت اور نیکی پورے یقین سے کی ہے۔ نہ اپنے گناہوں پر میں شرمندہ ہوں اور نہ نیکیوں پر داد کی خواہشمند ہوں بلکہ گناہ یا بدی اور نیکی کی مروجہ اصطلاحات کو میں تسلیم ہی نہیں کرتی لیکن ان مروجہ اصطلاحات کو صرف اس لئے استعمال کرتی ہوں کہ ان کو الگ الگ شناخت کراسکوں۔ مجھے اپنے ایک ایک گناہ کو کسی انسان کے سامنے بیان کرکے آسودگی محسوس ہوگی مجھے ایک ایسی لذت کا احساس ہوگا جو دل پر ہر لحہ گرتی رہنے والی برف کے پگھلنے سے ہوتا ہے مجھے یوں لگے گا کہ جیسے میں ٹھنڈی یخ ہواؤں کے طوفان سے کسی بند کمرے کے نیم گرم اور نیم تاریک گوشے میں آگئی ہوں یوں جیسے پہاڑوں کی برف پگھل جانے کے بعد تیز دھوپ میں ننھے ننھے شگوفے پھوٹنے لگتے ہیں۔ تنہائی میں آنسوؤں کے سیلاب میں اپنی مغفرت کی دعا مجھے انا کی شکست لگتی ہے مجھے کمزوری اور بے چارگی کا احساس ہوتا ہے میں چاہتی ہوں کہ میں کسی گوشت پوست کے ایسے انسان کو مخاطب کروں جو میرے گناہوں کو راز رکھے، اور میری کمینگیوں پر مجھے ملامت نہ کرے مجھے یقین ہو کہ میرا ایک ایک جملہ سنا اور سمجھا جارہا ہے اور محسوس کیا جارہا ہے اور شیئر کیا جارہا ہے۔ میرے ساتھ ہنسا جارہا ہے اور میرے ساتھ رویا جارہا ہے اور میں

تمھارے چہرے پر اپنے کہے ہوئے لفظوں کی تاثیر دیکھوں اور نفرت کی لکیر دیکھوں اور حیرت کے بگولے دیکھوں اور حقارت کی چنگاریاں دیکھوں اور ہمدردی کی چمک دیکھوں اور میں نے تمھارا انتخاب اس لیے کیا ہے کہ تم خوبصورت ہو' ذہین ہو اور تم راز کو راز رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہو اور میں یہ یقین رکھتی ہوں کہ تم میری لغزشیں' میری کمینگیاں' میری نفرتیں' میری محبتیں سب اپنے سینے میں دفن کرلو گے تمھارے سینے کے نہاں خانوں سے میرے عیب اور میرے ہنر نکل کر کہیں اور نہ جاسکیں گے اور میرے اور تمھارے علاوہ کوئی تیسرا کبھی میرے بارے میں کچھ نہ جان سکے گا یہ تمھارا مقدس فرض ہے اور میرا احساس تحفظ جو مجھے تمھارے پاس کھینچ لایا ہے میں نے کبھی کوئی غلط انتخاب نہیں کیا میرا یہ انتخاب بھی غلط نہیں ہے۔"

"تم شاید سچ کہتی ہو۔ یہ میرا فرض ہے کہ میں کہے ہوئے راز کی حفاظت امانت کی طرح کروں لیکن جو انسان Baptism نہ لے' جسے Holy communion نہ ملے اور جو Confirmation کے مدارج سے گزرا نہ ہو میں اس کا کنفشن نہیں لے سکتا۔ مسیحی قانون مجھے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔"

اس نے فادر ولکاکس کے چہرے کو غور سے دیکھا وہاں اسے ایک اٹل فیصلہ تقدیر کی طرح لکھا ہوا دکھائی دیا لیکن وہ اب بھی مایوس نہ ہوئی اس نے زندگی میں کبھی ہار نہ مانی تھی نہ کبھی اپنی غلطی تسلیم کی تھی اور نہ کبھی کسی سے معافی کی طلب گار ہوئی تھی اس نے ٹھوکریں کھائی تھیں اور اپنے لہولہان پاؤں ایک اور تازہ ٹھوکر کی طرف بڑھادیئے تھے اور پندار خودسری کے راستے پر ہمیشہ آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئی تھی کون پیچھے رہ گیا اس نے کبھی مڑ کر نہ دیکھا کون کچلا گیا اس نے رک کر نہ سوچا تھا۔

"فادر میں ایک طویل سفر کے بعد یہاں پہنچی ہوں یہ طویل سفر مسافت کے فاصلوں کا نہیں تھا ذہنی آمادگی کی طوالت کا تھا اور ذہنی فاصلے دو انسانوں کو جوڑ ہی نہیں سکتے اور ذہنی قرب کسی کو کسی سے دور نہیں ہونے دیتا میں جو کچھ کہنا چاہتی ہوں اگر وہ تم ایک فادر کی حیثیت سے نہیں سن سکتے تو نہ سہی بحیثیت انسان تو سن سکتے ہو میں مسیحی نہیں ہوں اور نہ مسیحی دین اپنانا چاہتی ہوں لیکن اگر مجھے مسیحی دین کی برکتیں تم نہیں دے سکتے تو ایک انسان کی ہمدردی تو دے سکتے ہو۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے اور مجھے بہت کچھ کہنا ہے شاید میں پھر کبھی کچھ نہ کہہ سکوں گی۔ فادر انتھونی ولکاکس میں تم سے استدعا کرتی ہوں۔"

اس کی آنکھوں کا رنگ بدل گیا۔ آنکھوں کے رنگ کی یہ تبدیلی اتنی نمایاں تھی کہ فادر انتھونی نے بھی محسوس کرلی اور اسے ایسا لگا کہ جیسے اس کی آنکھوں میں آئے ہوئے گہرے نیلے رنگ نے سارے ماحول کو ڈھانپ لیا ہے اور سارے چیپل میں نیلا رنگ بکھر گیا ہے اور روشنی نیلگوں ہوگئی ہے اور اس کے اپنے اندر اچانک کوئی سمندر لہریں لینے لگا ہے اور اس میں طغیانی آگئی ہے اور جیسے اب تک وہ گہری نیند سورہا تھا جس سے ان لہروں نے اسے جگادیا۔ اور اس کے سامنے بیٹھی ہوئی عورت کا چہرہ کبھی ہلکے اور کبھی گہرے بادلوں کے پیچھے سے جھانکنے لگتا ہو اور اس کے بال زیادہ لانبے اور گہرے سیاہ ہوگئے ہوں اور اس کی نیلگوں آنکھوں کا سمندر طغیانی میں ہو اور اس کی سانسوں میں خواہش کی خوشبو ہو اور اس کے بازوؤں میں چنبیلی کی شاخ لچک رہی ہو اور اسے اچانک علم ہوا کہ اس کے اردگرد کی ہمیشہ بند رہنے والی کھڑکیوں میں سے کسی ایک چھوٹی سی کرم خوردہ کھڑکی کا کوئی کمزور پٹ ہوا کے تازہ جھونکے سے ٹوٹ گیا ہے اور تازہ ہوا کے ساتھ مولسری کی خمار آلود خوشبو نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور شہتوت کا شیریں رس کسی نے اس کے گلے میں بھر دیا ہے اور پروا ہوا نے اس کے بدن میں آگ بھر دی ہے اور پروائی کے ٹھنڈے بہتے پانی میں نہاتے ہوئے پرندے ایسی زبان بولنے لگے ہیں جو جسموں کو نیند سے بیدار کردینے والی انگڑائیاں لے آئی ہے اور بڑے بڑے سایہ دار درختوں کی پتیاں جن پر ان دیکھے ہاتھوں نے انمٹ تحریریں لکھ دی ہیں آپس میں گلے مل مل کر سرگوشیاں کرنے لگی ہیں اور اونچی دیوار پر ٹین کی چھت کے سائے میں بیٹھے کبوتر ایک دوسرے کی چونچ میں چونچ ڈال کر آنکھیں موندے ساکت ہوگئے ہیں اور اپنے پروں کو پھلاکر مست ہوگئے ہیں اور فادر انتھونی ولکاکس نے طویل گہری نیند سے بیدار ہوکر انگڑائی لی اور تازہ ہوا سے توانائی لی اور رنگ بدلتی آنکھوں کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا۔

"میں تمہارا کنفشن ضرور سنوں گا"

اس نے ایک لمبی گہری سانس لی اور فادر انتھونی ولکاکس کی آمادگی کے ساتھ ہی اس کے اعصاب معمول پر آگئے۔

"شکریہ فادر"

"تا مجھے اب فادر نہ کہو میں تمہارا کنفشن بحیثیت انتھونی ولکاکس سنوں گا ایک ہمدرد کی طرح ایک گائیڈ کی حیثیت سے۔ مجھے تھوڑا سا وقت دو تاکہ میں اپنی موجودہ ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوجاؤں اور اس کی اطلاع دے دوں تاکہ میری جگہ کسی اور کا تقرر ہوجائے۔"

فادر انتھونی ولکاکس کمرے سے باہر نکل گیا اور وہ وہاں تنہا رہ گئی اس نے کلام مقدس کا ایک صفحہ اس طرح کھولا جیسے فال نکال رہی ہو اور کھلا ہوا صفحہ پڑھنے لگی۔

"دیکھو۔ بونے والا بیج بونے نکلا اور بوتے وقت کچھ راہ کے کنارے گرا اور پرندوں نے آکر اسے چگ لیا اور کچھ پتھریلی زمین پر گرا جہاں اسے بہت مٹی نہ ملی اور گہری مٹی نہ ملنے کے سبب سے جلد اگا لیکن جب سورج نکلا تو وہ جل گیا' اور جڑ نہ رکھنے کے سبب سوکھ گیا اور کچھ خاردار جھاڑیوں نے بڑھ کر اسے دبالیا اور کچھ اچھی زمین میں گرا اور پھل لایا کچھ سو گنا' کچھ ساٹھ گنا کچھ تیس گنا۔ جس کے کان ہوں وہ سن لے۔"

اس نے کتاب بند کردی اور کمرے کا جائزہ لینے میں مصروف ہوگئی۔ یہاں بھی مقدس مریم کی تصویر' جس کے چہرے پر معصومیت اور سکون تھا آویزاں تھی ایک الماری میں بہت سی کتابیں رکھی ہوئی تھیں اور الماری کے اوپر قطار میں کانسی' پیتل اور چاندی کے عوددان اور شمع دان سجے ہوئے تھے کھڑکیوں پر گہرے عنابی رنگ کے پردے پڑے ہوئے تھے اور تمام کھڑکیاں اورر دروازے بند تھے چھت پر لگاہوا واحد بلب تھا اور اب اس کی روشنی سفید ہوگئی تھی۔ دیواروں پر لگے ہوئے دودھیا رنگ کے بلب خاموش تھے ایک دیوار پر ایک بہت بڑی صلیب آویزاں تھی۔

اس نے سوچا

"بالآخر وہ مرحلہ آہی گیا۔ خدا کی ساری مخلوق میں انسان اشرف المخلوقات بھی ہے اور پیچیدہ بھی۔ ناقابل فہم بھی اور عجیب بھی۔ ہم جس طرح نظر آتے ہیں دراصل اس طرح نہیں ہوتے۔ شاید ہم اوروں کو جس طرح نظر آتے ہیں حقیقتاً اس طرح بھی نہیں ہوتے شاید ہم اپنے آپ کو اپنے اندر بھی طرح طرح کی پرتوں میں چھپائے ہوئے رکھتے ہیں اور ہم پھر بھول جاتے ہیں کہ ہم دراصل کیا ہیں اور اسی بھول میں ہم اپنی تلاش کرنے میں سرگرداں رہتے ہیں اور کسی اور سمت نکل جاتے ہیں جہاں ہم اپنے آپ کو تلاش کرنے میں ناکام ہوجاتے ہیں پھر نامعلوم جہت سے کوئی معلوم کی روشنی میں نمودار ہوکر ہمیں ہماری یاد دلاتا ہے پھر ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم تو اپنے آپ سے اب ملے ہیں شاید انتھونی ولکاکس بھی اپنے آپ سے آج پہلی بار ملا ہے وہ کب سے اپنے آپ کو بھول چکا تھا اور اپنی تلاش میں غلط سمت نکل گیا تھا ورنہ صرف میرا کنفشن سننے کے لئے اتنا بڑا فیصلہ کبھی نہ کرتا۔ وہ جو اچھے درخت سے اچھے پھل لینے کی تلقین کرتا ہے اچھے درخت سے دستبردار ہوکر ایسے درخت کی طرف کیوں چل دیتا ہے جس کا پھل اس نے چکھا نہیں ہے اور جو اس کے لئے نامعلوم ہے شاید فادر انتھونی ولکاکس اپنی تلاش میں غلط سمت نکل گیا تھا اور ناکام ہوگیا تھا یا شاید وہ اب بھی نہیں جانتا کہ وہ اپنے آپ کو کہاں مل سکتا ہے۔"

انتھونی ولکاکس چیپل میں داخل ہوا۔ اب اس نے روز مرہ کا عام لباس پہن رکھا تھا "اب میں سبکدوش ہوں۔ تم اب ایک فادر سے نہیں اپنی طرح کے ایک عام آدمی سے گفتگو کروگی میں اب تمہاری کہانی سننے کو تیار ہوں۔"

وہ اب زیادہ شگفتہ نظر آرہا تھا۔

"لیکن فادر میرا کنفیشن کے بھی ایک راز رہے گا اس کی کیا ضمانت ہے۔"

"اصولاً اب مجھ پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ میں تمہارے کنفیشن کے راز کی طرح حفاظت کروں لیکن اخلاقاً اور عادتاً میں تمہارا کنفیشن راز کی طرح اپنے سینے میں محفوظ رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ تم اب بھی آزاد ہو ضروری نہیں کہ تم مجھ پر اعتماد کرو۔ تم کو مجھ پر بھروسہ کرنے کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ تم بونے والے کی تمثیل سنو۔"

"جب کوئی بادشاہی کا کلام سنتا ہے اور سمجھتا نہیں تو شریر آتا ہے اور جو کچھ اس کے دل میں بویا گیا تھا لے جاتا ہے یہ وہ ہے جو راہ کے کنارے بویا گیا تھا۔ جو پتھریلی زمین میں بویا گیا وہ۔ وہ ہے جو کلام سنتا اور فی الفور خوشی سے قبول کرلیتا ہے لیکن وہ اپنے اندر جڑ نہیں رکھتا بلکہ عارضی ہے اور جب کلام کے سبب سے مصیبت یا ظلم برپا ہوتا ہے تو وہ ٹھوکر کھاتا ہے اور جو خار دار جھاڑیوں میں بویا گیا یہ وہ ہے جو کلام سنتا ہے پر دنیا اور دولت کا فریب کلام کو دبا دیتا ہے اور وہ بے پھل رہ جاتا ہے۔ لیکن جو اچھی زمین میں بویا گیا یہ وہ ہے جو کلام کو سنتا اور سمجھتا ہے اور پھل بھی لاتا ہے کوئی سو گنا پھل دیتا ہے۔

کوئی ساٹھ گنا کوئی تیس گنا اور میں انتھونی ولکاکس اب بے پھل کا درخت ہوں اس لئے جان لو کہ وہ کنفیشن جو آسمانی باپ کے روبرو روح القدس کی وساطت سے ہوتا ہے وہ اور ہے اور یہ کنفیشن جو تم میرے سامنے کروں گی وہ ایک بھٹکے ہوئے اپنے نصب سے اتارے گئے بے فیض انسان کے روبرو ہوگا جو عام انسانوں سے مختلف نہیں ہے۔"

وہ خاموش رہی۔

"تم چاہو تو اب بھی مجھ پر بھروسہ کرسکتی ہو"

"تم نے اپنا اہم اور مقدس عہدہ کیوں چھوڑ دیا"

"اس لئے کہ میں تمہاری سچ مچ مدد کرنا چاہتا ہوں"

"کیوں"

"اس لئے کہ تم ایک ذہین' خوبصورت' تعلیم یافتہ اور آزاد عورت ہو۔ اگر تم نے ضد یا عجلت میں کوئی ایسا قدم اٹھادیا جو تباہی کی طرف جاتا ہو تمہیں روکنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ تنہا اور لادین عورت کسی وقت کچھ بھی کرسکتی ہے۔"

میں تمہاری شکر گزار ہوں"

"نا۔۔ شکر گزار ہونے کی ضرورت نہیں۔ انسان ہی انسان کے کام آسکتا ہے۔ تم دیکھ رہی ہو کہ ہم کس طرح درگزر کی دولت سے محروم ہوگئے ہیں۔ ہم اپنے دہی کو میٹھا کہتے ہیں اور دوسرے کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف ہمارے دہی کو میٹھا کہے بلکہ اپنے دہی کو بھی کھٹا تسلیم کرے۔ لوگ اپنے دین کو سچا اور دوسرے کے دین کو مٹانے کو ہی عبادت جانتے ہیں۔ اپنے لئے سب کچھ اور دوسروں کے لئے کچھ نہیں کے اصول کو طاقت سے منواتے ہیں۔ خدا عبادت گاہوں تک محدود ہے باہر کی دنیا خدا کی خدائی سے بے نیاز ہے۔ میں اگر تمہارے کام آسکا تو اس میں میری روح کو سکون ملے گا کہ میں نے بے غرضی سے تمہارا ساتھ دیا۔"

"سوچتی ہوں کہ اس الجھی ہوئی ڈور کے کس سرے کو کہاں سے پکڑوں اور اپنا یہ اعتراف کہاں سے شروع کروں۔ کیا وہاں سے جہاں میں نے نیکی اور بدی میں تمیز کی یا وہاں سے جہاں مجھے گناہ اور ثواب کے پیمانے ملے لیکن نیکی کیا ہے اور بدی کسے کہتے ہیں۔ یہ پیمانے میرے اپنے ہیں کیا گناہ اور کیا ثواب اب اس کا انحصار اپنے ضمیر کے فیصلے پر ہے میں نے ان پیمانوں کو اپنی خواہشوں اور خوشیوں کے تابع رکھا ہے میں نے ہر ایسی تمیز کو رد کردیا جو میری راہ میں دیوار بن جائے اور ایسے پیمانے توڑ دیئے ہیں جو مجھے بزدل بنادیں دنیا بھر کی کتابوں میں ماں کی تعریف کی گئی اور ہر مذہب نے ماں کی عزت کی تلقین کی ہے مگر میں نے اپنی ماں سے کبھی شفقت نہیں پائی نہ اپنے دل میں اس کے لئے کبھی احترام محسوس کیا ہے۔ کمزور اور صلح جو باپ بد زبان اور ظالم ماں کا ہاتھ روک سکتا ہے اور نہ زبان۔ میری ماں نے اپنے اقتدار اعلیٰ کے تحفظ کے لئے ہر طرح کا جبر روا رکھا اس کے پاس غصے اور نفرت کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعہ اپنی قلمرو کو

اپنی مرضی کے مطابق قائم رکھنے کے لئے نہ تھا وہ جاہل عورت تھی اور اپنا جہل اپنی اولاد کو منتقل کردینے پر مصر تھی اس نے ہمیشہ گھر کو اپنی خواہش کے مطابق بسائے رکھنے کی کوشش کی لیکن مسلسل تناؤ نے گھر کے ہر بسنے والے کو اندر سے اجاڑ دیا باپ دوسری عورت کی محبت میں پناہ گزیں ہوگیا اور مسرت کے چند لمحے جو وہ عورت اس کی جھولی میں ڈال دیتی اس کے سہارے ہی اس نے زندہ رہنا سیکھ لیا۔ بھائی گھر سے باہر رہنے لگے اور میں اور بہنیں گلیوں میں آوارہ چھوکروں کے ساتھ وقت گزارنے پر مجبور ہوگئیں۔ گلی کے آوارہ چھوکروں نے کم سنی میں ہی ہمارے سروں پر کہانیوں کے عشق کا تاج رکھ دیا اور ہم اپنے آپ کو کہانیوں کی شہزادیوں کی طرح سمجھنے لگے جن کی تلاش میں کوئی نہ کوئی شہزادہ ضرور آسمانوں سے اترے گا اور ہمیں گھوڑوں پر بٹھاکر پریوں کے دیس لے جائے گا۔

میری ماں کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ اس کی ضد اور جبر گھر کے ہر فرد کو ایک دوسرے سے الگ کئے دے رہا ہے اور یہی بات سمجھانے کے لئے میں نے ماں سے بغاوت کی اور ماں کا ظلم سہا' میں نے ماں سے شدید نفرت کی اور مجھے اپنے گھر سے دور موناؤ پو کے گھر میں پہلی بار محبت ملی اور مجھے علم ہوا کہ گھروں میں محبت کس طرح خوشبوئیں اور خوشیاں بکھیر دیتی ہیں۔ صرف موناؤ پو میری یادداشت کا ایسا صفحہ ہے جس سے میں اپنے اعتراف کی ابتدا کرسکتی ہے۔ سخت گیر ماں' بزدل باپ' اپنی اپنی دنیاؤں میں گم آوارہ مزاج بہنیں اور گھر سے بے نیاز سرکش اور بے راہ رو بھائی کبھی ایسا گھر نہیں بناسکتے جس میں ایک خاندان بستا ہو ایک ایسی چار دیواری ضرور کھینچ سکتے ہیں جہاں ٹینشن' خود غرضی اور سرکشی رات بسر کرنے کو آجاتے ہوں اور باپ بے عملی کا' بھائی بد اعمالی کا اور بہنیں بد چلنی کا چلن سیکھ لیں اور موناؤ پو سے پہلے میرے گھر میں یہ ہی کچھ تھا اور اس کی ذمہ دار میری زبان دراز ماں اور بے زبان باپ دونوں ہی تھے۔ موناؤ پو میری یاد داشت کا وہ صفحہ ہے جس پر اب بھی کچھ مٹے مٹے سے نقوش موجود ہیں۔ موناؤ پو نالے پر بنا ہوا وہ چھوٹا سا پل ہے جس کے اس طرف نفرت ہے اور اس طرف وہ گھر ہے جس میں ایک ایسی عورت رہتی ہے جو ہر شام اپنے شوہر کی گالیاں اور مار کھاتی ہے اور صبح جب سوکر اٹھتی ہے تو تر و تازہ اور خوش مزاج ہوتی ہے اور شوہر کو معاف کردیتی ہے۔ وہ عورت میری ماں تو نہ تھی لیکن اس نے مجھے ماں کی محبت کا احساس دیا آغوش کی گرمی دی اور پیار کی قوت کا احساس دلایا۔ وہ آج تک میرے ذہن میں بسنے والی ایک ایسی عورت ہے جو ماں کا احساس دلاتی ہے۔ نالے پر بنے ہوئے چھوٹے سے پل کے اس طرف ایک چھوٹے سے گھر میں رہنے والی عورت ہی مجھے اپنی ماں لگتی تھی وہ بے حد پیار دیا کرتی تھی اس نے مجھے بتایا کہ یوں تو اس کے ساتھ اس گھر میں رہنے والا مرد بہت نیک اور ملنسار ہے لیکن جس رات وہ نشے میں گھر لوٹتا ہے تو اسے گالیاں بھی دیتا ہے اور مارتا بھی ہے۔ مجھے اس آدمی سے نفرت ہوگئی لیکن اس عورت کے پیار کو میں پھر بھی نہ بھلاسکی اس پیار کے لئے میں اپنے گھر سے تنہا نکل کھڑی ہوتی۔ چھوٹی سی سڑک پار کرتی پھر نالے پر بنے ہوئے پل سے گزرتی اور کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر گھومتی ہوئی اس کے پاس پہنچ جاتی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر ہری شاخ کی طرح لچک جاؤ گی تو زندہ رہو گی اور جب بھی خشک لکڑی کی طرح سخت ہوئیں توڑ دی جاؤ گی' مرد تمہیں توڑ ڈالے گا پھر میں ہری شاخ بن گئی اور لچک گئی اور کبھی کسی سے نبرد آزما نہ ہوئی چنانچہ میں زندہ ہوں۔"

فادر انتھونی دلکاکس نے اسے اس طرح دیکھا جیسے وہ دیوار پر لگی کسی ایسی پینٹنگ کو دیکھ رہا ہو جس کے رنگ اچانک فضا میں بکھر گئے ہوں اور پینٹنگ کا کاغذ سادہ رہ گیا ہو اور مصور کی ساری کوشش رائیگاں ہوگئی ہو اور پینٹنگ کے ایک گوشے میں لکھا ہوا مصور کا چھوٹا سا نام پینٹنگ کے فریم سے نکل کر بند دروازوں اور بند کھڑکیوں والے کمرے میں اچانک قید ہوجانے والی ننھی سی چڑیا کی طرح چھت اور دیواروں سے ٹکر ٹکرا کر دم گھٹا دینے والے کمرے سے نکل جانے کی کوشش میں مصروف ہو اور اس کے پروں کی آواز نظر نہ آنے والے معتوب فرشتے کے تنفس کی آواز کی طرح سنائی دے رہی ہو' اس نے غیر ارادی طور پر سینے پر صلیب کا نشان بنایا اپنے ہاتھ کی انگلیاں پہلے اس کے چوڑے سینے کے بائیں حصے کی جانب سے فرضی لکیر بناتی ہوئی داہنی طرف کی پسلیوں کے آخر تک گئیں پھر عمودی شکل میں اوپر سے نیچے کی طرف اور یوں پلک جھپکتے نظر نہ آنے والی لکیروں سے سینے پر بن جانے والی مقدس صلیب کے نشان نے اسے

اتنا مستعد اور خود اعتماد بنادیا کہ اس نے اس کی گہری بھوری سب کچھ چھپالینے والی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔
فادر انتھونی ولکاکس نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا

"ذرا دم لے لو۔ پرسکون ہوجاؤ اور غور کرو کہ تم دراصل کس چیز کی تلاش میں ہو۔ تمھیں اپنی ماں سے اس قدر شدید نفرت کیوں ہے اور تمھیں وہ اجنبی عورت کیوں اچھی لگی۔ کیا محبت کے دو بول کسی عورت کو ماں کا درجہ دے سکتے ہیں اور کیا زبان دراز ماں اپنی سخت گیری کے باعث ماں کے درجے سے معزول ہوسکتی ہے۔"

وہ معبد میں نصب کسی بت کی طرح تنی بیٹھی رہی۔ اس نے سوچا۔

یہ شخص جس کا نام انتھونی ولکاکس ہے جو میرے سامنے کالے دھاگے سے بندھی ہوئی سنہری صلیب ڈالے بیٹھا ہے۔ مجھے یوں دیکھ رہا ہے جیسے میں میلے میں بھٹکے ہوئے بچے کی مانند اس کی تحویل میں آگئی ہوں اور نہیں جانتی کہ میں اب اپنوں سے مل بھی سکوں گی یا نہیں۔

اس نے نظریں اٹھائیں اور انتھونی ولکاکس کو دیکھا اس کی تیز نیلگوں آنکھیں اس کے چہرے پر یوں جمیں ہوئی تھیں جیسے وہ اس کی گفتگو نہ سن رہا ہو بلکہ اس کے دل میں جھانک کر دیکھ لینے کی کوشش کررہا ہو' اچانک اسے یوں لگا جیسے گہرے پانیوں میں دور پڑی ہوئی ڈور کے دوسرے سرے پر بندھے ہوئے کانٹے میں پروئے گئے چارے کو کسی سرکش مچھلی نے کانٹے سمیٹ نگل لیا ہے اور اس کی انگلی میں دبے ہوئے ڈور کے اس سرے پر کھنکار محسوس ہونے لگی ہے اور ڈور تن گئی ہے وہ دل ہی دل میں اپنی کامیابی پر بے انتہا خوش ہوئی جیسے دشمن کے سپاہیوں کے اکھڑے ہوئے قدموں نے اسے اپنی فتح کا یقین دلایا ہو لیکن اسے علم تھا کہ ابھی انتھونی ولکاکس سے اس کی جنگ جاری تھی گوکہ اب اس میں پہلی جیسی شدت نہ رہ گئی تھی اوراب وہ پادری انتھونی ولکاکس نہ تھا اس نے اپنے عہدے سے سبکدوشی کا اعلان کردیا تھا۔

"لیکن موناؤ پو میری زندگی میں مٹی کی ان ہانڈیوں کی طرح ہے جو تہوار میں خاص طور سے بنائی جاتی ہیں اور جن میں کمہار پھول پتیاں اور روزن اس طرح آرپار تراش دیتے ہیں کہ ان کے اندر جلاکر رکھے جانے والے چھوٹے چھوٹے دیوں کی روشنی سے پھول' پتیاں اور روزن اس طرح روشن ہوجاتے ہیں کہ مٹی کی ہانڈیاں خوبصورت لیمپ جیسی نظر آنے لگتی ہیں اور گاؤں والے ان ہانڈیوں کو جھنجھنوں کے تہوار میں ہر سال استعمال کرتے ہیں اور رات گئے سارے دیئے ایک ایک کرکے بجھ جاتے ہیں اور مٹی کی پھول پتیوں والی کچی ہانڈیاں توڑ دی جاتی ہیں اور پھر اگلے سال تک کوئی ان ہانڈیوں کو یاد بھی نہیں کرتا۔ موناؤ پو میرے لئے جھنجھیوں کا صبح ہوتے ہی بھلا دیا جانے والا تہوار ہے اور موناؤ پو میرے لئے گئے سال کے بھیا دیوج کے دن کی طرح ماضی ہوا۔"

"موناؤ پو کے اس چھوٹے سے گھر میں رہنے والی عورت جس نے مجھے ممتا کا پیار دیا تھا ایک مظلوم عورت تھی وہ شوہر کی مار کھانے کے باوجود اسے نیک اور شریف کہتی تھی اور مجھے نصیحت کی تھی کہ ہر ظلم کے سامنے سرجھکا دوں تاکہ جینے کا قرینہ آجائے۔ میں نے اس سے جینے کا قرینہ ضرور سیکھا تھا لیکن میں اس کے شوہر کو معاف نہ کرسکتی تھی۔ میں نے اپنے بے زبان باپ کو دیکھا تھا۔ بے راہ بھائیوں کو دیکھا تھا اور بیوی کو جانوروں کی طرح پیٹنے والا ایک شوہر دیکھا تھا۔ میرے لئے مرد ہر روپ میں کمزور' بے راہ اور ظالم تھا۔"

انتھونی ولکاکس ایک ایک بات غور سے سنتا رہا۔

"ایک شام میں موناؤ پو پہنچی تو وہ گھر اجڑ چکا تھا' دروازے ٹوٹے ہوئے تھے ہر طرف پتھر اس طرح پڑے ہوئے تھے جیسے گھر کو سنگسار کیا گیا ہو' کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے برآمدے میں کتے سورہے تھے۔ میں دیر تک گھر کو دور سے دیکھتی رہی میری ہمت نہ ہوئی کہ میں برآمدے تک جاکر اس دروازے کو دھکیل کر اندر کا منظر دیکھ لوں۔ میرے اندر ایک ہوک سی اٹھی اور مجھے یوں لگا جیسے میرا سفر ختم ہوگیا ہو اور میرے سامنے پتھر کی ایک دیوار اچانک آگئی ہو میں یہاں کسی اور کو نہ جانتی تھی اور نہ گھر کے اندر جاسکتی تھی نہ

واپس لوٹ سکتی تھی۔ ایک نوجوان لڑکا جانے کہاں سے آگیا۔

"یہ لوگ گھر چھوڑ کر چلے گئے" اس نے کہا۔

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگی

"محلے والوں نے انھیں نکال دیا"

میں پھر بھی چپ رہی۔ لڑکے کا رنگ کھلتا ہوا گندمی' لانبا قد' چھریرہ بدن اور آنکھیں بے حد روشن تھیں۔ میں اس کی خوبصورتی سے مرعوب ہوگئی تھی

"تم نے سنا نہیں محلے والوں نے انھیں نکال دیا"

"کیوں نکال دیا" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا

"انھوں نے یہاں اڈا کھول لیا تھا"

"کیا کھول لیا تھا"

"عیاشی کا اڈا"

"وہ کیا ہوتا ہے"

اس نے ایک آنکھ دبائی اور اس طرح مسکرایا جیسے اس کے جسم پر لباس نہ رہ گیا ہو اور میرے بدن میں سن سے ایک لہر آکر گزر گئی اور میرے پاؤں کانپنے لگے اور مجھے اپنے جسم کے خون کا ایک ایک قطرہ آنکھوں اور دماغ میں جمع ہوتا محسوس ہوا اور قریب تھا کہ میں چکرا کر گر جاتی لیکن میں نے اپنے گھر کی طرف بھاگنا شروع کیا جوں جوں میری رفتار تیز ہوتی گئی مجھے اس لڑکے کی آواز تعاقب کرتی سنائی دی۔

"عیاشی کا اڈا"

"عیاشی کا اڈا"

اور پھر اس کی مادر زاد برہنہ گالی جیسی ہنسی میرے آگے آگے بھاگنے لگی۔ میرا موناؤ یو اسی شام سنگسار ہوگیا اور میری ماں جس نے مجھے پیار دیا تھا لہولہان ہوگئی تھی۔"

انتھونی ولکاکس نے بڑی توجہ سے سنا اور یوں بت بنا بیٹھا رہا جیسے وہ وہاں موجود نہ ہو۔

" سردار میری زندگی میں اس وقت آیا جب میں راتوں کو لیمپ کی روشنی میں کمرے کی دیوار پر بن جانے والی پرچھائیں کو کسی کہانی کا کردار بناکر جذباتی ہوجایا کرتی تھی۔ مجھے لیمپ کی روشنی سے بنی ہوئی پرچھائیں اپنی رفیق اور غمگسار لگا کرتی تھی اور میں اپنے آپ کو مظلوم تصور کرتی اور خوب روتی اور پھر میرا جی چاہتا کہ کہانیوں کی طرح کوئی خوبصورت مرد مجھ سے محبت کا دعویٰ کرے اور میرے لئے جان کی بازی لگانے کو آمادہ ہوجائے اور میں اپنا آپ اس کے سپرد کردوں اور سوہنی کی طرح کچے گھڑے کی مدد سے بپتے منہ زور دریا کو پار کروں اور کچے گھڑے کی خشک مٹی بھیگ کر گھل جائے اور میں ڈوب جاؤں اور میرے پیار کو لوگ اپنے گیتوں سے امر کردیں' اور میرا نام ہر زبان پر ہو اور محمل میں بیٹھ کر قیس کی دیوانگی پر آنسو بہاؤں اور فرہاد کے ہاتھ سے تیشہ لے کر ایک طرف پھینک دوں اور اس کی ہتھیلیوں کے چھالوں سے رستے ہوئے خون پر اپنے ہونٹ رکھ دوں اور میرے گائے ہوئے گیت کھیتوں اور کھلیانوں میں گونجنے لگیں اور لکھنے والے میری کہانیاں لکھیں اور پڑھنے والے میرے افسانے پڑھیں اور انھیں خود سپردگی اور وارفتگی کے دنوں میں سردار لیمپ کی روشنی میں بن جانے والے پر اسرار سائے کی طرح میرے سامنے آگیا اور میں محمل میں بیٹھ گئی اور میں نے تیشہ پکڑے ہوئے خون آلود ہاتھ دیکھے اور میں نے کچے گھڑے کے سہارے منہ زور دریا میں چھلانگ لگادی اور سردار مجھے جذبات کے ان دھاروں میں بہاکر لے گیا

جہاں راست بازی، خلوص اور محبت بہت زور کرم خوردہ کتابوں کے صفحوں میں رہ جاتی ہیں۔ میں سرشام ہی سے سردار کا انتظار کرنے لگتی۔

نیچے صحن میں میری ماں چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھائے رہتی۔ کبھی باپ کی بے وفائی کا رونا روتی اور کبھی اس حرافہ کو گالیاں دیتی جسے اس نے دیکھا نہ تھا، جس کے بارے میں اسے کچھ نہ معلوم تھا۔ کبھی بھائیوں کو دوزخ کی آنچ میں جھونکنے لگتی اور ان کی موت کی دعائیں ایسے خلوص سے مانگتی کہ جی چاہتا کہ اس کی دعاؤں کی قبولیت کی کوئی نہ کوئی سبیل نکل آئے۔ کبھی بہنوں کی جوانی پر آٹھ آٹھ آنسو روتی اور کبھی کبھی مجھے مغلظات سناتی۔ نیچے صحن کی آوازوں سے مجھے اندازہ ہوتا رہتا کہ اب ماں کہاں ہے اور کیا کررہی ہے۔

اس چھوٹے سے شہر میں ہمارا گھر دو حصوں میں تقسیم تھا۔ بالائی منزل کے کمرے عموماً گھر کا نہ استعمال ہونے والا سامان۔ رکھنے کے کام آتے۔ جب سے مجھے باپ نے میٹرک سے آگے نہ پڑھانے کا اعلان کیا تھا میں نے گھر والوں سے الگ تھلگ اوپر کی منزل میں رہنا شروع کردیا تھا اور برائے نام ہی نیچے جاتی تھی۔ میرا باپ خاموش صلح پسند آدمی تھا اور اس نے مجھے سیدھے اور سادے الفاظ میں یہ بات بتادی تھی کہ وہ میری مزید تعلیم کے اخراجات برداشت کرنے سے قاصر تھا۔ اب میں اسکول نہ جاتی تھی اور سردار جو روز مجھے اسکول جاتے ہوئے راستے میں ملتا تھا اور اپنی سائیکل پر بٹھاکر مجھے اسکول تک لے جاتا تھا بے چینی سے گھر سے دور کھڑا اسکول کے وقت پر میرا انتظار کیا کرتا تھا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں اس سے شادی کرلوں تو وہ مجھے جتنا میں پڑھنا چاہوں گی پڑھاتا رہے گا اور مجھ پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہ عائد کرے گا۔ وہ ایک جہاندیدہ اور مجھ سے تقریباً دوگنی عمر کا آدمی تھا، اس کا جسم مضبوط، قد لانبا اور اعضا متناسب تھے اور جب اس نے پہلے پہل مجھے اسکول جاتے ہوئے راستے میں روکا تھا اسی دن مجھے یقین آگیا تھا کہ میں سچ مچ سوہنی ہوں اور منہ زور دریا میرا منتظر ہے۔

میں سرشام ہی سے سردار کا انتظار کرنے لگتی اور میرے سامنے گزشتہ شب کی ساری خوشبوئیں سرگوشیاں اور آسودگیاں آکھڑی ہوتیں اور شام سے رات تک ایک ایک پل میرا جسم سلگتا اور میں پائپ کے ذریعہ رات کی تاریکی میں اپنے کمرے تک چڑھ کر آنے والے سردار کو دنیا کا سب سے جری آدمی سمجھتی اور سب کچھ بھول جاتی اور مجھے ان لمحوں کے علاوہ زندگی بے کیف محسوس ہوتی اور میرا جی چاہتا کہ میں اپنے جسم کی بوٹی بوٹی کرکے سردار کے قدموں میں ڈال دوں اور میں ماں کی گالیوں سے بے نیاز ہوگئی اور میرا دل اپنی گڑیوں سے بھرگیا اور میں گلی میں کھیلنے والے لڑکوں کے لئے اجنبی ہوگئی اور میں ان گنتی کی چند راتوں میں بہت بڑی ہوگئی اور بہت کچھ جان گئی اور میری گڑیوں کے ساتھ اپنی گڑیوں کا بیاہ رچانے والی لڑکیاں اپنی بے زبان گڑیوں کے ساتھ مجھ سے بہت پیچھے رہ گئیں اور مجھے تب معلوم ہوا کہ موناؤ پو میں عیاشی کا اڈا کھولنے کا کیا مطلب تھا اور وہ خوبصورت، خلیق عورت مجھے ماں کا پیار دیتی تھی، مجھے تنی اچھی کیوں لگتی تھی اوراس خوبصورت چھریرے بدن والے لڑکے کی ہنسی کیوں میرے ذہن پر نقش ہوکر رہ گئی تھی۔ لیکن خوابوں، خوشیوں اور تجربوں کے دنوں میں چپکے چپکے نتائج کا زہر گھل گیا اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دنیا کو اس طرح دیکھنے لگی جیسے تبدیلی مرے اندر ہی نہیں باہر بھی آگئی ہے۔ میں چیزوں کو اس طرح دیکھنے لگی جیسے ان کو میں نے پہلی بار دیکھا ہو، انسانوں سے مجھے خوف آنے لگا اور میری ذات بے وزن ہونے لگی اور جسم کا وزن تیزی سے بڑھنے لگا اور میری شخصیت کا گراف گرتے گرتے صفر تک آگیا اور دوسرے مجھے پہاڑ کی چوٹی کی طرح بلند نظر آنے لگے۔ کیسی فضول اور احمقانہ خواہش نے مجھے پکے ہوئے پھل کی طرح سردار کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔"

وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگئی۔

"بچپن سادہ سلیٹ کی طرح ہر آڑی ترچھی لکیر کو قبول کرلیتا ہے۔ میں اب سوچتی ہوں کہ ماں باپ بچوں کو گھر میں پڑی اشیاء کی طرح بکھیر کر کیوں بھول جاتے ہیں جو ہر آنے والے کی ٹھوکروں کی زد میں آجائیں۔ یہ بات میری ماں کو کسی نے کیوں نہیں بتائی یہ راز

میرا باپ کیوں نہ جان سکا۔ شاید اور بچے ایسے نہ ہوتے ہوں گے یا شاید میں ہی پالنے سے فرش پر پھینکی گئی اور آنگن سے راستوں پر ڈال دی گئی اور گڑیوں سے ہی بستر پر وقت سے بہت پہلے پہنچادی گئی یا کون جانے میرے خمیر میں لیمپ کی روشنی سے دیوار پر بن جانے والی پرچھائیوں کا وہم فطرت نے ایک ایسی دعا کی طرح گوندھ دیا تھا جو فقیر بھیک کا سکہ نہ ملنے کے باوجود زبان کی نوک سے فضا میں بے دلی سے اچھال دیتا ہے۔ ماں کی جھڑکیوں اور باپ کی مایوس کن باتوں نے دیوار کی متحرک پرچھائیں کو اور بھی مظلوم بنادیا۔ تیرہ سال کی عمر میں آکر پینتیس سال کا ذمہ دار مرد تمہارے لئے راتوں کو دیوار میں لگے ہوئے آہنی پائپ کے سہارے چڑھ کر بالائی منزل تک آئے اور تمہارے پیروں پر سر رکھ کر اپنی لازوال محبت کا یقین دلائے تو تم اس کمزور لمحے کی زد سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ سردار لانبے قد مضبوط جسم کا خوابناک گفتگو کرنے والا ذہین مرد تھا۔ وہ ماں کی جھڑکیوں کے گولوں میں شبنم جیسی ٹھنڈک لئے ہوا کے تیز جھونکے کی طرح میری زندگی میں آیا اور مجھے بغاوت کے نیزے دے گیا اور میں ہر خطرے سے بے نیاز ہوکر اس کی بانہوں میں قید ہوگئی اور گڑیاں فرش پر بکھری ہوئی چھوڑ کر بستر پر چلی گئی اور میں بے خبر سوگئی ابھی کسی نے تمہیں پیار کے دو بول بھی نہ سنائے ہوں اور باپ آگے تعلیم دلانے سے معذور ہو اور ماں ہاتھ میں دھان کوٹنے کا موسل لئے تمہاری منتظر ہو اور گیہوں کے ڈھیر صاف کرنے کے لئے دالان میں لگے ہوئے ہوں اور گندے کپڑوں کا انبار دھونے کے لئے تمہارا منتظر ہو اور چولھے میں گیلی لکڑیوں کا دھواں مستقبل کو تاریک کئے دے رہا ہو تو تم بھی سردار کے وعدوں اس کی لازوال محبت اور شادی کے اصرار کو یوں نظر انداز نہیں کرسکتے اور اس وقت تمہیں گڑیاں بکھری چھوڑ کر بستر تک جانے میں کوئی قباحت محسوس نہ ہوگی اور تم بھی یہ سوداکر لوگے اور یہ سودا اپنے دیکھے اور ادھورے خوابوں کی تعبیر کا راستہ خود بنادے گا۔ میں نے بغاوت کی اور خوابوں کی تعبیر کے راستے پر تن تنہا آکر کھڑی ہوگئی اور پھر مجھے علم ہوا کہ دسویں جماعت اور گیارھویں جماعت کے درمیان ایک ایسا ان دیکھا پل تھا جسے پار کرنے کے لئے میں گلی سے کھیلتی ہوئی ایک اجنبی کی خوابگاہ میں پہنچ گئی اور مجھے عورت مرد کے اس رشتے کا علم ہوا جس نے مجھے اپنے اندر چھپی ہوئی ایسی قوت کا احساس دلایا جس سے میں خواہش کا ہر مضبوط قلعہ فتح کرسکتی تھی اور اس لذت سے آشنا ہوئی جو ہر لذت اور ہر خوشی کا سرچشمہ بن سکتی تھی اور میں نپولین ہوگئی اور میں سکندر ہوگئی اور مجھے دراز قد' طاقت ور لوگ اچھے لگنے لگے' اور مجھے شائستہ گفتگو کرنے والے' اور شستہ انگریزی بولنے والے ذہین مرد اٹریکٹ کرنے لگے اور مجھے اسمارٹ اجنبی مانوس لگنے لگے اور پھر مجھے سادہ لوح شمس اچھا لگنے لگا اور میرا جی چاہا کہ میں تامار بن جاؤں اور عینائم کے تراہے پر بیٹھ جاؤں۔"

انتھونی ولکاکس کے چہرے پر پہلی بار قدرے ناگواری کا احساس سائے کی طرح آکر گزر گیا۔

"سردار نے میرے گھر کی دوسری منزل تک آہنی پائپ کے ذریعہ رات کے اندھیرے میں آکر زندگی کی جن لذتوں سے مجھے روشناس کردیا تھا میری جن قوتوں کو بیدار کردیا تھا وہ معاشرے کے لئے عیب مگر میرے لئے ہنر تھیں میرے لئے مسرتیں مگر میرے بزدل باپ اور زبان دراز ماں کے لئے آزار تھیں۔ ابھی تمہاری عمر صرف چودہ سال ہو اور کہیں سے شادی کا رشتہ تک نہ آیا ہو اور تم ماں بننے کے انتظار میں خوف زدہ ہوکر چیزوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگو تو پھر دنیا تمہارے لئے کیا رہ جائے گی۔ میرا چھوٹا سا گھر اس حادثے کے باعث ایک ایسے جہاز میں بدل گیا تھا جس کا مستول ناکارہ ہوگیا ہو' ناخدا عاجز ہو اور سمندر میں طوفان اور دور دور تک خشکی کا کہیں پتہ نہ ہو اور کوئی سیگل (Seagul) کہیں نظر نہ آتی ہو لیکن سردار نے مجھ سے شادی کرکے اس شکستہ جہاز کو ڈوبنے سے بچالیا اور میری ماں کے سر پر چادر اور باپ کا شملہ محفوظ رہ گیا۔ اور ہم شیشم اور پیپل کے بڑے بڑے درختوں سے گھرے اپنے چھوٹے سے مکان میں رہنے لگے اور ہمیں وہ تمام آسائشیں میسر آگئیں جو ایک والی بال کا کوچ فراہم کرسکتا تھا۔

فادر' سردار ایک تجربہ کار شوہر ہی نہیں تھا جہاندیدہ مرد بھی تھا اس نے ایک اوباش مرد کی زندگی گزاری تھی۔ والی بال کا کوچ ہونے کے باعث کئی ملکوں میں رہ چکا تھا اور بازاری عورتوں سے نباہ کرچکا تھا وہ جانتا تھا کہ عورت اپنے بدن کو جب چاہے ڈھال بناسکتی ہے اور

جب چاہے شمشیر کرسکتی ہے اور اس نے ایک ماہر کاروباری کی طرح میری تربیت کی اور مجھے مرد کو سب کچھ بھول کر اپنا عادی بنالینا آگیا اسے آسودگی کی اس انتہا تک لے جانا آگیا جہاں سے واپسی کا تصور بھی ناممکن ہے اور میں نے اپنے اندر نئی قوت محسوس کی جیسے میری کمک کو کہیں سے اور تازہ دم فوج آگئی ہو۔

سردار کی ماں بھی ہمارے ساتھ اسی چھوٹے سے مکان میں رہتی تھی اور مجھے بچوں کی طرح بہلایا کرتی تھی۔ سردار نے مجھے سائیکل دلادی تھی اور میرا داخلہ کالج میں ہوگیا تھا میں اس کے لئے سردار کی حد درجہ مشکور تھی سردار مجھ سے محبت بھی کرتا تھا یوں ہم خوش تھے۔ میں جب کالج میں ہوتی تو سردار کی ماں میرے بچے کی دیکھ بھال کرتی اور میں مزے سے سردار کے دیئے ہوئے روپوں سے کالج میں اپنے دوستوں کی تواضع کرتی۔ دوپہر میں کالج سے واپس آتی تو سردار عموماً گھر سے باہر ہوتا سردار کی ماں مجھے کھانا دیتی اور مجھے کالج میں پڑھنے سے منع کرتی تاکہ میں اپنے بچے کی صحیح خطوط پر پرورش کرسکوں۔ پھر سردار کی ماں اپنے دوسرے بیٹوں کے پاس چلی گئی اور ہم نے ایک عورت، بچے کی دیکھ بھال کے لئے رکھ لی۔ ایک صبح میں حسب معمول کالج گئی لیکن کسی لکچرار کے انتقال کے باعث کالج بند ہوگیا تھا اور میں خلاف معمول گھر لوٹ آئی۔

میں گھر میں داخل ہوئی تو وہاں کوئی نہ تھا نہ وہ عورت تھی نہ میرا بچہ، گھر میں ایک اجنبی سی خاموشی تھی، برآمدے میں بچھے ہوئے پلنگ پر ایک سیاہ برقعہ پڑا ہوا تھا اور پلنگ پر اور پلنگ کے آس پاس کھائے ہوئے سنگتروں کے چھلکے بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ عورت اور بچے کی عدم موجودگی کے باعث میں پریشان ہوگئی اور بھاگ کر میں نے کمرے کے دروازے کو دھکادیا تو دروازہ چوپٹ کھل گیا سامنے مسہری پر سردار موجود تھا۔ میں ششدر کھڑی تھی کبھی عورت اور کبھی سردار کو دیکھتی رہی نہ میں اپنی جگہ سے آگے بڑھی اور نہ ان دونوں نے جنبش کی۔ جانے مجھے کیا ہوا کہ میں کمرے سے باہر نکلی برآمدے سے ہوتی ہوئی صحن سے سائیکل اٹھاکر گھر سے باہر نکل گئی اور تمام دن سڑکوں پر سائیکل چلاتی رہی۔ کبھی تھوڑی دیر کے لئے کسی دوست کے گھر جاکر دم لے لیتی کبھی کسی درخت کے نیچے ستانے بیٹھ جاتی، شام کو گھر واپس لوٹی تو سب کچھ نارمل تھا، بچہ پالنے میں سورہا تھا اور سردار برآمدے میں بچھے ہوئے پلنگ پر بیٹھا ہوا تھا سیاہ برقعہ اور سنگترے کے چھلکے غائب تھے۔ میں نے سردار سے کوئی باز پرس نہ کی اور اس کی ہر معذرت اور آئندہ محتاط رہنے کے وعدے بے کم و کاست قبول کرلئے۔ مجھے سردار کی ماں نے سردار کے بارے میں سب کچھ بتادیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ سردار کی پہلی بیوی اسی شہر میں رہتی تھی اور طلاق کے باوجود سردار اس سے ملتا رہتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ سردار اس عورت سے کبھی قطع تعلق نہ کرے گا لیکن میں نے سردار پر کبھی یہ راز نہ کھلنے دیا تھا کہ اس کی ماں نے اس کا ماضی اس پر کھول دیا ہے۔ مجھے اب اپنے اوپر اعتماد تھا ماں باپ نے مجھے گھر میں پڑی اشیا کی طرح راستے میں ڈال دیا تھا اور میں سردار کی زد میں آگئی تھی لیکن اب مجھے یقین تھا کہ میں کسی بھی مرد کو اپنا مطیع بناسکتی ہوں اور میں مفتوح مردوں کے سروں کے مینار بنا سکتی ہوں۔ سردار نے مجھے اپنے بازاری عورتوں سے حاصل کئے ہوئے تجربوں کی ایسی منجنیقیں دے دی تھیں جن سے میں انا کے کسی بھی قلعہ کو مسمار کرسکتی تھی کسی بھی بت کو ڈھاسکتی تھی۔ سردار نے اپنے اور میرے درمیان شوہر اور بیوی کے مقدس رشتے کے احترام کے نام پر تحفظات کی کوئی دیوار نہ حائل ہونے دی تھی۔

فادر کبھی کبھی کسی خط میں کسی کی لکھی ہوئی چند سطریں کسی کی زندگی میں ایسا طوفان اٹھادیتی ہیں جو نظریوں محبتوں اور خلوص پر سے اعتماد ختم کردیتا ہے ظہیر نے ایک خط میں مجھے لکھا تھا کہ تمہارے لمس نے میرے جسم پر ایک نئی کہانی اگادی ہے اور میں ہر دم اس ننھی سی کونپل کی حفاظت میں لگا رہتا ہوں جذبوں کی کھاد ڈالتا ہوں اور یادوں کی گوڈی کرتا ہوں تاکہ محبت کی یہ ننی سی کونپل ایک بوٹا بن جائے۔ یہ خط امروز نے پڑھ لیا اور اندر سے ٹوٹ گیا اور میری کوشش کے باوجود وہ اپنے سالہا سال کی محبت کے تناور درخت کی شاخوں کو سرسبز نہ رکھ سکا۔ اس نے مجھ سے محبت کی تھی لیکن رقابت کا ایک ہی جھونکا ہمارے گرد کھلے شگوفوں کو راکھ کرگیا۔ اس نے

بڑے دکھ سے اپنے ہاتھ میں دبی ہوئی کتاب کا ایک صفحہ کھول کر اس طرح پڑھا جیسے وہ مجھ سے کچھ نہ کہہ رہا ہو صرف بلند آواز سے کتاب کی سطریں پڑھ رہا ہو۔

How can you love a woman who constently makes you feel that you are a common street walker.

(تم اس عورت سے کیسے محبت کرسکتے ہو جو تمہیں ہر لمحے یہ احساس دلائے کہ تم محض ایک عام راہ گیر ہو)

"یہ ظہیر اور امروز کون ہیں" انتھونی ولکاکس نے پہلی بار سوال کیا

"ظہیر میرے ساتھ مزار پر پھول چڑھانے گیا تھا پھر ہم رات گئے دیر تک سڑکوں پر پھرتے رہے۔ ہم نے شاپنگ کی اور رات کا کھانا ساتھ کھایا اور وہ مجھے بہت اچھا لگا۔ پھر جب میں اس کے شہر سے لوٹ آئی تو اس نے مجھے خط لکھا۔ جسے امروز نے پڑھ لیا۔ ظہیر کے ساتھ وہ میری عارضی رفاقت تھی۔ خوشیوں کے چند لمحے۔ میں اس کے ساتھ داتا دربار گئی تھی اور امروز میرے ساتھ عبداللہ شاہ غازی کے ارد گرد پھیلے ریگستانوں میں پھرتا رہا تھا اس نے میرے دکھ بانٹے تھے۔ مگر امروز کا ذکر ابھی قبل از وقت ہے۔ ہاں ظہیر ایک خوبصورت شام تھا۔ امروز سے پہلے میری زندگی میں شمس آیا تھا۔ شمس مجھے ان دنوں ملا جب سردار میرے لئے ایک روائتی شوہر بن چکا تھا۔ شمس گاؤں سے آیا تھا اس کی آنکھوں میں غول سے بچھڑ کر بستی میں آجانے والی نیل گائے جیسی وحشت تھی اور میں روزمرہ کے معمول سے ماند پڑنے لگی تھی اور مجھے اپنی منجنیقوں کے استعمال کے لئے نئے قلعے کی تلاش تھی اور گاؤں سے آیا ہوا شمس میرے سامنے مضبوط فصیلوں کی طرح آگیا تھا۔ میں نے ان مضبوط فصیلوں کو ڈھا دینے کا فیصلہ کرلیا۔ میرے سامنے برآمدے کی پلنگ پر پڑا ہوا برقعہ اور کھائے گئے سنگترے کے بکھرے ہوئے چھلکے اس علم کی طرح لہرانے لگے جیسے فوج کا سپہ سالار اپنا علم بلند کرکے فوجوں کو آگے بڑھنے کا فیصلہ کن اشارہ دے رہا ہو۔"

فادر ولکاکس ایک بت کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔

"میں یہودہ کی بہو اور اس کے سب سے بڑے بیٹے عیر کی بیوہ نہ تھی نہ میں عیر کے بھائی اونان سے بیاہی گئی تھی جو اس خوف سے کہ اس سے پیدا ہونے والی اولاد اس کے بھائی عیر کی کہلائے گی اپنا نطفہ زمین پر ضائع کرتا تھا اور نہ بیوگی کے لباس میں یہودہ کے تیسرے بیٹے شیلہ سے بیاہے جانے کی منتظر سالہا سال سے بن بیاہی بیٹھی تھی اور نہ مجھے کسی ایسے یہودہ سے کوئی شکوہ تھا جس نے شیلہ کے جوان ہوجانے کے باوجود مجھے بیوگی کے لباس میں بیٹھا چھوڑ کر پشم کترنے والوں کے پاس تمنت میں اپنے دوست میرہ عدلای کے پاس جانے کا فیصلہ کیا تھا مجھے تو اپنی منجنیقوں کے لئے قلعے کی تلاش تھی۔ میں سروں کے مینار بنانا چاہتی تھی میرا جی چاہا تھا کہ میں تامار کی طرح نقاب ڈال کر فاحشہ بن جاؤں اور کسی بھی ترا ہے پر بیٹھ جاؤں میں اب اپنے اندر کی آگ میں سلگ رہی تھی اور اپنی خواہش سے مغلوب ہوچکی تھی۔"

فادر ولکاکس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدلا لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔

"میں نے سنا ہے کہ سردار کے ڈرائنگ روم میں آج بھی آتش دان پر سائڈ ٹیبلز پر اور شوکیسوں پر میرے بڑے بڑے پورٹ ریٹ سجے ہوئے ہیں جن پر وہ پابندی سے پھول چڑھاتا ہے۔"

وہ مسکرادی یوں جیسے سردار ہاتھوں میں پھولوں کا گلدستہ لئے اس کے سامنے آگیا ہو اور معذرت کا ہر لفظ اس کے قدموں میں پھولوں کے ساتھ ڈال رہا ہو۔

"میں نے سردار کے ساتھ بہت خوبصورت دن گزارے تھے اس نے مجھے حد سے زیادہ پیار دیا تھا اب میں سوچتی ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے وہ پیار کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا مگر میں گھٹنوں گھٹنوں پانی ہی تک اتر سکی اور کنارے ہی سے گزرنے والوں کے قدموں سے روندی ہوئی سیپیاں چن کر ادھر ادھر دیکھنے لگی سردار کنارا کہاں تھا وہ بیچ سمندروں میں آیا ہوا طوفان تھا اس نے مجھے اپنی ہی

آسودگی کے لئے ہر طرح کے حربوں سے لیس کیا تھا اس نے مجھے اس قابل بنادیا تھا کہ میں گہرے سمندر میں اترتی چلی جاؤں اور اپنے دامن میں وہ سیپیاں بھرلاؤں جن کا کسی کو گمان تک نہ ہو ایک مرد جب ایک عورت کو نامعلوم سے معلوم تک لے آتا ہے تو وہ عورت پھر قلوپطرہ ہوسکتی ہے' وہ نیرو کی بانسری چھین کر شہروں کو جلنے سے بچا سکتی ہے اور میری بن کر سروں کے انبار لگا سکتی ہے۔ سردار مجھے نامعلوم سے معلوم میں لے آیا تھا۔ وہ مجھے ہر طرح کی آزادی دیتا تھا مجھے اور پڑھنے اور پڑھتے رہنے کا حوصلہ دیتا تھا وہ مجھے اتنا جیب خرچ دیتا تھا جس سے میں اپنی تمام دوستوں کو کالج کی کینٹین سے لنچ کراسکوں مگر میں نے جو کچھ پالیا تھا اتنے ہی کو بہت کچھ سمجھ بیٹھی اور سردار کے بعد مجھے گہرے پانیوں کے راز بتادینے والا کوئی اور نہ مل سکا۔ اب جب کہ میں اسے چھوڑ کر بہت دور نکل آئی ہوں اگر وہ میرے پورٹ ریٹ پر پھول بھی چڑھاتا ہے تو کیا میں اب لوٹ کر پھر ان پورٹ ریٹس تک نہیں جاسکتی اسے نہیں معلوم کہ میرے کتنے پورٹ ریٹس کہاں کہاں سجے ہوئے ہیں اور کتنی محرومیاں اور کتنی یادیں ان پر کیسے کیسے پھول چڑھاتی ہیں۔ یہ وہ سر ہیں جن سے میں نے مینار بنائے ہیں اور جن پر میں نے اپنی فتح کے پرچم لہرائے ہیں۔ میں پائیدار دائمی محبتوں پر یقین ہی نہیں رکھی۔ پائیدار محبتیں محکومی کا احساس دلاتی ہیں دائمی محبتیں اپنی ذات کی نفی کا تقاضا کرتی ہیں اور آزادیاں سلب کرتی ہیں۔ والی بال کے کوچ کے ساتھ زندگی جال کے اس طرف سے جال کی دوسری طرف تک جاسکتی ہے اس سے زیادہ نہیں جب کہ جال کے دونوں ہی طرف زندگی ایک مستطیل سے آگے نہیں ہے۔ میری منزل والی بال گراؤنڈ کی چونے کی لکیروں سے بنی چھوٹی سی مستطیل تھی۔ میری منزل میرا ذاتی ہوائی اڈہ تھا۔ میری منزل والی بال کے جال تک کی بلندی ہر گز نہ تھی۔ میں تو اپنے ذاتی طیارے میں بیٹھ کر پائلٹ کا اعلان کہ اب ہم اٹھارہ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کررہے ہیں سننا پسند کرتی تھی اسی لئے میں نے سردار کو چھوڑ دینے کا فیصلہ بہت پہلے کرلیا تھا۔ گھر کے برآمدے کی پلنگ پر پڑا ہوا کالا برقعہ اور زمین پر ادھر ادھر بکھرے ہوئے سگریٹ کے چھلکے تو میرے منتشر خیالات کو یکجا کرنے اور اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے اسباب تھے۔ جس طرح ہر شے ایک مخصوص مدت کے بعد اپنی پہلی افادیت گھٹانے اور کھونے لگتی ہے اسی طرح مرد پہلی پرجوش رفاقت کے بعد ہی لمحہ لمحہ اپنی افادیت کھونا شروع کردیتا ہے اس کی خواہش کی شدت ہر سانس قطرہ قطرہ کم ہونے لگتی ہے اور رفاقت کی پہلی خوشبو جو پرجوش مترنم سانسوں سے نکل کر بام و در میں پھیل جایا کرتی تھی ہوا کے ہر نئے جھونکے کے ساتھ بکھرنے لگتی ہے اور سب کچھ روزمرہ کے معمولات میں بدل جاتا ہے اور ہم پہلے تو محسوس ہی نہیں کرپاتے پھر جب ہمیں احساس ہوتا ہے تو ہم اپنے آپ کو بہلانے لگتے ہیں پھر آخر کار جب ہم سوچتے ہیں تو ہمارے بس میں کچھ نہیں رہ جاتا' اور پھر ہم نئی محبت کا کوئی چراغ چپ چاپ روشن کرلیتے ہیں اور پھر سب کچھ نیا اور اسی طرح ہوجاتا ہے جس طرح ہم پسند کرتے ہیں اور ہماری خواہش ہوتی ہے تاکہ پچھلی گم شدہ محبت کا کوئی نقش کبھی ہماری راہ میں نہ آئے اور ہمیں کبیدہ خاطر نہ کرے اور شوہر بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہے جب تم دوبارہ آزاد ہوجاتے ہو تو پھر تمہارے گرد ہیزل آنکھوں خوبصورت انگلیوں' سجل پیروں کے ناخنوں پر لگی ہوئی کیوٹکس کی تعریف کرنے والے جمع ہوجاتے ہیں اور اپنی گھروں میں بیٹھی روز مرہ کے معمولات میں مشغول بیویوں کی برائی کرکے دوسری عورتوں کی ہمدردیاں سمیٹنے لگتے ہیں اور مجھے ایسی مچھلیاں بہت اچھی لگتی ہیں جو ڈور کے سرے پر بندھے کانٹے میں پروئے گئے چارے کو کانٹے سمیت فوراً نگل لیتی ہیں۔

گاؤں سے آیا ہوا شام سردار کا رشتہ دار تھا اور میرے پاس بیٹھا گھنٹوں گاؤں کی باتیں کیا کرتا۔ وہ فصلوں کی باتیں کرتا جو کھیتوں میں بوئی جاتی ہیں وہ کھیتوں کی باتیں کرتا جو فصل پکنے پر کاٹے جاتے ہیں۔ وہ رستوں کی باتیں کرتا جو کچے ہوتے ہیں اور جن پر گزرنے والی بیل گاڑیاں گہری لیک بنادیتی ہیں جن میں پہیے آدھے آدھے دھنس جاتے ہیں اور سڑکیں پختہ سڑکوں سے مل جاتی ہیں اور مسافر بیل گاڑیوں اور یکوں سے بسوں میں منتقل ہوجاتے ہیں اور بسیں ان مسافروں کو لے کر شہروں کو چلی جاتی ہیں جہاں وہ تازہ ہوا اور صاف پانی کو ترسنے لگتے ہیں اور نفرتیں کرنا سیکھ لیتے ہیں اور حقوق کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں اور اشک آور گیس ان کی آنکھوں میں جبری آنسو بن جاتی ہے اور ان کے پھیپھڑے گیس کی شدت سے زخمی ہوجاتے ہیں اور وہ جلسوں میں نعرے لگاتے ہیں اور اپنے مسائل کے حل کے

لئے ان کے ہاتھوں میں بک جاتے ہیں جن کے کوئی مسائل ہوتے ہیں اور نہ جنھیں مسائل کا ادراک ہوتا ہے اور جو مسائل کے حل کے جھوٹے خواب دکھاتے ہیں اور اپنی خوابگاہوں میں ہر شب نئے مسائل لے آتے ہیں اور مشروب و مسائل کا آمیزہ بنا کر پی جاتے ہیں اور صبح ہینگ اوور میں رات کے افسانے اور دن کے مسائل بھول جاتے ہیں۔ وہ گاؤں کی لڑکیوں کی باتیں کرتا ہے جو دیواروں پر اوپلے تھاپتی ہیں اور حویلیوں میں اپنا بچپن وقت سے پہلے چھوڑ کر کچے مکانوں کو لوٹ آتی ہیں اور وہ اپنے ساتھ گاؤں کی یادیں اپنے کپڑوں کی پوٹلی اور بستر کی رسی میں باندھ لایا تھا اس کے جسم سے گاؤں کی سوندھی مٹی کی خوشبو اور محنت کے پسینے کی لپٹیں اٹھتی رہتی تھیں اور بازوؤں کی مچھلیاں مچلتی رہتی تھیں اور اس کی سانسوں میں ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشمے ابلتے رہتے تھے اور اس کی آنکھوں میں جوانی کی اشتہا بیر بہوٹی بن گئی تھی اور سردار راتوں کو دیر سے گھر لوٹتا تھا اور اسے یقین تھا کہ میں ہمیشہ کی طرح اس کے انتظار میں دروازے کی آہٹ پر کان لگائے ملوں گی اسے احساس ہی نہیں تھا کہ میں اس کے انتظار کے کرب سے آزاد ہو چکی ہوں اور اسے علم نہیں تھا کہ میں اور شام اس کی عدم موجودگی میں گئی رات تک ایک دوسرے کو جان لینے اور تلاش کر لینے کے لئے جاگتے رہتے ہیں۔ میں جو کس سنا کر اس کی اجنبیت کاٹتی ہوں اور وہ گاؤں کے قصے سنا کر میری تنہائی بانٹتا ہے اور جب رات گئے سردار گھر لوٹتا تو شام پروائی کے دن بھر کے تھکے بیل کی طرح نڈھال کچلا ہوا اور خالی خالی اپنے کمرے میں سو رہا ہوتا اور میں گزرے ہوئے لمحوں کے ٹرانس میں ہولے ہولے سانس لے رہی ہوتی حتیٰ کہ سردار مجھے آوازیں دیتے دیتے سو جاتا اور میں بیدار رہتی اور ہنسی میرے ہونٹوں پر مچلتی رہی لیکن میری سرد مہری نے سردار کو سوچنے پر مجبور کر دیا اور اس نے میری اور شام دونوں کی نگرانی شروع کر دی اور اسے بہت جلد علم ہو گیا کہ شام نے مجھے اور میں نے شام کو تلاش کر لیا ہے اور ہم دونوں نے اسے شکست دے دی ہے پھر سردار نے شام کو اپنے گھر سے نکال دیا اور میں اس کی زندگی سے نکل گئی۔

میں نے جب سردار کو بتایا کہ میں اس سے آزادی حاصل کرنا چاہتی ہوں تو سردار کو یوں لگا جیسے میں اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی ہوں یا جو کچھ میں کہہ رہی ہوں اس کا مفہوم میں نہیں سمجھ رہی۔ سردار گاؤں سے اپنی ماں کو بلا لایا۔

"بیٹی تو جو کچھ کہہ رہی ہے اس کا مطلب بھی جانتی ہے" اس نے گاؤں کے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہا۔

"جانتی ہوں"

"یہ لوگ تجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے مگر آزاد نہیں کریں گے"

"میں ان کے ٹکڑے کر دوں گی"

"تیرے اندر اتنی طاقت ہے"

"طاقت ہاتھوں میں نہیں ارادوں میں ہوتی ہے اور کلہاڑی چاہے جس کے ہاتھ میں ہو ٹکڑے برابر کرتی ہے۔"

سردار کا بھائی مجھے سمجھانے کے لئے گاؤں سے آگیا۔

"میں جانتا ہوں کہ سردار آوارہ اور بدچلن ہے۔ وہ خود غرض ہے۔ تجھے تیرا حق نہ دے سکتا ہے نہ دے گا۔ اسے چاہیے تھا کہ تجھے پھولوں کی طرح رکھتا۔ تو میرے ساتھ چل میں تجھے اپنے دل کی ملکہ بنا کے رکھوں گا۔ جو تو کہے گی وہی کروں گا۔ میں سردار سے زیادہ خوبصورت اور جوان ہوں۔ تو چل میرے ساتھ۔ میں تیرے سر کی قسم کھاتا ہوں۔ میں جس دن تو اس کے چکر میں پھنسی اسی دن سے دعا مانگتا تھا کہ کسی طرح تو سردار سے آزادی حاصل کرے۔"

سردار کی ماں نے مجھے ڈرانے کی کوشش کی تو بھائی نے مجھے اپنے لئے پسند کر لیا۔ میں نے سردار کی ماں اور بھائی دونوں کو سردار کے سامنے بلا کر کہا۔

"تو مجھے ڈراتی ہے اور تیرا یہ دوسرا بیٹا مجھے اپنے پاس رکھنے کو تیار ہے۔ اب تم لوگ کیا کہتے ہو۔ میں اگر تیرے چھوٹے بیٹے کی

داشتہ بن گئی تو سردار کا گلا اسی سے کٹوادوں گی"
سب ڈر گئے اور سردار نے مری ہوئی آواز میں کہا
"مگر میں بیٹا تجھے نہ دوں گا۔ بول منظور ہے"
"میں اپنی آزادی کے لئے اگر ایسا ہی ایک بیٹا اور ہوتا تو دونوں کو تیرے پاس چھوڑ دیتی مجھے بیٹا نہیں آزادی چاہیے"
"تو کہاں جائے گی، تجھے اب کون پوچھے گا۔ تجھے داغ لگ گیا اب سڑکوں پر پھرے گی کیا" ماں نے کہا۔
"کیوں میرے کچھ پھول تھے جو سردار نے نوچ لئے، کیا بگڑ گیا ہے میرا جو مجھے کوئی نہ پوچھے گا تیرا دوسرا بیٹا اپنا کاسہ لئے تیرے سامنے ہی بھکاریوں کی طرح کھڑا ہے۔ بہت ہیں ایسے بھکاری دنیا میں۔ میں خوبصورت ہوں، جوان ہوں اور پڑھی لکھی ہوں"
"منع کرتی رہی میں سردار کو کہ نہ پڑھا اس کو۔ ہاتھ سے بے ہاتھ ہوجائے گی"
"میں اگر پڑھتی لکھتی نہ تو بھی سردار کے ساتھ اب نہ رہتی"
"دیکھ اب بھی مان جا۔ ورنہ بیٹے کو دیکھنے کو ترس جائے گی۔" ماں نے پھر ڈرایا
"اور پیدا کرلوں گی ایسے بیٹے۔ رکھ لو اپنے پاس"
"تو عدالت میں بچے سے دست بردار ہوجائے گی" سردار بولا
"ہاں عدالت ہی میں تجھ سے قانونی آزادی حاصل کرلوں گی اور تجھے بچہ تب دوں گی"
میں سردار کی یکسانیت کی قید سے آزاد ہوئی اور نئے سفر پر چل کھڑی ہوئی۔ شام میرے لئے گذار ہوا کل تھا۔ سردار میرا گمشدہ ماضی تھا۔ فادر میں سوچتی ہوں کہ وفاداری کا تصور مرد کے ذہن میں کچھ اور ہے۔ وفاداری کا وہ محدود اور یکطرفہ تصور جو مرد کے ذہن میں ہے میں نے اسے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ عورت بیوی ہو یا محبوبہ دونوں حیثیتوں میں وفادار رہتے ہوئے بھی کسی وقتی جذبے ضرورت یا حماقت سے کسی اور سے عارضی تعلقات قائم کرسکتی ہے۔ کسی نئے دوست کے ساتھ چند ساعتیں تسکین کے لئے گزار لینے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنے شوہر یا عاشق سے وفادار نہیں رہی۔ یہ ہنگامی لمحے اور عارضی ساعتیں بالکل اس طرح ہوتی ہیں جیسے برساتی ندی باڑھ کے دنوں میں اپنے ارد گرد کی خشک زمینوں تک پھیل جاتی ہے لیکن باڑھ گزر جانے کے بعد پھر اپنی محدود وسعتوں تک سمٹ آتی ہے۔ برسات کے موسم میں اک ذرا کے ذرا ادھر ادھر پھیل جانے کو عورت کی آوارگی کا نام دینا یکطرفہ کاروائی ہے اس طرح کی عارضی رفاقت کو شوہر یا عاشق سے بے وفائی کہنا تنگ نظری ہے خاص طور سے ایسی صورت میں کہ ایسی عورت اپنے مستقل رفاقتوں میں مخلص ہو تو وہ میری نظر میں سچی کھری اور وفادار ہے۔"
فادر انتھونی ولکاکس نے گردن اثبات میں اس طرح ہلائی جیسے اسے اس کی وفاداری کے تصور سے مکمل اتفاق ہو۔
"پورٹ ریٹ پر پھول چڑھانا رات کے اندھیرے میں دیوار میں لگے پائپ کے سہارے دوسری منزل تک چڑھنے سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ پائپ کے سہارے چڑھنے کی محنت شاقہ کا ثمر ایک خوبصورت منتظر بدن تھا جو میرا تھا پورٹ ریٹ پر پھول چڑھانے کے رومانس کا ثمر ایک مسرت ہے جو اس کی ہے۔ مرد اپنی بچھڑی محبتوں کی یاد کے رومانس سے مسرت حاصل کرتا ہے۔ مجھے ان تازہ پھولوں سے جو پورٹ ریٹ پر سوکھ جاتے ہیں۔ ایک ایسی ڈپریشن ہوتی ہے جیسے گزرتے ہوئے نظر کسی اجنبی کی شکستہ قبر پر پڑ جانے سے ہوتی ہے۔ گھر کے آنگن میں بکھری ہوئی چیزیں کب کس کی ٹھوکروں میں آجائیں گی کسے معلوم ہے جانے کتنے پورٹ ریٹ گرد سے اٹے ہوتے آتش دانوں پر کب سے پڑے ہوں گے کوئی ان پر کبھی پھول نہ ڈالتا ہوگا مگر کسی پورٹ ریٹ نے کبھی کسی سے یہ تمنا بھی نہ کی ہوگی کہ کوئی ان پر ڈسٹر پھیر کر گرد ہی صاف کردے پورٹ ریٹ ان تماشوں سے بے نیاز ہوتے ہیں اور کسی کے کچھ نہیں لگتے وہ صرف عورتوں کے عکس ہوتے ہیں اور تمام رشتوں اور بندھنوں سے آزاد ہوتے ہیں اور فریم میں جڑے شیشوں میں قید ہوتے ہیں فادر سردار

ختم ہوا تو ایک سفر ختم ہوا اور شام قدموں کے نشان سے بن جانے والی پگڈنڈی کی طرح بھری برسات میں اگ آنے والی گھاس میں چھپ گیا۔ سردار نے اسے اپنے گھر سے اور میں نے اسے اپنی زندگی سے ایک ساتھ ہی نکالا تھا۔"

وہ تھوڑی دیر خاموشی سے سوچتی رہی پھر بولی۔

"عجیب بات ہے۔ لڑکی ایک بار ماں باپ کے گھر سے نکل کر کسی مرد کی ہوجائے تو پرائی ہوجاتی ہے پھر وہی گھر جہاں وہ پیدا ہوئی تھی بچپن گزارا تھا اور پل کر جوان ہوئی تھی اس کا نہیں رہ جاتا اور صرف ماں باپ ہی نہیں گھر کے در و دیوار اس سے پوچھنے لگتے ہیں کہ وہ کب اپنے گھر جائے گی اور بیٹی یوں محسوس کرتی ہے جیسے لمبی مسافت سے تھک کر جہاں کچھ دیر ستانے کو رکی تھی وہاں کچھ اور مسافر آنے کو ہیں جن کے لئے اسے یہ جگہ خالی کردینی ہوگی اور جس گھر کے گھڑے کا پانی اسے ٹھنڈا اور شہد کی طرح میٹھا لگتا تھا اس کو اور اسی گھڑے کے پانی میں فاصلوں کی کھار اور خود غرضی کی لو محسوس ہونے لگی میں گھر چھوڑ کر آگے کی اور لمبی مسافت پر نکل کھڑی ہوئی۔

میں اپنا بدن اپنے ساتھ لے جارہی تھی' میری ہیزل آنکھیں تلاش کرسکتی تھیں۔ میرے خوبصورت پاؤں فاصلے طے کرسکتے تھے میرا ذہن میرے لئے سوچ سکتا تھا' میرے ہاتھ' میرے بازو' میری انگلیاں اور میرا لمس میرے ساتھ تھا اور اب بھی یہ سب کچھ میرا ہی تھا۔ جب کوئی کسی کو چھو کر آگے چل دیتا ہے تو صرف تھوڑی دیر میں اس کے قدموں کے نشان ہمیشہ کے لئے مٹ جاتے ہیں میں نے سردار یا شام کے لئے اپنے پیچھے کوئی نقش قدم نہ چھوڑا تھا مگر اب کے ماں باپ کے گھر سے نکل کر یوں محسوس ہوا کہ اب میرا کوئی گھر نہیں ہے اور اب میرے نقش قدم تلاش کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ ماں باپ سے میرا رشتہ اب اس طرح ٹوٹا تھا کہ میں اس رشتے کو ماضی کے دنوں کی طرح کبھی یاد بھی نہ کرسکتی تھی رونے کے لئے بھی میں اب اپنے گھر کو سہارا نہ بناسکتی تھی۔ کوئی بھی میرا اس جگہ رک کر انتظار نہ کرے گا جہاں میں نے اسے چھوڑا تھا سب اپنے اپنے سفر پر اسی لمحے نکل کھڑے ہوں گے جیسے میں مرچکی ہوں اور میرے سارے رشتے مجھے دفن کرکے ٹوٹ گئے ہیں اور اب میں سرراہ اگے ہوئے درخت میں لگا ہوا ایسا پکا ہوا پھل تھی جو کسی وقت بھی ہوا کے جھونکے سے ٹوٹ کر کسی کی جھولی میں گر سکتا تھا اور جھولیاں--- اور جھولیاں---"

اس نے انتھونی ولکاکس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔

"تم جب تنہا ہوتے ہو تو اپنی ذات کے خول سے باہر نکل آتے ہو اور تمھاری ساری اذیتیں جو تم خود اپنے لئے بٹورتے ہو تمھارے گوشت میں پنجے گاڑ دیتی ہیں اور تمھارا ماضی تم سے پوچھتا ہے تمھارے گناہوں کے بارے میں' تمھاری نیکیوں کے بارے میں' تمھارے دوستوں اور تمھارے دشمنوں کے بارے میں اور تمھارے چہیتوں کے بارے میں جنھیں تم نے بلا کچھ کہے اچانک چھوڑ دیا حالانکہ تمھارے پاس بے شمار شکوے رہے ہوں گے ان گنت جواز ہوں گے' لیکن کیا اب اگر تم چاہو بھی تو انھیں تلاش کرسکو گے کیا تم اب ان سے مل کر ان کی فرد جرم جو تم اپنے سینے میں لئے پھرتے ہو انھیں سناسکتے ہو۔ وہ اب تمھیں کہاں ملیں گے وہ تو کب کے تمھارے سسٹم سے نکل چکے وہ تو شاید اب تمھیں بھول بھی گئے ہوں گے' اور شاید تمھیں دیکھ کر تمھارے بدلے ہوئے چہرے کے باعث تمھیں پہچان بھی نہ سکیں اور منہ پھیرلیں لیکن تمھارا ماضی تم سے ان لمحوں کا حساب مانگتا ہے جن میں تم نے محبتیں کیں اور ان لمحوں کا بھی جن میں تم اپنی پامال محبتوں کے خشک پھول ڈسٹ بین میں ڈالتے رہے تمھارا سچ' تمھارا جھوٹ اور تمھاری انا سب ٹوٹے ہوئے کھلونوں کی طرح پچھتاووں کی زد میں ہیں کیا تم ماضی کے کسی لمحے کو صرف اپنا کہہ سکتے ہو۔"

انتھونی ولکاکس چپ چاپ سنتا رہا جیسے وہ پتھر کا ہوگیا ہو۔

"میں نے ساری محبتیں بھلادیں' تمام نفرتیں ذہن کے منظرنامے پر سے کھرچ دیں اور پھر مجھے یقین ہوا کہ میں ویرانے میں کھلا ہوا تنہا پھول ہوں جسے کسی نے دیکھا نہیں ہے جسے کسی نے چھوا نہیں اور جسے کوئی کسی نام سے پہچانتا نہیں۔ میرے ذہن میں ایک چیلنج در

آیا اور میرے جسم کی انرجی بحال ہوگئی اور میں نے جانا کہ میں تو آزاد ہوں میرے اردگرد' اب فرسودہ نصیحت کھیاں بھنبھنانے کے لئے موجود نہ تھیں میری راہ میں خائف چہرہ رکاوٹیں نہ تھیں اور میرے پیروں میں ماں زنجیر نہ تھی اور باپ کا بوجھ میرے کاندھوں پر نہ تھا اور سب رینگتے حشرات الارض اور بھونکتے کتے تھے اور میرے سر پر کھلا آسمان تھا اور قدموں میں اجنبی راستے تھے۔ میں نے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے لئے فزیکل ٹریننگ اسکول میں داخلہ لینے کا فیصلہ کیا اور داخلہ فارم بھیج دیا۔ میرا داخلہ ہوگیا۔ داخلے کی فیس کے لئے میں نے اپنے باپ کو خط لکھا اور قرض مانگا۔ شاید اس نے میرے قرض کوڑے کی مار اپنی پیٹھ پر چپ چاپ اس لئے سہولی کہ کہیں خون کا یہ کمزور رشتہ بھی پانی نہ ہوجائے۔ شاید میرا باپ بہت زیادہ رحم دل اور بہت زیادہ خدا ترس تھا یا شاید وہ میری کمزوریوں سے واقف تھا اور جس طرح اس نے اپنی ناکامیوں اور محرومیوں سے سمجھوتے کرکے جینا سیکھ لیا تھا اسی طرح اس نے میری شکستوں اور بغاوتوں سے بھی سمجھوتہ کرلیا تھا اس کے اندر مجھے گھر وٹ آنے کی نصیحت کرنے کا حوصلہ نہ تھا یا یوں بھی ہوسکتا ہے کہ مجھ جیسی خود سر بیٹیوں کے باپ اسی طرح کمزور اور بزدل بن کر زندہ رہنے کی مصلحت کا شکار ہوجاتے ہوں گے میرے باپ نے مجھے داخلے کے لئے قرض بھی دیا اور میری حوصلہ افزائی بھی کی اور کوئی شکوہ نہ کیا۔ میں آج بھی اپنے باپ کے لئے اس کی تمام کمزوریوں کے باوجود اپنے دل میں ایک نرم گوشہ محسوس کرتی ہوں۔ میں نے ٹریننگ اسکول میں داخلہ لے لیا اور ہوسٹل میں رہنے لگی۔ مجھے ہوسٹل میں رہتے ہوئے ہمیشہ ضحاک بادشاہ کا قصہ جانے کیوں یاد آتا جس نے بادشاہ بننے کی تمنا کی تھی اور شیطان کا دوست بن گیا تھا اور شیطان نے اپنی بے پناہ قوت اور بدی کی صلاحیتوں سے ضحاک کے راستے کی ساری رکاوٹیں دور کیں اور اسے بادشاہ بنادیا لیکن رخصت ہوتے ہوئے ضحاک سے دونوں کاندھے برہنہ کرنے کے لئے کہا اور جب ضحاک نے اپنا لباس اتار دیا تو شیطان نے اس کے دونوں کاندھوں کو بوسہ دیا اور غائب ہوگیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ضحاک کے دونوں کاندھوں پر دو سانپ اگ آئے۔ تب شیطان کی آواز ضحاک نے سنی جو کہہ رہا تھا کہ ان دونوں سانپوں کو روز دو انسانوں کا مغز کھلانا ہوگا ورنہ یہ سانپ تجھے کاٹنا شروع کردیں گے۔ ضحاک نے سوچا کہ وہ کس طرح ان موذی سانپوں کو دو انسانوں کے مغز کھلاسکے گا۔ تو پھر اسے شیطان کا قہقہہ اور آواز سنائی دی کہ بیوقوف بادشاہ بننا آسان نہیں۔ تو اب بادشاہ ہے تیری قلمرو میں اتنے انسان بستے ہیں تیرے لئے کیا مشکل ہے تو اپنی رعایا میں سے روز انسانوں کو قتل کرے گا اور ان کے مغز ان سانپوں کو کھلاتا رہے گا۔ بادشاہ کی زندگی رعایا سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے اور اب تو جب تک بادشاہ رہے گا تیری رعایا میں سے دو زندہ انسان تیرے اشارے پر قتل ہوتے رہیں گے۔ ہوسٹل میں میرے اردگرد صرف لڑکیاں تھیں اور کہیں آنے جانے کی اجازت نہ تھی۔ تمام لڑکیاں ہوسٹل کے کمروں میں قید تھیں اور ان کمروں کے اردگرد اونچی دیواریں اور خار دار تار تھے۔ کلاس روم کو بھی ایک پردے کے ذریعہ دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا تھا جس کے ایک طرف لڑکیاں بنچوں پر بیٹھ کر لکچر سنا کرتی تھیں اور دوسری طرف لڑکے ہوتے تھے جن کے بے پالش آڑے ترچھے بگڑی صورتوں کے جوتے اور ان کے اوپر پتلونوں کے پنڈلیوں تک پائینچے نظر آتے تھے اور کلاس روم میں یوں محسوس ہوتا کہ پردے کے دوسری طرف مردانہ جوتے' پائینچے اور آوازیں ہیں اور کچھ نہیں ہے۔ ہوسٹل کے کمرے میں اندھیرا ہوتے ہی مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میرے کاندھوں پر سانپ اگ آئے ہیں اور وہ مجھے ابھی ڈسنا شروع کردیں گے ہوسٹل کے شب و روز میں اتنی یکسانیت تھی اور ایسا جمود تھا کہ میں ساری رات وحشت زدہ ہو ہوکر کمرے کی دیواروں کو دیکھتی رہتی جو سمٹ کر مجھے پیسنے لگتیں اور دنوں کو تنہائی مجھے ڈستی رہتی اور سانپ میرے جسم پر رینگتے رہتے اور میرے اردگرد صرف لڑکیاں ہوتیں اور ہر لمحے سوتے جاگتے مجھے صرف لڑکیوں کی آوازیں سنائی دیتیں اور ان کے زیر جامے ادھر ادھر لٹکتے ہوئے دکھائی دیتے اور ان کا ٹھنڈا لمس مجھے یوں لگتا جیسے میں نے برف کی سل پر ہاتھ رکھ دیا ہو اور میں چیخ چیخ کر رونا چاہتی مگر میری آواز حلق میں گھٹ کر دم توڑ دیتی اور میں لڑکیوں کے سامنے رونا اپنی توہین سمجھتی اور مجھے لڑکیوں کے سامنے ہنسنا اپنی ہستی کو ضائع کرنا لگتا۔ اور مجھے لباس پہننا غیر فطری لگتا اور مجھے آئنہ دیکھنا فریب لگتا اور میرا جی چاہتا کہ میں بھی شیاما اور منزہ کی طرح ہفتے کی شام کو عزیزوں سے ملنے کی چھٹی لے کر ہوسٹل کی یکسانیت سے چند گھنٹوں

کے لئے کہیں بھاگ جاؤں۔ مگر کہاں۔ میرا گھر اب کہیں نہ تھا۔ میں ماں تھی مگر اب میرا کوئی بیٹا نہ تھا' میں بیوی تھی مگر اب میرا کوئی شوہر نہ تھا' میں بیٹی تھی مگر میرا اب نہ کوئی باپ تھا نہ ماں تھی نہ بھائی تھے اور نہ کوئی بہن تھی۔ میں اب ایک ایسی خود رو اکیلی گھاس تھی جو کائی لگی دیوار پر الگ تھلگ اگی ہوئی تھی جس کے بڑھتے رہنے سے کسی کو دلچسپی تھی نہ خشک ہوجانے سے اور نہ اگر کوئی پرندہ اسے اپنے گھونسلے میں لگانے کے لئے اکھاڑے تو کوئی فرق پڑتا۔ میں گھاس کے اسی ننھے سے پودے کی طرح اکیلی اور بے یارو مددگار تھی تو پھر ہفتے کو چھٹی لے کر کس کے پاس جاتی کیا شیاما اور منیزہ کے ساتھ۔ ان کے عزیزوں کے پاس یا ان کے دوستوں کے پاس' مگر کیا ایسا ممکن نہ تھا۔ ایک ایسے ہوسٹل میں جہاں صرف لڑکیاں ہوں' ان کے چیختے چلاتے بین کرتے قہقہے ہوں' ان کی بے رس آوازیں ہوں' الگنی پر' رسیوں پر اور لان کی گھاس پر ان کے خود کے دھوئے ہوئے زیر جامے اور جوتے ہوں جن میں تازہ تازہ سفید پالش کی مہک ہو' اور کمروں میں بالکنی میں اور باتھ روم میں صرف لڑکیوں کی بساندھ ہو تو یوں لگتا ہے جیسے ہواؤں میں مچھلیاں تیر رہی ہوں اور کمروں میں مرغیاں کٹ کٹا رہی ہوں اور چیزیں کمزور اور بھُدار ہوگئی ہوں اور زمین میں دلدل بچھی ہوئی ہو اور کسی مردانہ آواز کسی مرد کے پسینے کی اور بالوں سے بھری کلائیوں کے لئے جان کی بازی لگا دینے کی خواہش سلگنے لگتی ہے۔"

"ہفتے کی ایک شام جانے کیوں شیاما اور منزہ نے مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کیا شیاما اور منیزہ سے میری بے تکلفی بھی نہیں تھی پھر بھی انھوں نے ضد کی کہ میں ان کے ساتھ جاؤں میں بھی لڑکیوں کی دماغ میں گھس کر بیٹھ جانے والی مہک سے ادبھ چکی تھی اسی لئے میں ان کے ساتھ جانے کو تیار ہوگئی۔ ہم تینوں نے مل کر درخواست لکھی اور شیاما دفتر سے منظوری لے آئی اور ہم تینوں ٹریننگ اسکول کے ہوسٹل سے نکل کر شہر میں آگئے۔ اسی شام اچانک میری زندگی میں راجو آگیا یوں جیسے بند پانی میں اونچائی سے آکر گرنے والے پتھر نے دائروں میں دائرے بنادیئے ہوں۔ راجو شیاما کا دوست تھا۔ اس شام جب میں منیزہ اور شیاما ایک صاف ستھرے ہوٹل کے کیبن میں داخل ہوئے تو راجو' میجر راجو اپنے ایک دوست کے ساتھ ہمارا منتظر تھا۔ شیاما اور منیزہ نے مجھے راستے میں بتایا تھا کہ ان کی ملاقات راجو سے ہوسٹل سے ملے ہوئے پلے گراؤنڈ میں ہوئی تھی اور شیاما اور راجو دوست ہوگئے تھے اور پھر راجو نے منیزہ کو اپنے ایک دوست میجر مہتا سے ملادیا تھا اس طرح ہر سنیچر کی شام شیاما اور منیزہ ہوسٹل سے اپنے عزیزوں سے ملنے کے بہانے راجو اور متھا کے پاس پہنچ جاتیں اور دوسرے دن شام کو واپس ہوسٹل پہنچ جاتیں ہر ہفتے ان دونوں کو تقریباً بیس گھنٹے کی رفاقت میسر آجاتی اور اس طرح یہ دونوں ہفتے بھر کی ہوسٹل کی بے کیفی سے فرار حاصل کرلیا کرتیں۔ ہم جب ہوٹل کے کیبن میں ایک دوسرے کے قریب بیٹھ گئے تو میجر راجو نے گفتگو شروع کی اور شیاما سے مرا تعارف کرانے پر اصرار کیا وہ ایک انتہائی شائستہ فوجی افسر ہی نہیں اپنے لانبے قد' چھریرے جسم' ذہانت اور انگریزی بولنے کے خوبصورت انداز کی وجہ سے بے حد پسندیدہ شخصیت کا مالک بھی تھا۔ شیاما بے حد خوش تھی اور بڑی فیاضی سے میری تعریف کئے جارہی تھی منیزہ اور میجر متھا ایک دوسرے سے سر جوڑے کبھی نہ ختم ہونے والی سرگوشیوں میں مصروف ہوگئے تھے معاً شیاما' منیزہ اور متھا اپنے چہروں' آوازوں اور خواہشوں کے ساتھ دور سمندر کے گہرے نیلگوں پانیوں میں ڈوبتے چلے گئے اور راجو نے ڈور کے سرے پر بندھے ہوئے کانٹے میں پروئے گئے چارے کو نگل لیا اور میری انگلیوں پر ڈور کا دباؤ اس شدت سے بڑھا کہ ڈور میری انگلیوں کے گوشت میں پیوست ہوگئی اور ان سے نئے جذبوں کے سرخ گلابوں جیسا مہکتا ہوا خون رسنے لگا۔"

وہ خاموش ہوگئی اور کچھ دیر سوچتی رہی پادری ولکاکس اس کی طرف دیکھتا رہا

"ہمیشہ اسی طرح ہوتا ہے کہ جب دوستی اسٹیل ہونے لگے تو بیتی باتوں اور کیے ہوئے وعدوں کو یاد کرنے اور وفاداریوں کی قسمیں لینے اور آنسو بہانے سے جذبوں کو نئی زندگی نہیں ملتی جب تک بدن ایک دوسرے کے لمس کو قبول کرکے خواہش پیدا کرتے رہیں سب کچھ محفوظ رہتا ہے اور طوفانوں میں بھی چراغ جلتا رہتا ہے ورنہ سرد ہوتے ہوئے جذبے دوبارہ کبھی حرارت نہیں پاتے نئی امنگ اور نئے جذبے سوچ اور جاتے ہیں۔ شیاما نہ سوچ اور کی قوت سے آشنا تھی اور نہ اسے گہرے پانیوں میں پھینکی گئی ڈور دکھائی دے سکتی تھی

جس کے دوسرے سرے پر باندھے ہوئے کانٹے میں پروئے گئے چارے کو راجو نگل چکا تھا۔ اس رات جب میں شیاما اور منیزہ کے ساتھ ہوسٹل واپس آرہی تھی تو مجھے وہ دونوں اور زیادہ پستہ قامت لگ رہی تھیں اور مجھے شیاما پر ترس آرہا تھا جسے کچھ علم نہ تھا کہ وہ بھری بساط میں اپنی بازی ہار چکی ہے اور اس کا بادشاہ موت کی زد پر ہے اور فرزیں پٹ چکا ہے اور میں آنے والے ویک اینڈ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔"

راجو نے کافی کا گھونٹ لیتے لیتے رک کر کہا تھا جب شیاما منیزہ کو کوئی نیا جوک سنا رہی تھی

"اگلے ہفتے آپ آئیں گی"

"اگر شیاما نے مجھ سے کہا تو ضرور آجاؤں گی"

"شیاما اگلے ہفتے نہیں آئے گی"

شیاما کا جوک ختم ہوا تو ہم دونوں قہقہوں میں اس طرح شریک ہو گئے جیسے ہم نے بھی اس کا جوک توجہ سے سنا ہو۔

جب ہم واپس ہونے کے لئے رخصت ہونے لگے تو راجو نے کہا۔

"ہم اگلے ہفتے پریکٹس پر جائیں گے اس لئے نہ آسکیں گے" میجر متھا نے راجو کی طرف دیکھا اور شیاما کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

"پریکٹس" شیاما نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں میں اور میجر متھا دونوں اگلے ہفتے نہ آسکیں گے اس لئے تم لوگ نہ آنا"

شیاما خاموش ہو گئی

ہم نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا

"So it is fixed for the next week- ok"

میں نے سمجھ لیا کہ اگلے ہفتے صرف مجھے آنا ہے

ہوسٹل جاتے ہوئے میرے جسم سے اٹھتی ہوئی خواہش خوشبو سارے میں پھیل رہی تھی لیکن شیاما اور منیزہ اس خوشبو سے بے خبر تھیں۔

ہمیشہ اسی طرح ہوتا ہے کہ دوستیوں کے بند میں شگاف پڑ جاتے ہیں اور منہ زور دھارے پھوٹ نکلتے ہیں اور پانی رسنے لگتا ہے اور بند کو اور بستی کو اور چیزوں کو بہالے جاتا ہے اور جذبے وہ نہیں رہ جاتے اور تنہائیاں مقدر بن جاتی ہیں اور شیاما اپنی بازی کی بساط پر پچھتاووں کے پٹے ہوئے مہرے دیکھ نہ سکی تھی۔ راجو لانبے قد' چھریرے جسم اور خوبصورت گفتگو کا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اور میں ایک جیسی آوازوں' زیر جاموں اور بساندھ سے تھک چکی تھی اور میرے سر پر کھلا آسمان تھا اور پاؤں کے نیچے شفیق و مہربان زمین تھی اور میرے آس پاس اب فرسودہ نصیحت کھیاں نہ تھیں' خائف چہرہ رکاوٹیں نہ تھیں اور ماں زنجیر نہ تھی۔ میں نے پورا ہفتہ آنے والے ویک اینڈ کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنے میں گزارا اس لئے کہ میں میجر راجو کے پاس جنگل میں کھلے اچھوتے ان دیکھے اور تازہ پھول کی خوشبو کی طرح بچھنا چاہتی تھی۔"

اس نے انتھونی ولکاکس کی طرف دیکھا جیسے یہ جاننا چاہتی ہو کہ اس کی باتوں کا اثر فادر انتھونی ولکاکس پر کس طرح ہو رہا تھا۔

"It is so exciting when you get full attention from a tall hand some man"

(وہ کیسا پرجوش لمحہ ہوتا ہے جب کوئی لانبے قد کا خوبصورت نوجوان تمہیں پوری توجہ دے رہا ہو)

میں جوں ہی فوجی چھاؤنی پر بس سے اتری راجو میرے قریب آگیا اور اس نے میرا بیگ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"راستہ کیسا گزرا"

"ہوں' ٹھیک تھا"

"میرا مطلب ہے کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی"

میں مسکرادی۔ ہم دونوں کو گفتگو کرنے کے لئے اس لمحے کوئی موضوع مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ ہم دونوں اس طرح اچانک مل جانے پر حیران تھے۔ یہ لمحہ اس قدر جلد آجائے گا ہمیں یقین نہیں آرہا تھا' یہ سب کچھ اس قدر آسانی سے ممکن ہوسکے گا دل ماننے کو تیار نہ تھا' مگر ہم دونوں بس اسٹاپ پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ یہ میں تھی اور یہ وہ تھا' یہ میں ہوں اور یہ وہ ہے اس کا ہی یقین نہیں آرہا تھا۔ لیکن ہم دونوں وہاں موجود تھے۔ یہ ایک حیران کردینے والی حقیقت تھی۔ محبت کے ابتدائی لمحے کتنے معصوم' انمٹ اور اچھوتے ہوتے ہیں کتنی شدید اجنبیت کے لمحوں میں کتنی گہری اپنائیت ہوتی ہے۔ صرف دو روحیں ہوتی ہیں اور ایک جذبہ ہوتا ہے اور آنے والے لمحوں کا ایک ایکسا ئٹمنٹ خون میں گردش کرنے لگتا ہے اور گوشت میں لطیف ٹیسیں اٹھنے لگتی ہیں اور دل قابو میں نہیں آتا اور سانسیں دھونکنی ہوجاتی ہیں اور تب میں نے راجو کے بیچلر اپارٹمنٹ میں جاتے ہوئے بڑی بے رحمی سے شیاما کے بارے میں سوچنا شروع کیا تاکہ دھیان بٹے اور قدم ادھر ادھر نہ پڑیں۔ وہ اس وقت ہوسٹل کے نیم تاریک کمرے پڑی سوچ رہی ہوگی کہ اگر راجو اس وقت پریکٹس پر نہ ہوتا تو اسی کے ساتھ ہوتا وہ ہوٹل میں چائے پیتے' ہوٹل میں رات کا کھانا کھاتے اور ہوٹل میں تھک کر سوجاتے۔ اور شیاما کے ارد گرد سارے ہوسٹل میں ایک ناآسودہ بھوک اتری ہوئی ہوگی اور باتھ روموں میں خواہشوں کی کیچڑ کی سڑاند پھیل گئی ہوگی اور ساری لڑکیوں کے دماغ میں آڑے ترچھے بگڑی شکل والے جوتے اور پنڈلیوں تک پتلون کے پائنچے گھس کر بیٹھ گئے ہوں گے اور اس کے آگے انھیں کچھ بھائی نہ دیتا ہوگا۔ اس کے بیچلر اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی میرے کانوں میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں لیکن اس نے کرسی کھینچ کر آگے کی اور میرے اور اپنے درمیان کرسی لے کر میرے کاندھوں کو پکڑ کر بڑے پیار اور بڑے احترام سے مجھے کرسی پر بٹھادیا اور اجنبیت کا بت ایک ہی غزنوی ضرب سے پاش پاش کردیا اور میں کمرے کا جائزہ اس طرح لینے لگی جیسے میں ایک طویل سفر کے بعد اپنے گھر لوٹی ہوں اور یہ دیکھ کر خوش ہوں کہ میری عدم موجودگی میں میرے شوہر نے گھر کا وہی قرینہ برقرار رکھا ہے جو میں چھوڑ کر گئی تھی۔ مجھے اپنے اس خیال پر ہنسی بھی آئی اور میں نے راجو کو اس طرح دیکھا جیسے راجو سے میری شادی کو بہت دن گزر چکے ہیں اور راجو نے اپنے آپ کو ایک اچھا شوہر ثابت کردیا ہے۔ جب تم کسی ایسے گھر میں داخل ہوجاؤ جس میں صرف ایک مرد ہو اور وہاں تمھارے علاوہ اور کوئی نہ ہو اور ایک چھت کے نیچے تم اس مرد کے ساتھ ایک بھی رات بسر کرلو تو پھر اس مرد سے تمھارا رشتہ وہی ہوتا ہے جو ایک شوہر اور ایک بیوی کو ہوتا ہے۔ شاید قانون بھی یہی قیاس کرتا ہے۔ لیکن کہاں اس گھر میں' میں ابھی چند لمحے قبل داخل ہوئی تھی اور میں ابھی اسی وقت اس گھر سے نکل کر قانون کے اس قیاس کو باطل قرار دے سکتی تھی۔ راجو میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا' وہ مجھے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے میں اپنے گھر لوٹی ہوں اور گھر کی ہر چیز کو قرینے سے پاکر خوش ہورہی ہوں ہر چیز صاف ستھری اور سلیقے سے ہونے پر اس کی مشکور ہوں' لیکن گلدان میں صرف سفید گلاب کے پھولوں نے مجھے امن' آشتی اور سکون کا احساس دیا تو میں اٹھ کر گلدان کے قریب چلی گئی۔

"سفید قمیض' سفید شلوار' سفید ڈوپٹہ اور سفید پی ٹی شو۔ تمھاری یونی فارم سفید ہے نا" اس نے مجھے سفید گلاب کے پھولوں سے بھرے گلدان کے قریب دیکھ کر سوال کیا۔

"ہاں۔ وہ تو تم دیکھ ہی رہے ہو" میں نے اس وقت بھی ٹریننگ کالج کی سفید یونی فارم پہن رکھی تھی۔

"ہم فوجی لوگ یونی فارم کے بہت زیادہ عادی ہوجاتے ہے"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"جب میں نے اس شام پہلی بار تمہیں پلے گراؤنڈ میں سفید یونی فارم میں دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے میرے آس پاس سفید گلاب مہک رہا ہو"

"تم نے مجھے پلے گراؤنڈ میں کب دیکھا تھا"

"کئی بار"

اس کی شستہ انگریزی اور بہت زیادہ نرم اور دھیما لہجہ میرے پپوٹے بوجھل کئے دے رہا تھا اور میری آنکھیں بند ہوئی جارہی تھیں۔ غزنوی نے اجنبیت کے بت کو مسلسل ضربوں سے پاش پاش کردیا تھا۔

"اردلی چائے لے کر آگیا۔ راجو نے اپنے ہاتھوں سے چائے بنائی اور میں نے دیکھا کہ پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے

پادری دلکاکس خاموش بت بنا بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے کمر سے نیچے تک لٹکے ہوئے لمبے بالوں کو سر جھٹک کر ماتھے پر پھیل جانے دیا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ سفید گلابوں کی مہک اس کے سینے' دماغ اور نتھنوں میں بھر گئی۔

"میں آج اس وقت بھی راجو کے بنگلے میں اس رات پھیل جانے والی خود فراموشی کو فراموش نہیں کر سکتی۔ ہم دونوں نے رات کا کھانا کھایا اور باہر چہل قدمی کرنے کے لئے نکل گئے اس نے مجھے اس قدر امپارٹینس دی کہ میرا سر فخر سے بلند ہوگیا۔ یہ فوجی چھاؤنی تھی چاروں طرف شیشم اور برگد کے اونچے درخت سڑکوں کے کنارے دو رویہ لگے ہوئے تھے اور کنکریٹ کی پتلی پتلی سڑکوں پر ان کے سائے کا گھنا اندھیرا تھا جس میں چونے کی بنائی ہوئی لکیریں چمک رہی تھیں۔ آرمی آفیسرز کے میس اور بنگلوں میں روشنی اور خاموشی تھی سڑکوں پر اکا دکا اردلی سائیکلوں پر یا پیدل آجارہے تھے جو چپ چاپ اچانک نمودار ہوتے اور پھر دوسرے لمحے چپ چاپ اچانک دوسری طرف دور نکل جاتے۔ ہم دیر تک سنسان سڑکوں پر چہل قدمی کرتے رہے۔ وہ کبھی جوک سناتا' کبھی فوجی چھاؤنیوں کے رہن سہن کی مشکلات بیان کرتا' کبھی اپنے بارے میں کچھ بتاتا اور کبھی میرے بارے میں کچھ پوچھ لیتا۔ میں چلتے چلتے تھک گئی تھی مگر سایوں میں اندھیروں میں اور اونچائی پر ٹکے ہوئے کمزور بلب کی مدھم روشنی میں اور درختوں کی خشک پتیوں اور اجنبی خوشبوں میں اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا خواب جیسا لگ رہا تھا' پھر گھنے شیشم کے درخت کے گھنے سائے میں ہم دونوں رک گئے اور ہم ایک دوسرے کے بہت قریب کھڑے ہوگئے پھر اچانک جذبوں کے طوفان نے ہمیں اپنے گرداب میں لے لیا اور آرمی آفیسرز کے بنگلے' بیچلر بیرکس کی روشنیاں' اونچائی پر ٹمٹماتے ہوئے کمزور روشنیوں والے بلب' کنکریٹ کی پتلی سڑکیں سب ہماری نگاہوں سے ایک ایک کرکے اوجھل ہوگئے اور ہم جانے کب تک' ان سب کو اپنی نگاہوں کے احاطے میں نہ لاسکے پھر ہمیں یوں لگا کہ ہم مکمل بے ہوشی سے بیدار ہونے لگے ہیں اور میرے پاؤں کانپنے لگے جیسے پیروں کی جان نکل گئی ہو۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہم بنگلے میں داخل ہوئے اور جوں ہی بنگلے کا دروازہ ہمارے پیچھے بند ہوا باہر کی دنیا ہم پر بند ہوگئی۔

وہ خاموش ہوئی تو اس کی آنکھوں میں گزرے لمحوں کی یادیں جگنوؤں کی طرح چمکنے لگیں جیسے بہت دور کوئی قطار در قطار جھلملاتی شمعیں اٹھائے چلا جارہا ہو۔

"فادر' راجو کے بنگلے میں ایک رات' ایک دن اور پھر ایک رات نہ کوئی سورج نکلا نہ اندھیرا آیا نہ کوئی دھوپ پھیلی نہ سایہ اترا اور ایک دن اور دو راتیں مسلسل جاگتے رہنے کے باوجود صبح جب میں واپس ہوسٹل جانے کے لئے بس اسٹاپ پر کھڑی ہوئی تھی تو مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں بھرپور نیند کے بعد بیدار ہوئی ہوں اور تازہ دم ہوں اور جیسے راجو میری سانسوں اور خون کی گردش میں اتر گیا ہے اس صبح بسوں میں آنے جانے والے اور پیدل چلنے والے اور دوکاندار اور خوانچہ فروش سب ہی مجھے خوش اور مسرور نظر آرہے تھے پیڑوں پر شور مچاتے پرندے اور اچھوتے اور ان سنے گیت سنارہے تھے اور دھوپ نرم اور مہربان لگ رہی تھی اور میں اپنے اندر مکمل'

بھرپور اور آسودہ محسوس کر رہی تھی۔

راجو نے پہلی شام جو کس سنائے تھے اور میرے بالوں، میری آنکھوں، میرے پیروں، میری انگلیوں، انگلیوں پر لگی ہوی کیونکس حتی کہ میرے جسم پر تلوں کی بڑی فیاضی سے سچی تعریف کی تھی اور دوسرے ویک اینڈ کی شام کو اس نے مجھے شاپنگ کرائی تھی اور جب ہم شاپنگ سے لوٹ رہے تھے تو مجھے یقین تھا کہ دیکھنے والے ہمیں نیا شادی شدہ جوڑا سمجھ رہے ہوں گے۔ راجو کا اردلی مجھے بڑی محبت سے دیکھا کرتا لیکن اس کی نگاہوں میں مجھے ہمیشہ ہی سوال نظر آتا کہ میں کون ہوں اور راجو سے میرا کیا رشتہ ہے کیا میں نے راجو سے خفیہ شادی کی ہے یا اب میں اس سے شادی کا ارادہ رکھتی ہوں وہ ایک بوڑھا فوجی تھا اور راجو سے بڑی محبت رکھتا تھا اور اس کا ہر طرح خیال رکھتا تھا یہاں تک کہ موسم کے اعتبار سے لباس میں راجو کی لاپرواہی پر باز پرس بھی کرلیا کرتا تھا مجھے احساس تھا کہ ایسے مخلص اور پرانے ملازم ہر طرح کی غیر معمولی باتوں کو ایک خاص نقطہ نظر سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں اور تیسرے ویک اینڈ پر اس نے مجھے شادی کے لئے پروپوز کیا تھا۔ اس طرح ہر ویک اینڈ پر ہم آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے۔ میں شیاما کو بتائے بغیر راجو کے پاس چلی جاتی اور اکثر سوچتی کہ شیاما کی مسرتوں پر میرے اس کامیاب شب خون کی خبر خواہ ساری دنیا کو ہوجائے مگر خود شیاما ہی کو نہ ہوسکے گی۔ وہ ہفتہ بھر میں جب بھی ملتی مجھ سے راجو کی باتیں کرتی اور اس کے بارے میں اتنی بے سرپا باتیں بتاتی جیسے راجو کو اس سے زیادہ کوئی نہ جانتا ہو اور اگر اس کی شادی راجو سے نہ ہوئی تو راجو مرجائے گا یا پاگل ہوجائے گا اور راجو دنیا بھر میں صرف شیاما ہی سے محبت کرتا ہے اور راجو یہ کہتا ہے اور راجو وہ کہتا ہے اور راجو نے اس ویک اینڈ پر اسے یہ تحفہ دیا تھا اور اس ویک اینڈ پر وہ جوک سنایا تھا جب کہ ان تمام ویک اینڈ زپر وہ ہمیشہ میرے ساتھ تھا۔ کبھی شاپنگ کراتا، کبھی ہم لمبی ڈرائیو پر نکل جاتے کبھی چھاؤنی میں سیر کرتے اور کبھی بیچلر بنگلے کے لان میں کافی پیتے۔ وہ ہر ویک اینڈ پر بس اسٹاپ پر میرا منتظر ملتا۔ پھر ہم شام کی کوئی تفریح کرتے کھانا کھاتے اور بنگلے میں قید ہوجاتے۔ راجو مجھے اپنے گاؤں کے قصے سناتا۔ وہ کہتا ہمارے گاؤں میں خانوں کی حکومت ہوتی ہے اور خوانین کے علاوہ باقی گاؤں والے خان نہیں ہوتے وہ رعایا ہوتے ہیں وہ اپنے آپ کو خان نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ خوانین کے علاوہ نہ کسی کی زمینیں ہوتی ہیں اور نہ حویلیاں اور نہ کسی کے اپنے قبرستان ہوتے ہیں اور نہ پکے مکان اور جن لوگوں کے اپنے قبرستان نہیں ہیں وہ خان نہیں ہیں اور جو خان نہیں ہوتا گاؤں میں اسے کم رتبہ بلکہ حقیر سمجھا جاتا ہے۔ راجو نے بتایا کہ گاؤں میں اس کے خاندان کا بھی کوئی قبرستان نہیں ہے اور خانوں کی حویلیوں میں انھیں جوتے اتار کر جانا ہوتا ہے اور یہاں شہروں میں آکر ہر کم رتبہ اپنے نام کے ساتھ خان لگا سکتا ہے اس سے کوئی باز پرس نہیں ہوسکتی بلکہ بہت سے نوجوانوں نے یہاں آکر نوکریاں کی، تجارت کی، اور کسی نہ کسی طرح جب ڈھیروں سرمایہ جمع کرلیا تو اپنے ناموں کے ساتھ خان کا اضافہ کرلیا بلکہ خان زادہ نام رکھ لیا اگر ان کے گاؤں کے اسکول کا مڈل یا میٹرک کا سرٹیفکیٹ دیکھا جائے تو ان کے ناموں کے ساتھ خان نہیں لگا ہوتا بلکہ زیادہ تر مڈل اور میٹرک کے سرٹیفکیٹ بھی نہیں ہوتے اس لئے کہ اصل خان نہیں چاہئے گا کہ گاؤں والے پڑھ لکھ کر خان بن سکیں اب یہ لوگ خان تو بن گئے مگر اپنے گاؤں کبھی نہ لوٹ سکیں گے اور ترک سکونت کرکے شہروں ہی میں رہیں گے جہاں ان کے ماضی سے کوئی واقف نہ ہوگا۔ مگر میں اپنے گاؤں سے پیار کرتا ہوں میں وہیں رہوں گا اور تم کو بھی وہیں رکھوں گا پھر تم گاؤں میں میری ماں کے ساتھ رہو گی اور میں ایک بڑا سا پنجرہ بنواؤں گا اس پر بہت خوبصورت غلاف ڈالوں گا اور اس میں تمہیں بند رکھوں گا تاکہ تمہیں کوئی خان دیکھ ہی نہ سکے بلکہ میرے علاوہ تمہیں کوئی اور مرد کبھی نہ دیکھے۔ وہ اسی طرح کی بے سرپا باتیں کرتا اور صبح بھرپور شب بیداری کے باوجود پریڈ گراؤنڈ پر چلا جاتا اور جاتے ہوئے بنگلے کو باہر سے قفل کرجاتا اور میں بے خبر سوتی رہتی وہ جب پریڈ سے لوٹتا تو مجھے جگاتا۔ پھر راجو مجھ سے شادی پر اصرار کرنے لگا اس نے مجھے بے انتہا پیار دیا اور اس شدت سے چاہا کہ کبھی کبھی مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوتا۔ وہ مجھ سے کہتا کہ میں اس کی زبان سیکھ لوں اس کے گاؤں میں رہوں اور اس کے بہت سے بچوں کی ماں بن جاؤں لیکن مجھے اس کے گاؤں کی پس ماندہ عورتوں کے بارے میں اس کے تصورات اور گاؤں میں رہنے کے تصور سے

خوف آنے لگا تھا میں اپنی آزادی کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے راجو کے ساتھ ایک سال گزارا تھا وہ خوبصورت تھا' مجھ پر جان چھڑکتا تھا اور مجھ کو ہمیشہ کے لئے اپنانا چاہتا تھا مگر یہ نہ جانتا تھا کہ میں کسی پنجرے میں چاہے وہ سونے ہی کا کیوں نہ ہو قید ہونے کو تیار نہ تھی اور اب ایک سال کے بعد آنے والے دنوں میں راجو کی افادیت کم ہونا شروع ہوجائے گی اور بالآخر ختم ہوجائے گی۔ فادر' راجو میرے بارے میں کچھ نہ جانتا تھا میری آزادی' عزائم' اور تشنگی سے ناواقف تھا ورنہ وہ ایسے احمقانہ خواب کبھی نہ دیکھتا۔"

وہ اس طرح خاموش بیٹھ گئی جیسے تھک گئی ہو

"فادر' راجو مجھے اچھا لگتا تھا مگر اس کا فیملی بیک گراؤنڈ' اس کے رسم و رواج اس کا حد سے زیادہ بڑھا ہوا POSSESSIVE رویہ میرے مزاج کے خلاف تھا میں اب کسی کی ملکیت بننے پر کسی قیمت پر آمادہ نہ ہوسکتی تھی میں چاہتی تھی کہ محبت کے بدلے میں صرف محبت کی توقع کی جائے کتابوں میں لکھی وفاداری مجھے اپیل نہ کرتی تھی کوئی آزادی مکمل آزادی نہ ہوسکتی تھی جب تک اس آزادی کے ساتھ ایسی آزادی کا تصور نہ ہو جیسی ایک مرد کو میسر ہے اور یہ آزادی مرد اور عورت دونوں کے لئے مساوی نہ ہو۔ راجو خود تو مستقل انگریزی بولتا تھا اور چاہتا تھا کہ میں اس کی مادری زبان سیکھ لوں۔ کیوں آخر کیوں' زبانوں کا یہ تعصب کیوں' زبان تو اظہار خیال کے لئے ہے' یہ تو ایک ضرورت ہے اور ہر آدمی مجبور ہے کہ جو زبان اس کے اردگرد پیدائش کے وقت سے بولی جاتی ہے سب سے پہلے اسی زبان میں اپنی ضرورت کا اظہار کرتا ہے اس میں اس بچے کی پسند و ناپسند کو کوئی دخل ہی نہیں ہوتا۔ اور بچپن سے جن اشیاء سے مستقل رشتہ ہے وہ عزیز ہوجاتی ہیں ہر شخص کو ان سے پیار کا حق ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تم اپنی پسند دوسروں پر جبراً تھوپ دینے کی کوشش کرو اس کا یہ بھی مطلب ہرگز نہیں کہ دوسروں کی ان اشیا سے جس سے وہ بچپن سے پیار کرتا رہے تم نفرت کرنے لگو۔ محبت کرنے والے محبوب کی زبان کے بارے میں پہلے کوئی معلومات جمع نہیں کرتے محبت کی تو کوئی زبان نہیں ہوتی وہ آنکھوں سے چلتی ہے اور چپ چاپ دل میں اتر جاتی ہے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ میجر راجو میں تمھیں ہمیشہ یاد رکھوں گی اس لئے کہ تم نے میری تنہائیاں بانٹیں' مجھے امپارٹینس دی' مجھے حسرتیں دیں لیکن میں تمھارے لئے اپنی آزادی کی قربانی نہ دے سکتی تھی اور تمھارے ساتھ اپنا سفر وہاں تک جاری نہ رکھ سکتی تھی جہاں ہم ایک دوسرے کی دوسر دوسراتھ سے اکتا جائیں۔ میں تمھاری POSSESSIVE رویئے سے ڈر گئی تم شاید عورتوں کو اپنی ملکیت سمجھتے ہو تو سنو میں ملکیت بن جانے والی عورت ہرگز نہیں ہوں۔ جب بھی عورت مرد کی اسیری قبول کرلیتی ہے تو مرد اس سے اکتا جاتا ہے۔ اور نئی منزل کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ فادر آپ نے کبھی کوئی مرد ایسا دیکھا ہے جو ایک عورت پر قانع رہنا جانتا ہو معاشی مجبوری نہ ہو تو مرد کبھی نہیں رکتا اور سماجی مجبوری نہ ہو تو وہ اپنی فتوحات علی الاعلان بیان کرتا ہے اور خوش ہوتا ہے اور پچھلی فتوحات فراموش کردیتا ہے سو فادر میں بھی اپنی پچھلی فتوحات فراموش کردیتی ہوں اور آگے قدم بڑھا دیتی ہوں میجر راجو تمھیں اپنے گھر' اپنے آنگن' اپنے بستر اور اپنے بچوں کے لئے روبوٹ کی ضرورت تھی اور میں روبورٹ نہ تھی میں بچ مچ اور گوشت پوست کی زندہ عورت تھی اس لئے تم سے شادی پر رضا مند نہ ہوسکی' میں تمھاری مادری زبان کیوں سیکھتی یا تمھارے خان کے گھر ننگے پاؤں کیوں جاتی تم تو میرے کاندھوں پر اگے ہوئے ان سانپوں کا بھی اورک نہ کرسکے جن کے مطالبے مجھے پورے کرنے ہوتے ہیں۔

میری ٹریننگ ختم ہوگئی تو مجھے ہوسٹل چھوڑنا پڑا۔ وہ ہوسٹل جہاں شیاما میجر راجو کی بیوفائیوں پر آنسو بہایا کرتی تھی۔ ویک اینڈس پر ہوٹل میں جاکر اس کا انتظار کرتی تھی اور آنکھوں میں آنسو لئے لوٹ آیا کرتی تھی اور اپنی خطاؤں کا سراغ لگانے کی کوشش کرتی تھی جو اس سے کبھی سرزرد نہ ہوئی تھیں مگر اس کے خیال میں راجو اسی کی خطاؤں کی وجہ سے اسے چھوڑ گیا تھا۔ بے چاری شیاما۔ ہوسٹل کے مین گیٹ سے باہر نکلتے ہی شیاما اور منیزہ اور ہوسٹل میں پھیلی ہوئی ناآسودگی میرے ذہن سے نکل گئی اب میں اپنی نئی زندگی کا آغاز پورے اعتماد سے کرسکتی تھی اس لئے کہ ٹریننگ اسکول کا سرٹیفکیٹ بھی اب میرا معاون تھا۔ مجھے اب اپنے باپ کے گھر لوٹ جانے کی ضرورت

نہ تھی جو میری وجہ سے اپنے عزیزوں اور رشتے داروں کے طعنے سننے پر مجبور ہوگا اور اس کے دوست اور اس کے عزیز اس سے ہمدردی کے بہانے مجھے گالیاں دیتے ہوں گے اور میرے باپ کی دل آزاری کرتے ہوں گے اور باری باری سارے عزیز اور سارے دوست میرے باپ کے زخموں کو کھول کر دیکھتے ہوں گے اور ان پر ہمدردیوں کی نمک پاشی کرکے لوٹ جاتے ہوں گے اور میرا باپ ان عزیزوں کی مدارات کرتا ہوگا جنھوں نے سوائے طعنوں کے کبھی کسی کو کچھ نہ دیا ہوگا لیکن کوئی سماج کی اس ان دیکھی ڈور کو توڑ نہیں سکتا' میری ماں اس لئے سینے پر ہاتھ مار مار کر مجھے کوس رہی ہوگی کہ اب اس کی دوسری بیٹیوں کے رشتے نہ آئیں گے اور بھائی اپنی اپنی محبوباؤں کی دلجوئی کرتے ہوئے اپنے دوستوں سے اس لئے نظریں چراتے ہوں گے کہ کہیں ان میں سے کوئی میرے بارے میں سارے حقائق جانتے ہوئے کچھ دریافت نہ کرنے لگے اور میری بہنیں اپنے اپنے دوستوں کے ساتھ شادیاں کرلینے کے منصوبے بنارہی ہوں گی۔ ٹریننگ اسکول جہاں میں نے گھر سے نکل کر پناہ لی تھی ان برسوں میں میری بڑی محفوظ پناہ گاہ تھی۔ اسکول سے نکلتے ہوئے محسوس ہوا کہ اب میں آزاد ہوں لیکن مجھے یہ بھی علم ہوا کہ میری کوئی محفوظ پناہ گاہ نہیں ہے اور میں تنہا اور غیر محفوظ ہوں۔ اس لمحے مجھ پر بھی یہ انکشاف ہوا کہ ماں کا گھر ایسی جگہ ہے جہاں بیٹی آڑے وقتوں میں پناہ لے سکتی ہے۔ جہاں باپ کا سایہ میسر ہوجاتا ہے جہاں بھائی اور بہنیں ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹ سکتے ہیں لیکن میں نے وہ گھر تو کب کا کھودیا تھا اب یہاں سے کوئی بھی راستہ میرے گھر کو نہ جاتا تھا میں تو بچپن ہی سے دوسروں کے گھروں کو اپنے گھر پر ترجیح دیتی رہی تھی۔ مجھے دوسروں کے ماں باپ ہمیشہ اپنے ماں باپ سے زیادہ شفیق لگے۔ میں تو بچپن ہی سے ان کو برا سمجھنے اور کہنے میں خوشی محسوس کرتی تھی جو مجھ سے پیار کرتے تھے اب سوچتی ہوں کہ تو مجھے یقین آجاتا ہے کہ شاید میں اپنوں کی دشمن اور غیروں کی دوست تھی اور مجھے ہمیشہ اپنوں کا دشمنی اور غیروں کا دوست بن جانے میں امپارٹینس ملتی تھی۔ فادر شاید میں امپارٹینس کی چاہ میں بہت زیادہ دور نکل جایا کرتی تھی' اور اسی لئے میں نے ہمیشہ امروز کو اس کے منہ پر ذلیل کیا اور اس کے منہ ہی پر اس کے دشمنوں کی تعریف کی جن سے مجھے امپارٹنس ملا کرتی تھی۔

ٹریننگ اسکول سے باہر نکل کر میں نے اپنی ایک سہیلی کے گھر جانے کا فیصلہ کیا جس کی ماں مجھے بہت زیادہ اہمیت دیا کرتی تھی اور وہ اسی شہر میں رہتی تھی۔ سردار نے مجھ سے میرا پہلا گھر چھینا تھا اور اب اسی گھر میں مجھے اس طرح محسوس ہوا تھا جیسے میں' میری ماں' میرا باپ اور میرے بھائی' بہن اسی گھر میں رہتے ہوئے ایک ٹرین کے کمپارٹمنٹ میں سفر کرنے والے مسافر ہیں جو اپنے اپنے اسٹیشنوں کے منتظر ہیں اور ان میں سے ہر شخص اپنا اسٹیشن آنے سے قبل اپنا اسباب کمپارٹمنٹ کے دروازے کے قریب لگالینے کا خواہش مند ہے اور اسٹیشن آجانے پر چپ چاپ اترجانا چاہتا ہے۔ پھر شام کی آنکھوں کی بہرہوتیوں نے مجھ سے وہ گھر چھینا تھا جو مجھے سردار نے دیا تھا اور ٹریننگ اسکول کے گیٹ سے نکل کر میں نے سوچا کہ میرا دنیا بھر میں اب کوئی گھر نہیں ہے۔"

"فادر تم سنو گے تو حیران رہ جاؤ گے" اس نے اس قدر یقین سے کہا کہ فادر انتھونی ولکاکس نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

"میری سہیلی اور اس کی ماں نے مجھے اپنے گھر میں جب تک جی چاہے ٹھہرنے کی دعوت دی اور میں نے رہائش کا مسئلہ حل ہوجانے پر سکون کا سانس لیا۔ لیکن جو ان لڑکی کے مسائل میں صرف رہائش' لباس اور خوراک شامل نہیں ہیں۔ میری کہانی میرے تمام جاننے والوں تک مجھ سے آگے آگے چل کر پہنچ جاتی تھی۔ اپنے بچے کو جس طرح میں نے چھوڑ کر اپنی آزادی حاصل کی تھی اس پر سب ہی میرے حوصلے کی تعریف صرف میرے منہ پر کرتے تھے' پیٹ پیچھے مجھے وہی لوگ ظالم قرار دیتے تھے۔ میری سہیلی کا بھائی راضی فوٹوگرافی کا شوقین تھا اس نے پہلے میری تصویریں میری سہیلی کے ساتھ اتاریں پھر میری تنہا تصویروں پر اصرار کرنے لگا اور مجھ پر ضرورت سے زیادہ مہربان ہوگیا۔ میری سہیلی کے باپ نے ابتدا میں اس خیال سے میری دلجوئی کی کہ میں مصیبت زدہ ہوں پھر اس کی مہربانیوں میں بھی مجھے غرض شامل ہوتی محسوس ہوئی اور مجھے پہلی بار علم ہوا کہ عشق کے لئے عمروں کا فرق بے معنی ہے یا شاید سردار' شام اور راجو نے میرے چہرے پر لکھ دیا تھا کہ میں تراہے پر بیٹھی ہوئی فاحشہ ہوں یا شاید میری سہیلی کے باپ کو یقین تھا کہ میں سڑک کے کنارے اگے

ہوئے درخت کی شاخ پر جھولتا ہوا ایسا پکا ہوا پھل ہوں جو ہوا کے ایک معمولی سے جھونکے سے ٹوٹ کر اس کی جھولی میں کسی وقت بھی گر سکتا ہے۔ یا وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس کے ہاتھ میں عصا' انگلی میں انگوٹھی اور کمر میں ایسی ڈوری بندھی ہوئی ہے اور اس کے گلے میں بکری کا ایک فالتو بچہ ہے لیکن شاید وہ یہ نہ جانتا تھا کہ اس کے بیٹے راضی نے گہرے نیلے پانیوں میں پھینکی گئی ڈور کے دوسرے سرے پر بندھے ہوئے کانٹے میں پروئے گئے چارے کو نگل لیا تھا' اور ڈور کا دباؤ میری انگلیوں پر سخت ہوتا جارہا تھا اور راضی کے کمرے کے شٹر میں میری ہزاروں تصویریں بند تھیں اور میں خود اکثر راتوں کو اس کے بند کمرے میں اپنے آپ کو محفوظ اور مطمئن محسوس کرتی تھی۔ راضی کا باپ جو کچھ مجھ سے چھین کر لے سکتا تھا یا چرا سکتا تھا یا مانگ سکتا تھا میں نے راضی کو پوری چاہت کے ساتھ دے دیا تھا اور راضی میری سنگینیوں کا مفتوح یہ بھی جانتا تھا کہ میں اس ایک ہی گھر میں دو مردوں کی زد میں ہوں اور اس کا باپ ہر تراہے پر بکری کا بچہ لئے میرا منتظر تھا۔ ایک دوپہر راضی کے باپ نے جب گھر میں میرے اور اس کے علاوہ کوئی اور نہ تھا مجھے سیتیں کرنے کے لئے برآمدے میں روک لیا۔

"تم کو اس گھر میں کوئی تکلیف تو نہیں"

"نہیں"

نوکری کی کوشش کی"

"ہاں درخواستیں بھیج دی ہیں"

"تم احمق ہو' تمھیں اس دور کی پیچیدگیوں کا علم ہی نہیں ہے۔ یہاں نوکری نہ سرٹیفکیٹ پر ملتی ہے اور نہ لیاقت پر۔ درخواستیں بھیج دینے سے صرف انٹرویو لیٹر ملتا ہے یا کبھی کبھی وہ بھی نہیں ملتا۔ درخواست پر منسٹر سے سفارش لکھائی ہوگی اور منسٹر سفارش جب لکھے گا جب تم اس کی سیاسی پارٹی میں شامل ہوجاؤ یا اس کی پارٹی کے کسی ورکر کو ایک لاکھ روپیہ رشوت دو۔ اب کوئی کسی کو نہیں پہچانتا۔ رشوت لینے والوں سے زیادہ رشوت دینے والے آگاہ ہوچکے ہیں اگر ان سے کسی کام کی رشوت کام کرنے والا طلب نہ کرے تو وہ خود رشوت دینے کا وعدہ کرتے ہیں اور پیش کرتے ہیں بلکہ مجبور کرتے ہیں۔ تم اگر درخواستیں بھیجتی رہیں تو تمھیں کبھی نوکری نہ ملے گی۔ تم خوبصورت ہو جوان ہو خود لوگوں سے ملو قدرت کی فیاضی سے دی ہوئی اس دولت کو استعمال کرو"

"انکل آپ کیا چاہتے ہیں کہ میں لوگوں کے پاس جاؤں"

"تو تمھارا کیا خیال ہے کہ لوگ تمھارے پاس نوکری دینے خود آئیں گے"

"لیکن میرے پاس ان کو دینے کے لئے کیا ہے۔ میں روپے رشوت دینے کے لئے کہاں سے لاؤں گی"

"رشوت میں صرف روپیہ نہیں خدمت بھی شامل ہے"

"مگر میں ان کی کیا خدمت کرسکتی ہوں"

"جو خدمت تم راضی کی بغیر اس سے کچھ حاصل کئے کررہی ہو"

چھن سے جیسے میرے ہاتھ سے گر کر کچھ ٹوٹ گیا ہو۔

"مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ تمھیں شرمندہ یا خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مگر راضی تمھاری تصویریں کھینچنے کے علاوہ تمیں کیا دے سکتا ہے جب کہ اسی خدمت کے معاوضے میں تم جو نوکری چاہو حاصل کرسکتی ہو۔ میں کون ہوتا ہوں جو تمھاری آزادی میں رخنہ ڈالوں۔ تمھیں جو کچھ پسند ہے وہ کرو لیکن یاد رکھو کہ تمھیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لئے جن سہاروں کی ضرورت ہے وہ تمھیں حاصل کرنا ہوں گے۔"

میں چپ چاپ اس کا منہ دیکھتی رہی۔

"اور اگر تم خدمت کی رشوت دینے سے قاصر ہو۔ یا تم پسند نہیں کرتیں تو میں تمھیں ایک لاکھ روپیہ یا کم زیادہ جو بھی نوکری حاصل کرنے کے لئے دینا ہوگا میں تمھیں دے دوں گا۔"

"آپ مجھے ایک لاکھ روپیہ دیں گے۔ مگر میں ادا کیسے کروں گی"

"میں نے قرض دینے کے لئے کب کہا ہے"

"پھر"

"یہ روپیہ میں تمھیں تمھارے مہر میں نقد دوں گا"

میں تھوڑی دیر تک سکتے میں رہی

"مگر میں شادی اب ہرگز نہ کروں گی خواہ کچھ ہوجائے"

"چلو شادی نہ کرو۔ پھر بھی میں تمھیں جب بھی نوکری حاصل کرنے کے لئے رشوت دینے کی ضرورت پڑی روپیہ دے دوں گا۔ تم اطمینان رکھو"

"آپ وعدہ کرتے ہیں"

"ہاں میں وعدہ کرتا ہوں"

اور پھر میں ایسی صورت حال میں اچانک آگئی جس میں آکر کوئی بھی اپنے آپ کو حق بجانب نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن جب حالات ایسے ہوں کہ ان سے مفر ممکن نہ ہو تو پھر آنسو بہانے اور انھیں حالات میں رہنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ انھیں نہ صرف دل سے قبول کرلینا چاہئے۔ بلکہ ان میں کسی نہ کسی طرح تجربے کا' مسرت کا یا سیکھنے کا کوئی نہ کوئی پہلو تلاش کرلینا چاہئے۔ مجھے یقین تھا کہ میں اپنی سہیلی کے باپ کی مرضی کے خلاف ایک دن بھی اس گھر میں نہ رہ سکتی تھی اپنی سہیلی یا اس کی ماں سے بھی کسی قسم کا مشورہ یا مدد حاصل نہ کرسکتی تھی اور اس گھر سی نکل کر سردست کہیں اور جا بھی نہ سکتی تھی۔ پھر اس گھر میں راضی تھا جسے میں پسند کرتی تھی۔ راضی سے میرے تعلقات کی نوعیت کا علم راضی کے باپ کو تھا چنانچہ میں راضی کے شہر میں بھی بندری اور راضی کے باپ سے عصا' خاتم اور ڈوری بھی قبول کرلی اور یوں مجھے یہودہ اور شیلہ دونوں کو تحفظ حاصل ہوگیا اور میری منجنیقوں کا مفتوح راضی اپنے کمرے کی دیواروں پر میری بڑی بڑی تصویریں سجاتا رہتا اور یہ تجربہ میرے لئے اتنا ایکسا ئٹنگ تھا کہ ہر لمحے یوں محسوس کرتی جیسے خواب دیکھ رہی ہوں میں جس لمحے ایک کے ساتھ ہوتی تو دوسرے کی لاعلمی میرے لئے اس لمحے سے زیادہ ایکسائیٹنگ ہوتی اور میرا جی چاہتا کہ میں اس گھر کی کہانی کسی کو سناکر اپنی خوشیوں میں شریک کردوں مگر میں کس کو سناتی میں چاہتی تھی کہ میں کسی راہ گیر کو راستہ چلتے ہوئے روک لوں اور بدن کی تسکین میں عمروں کے تفاوت اور رشتوں کی بے معنویت کا خوبصورت راز اس پر کھول دوں اور وہ راستہ بھٹک کر کسی اور طرف نکل جائے اور میرے اس نئے تجربے کا کبھی منحرف نہ ہونے والا گواہ بن جائے۔

سورج غروب ہوئے اب دیر ہوچکی تھی باہر ابھی اسٹریٹ لیمپ روشن نہ ہوئے تھے۔ ٹھیلوں پر بند کباب فروخت کرنے والوں نے گیس کے چولھوں میں آگ لگادی تھی۔ ابھی ابھی کوئی ٹرین گزری تھی جس کے پہیوں کی مانوس آواز ابھی تک ڈوبتی سنائی دے رہی تھی۔ کمرے میں اکلوتے بلب میں اب زیادہ روشنی ہوگئی تھی۔

"فادر اگر آپ تھک گئے ہوں تو"

"نا بالکل نہیں" اس نے ہاتھ اٹھاکر یقین دلاتے ہوئے کہا "تم اپنی بات جاری رکھو میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔ میں نے تمھیں پہلے ہی بتادیا ہے کہ میں تمھارا اعتراف فادر کی حیثیت سے نہیں ایک دوست کی طرح سن رہا ہوں۔ کیا تم سمجھ گئیں"

اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

"بعض لوگ کتنے اچھے ہوتے ہیں چپ چاپ نہ جانے کہاں سے نمودار ہوتے ہیں تمہاری مدد کرتے ہیں تمہارے غم بانٹتے ہیں' تمہیں خوشیاں دیتے ہیں تمہارے حوصلے بڑھاتے ہیں اور چپ چاپ کہیں چلے جاتے ہیں راضی بھی میری زندگی میں یوں آگیا جیسے بے موسم بادل کا ایک ٹکڑا آئے اور برس کر نکل جائے اور تمہارے اپنے موسموں کے مزاج اس طرح بدل جائیں کہ ہر لمحہ رم جھم پھوار برستی رہے۔ وہ خاموش پرسکون اور گھر والوں سے الگ تھلگ رہتا تھا لیکن میرے لئے ہمیشہ وہ گھر کے ان دروں اور راستوں میں منتظر رہتا جہاں سے چند لمحوں بعد میرے گزرنے کا امکان ہو۔ میں غروب آفتاب کے بعد گھر کی سیڑھیوں' تاریک کمروں اور تنہا گوشوں میں جانے سے قبل سوچتی کہ راضی ضرور چھپا کھڑا ہوگا اور میرا اندازہ کبھی غلط نہ ہوتا وہ کسی نہ کسی گوشے سے نکل کر مجھے روک لیتا۔ میری زندگی میں بے موسم آنے والا بادل کا یہ ٹکڑا دیوار پر ایسے نقش نگار چھوڑ گیا ہے جنہیں میں اب بھی تنہائیوں میں کہانی کی طرح دہراتی ہوں۔ اسی طرح بعض شہر ایسے خلیق ہوتے ہیں کہ تم جس حال میں بھی ان سے ملو وہ تمہیں اپنا لیتے ہیں تمہاری سواری کی پہیوں کے' تمہارے قدموں کے اور تمہاری عیبوں کے سارے نشان چھپالیتے ہیں اور کسی کو ان کا سراغ کبھی نہیں دیتے تمہیں موسموں کی شدت سے محفوظ رکھنے کے لئے چھت مہیا کرتے ہیں اور تمہیں نہ بھوکا سونے دیتے ہیں نہ تنہا ہونے دیتے ہیں تمہیں خطروں میں ڈال دیتے ہیں اور پھر ان خطروں کا مقابلہ کرنے کی جرائت دیتے ہیں ایسے دوست شہروں اور ان ماں گلیوں کی دھول چہرے کا غازہ بن کر ہر اندھیرے میں چمکتی ہے اور راستہ دکھاتی ہے وہ شہر ایسا ہی شہر تھا اور وہ گلیاں ایسی ہی گلیاں تھیں جہاں مجھے نہ کرنسی نوٹوں کی رشوت دینی پڑی اور نہ جسمانی خدمت کی اور مجھے نوکری مل گئی اور میرے گرد اسٹاف کوارٹر کی دیواریں محافظ دستوں کی طرح کھڑی ہوگئیں اور میرے سر پر اسٹاف کوارٹر کی چھت ایک شفیق سائبان بن گئی اور رازی کا باپ جو مجھ سے رشوت کے لئے روپے دینے کا وعدہ کرکے حسرتیں سمیٹتا رہا میرے لئے کچھ نہ کرسکا اور مجھے صرف ایک درخواست کے عوض نوکری مل گئی اور راضی میری روانگی کے وقت دور دالان کی دیوار سے لگا روتا رہا اور میری سہیلی اور اس کی ماں مجھے دعاؤں کے ساتھ رخصت کرنے دروازے پر آکر کھڑی ہوگئیں۔ تانگے پر بیٹھ کر اسٹیشن کی طرف جاتے ہوئے مجھے منیزہ وقت کے دائروں میں سمٹ کر اب سب سے چھوٹے دائرے میں تحلیل ہوتی دکھائی دی' شیاما ایسی کہانی بن گئی جس کا سرا اور آخر دونوں تازہ وارداتوں میں گم ہوچکے تھے اور مجھے بہت دنوں کے بعد کسی نے بتایا تھا کہ میرے جانے کے بعد میجر راجو اور میجر متھا آفیسرز میں بیٹھ کر شراب کے نشے میں بحثیں کرتے اور ایک دوسرے کو گالیاں دیتے اور میں شراب کے پہلے پیگ کے ساتھ ہی بحث کا موضوع بن جاتی اور راجو مجھے بے وفا کہتا اور میجر متھا منیزہ کو اور پھر دونوں رونے لگتے اور افسرز میں موجود افسر ان کے گرد جمع ہوجاتے اور آخری پیگ تک میں کسی نہ کسی طرح گفتگو کا موضوع بنی رہتی۔ حتیٰ کہ میجر راجو اور میجر متھا دونوں رات بھیگ جانے کے بعد آنسو بہاتے اپنے اپنے بنگلوں کو جاکر بستروں پر ڈھیر ہوجاتے اور ان کے اردلی ان کے جوتے اور موزے اتار کر ان پر کمبل ڈال دیتے۔"

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور لڑکا کافی کی دو پیالیاں ہمارے سامنے رکھ کر الٹے پاؤں لوٹ گیا کافی کی خوشبو سے کمرہ مہکنے لگا اور مجھے فرحت محسوس ہوئی۔

"میرے قدموں اور عیبوں کے نشان چھپالینے والا یہ ایک چھوٹا سا شہر تھا اس شہر کی روشنیوں پر اتنے بڑے رنگ برنگے گلاب کھلتے تھے کہ ذہن اور جسم دونوں خوشبو سے بھر جاتے تھے اور موسم بہار اس طرح آتا تھا کہ دل امنگوں سے لبریز اور کچھ ہی دنوں میں سارا کیمپس ہمیشہ گلابوں' گیندوں اور رات کی رانی سے مہکتا رہتا تھا اور کچھ ہی دنوں میں کیمپس میں گفتگو کا مرکز بن گئی۔ اسٹاف روم میں میرے تذکرے روزانہ تازہ خبروں کی طرح بتائے اور سنے جاتے۔ میں اپنا ماضی بھول جانے کی کوشش میں جتی رہتی۔ مجھے مستقبل کے لئے اپنے راستے بناتے تھے یہاں میں اپنی زندگی کی نئے سرے سے ابتدا کرنا چاہتی تھی۔ راجو اب میرے لئے قصہ پارینہ بن چکا تھا۔ یاور لوگ یہ نہیں سمجھ پاتے کہ جب ان کی ضرورت ختم ہوجاتی ہے تو وہ گمشدہ ماضی بن جاتے ہیں۔ ہوسٹل میں میرے ارد گرد صرف لڑکیاں

ان کی محرومیاں اور ان کے بار بار کے دیکھے ہوئے لباس تھے یا کلاس روم میں پردے کا اس طرف گھسے گھسائے ٹیڑھی میڑھی ایڑیوں والے جوتے اور پنڈلیوں پر منڈھے ہوئے کالے نیلے سفید اور بے رنگ پتلون تھے اور کچھ نہ تھا اس وقت راجو میری ضرورت تھا میں گئی میں نے فتح کیا اور میں نے قدم آگے بڑھادیئے راجو اب اپنی افادیت کھوچکا تھا وہ ایک اچھا دوست تھا اور وہ میرے لئے ہمیشہ ایک اچھا دوست ہی رہے گا محبتیں اور وفاداریاں گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ اپنا مفہوم بدلتی رہتی ہیں اس لئے میں نے اسے فراموش کردیا اسے بھی کسی نے بتاہی دیا ہوگا کہ شراب پی کر شراب کی میز پر کسی کی یاد میں آنسو بہانا ایک احمقانہ فعل ہے۔ میجر راجو تم مجھے Posses کرنا چاہتے تھے۔ تم چاہتے تھے کہ میں تمہاری زبان سیکھ کر گاؤں میں تمہاری ماں کے ساتھ رہوں اور تمہاری ڈھیرسے بچوں کی ماں بن کر ان کے جنتی بدلتی رہوں لیکن میجرا راجو تم ہار گئے اور اب تمہارے سینے سے تمہارے تمغے اتر گئے ہیں تم اپنے اندر اس سچائی کو تسلیم کرلینے کی جرائت پیدا کرلو سب پھر اسی طرح ہوجائے گا جیسے میرے آجانے سے پہلے تھا۔ کاش تم علی کو گمنام خطوط لکھ کر مجھے آوارہ اور بدچلن ثابت کرکے میرا امیج خراب کرنے کی کوشش نہ کرتے اور بیتے دنوں کی خوشیاں یاد رکھ سکتے۔"

"یہ علی کون ہے اور یہ گمنام خطوط" فادر انتھونی ولکاکس نے سوال کیا۔

"فادر میں اب علی ہی کی باتیں کروں گی میں نے اس سے شادی کرلی تو میجر راجو نے اسے گمنام خطوط لکھے۔ وہ اپنی شکست تسلیم کرلینے پر اپنے آپ کو آمادہ نہ کرسکا۔ اس نے مجھ سے شادی کرنے کی خواہش کا اظہار ضرور کیا تھا لیکن میں نے اس سے اس طرح کا کوئی وعدہ کبھی نہ کیا تھا ایک تو اس لئے کہ میں اس وقت تک شادی کرنے کے لئے تیار نہ تھی دوسرے اس لئے بھی کہ وہ جس طرح مجھ سے شادی کرکے مجھے اپنے گاؤں میں جہاں پس ماندگی کے علاوہ کچھ نہ تھا رکھنا چاہتا تھا وہ میرے لئے ممکن نہ تھا اور تیسرے اس لئے بھی کہ وہ اتنا Possessive تھا کہ مجھے اس سے وحشت ہونے لگی تھی۔ پھر بھی اگر وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ میں اس سے شادی کرلوں گی تو یہ اس کی خوش فہمی تھی۔ مرد آخر یہ کیوں سمجھنے لگتے ہیں کہ اگر وہ کسی لڑکی سے شادی کی خواہش کا اظہار کریں گے تو وہ ان کی اس خواہش پر سرمٹے گی۔ کیا لڑکیوں کو انتخاب کا کوئی حق نہیں ہے۔ فادر نے اثبات میں سرہلادیا اور خاموش رہا

"فادر راجو کو عملاً میں نے اپنی زندگی سے خارج کردیا تھا اس کا کردار میری کہانی سے موقوف ہوچکا تھامیری کہانی اب نئے موڑ پر آپہنچی تھی جہاں میجر راجو کی کوئی ضرورت نہ تھی مگر وہ میرے خواب دیکھے جارہا تھا۔ علی ایک سادہ اور بے پرواہ انسان تھا اور شدت سے احساس کمتری کا شکار تھا اسے صرف زندگی کی تمام آسائشوں کی خواہش تھی وہ زندگی کی چیرہ دستیوں کے مقابل کبھی نہ آیا تھا اور نہ زندگی کی تہوں سے واقف تھا۔ وہ اوسط درجے کے جاگیردارانہ نظام کا پروردہ تھا اس نے پرندوں کا شکار کیا تھا اور چوسراور شطرنج کھیلی تھی اور قصباتی زندگی کا عادی تھا۔ وہ گاؤں سے زوال پذیر جاگیرداروں کی شکستہ حویلیوں میں کام کرنے کے لئے آنے والی عورتوں سے فحش مذاق کیا کرتا تھا اور انھیں تھوڑے سے پیسوں کے عوض اپنی ہوس کا نشانہ بناکر مطمئن رہتا تھا اور اب جب کہ وہ ایک مشہور کمپنی میں افسر تھا اپنی عادتوں اور خواہشوں میں ذرا نہ بدلا تھا۔ اسے اب گاؤں سے آنے والی عورتیں میسر نہ تھیں تو وہ سڑک پر بھیک مانگنے والی جوان عورتوں میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ وہ دفتر سے نکل کر فٹ پاتھ کے ساتھ کار پارک کرکے مشروب پیتے ہوئے ان عورتوں کا انتظار کرتا اور جب وہ اس سے دست سوال دراز کرتیں تو انھیں اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دیتا جو عموماً قبول ہوجاتی پھر ایسے کسی دوست کے فلیٹ پر جاکر شراب نوشی کرتا اور رات کو گھر آکر سادہ لوح ماں سے سر درد کا بہانا کرکے اپنے کمرے میں جاکر سوجاتا۔ میں نے یہ جان لیا تھا کہ علی جیسا شریک حیات میرے ماضی کو جان کر بھی مجھے قبول کرے گا اور کبھی ماضی کے بارے میں باز پرس نہ کرے گا وہ اپنی کمزوریوں کے باعث میرے عیبوں کو قبول کرے گا اور ان کی پردہ پوشی بھی کرے گا اور شاید میرے سحر سے برسوں نہ نکل سکے گا اور مجھے یقین تھا کہ وہ میرے دیئے ہوئے آدھے سچ پر ہمیشہ مطمین رہے گا۔ اس کی ماں نے بتایا تھا کہ وہ پہلے کئی لڑکیوں سے شادی پر رضا مند ہوکر اچانک منحرف ہوگیا تھا اور اب ماں اس کی شادی سے مایوس ہوچکی تھی وہ صرف اپنے اکلوتے بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنے کی خواہش مند تھی اسے

اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ اس کی ہونے والی بہو کون اور کیسی ہوگی۔
علی کی ماں نے مجھے کیمپس میں دیکھا اور مجھ پر ریجھ گئیں ان کا خیال تھا کہ علی کے لئے ایسی بیوی کی ضرورت ہے جو اسے سنبھال سکے اسے حوصلہ دے سکے اسے مشورہ دے سکے اور اسے ایسی محبت دے سکے جس میں ممتا کا احساس بھی شامل ہو اور انھیں میرے اندر وہ تمام خوبیاں نظر آگئیں۔ انھوں نے مجھے بتادیا تھا کہ جن لڑکیوں سے پہلے علی کا رشتہ طے ہوا تھا وہ ان لڑکیوں کی خود اعتمادی نے اسے متزلزل کردیا تھا وہ اب نچلے درجے کی کام کرنے والی لڑکیوں اور بھیک مانگنے والی عورتوں کا مرد رہ گیا تھا اسے پر اعتماد تعلیم یافتہ اور صاف ستھری عورتوں میں اب کوئی کشش محسوس نہ ہوتی تھی۔ اسی لئے علی کی ماں کی خواہش تھی کہ علی کو میری جانب سے ہمیشہ احساس برتری ملنا چاہئے میں اس کو حوصلہ دوں تو التجا کی طرح اور مشورہ دوں تو دعا کی مانند تاکہ وہ اپنے آپ کو میرے مقابلے میں خود اعتماد محسوس کرے۔ علی کی ماں نے مجھے یہ بتایا تھا کہ علی ملنسار، ہنس مکھ، فیاض اور روشن خیال ہے۔ میں نے علی سے شادی اسے روشن خیال اور فیاض جان کر کی تھی۔ علی کی یہی دونوں خوبیاں میرے لئے اہم تھیں اس کی روشن خیالی میرے مستقبل کے لئے اور اس کی فیاضی میری کج روی کے لئے ایک انعام تھی، ایک مضبوط ڈھال تھی اور مرد کے یہی دو اوصاف عورت کو معاشرے میں ممتاز اور توجہ کے قابل بناتے ہیں۔
شادی کے بعد علی بھی میرے ساتھ کیمپس کے مکان میں رہنے لگا۔ بحیثیت مرد علی ایک ایسا بچہ تھا جو اپنوں سے بچھڑ کر اجنبیوں میں آگیا ہو اور نئے طور طریقے سیکھنے اور اجنبیوں میں گھل مل جانے کی دیانت داری سے کوشش کررہا ہو۔ لیکن ایسے بچے کو ان مسرتوں تک نہ لے جاسکتی تھی جن کی راہیں مجھ پر سرِدار نے کھولی تھیں کیوں کہ علی میری اس واقفیت سے اپنے آپ کو میرے مقابلے میں کم تر سمجھ لیتا اور یہ جاننے کی کوشش کرتا کہ میں ان راہوں سے کب اور کیسے آشنا ہوگئی اور فادر یہ میری ہی نہیں تمام عورتوں کی مجبوری ہے کہ اپنے شوہر کو وہ تمام مسرتیں نہیں دے سکتیں جو وہ سچ مچ دے سکتی ہیں اس لئے کہ شوہر محترم ہوتا ہے اور اسے اپنی عورت کے ماضی کے بارے میں ایک وہم ہمیشہ خوف زدہ رکھتا ہے جب کہ آشنا نہ محترم ہوتا ہے اور نہ اسے آشنا کے ماضی سے کوئی سروکار ہوتا ہے اس لئے وہ شوہر کے حصے کی مسرتیں بھی اڑالے جاتا ہے۔ فادر اگر شوہر اپنے ہی گھر اور اپنے ہی بیڈ رومز اور بستروں کی فضا اپنی بیویوں کے لئے دباؤ سے آزاد کردیں اور اپنے گھر میں کھل کھیلیں تو بازار چند دنوں میں اجڑ جائیں اور گھروں کے جہنم جنت میں بدل جائیں اور میں علی کی بری عادتوں کو ایک ناصح کی طرح نہ چھڑا سکتی تھی۔ دوست کی طرح ان کی نشاندہی ضرور کرسکتی تھی۔
فادر شادی کے بعد ہم نے ایک چھوٹی سی کار خرید لی علی واقعی ایک روشن خیال، فیاض اور محبت کرنے والا شوہر تھا۔ اس نے میرے ماضی کے بارے میں کوئی سوال نہ کیا اور ہماری زندگی میں روشوں پر کھلے گلاب کے دن مہکنے لگے اور نیلے آسمانوں میں اڑتی قاصنوں کی ڈار جیسے سورج ہمارے پاس سے گزرنے لگے اور صاف پانیوں کی گہرائیوں میں تیرتی ہوئی رنگین مچھلیوں جیسے دن کیمپس کی دیواروں پر اترنے لگے اور فضا میں بہت سی اڑتی اور پھولوں پر بیٹھتی اور پھر اڑ جانے والی تتلیوں جیسے رنگین لمحے ہمارے گھر کے صحن میں بس کر رہ گئے اور ان دنوں کو پر لگ گئے اور ایسی سبک خرامی سے گزر گئے کہ میں ایک بیٹے اور ایک بیٹی کی ماں بن گئی اور علی نے مجھ پر گھر بچوں اور شوہر کے خوبصورت در مجھ پر وا کردیئے اور سارے وسوسے میرے ذہن سے محو ہو گئے۔
میں صبح صبح اٹھتی اور بچوں کو اسکول بھیج کر خود کالج چلی جاتی اور علی کا ناشتہ تیار کر جاتی۔ میرے جانے کے بعد علی اٹھتا اور کار لے کر دفتر چلا جاتا۔ دوپہر میں بچے اسکولوں سے پڑھ کر اور میں کالج میں لڑکیوں کو پی ٹی کی تربیت دے کر اچھل کود سے تھکی گھر آکر کھانا کھاتی اور بچوں کو لے کر سو جاتی۔ شام کو علی آجاتا ہم سب تیار ہوتے اور چھوٹے سے شہر میں روز مرہ کی شاپنگ کرتے اور کبھی کبھی باہر کھانا کھاتے اور گھر لوٹ کر مزے سے دن ختم ہونے کا اعلان کر کے سو جاتے۔ پھر علی کا تبادلہ دوسرے شہر کا ہو گیا وہ مجھے اور بچوں کو چھوڑ کر [illegible] چلا گیا۔ میرا [illegible] بچے کر [illegible] میں تنہا ہو گئے۔ میں [illegible] کو لے کر اکیلی شاپنگ کے لئے جانے لگی اور گھر لوٹ کر لیمپ

کے سامنے بیٹھ کر علی سے خط میں تنہائی کا شکوہ کرنے لگی کہ انہی اکیلے پن کے دنوں میں راشد مسعود آ گیا۔ فادر انتھونی ولکاکسن جب مرد اپنی عورتوں کو تنہا چھوڑ دیتے ہیں اور وہ تن تنہا دنیا کے سامنے آ جاتی ہیں تو انہیں ٹھوکر لگتی ہے وہ راستہ بھول جاتی ہیں اور گر جاتی ہیں۔ کیا میں غلط کہتی ہوں۔ میں نے تو اپنے اندر اسی طرح محسوس کیا ہے شاید دنیا بھر میں دوسری عورتیں مجھ سے مختلف ہوتی ہوں گی۔ شاید اور عورتیں اپنے شوہروں کے انتظار میں مہینوں مہینوں' برسوں برسوں گھروں کی چہار دیواری میں بیٹھی رہتی ہوں گی تو پھر اپنی بیویوں سے روٹھے ہوئے آزاد اور عیاش مردوں کو اتنی ڈھیر ساری عورتیں کہاں سے مل جاتی ہیں جنہیں وہ فلرٹ کرتے ہیں اور بازاروں کا رخ کئے بغیر جہاں بیماریوں اور غلاظتوں کا ڈھیر ہوتا ہے اپنے آپ کو مطمئن رکھتے ہیں۔ میں نے اپنے آپ سے ہمیشہ یہی سوال کیا ہے اور مجھے ہمیشہ غلط جواب ملا ہے۔

You can not avoid to be friendly with a smart young man who gives you all the importance.

(تم ایک ایسے اسمارٹ نوجوان کو نظرانداز نہیں کر سکتیں جو تمہیں ہر طرح اہمیت دیتا ہو)

علی یوں بھی بچوں کی پیدائش کے بعد نارمل ہو گیا تھا اور اس کے مزاج میں شوہروں والی روائتی سردمہری آ گئی تھی اور میں محسوس کرنے لگی تھی کہ علی بھی شدید پیاس میں ملنے والے پانی کے پہلے گلاس کے بعد دوسرے گلاس اور پھر تیسرے گلاس کی طرح افادۂ مختتم کی طرف اپنا سفر شروع کر چکا ہے اور اب اس کے وہی جوکس جن پر میں قہقہے لگایا کرتی تھی مجھے بیہودہ اور عامیانہ لگنے لگے تھے۔ دعوتوں میں اردگرد بیٹھی خواتین کو جس طرح پہلے علی جوکس سنا سنا کر ہنسایا کرتا تھا اور میں فخر محسوس کیا کرتی تھی اب انہیں پر مجھے سبکی محسوس ہونے لگی تھی۔ جب راشد مسعود مجھے ملا تو علی کی سرد مہری اور میری علی کے عامیانہ جوکس پر سبکی کے دنوں کی ابتداء ہو چکی تھی۔ راشد مسعود سے جب میں شادی سے پہلے ملی تھی تو اس کی طالب علمی کا زمانہ تھا اور چونکہ وہ عمر میں مجھ سے ایک دو سال کم تھا اس لئے ان دنوں میرا رویہ اس کے ساتھ ہمیشہ ناصحانہ ہوا کرتا تھا لیکن اب وہ پہلے جیسا شرمیلا اور مشورے طلب کرنے والا راشد مسعود نہ تھا اس کے لانبے قد اور چھریرے جسم پر فوجی یونیفارم بہت خوبصورت لگتی تھی اور جسمانی مشقت اور فوجی ڈسپلن نے اسے ایک پراعتماد صم جو اور بے خوف افسر بنا دیا تھا اور اس کی شخصیت میں ایک مقناطیسی کشش پیدا ہو گئی تھی۔ وہ بے تکان بولتا رہتا تھا اور انگریزی کتابوں میں لکھی کہاوتیں اسے ازبر ہو گئی تھیں جنہیں وہ موقعہ کی مناسبت سے کوٹ کیا کرتا تھا۔ اس نے ایک شام پھولوں سے گھری روش پر ملگجے اندھیرے میں میری انگلیوں میں اپنی انگلیاں ڈال کنگھوں کے دانوں کی طرح پرو کر کہا تھا کہ انسان کو کبھی بھی RECEIVING END پر نہیں رہنا چاہئے ورنہ وہ ہمیشہ اپنا دفاع ہی کرتا رہے گا تم اپنے لئے SENDING END کا انتخاب کرو اور اپنی پوزیشن SENDING END پر ہی مستحکم رکھو' پھولوں سے گھری روش پر گزری شام اور آتی رات کے ملگجے اندھیرے میں دو ہاتھوں کی ایک دوسرے کی انگلیوں میں پروئی انگلیوں کی پرجوش حرارت میں میرے پاوں اکھڑ گئے' قدم ڈگمگا گئے اور میں نے چوڑی پختہ اور سیدھی روش سے راستہ بدل دیا اور RECEIVING END سے نکل کر اپنی پوزیشن مستحکم کر لی۔ بالکل اسی طرح جیسے فوجیں دشمن کو پیچھے دھکیل کر نئے مورچوں میں اپنی پوزیشن مستحکم کر لیتی ہیں۔ راشد مسعود کے آتے ہی میں نے محسوس کیا تھا کہ علی نے جس عورت کو اپنے خواب آور نارمل پیار سے تھپکیاں دے کر سلا دیا تھا وہ اچانک پھر سے جاگ اٹھی ہے اور اس میں نئی زندگی اور توانائیاں لوٹ آئی ہیں۔

علی کے خطوط آتے گئے' میں بے دلی سے پڑھ کر ایک طرف ڈال دیتی
علی کے خطوط آتے اور میں بے پڑھے ہی ایک طرف ڈال دیتی
پھر علی کے خطوط آنے بند ہو گئے

راشد مسعود اسی شام چھاؤنی سے سر شام ہی کیمپس آگیا تھا' میں نے سارا دن اس کا بے چینی سے انتظار کیا تھا' اس کے بارے میں سوچا تھا' اس کی پر اعتماد گفتگو یاد کی تھی اور اس ملگجی شام کے اندھیرے کو سوچا تھا جب اس نے تنکھوں کے دانوں کی طرح اپنی انگلیوں میں میری انگلیاں پھنسا کر مجھے Receiving End سے Sending End پر اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کا مشورہ دیا تھا اور اپنے جسم میں انگڑائیاں ٹوٹتی محسوس کی تھیں اور میں نے اپنے آپ کو تازہ اور شگفتہ رکھنے کے لئے ساری دوپہر لیٹ کر گزاری تھی وہ جوں ہی آیا ہم دونوں بچوں کو آیا پر چھوڑ کر شاپنگ کے لئے چلے گئے۔ وہ مجھے اس طرح اہمیت دیتا رہا کہ میں نے اپنے آپ کو بچوں کی کتابوں میں لکھی کہانیوں کی پریوں کی طرح محسوس کرنے لگی اور اس شام شاپنگ کرتے ہوئے اس کے قدموں سے قدم ملا کر چلی تو مجھے علم ہوا کہ ہمارے دم ہی نہیں دل بھی ملے ہوئے ہیں اور ایک ساتھ دھڑک رہے ہیں اور ہم ایک ساتھ سوچ رہے ہیں اور ہمارے ذہن ایک ہو گئے ہیں۔ اور میری خوداعتمادی میں بڑھ اضافہ ہو رہا ہے اور میں غیر محفوظ نہیں ہوں۔ جب ہم شاپنگ سے لوٹے تو تھک کر چور ہو چکے تھے لیکن ہمارے درمیان ایک جانی پہچانی خواہش کی نغمہ ریز لہر مضبوط ہوتی چلی جا رہی تھی اور ہم دونوں اپنے آپ کو بہتر سے بہتر بنا کر ایک دوسرے کے سامنے پیش کرنے کی کوشش میں مصروف تھے اور ہلکی پھلکی گفتگو کر رہے تھے اور ہمیں ایک بے نام سی اجنبی سی چپ لگ جاتی تھی۔ میں نے کافی بنائی ہم دونوں کافی پیتے رہے اور دیر تک چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور محسوس کرتے رہے' کمرے میں ہمارے علاوہ کوئی نہ تھا کافی کی پیالیاں خالی ہو گئیں اور ہم خواہشوں سے لبالب بھر گئے اور کمرہ ہمارے تنفس کی آوازوں سے گونجنے لگا اور جانے کب کس طرح کیا ہوا کہ کمرے میں نہ میں رہ گئی نہ راشد مسعود رہ گیا۔ ہم دونوں ایکا ایکی صرف ایک عورت اور ایک مرد رہ گئے اور خواہش کی مضبوط لہر جو ہماری نس نس میں لاوے کی طرح بہ رہی تھی ایک تیز روشنی میں بدل گئی اور کمرے میں بہت سے بلب روشن ہو گئے اور علی بہت دور کہیں اندھیروں میں بچھڑ گیا اور آسمانوں پر تسکین کے متلاشی جگنو اڑنے لگے اور ہم دونوں بہتے لاوے کی زد میں آ گئے اور یہ لہریں سرکش ہوتی گئیں اور کمرہ ان لہروں کی جھاگ سے بھر گیا اور تسکین کے متلاشی جگنو آسمانوں سے اتر اتر کر کمرے کے روشن دانوں اور دریچوں میں سانس لینے گئے اور لمحے گھڑیوں پھر پہروں میں بدل گئے اور ہم آسودگی کے سحر میں گم خاموش بیٹھے خوشبو سانسیں لیتے رہے پھر میں نے راشد مسعود کو غور سے دیکھا اور مجھے یاد آیا کہ وہ تو میرے چھوٹے بھائی کا کلاس فیلو تھا' عمر میں مجھ سے کئی سال چھوٹا تھا لیکن اب تو وہ مجھ سے بھی بڑا ہو گیا تھا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ ڈور کے دوسرے سرے پر بندھے کانٹے میں پروئے گئے چارے' کو اس بار جس مچھلی نے نگلا ہے اس کی سانسوں میں تسکین خوشبو ہے اور اس کے بازوؤں کی مچھلیوں میں گرم تپے ہوئے سرخ لوہے کی نرمی ہے اور اسے گہرے پانیوں میں تیرتے اور ڈوب جاتے دیکھنا ایک نیا تجربہ ہے اور مجھے بے حد خوشی ہوئی اب سے تھوڑی دیر پہلے اس کمرے میں آنے سے پہلے جس راشد کو میں جانتی تھی وہ میرے چھوٹے بھائی کا ہم جماعت تھا اور اب جس راشد مسعود کو میں نے اس کمرے میں چند ساعتیں پہلے تلاش کیا تھا وہ تو مجھ سے بڑا تھا۔ راشد مسعود نے میرے ساتھ رات کا کھانا کھایا اور اس کی کار تمام رات میرے گھر کے سامنے کھڑی رہی اور رشتوں اور اخلاقیات اور عمروں کی تفاوت کے کتے تمام رات اس کی کار کے گرد بھونکتے رہے اور روتے رہے اور کیمپس کی کھڑکیوں' روزنوں اور دروازوں کی جھریوں کے پیچھے آنکھیں لگی رہیں اور ہم دونوں ان آوازوں کو جذبات کے رواں دواں سیلاب کے باوجود سنتے رہے اور ان آنکھوں کو اندھیروں میں کھو جانے کے باوجود دیکھتے رہے اور ہم نے اس رات پلک بھی نہ جھپکی۔ صبح جب چھاؤنی جانے کے لئے راشد مسعود نے کار اسٹارٹ کی تو ابھی آسمان پر تارے جھلملا رہے تھے اور اس کی آنکھوں میں رت جگے کا خمار تھا لیکن اسے چھاؤنی تک سورج نکلنے سے قبل پہنچنا تھا اور صبح کی پریڈ میں شریک ہونا تھا۔ اس کی کار نے جب حرکت کی تو میرے اردگرد نشوں میں ڈوبی ہواؤں کی تازہ خوشبو تھی اور میرا بدن ٹوٹ رہا تھا اور آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی۔

صبح لڑکیوں کی ورزش کے پیریڈ کے بعد میں کینٹین میں داخل ہوئی تو سب مجھے حیرت سے اس طرح دیکھ رہے تھے کہ جیسے میری

پیشانی پر کوئی تحریر لکھی ہوئی ہے جسے وہ ڈی کوڈ کرنے کی کوشش میں مصروف ہوں اور مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کسی نے رات بھر میرے مکان کے سامنے کھڑی رہنے والی کار کے بارے میں پوچھ لیا تو کیا ہو گا لیکن میں کینٹین میں بڑی دیدہ دلیری اور بے نیازی سے داخل ہوئی۔ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنے آپ سے کہا "SO WHAT" -- اور میرے اندر شگفتی آ گئی۔

مجھے راشد مسعود کی شگفتی۔ والہانہ پن اور بے خبری کا خیال آیا میں نے کینٹین میں چائے کی میز پر راشد مسعود کی پریڈ کے بارے میں سوچا پھر تھک کر اسے بے خبر سوتا ہوا محسوس کیا اور گزری ہوئی رات کے ایکسا ئٹمنٹ کو یاد کیا جب کہ میری شریک کار لیکچرار مجھے انکھیوں سے دیکھ کر میری کیفیت کا اندازہ کر کے لذت محسوس کر رہی تھیں۔ میں ان چھوٹی موٹی کلاس میں لڑکیوں پر ذرا ذرا سی بات پر برس پڑنے والی نیک بیبیوں کو کیا بتاتی کہ وہ ذہین تھا' اس کا قد لانبا اور جسم مضبوط تھااور ذہن اور مضبوط جسم والے لانبے مرد بے حد نرمی اور شائستگی سے پھولوں کی ٹوکریوں کی طرح اٹھاتے اور پھولوں کی ٹوکریوں کی طرح رکھتے ہیں اور وہ میری کمزوری ہیں۔ وہ سب اپنی خود لذتی میں میری طرف اس طرح دیکھ رہی تھیں جیسے میرے لباس میں میرے جسم کو چھپا لینے کی صلاحیت نہ ہو اور میرے چہرے پر کہانیاں کہتے نشان ہوں۔ جوں ہی پہلی بار میری نظریں ان سے ملیں میں مسکرا دی اور چائے کی پیالی منہ سے لگا لی۔ ان سب نے میرے مسکرا دینے ہی کو بہت جانا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے میرے بارے میں اپنے ذہن میں سوچی ہوئی کہانی کی تصدیق کاتبادلہ کرنے لگیں۔ اور میں انہیں سوچنے اور لذت حاصل کرنے سے زیادہ آپس میں کھل کر گفتگو کرنے کی آزادی دے کر کینٹین سے باہر آ گئی اور ان سب کو دل میں ایک موٹی سی گالی دی "سالی' نیک پروینیں"

لیکن میری گالیاں ان نیک پروینوں کی زبان نہ بند کر سکتی تھیں اور میں راشد مسعود کے ساتھ ویک اینڈ گزار کر دوسرے ویک اینڈ کاانتظار شروع کر دی تھی۔ ایسے میں علی کے بے پڑھے خطوط میز پر پڑے میرا منہ چڑھاتے رہتے اور میں انہیں میز سے اٹھا کر ریک میں ڈالتی جاتی تھی۔ راشد مسعود کی کار میرے دروازے پر ویک اینڈ کی تمام رات کھڑی رہنے لگی اور کیمپس میں چرچے شروع ہو گئے۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ جس گھر میں تنہا عورت رہتی ہو اس گھر میں کسی مرد کا قیام قانونی قیاس کا جواز بن جاتا ہے نہ کہ کیمپس کے رہائشی علاقے میں۔ لیکن میں نتائج سے بے پرواہ ہو کر فیصلے کرنے کی عادی ہوں۔ ادھر میرا بیٹا اور بیٹی راشد مسعود سے اس قدر گھل مل گئے تھے کہ اس کے چلے جانے کے بعد بیٹا ضد کرتا کہ انکل مجھ سے مل کر کیوں نہ گئے اور سر پر قیامت اٹھا لیتا اور سر شام مجھ سے پوچھتا کہ آج انکل آئیں گے اور میں نفی میں جواب دیتی اور دونوں اداس ہو جاتے' بیٹی منہ سے تو کچھ نہ کہتی مگر وہ بھی راشد سے بہت زیادہ مانوس ہو گئی تھی۔ یہ دونوں میرے بچے تھے اور اب صرف میری ذمہ داری تھے۔ علی اپنے مزے سے مجھے مہینے میں ایک خط لکھ کر اور تھوڑے سے پیسے بھیج کر مطمئین ہو جاتا اور میں ان بچوں کی پرورش پر مامور ایک آیا تھی جو اس کے بچوں کی تعلیم' صحت اور صفائی کی ذمہ دار تھی' یہ بچے جوں جوں بڑے ہو رہے تھے میرے پاؤں کی زنجیر ہوتے جا رہے تھے۔

جس رات بیٹا پیدا ہوا میں بالکل اکیلی تھی میرے ساتھ کوئی نہ تھا' علی مجھے اسپتال میں تنہا چھوڑ آیا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے خلاف علی نے کوئی سازش کی ہو' جیسے علی اور اس کی ماں چاہتے ہوں کہ میں مر جاؤں۔ یہ میرا دوسرا بیٹا تھا لیکن مجھے عجیب طرح کی بے اطمینانی تھی۔ ہر چیز سے خوف آنے لگا تھا اور میں بیٹے کی پیدائش سے کچھ پہلے بیمار رہنے لگی تھی اس لئے بے حد کمزور ہو گئی تھی اور اسپتال کا وہ کمرہ بے حد صاف' شفاف اور روشن تھا۔ میں اس رات یہی سوچتی رہی تھی کہ یہ کمرہ اتنا روشن اور صاف کیوں ہے۔ میں درد سے تڑپ رہی تھی اس وقت میں نے نرس سے پوچھا تھا۔

"نرس اس کمرے میں اتنی روشنی کیوں ہے۔"

پہلے تو نرس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا' میں نے دوبارہ نرس سے پوچھا

"اس کمرے میں اتنی روشنی کیوں ہے۔"

تب لیڈی ڈاکٹر نے کہا
"نرس چھوٹا بلب روشن کر دو اور یہ سارے بلب بجھا دو"
میں نے پھر نرس سے کہا
"باہر کون ہے۔"
"باہر تو کوئی بھی نہیں ہے۔"
پھر مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ میں کہاں ہوں' دور کہیں سے بچے کے رونے کی آواز مسلسل آئے جا رہی تھی۔
"یہ کون رو رہا ہے نرس" بالآخر مجھ سے رہا نہ گیا۔
"مبارک ہو۔ بیٹا ہوا ہے"
"تو یہ اس قدر حلق پھاڑ پھاڑ کر رو کیوں رہا ہے؟؟"
"بچے پیدا ہوتے ہی اسی طرح روتے ہیں" نرس نے جواب دیا۔
"کیوں اس طرح کیوں روتے ہیں؟؟"
نرس ہنسنے لگی اس کے پاس شاید میرے اس سوال کا جواب نہ تھا۔
جب بیٹا پیدا ہوا تو باہر کوئی نہ تھا جو مجھے آکر دلاسا دیتا۔ کمرے کے اندر سب چہرے اجنبی تھے اور بچے کا رونا مجھے اذیت دیئے جا رہا تھا۔

مجھے علی سے نفرت ہو گئی۔

پھر دو سال کے بعد بٹی پیدا ہوئی اور میں بچوں میں مشغول رہنے لگی اور علی دوسرے شہر میں تنہا رہتا اور مہینے میں ایک دو بار میرے پاس آ جاتا۔ یہاں تک کہ راشد مسعود آ گیا اور کیمپس میں اس کی کار موضوع گفتگو بن گئی۔اس طرح دو سال اور گزر گئے اور مجھے اسکالر شپ مل گیا۔ یہ غیر ملکی اسکالر شپ تھا اور مجھے وہاں جانا تھا میں بے حد خوش تھی۔ علی نے بھی اس اسکالر شپ پر خوشی کا اظہار کیا اور میں بچوں کو علی کی ماں کے پاس چھوڑ کر ملک سے باہر چلی گئی۔

فادر ہمارے معاشرے میں جھوٹ اس طرح رچا بسا ہوا ہے کہ ہم روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں جھوٹ بولتے' جھوٹ لکھتے اور جھوٹ سوچتے رہتے ہیں اور ہمیں احساس تک نہیں ہوتا کہ ہم اپنے آپ سے بھی جھوٹ بولتے ہیں۔ میری تمام لیکچرار دوست جب مجھ سے ملتیں تو میری کج روی کو جرات کہتیں اور اس جرات کے حق میں ایسی ایسی دلیلیں دیتیں کہ میں حیران رہ جاتی اور مجھے یقین ہونے لگتا کہ یہ نیک بیبیاں بس اب تھوڑی ہی دیر میں حقوق نسواں کے حق میں اور اپنے شوہروں کے خلاف نعرے لگاتی سڑکوں پر نکل جائیں گی اور سارے شہر کی دیواروں کو رنگ کر سرخ کر دیں گی اور مردوں کے ہوش ٹھکانے لگا دیں گی لیکن جب میری عدم موجودگی میں آپس میں باتیں کرتی تو ان کو میرے دیدوں کا پانی ڈھلا ہوا دکھائی دیتا اور علی سے ہمدردی کا اظہار کرتیں کہ وہ بے چارہ کما کما کر مرا جا رہا ہے اور میں اس کی عدم موجودگی میں گلچھرے اڑا رہی ہوں اور میں بے حیا ہوں اور میں آوارہ ہوں اور میں بے وفا ہوں اور میری آوارگی اور بدچلنی پر تبصرے کرتے کرتے لذت محسوس کرنے لگتیں اور ان کی آوازوں میں لچک پیدا ہو جاتی اور جسم لو دینے لگتے اور سرشام اپنے شوہروں کے ساتھ آئس کریم کھانے شہر جاتیں اور اپنے شوہروں کو مجھ سے دور رہنے کی قسمیں دے کر سو جاتیں۔

اسکالر شپ کے دو سال میری زندگی اور میری آزادی کے دو خوبصورت ترین سال ہیں۔ ان دو سالوں کو اپنی زندگی میں پھر سے لانے کے لئے میں اپنی باقی ماندہ زندگی کے تمام سالوں سے دستبردار ہونے کو تیار ہوں۔ فادر شاید تم نہ محسوس کر سکو کہ اس یونیورسٹی میں' اس کے ہوسٹلوں میں' ریستورانوں میں' لائبریری میں اور کلاس روموں میں ہر جگہ محبتیں دامن پھیلائے سایہ دار درختوں کی

طرح انتظار کیا کرتی ہیں۔ وہاں نہ منافق نیک پروینیں ہوتی ہیں' نہ حاسد مرد۔ سب اپنی اپنی باری اور اپنی محبت کا انتظار کیا کرتے ہیں اور دوست بن جاتے ہیں پھر جب بچھڑ جاتے ہیں تو خاموشی سے کسی نئی محبت کے منتظر رہتے ہیں' کسی سے کوئی شکوہ نہیں کرتے' کوئی کینہ نہیں رکھتے اور جب دوبارہ کہیں مل جاتے ہیں تو بڑی خندہ پیشانی سے استقبال کرتے ہیں' خیریت پوچھتے ہیں' اپنی خدمات پیش کرتے ہیں اور چپ چاپ اپنے راستوں پر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ رقابت اور حسد سے ناواقف ہوتے ہیں' دوست کی جدائی میں آنسو نہیں بہاتے بلکہ کسی نئے دوست کو خوش آمدید کہنے کے لئے ہر لمحہ تیار رہتے ہیں۔ میں ان دو سالوں میں نئے لوگوں سے ملی' نئی زبان سیکھی' نئے تجربوں سے گزری اور وہاں مجھے ایسا لگا کہ آزادی انسان کو ہمہ جو بنا دیتی ہے۔ وہاں کسی طرح کی کوئی پابندی نہ تھی' صبح بچوں کو اسکول نہ بھیجنا تھا' علی کے کپڑے تیار نہ کرنے تھے اور نہ کسی کے لئے ناشتہ تیار کرنا تھا وہاں صرف اپنے لئے صبح کا انتظار کرنا تھا اور اپنے لئے شام کے پروگرام بنانے تھے اور وہیں مجھے معلوم ہوا کہ نئے دوست بنانے کے لئے لائبریری' موسیقی اور مختلف زبانیں سیکھنے کی کلاسیز اور Meditation Club سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ وہاں ہر روز جانے کا جواز ہوتا ہے وہاں اور بہت سے لوگ ہوتے ہیں جن سے بار بار مل کر یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس میں اچھا دوست بننے کی کتنی صلاحیت ہے۔ میں نے وہاں اپنی پسند کے دوست بنائے اور کچھ دنوں بعد انہیں خدا حافظ کہہ دیا پھر نئے دوست بنا لئے' میرے پرانے دوستوں نے میرے نئے دوستوں سے کبھی میرے بارے میں غیبت نہ کی' کبھی کوئی شکوہ نہ کیا' کبھی کوئی سوال نہ کیا کہ انہیں کیوں چھوڑ دیا گیا؟ وہاں کسی کو یہ سب کچھ سوچنے کی نہ فرصت ہے' نہ ضرورت وہ کسی سے کچھ نہیں کہتے۔ میں آج بھی ان بچھڑے ہوئے یا خود سے چھوڑے ہوئے دوستوں کو یاد کرتی ہوں تو یہاں کی رفاقتوں سے خوف آتا ہے۔ فادر یہ لوگ کیوں نہیں محسوس کرتے کہ بس ان کی افادیت ختم ہوئی' ان سے اب مسرتیں نہیں مل سکتیں پھر دوست بنے رہنے پر اصرار کیوں؟ کاش یہاں کے لوگ بھی اس ایک بات کو جان لیں اور عورتوں کو اپنی ملکیت سمجھنا چھوڑ دیں۔ عورتیں انگوٹھیاں نہیں ہیں' وہ ٹیپ ریکارڈ یا نیا سوٹ بھی نہیں ہیں' وہ گوشت پوست کی انسان اور الگ ایک اکائی ہیں۔ وہ پسند کرنے کا حق بھی رکھتی ہیں اور اپنی غلط پسند کو ریجکٹ کر دینے کا حق بھی رکھتی ہیں' جس طرح تم غلط رنگ کی ٹائی خرید کر واپس کر دینے پر قادر ہو اسے اپنے گلے میں باندھے پھرنے پر مجبور نہیں ہو اسی طرح عورت غلط رنگ کا اسکارف کیوں پہنے؟ اور یہ حق دونوں کو برابر ملنا چاہئے۔

آہ۔۔ ماضی کے واقعات اور گزرے ہوئے دنوں کی یادیں' لگتا ہے جیسے دور بہت دور بہت دور کہیں ہنستے ہنستے بہت سے دیئے روشن ہوں اور کیسے کیسے لوگ کہاں کہاں بچھڑ گئے یہ سچ سچ کس قدر ایکسا ئٹنگ ہے کہ تمہارے ارد گرد بہت سے لوگ ہوں اور وہ تمہارے بالوں' تمہاری آنکھوں' تمہاری چال اور تمہارے پیروں' پیر کے ناخنوں پر لگی کیوٹکس اور تمہارے ہاتھوں اور انگلیوں پر لگی نیل پالش کی تعریف کریں اور تمہاری بے راہ روی کو لاپرواہی اور آوارگی کو جرات کہیں اور تمہارے بارے میں سوچتے رہیں۔ ہے نا فادر"

انتھونی ولکاکس نے اس کی آنکھوں کو دیکھا پھر بالوں پر نگاہ ڈالی پھر اس کی رنگ بدلتی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور پوری یکسوئی' پسندیدگی اور دلی مسرت کے ساتھ اس کے اعضا کا جائزہ لینے لگا۔ پھر وہ ہنس دیا اس کی اس ہنسی میں تصنع نام کو بھی نہ تھا بلکہ اندر کی خوشی سانس کے ساتھ ابل کر ہونٹوں پر پھیل گئی تھی یہ سچی اور بے ریا ہنسی تھی اسے یہ ہنسی بہت اچھی لگی اس نے سوچا کاش اسی طرح وہ بھی ہنس سکتی بے ریا اور سچی ہنسی اندر کی خوشی کے ساتھ۔ مگر اب تو وہ ایک سانس بھی ایسی نہ لے سکتی تھی جو بے ریا ہو۔ اس کے اندر ریاکاری کے علاوہ اب کچھ باقی نہ تھا۔ شاید موناڈیو میں وہ ایسی ہی بے ریا ہنسی ہنسا کرتی ہو گی اندر کی سچائی کے ساتھ۔

اس نے اپنے اس خیال کو جھٹک دیا اور اس کے لانبے بال کاندھوں سے پھسل کر پشت پر لہرانے لگے۔

(زیر تصنیف ناول کا حصہ)

محمد سعید شیخ

اِقبالِ جُرم



گناہ گار

کھالے کے تھل تھل کرتے پانی سے بھیگی مٹی پر وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب قریب لیٹے لذت اور بے چینی کے ایسے احساس سے دوچار تھے' جس سے وہ پہلے کبھی آشنا نہیں ہوئے تھے۔

ان کے چار چپھیرے کچی گندم کی ایسی نشہ آور خوشبو پھیلی ہوئی تھی جو جسموں کی نافرمانی کو طرف مائل کرتی تھی۔

ٹھہرے ہوئے لمحے کے احساس میں شرابور یوسف نے باشعور ہوکر خود کو شناخت کرنے کے لئے دوسرے جسم سے فاصلہ پیدا کیا۔ ابھی ابھی کچھ دیر پہلے سوتے سے کی خواب کی اسی حالت میں یہ جسم اور اس کے خدوخال اس کی نظر کے اتنا قریب تھے کہ پورا منظر دھندلا کر ایسا بے شناخت ہوگیا تھا کہ اسے شعور اور لاشعور کی تیز دہار پر چلنے تک کا علم نہیں ہوپایا تھا۔

اس نے سوچنے کی کوشش کی۔ آج کونسی طاقت انہیں اتنا قریب لے آئی تھی۔ گناہ کی ترغیب ان کے اندر تھی یا کہیں باہر سے کسی اندھی طاقت نے انہیں اس حالت کی طرف دھکیل دیا تھا۔ ایک ایسے لمحے سے دوچار کردیا تھا جو پھیلتا ہی جارہا تھا۔ جس کا کوئی ماضی تھا نہ کوئی مستقبل۔

وہ تو ساتھ بہتے کھالے کے پانی کی طرح بہتا جارہا تھا۔ جس کی گرفت میں آکر وہ اس حالت کو پہنچے تھے جس کا اثر ابھی تک ان کے جسموں سے چمٹا ہوا تھا۔

یوسف نے کبھی خود کو اس وقت کے لئے تیار نہیں کیا تھا۔ یہ سب بہت اچانک ہوا تھا۔ کسی ان دیکھی طاقت نے اسے اندر یا باہر سے اس حالت کی طرف دھکیل دیا تھا۔ اگر اسے سوچنے کا موقع ملتا' تو وہ کبھی ایسا نہ کرتا۔

اسے خود سے یہ امید نہیں تھی۔ اسے نہیں پتہ تھا اس کے اندر کہیں کوئی دوسرا' اس سے زیادہ طاقت ور چھپ کر بیٹھا ہوا ہے۔ جو اچانک یوں اسے بے بس کردے گا کہ اس کے فیصلہ کرنے کی طاقت سلب ہوجائے گی۔

لڑکیاں اسے اچھی لگتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر اس کے جسم میں سرسراہٹ ہونے لگتی تھی مگر وہ ابھی تک عورت کے اصلی لمس سے ناآشنا تھا۔ ابھی یہ بھید اس پر نہیں کھلا تھا۔ کائنات کے بہت سے دوسرے رازوں کی طرح یہ بھی اس کے لئے سربستہ راز تھا۔

عورت کو بہت قریب دیکھ کر وہ گھبرا جاتا تھا۔

ریشماں کو بچپن سے جانتا تھا۔ دونوں اکٹھے بڑے، پلے تھے اور دونوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو جوان ہوتے، رنگ بدلتے دیکھا تھا۔

ریشماں جسے وہ بچپن میں جھلی کہا کرتا تھا، جوان ہو کر اسے حیرت زدہ کرنے لگی تھی۔ وہ اس کے سامنے نئے جسمانی سانچوں میں ڈھلی تھی ان کے ہاتھوں میں ایک دوسرے کا لمس ضرور رچا بسا تھا مگر ریشماں کے متعلق یوسف کی سوچ اور ہاتھوں کے لمس کی ایک حد تھی اور ابھی ابھی جس وقت سے یوسف دوچار ہوا تھا، اس نے اس حد تک کبھی نہیں سوچا تھا۔

اس لمحے کی خوشی اور دکھ کچھ اس طرح گھلے ملے ہوئے تھے کہ یوسف کا جی چاہتا تھا کہ بیک وقت رونے اور ہنسنے لگ جائے۔ ریشماں کا خاوند نشہ کرتا تھا۔ یوسف کو اس سے ہمدردی تھی۔ آخر تو وہ اس کے بچپن کی ساتھی تھی۔ مگر اسے نہیں پتہ تھا کہ ریشماں اندر سے اتنی ویران اور اجاڑ ہے۔

یوسف نے اس اٹل لمحے، ریشماں کے وجود پر ہریالی اترتے دیکھی تھی۔

وہ کھالے کی ٹوٹی وٹ سے جھر جھر کرتے پانی میں بھیگی مٹی کی طرح ڈھیلی ہو کر یوں مسلسل لمبے لمبے سانس لے رہی تھی جیسے کہیں باندیوں کے سفر سے لوٹی ہو۔ اس کے جسم کی مہتابیاں چھوٹ چھوٹ کر بجھ چکیں تھی مگر ان کے بجھنے کی خوشبو ابھی تک اس کے جسم کے مساموں سے پھوٹ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ جنہیں یوسف نہیں دیکھ سکتا تھا۔

وہ جاگنا نہیں چاہتی تھی۔ یوسف جیسے بیدار ہو چکا تھا۔

وہ سوچے جا رہا تھا۔

"ایسا کیوں ہوا؟ میں نے ایسا تو نہیں چاہا تھا۔"

دور کہیں کھیتوں سے کسی کے ہیر گانے کے بول ہوا کے دوش پر اڑتے آ رہے تھے۔ ریشماں نے گاؤں کی محفلوں میں کئی موقعوں پر ہیر سنی تھی۔ آج اسے ہیر کے دکھ کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ہیر کو بھی اس کی مرضی کے خلاف اس کے گھر والوں نے بیاہ دیا تھا۔ ہیر نے بھی نافرمانی کی تھی۔ بغاوت کی تھی۔

"ہیر کی یہ نافرمانی... یہ بغاوت محبت کی داستان کیسے بنی؟"

جب وہ اس سوچ میں گم تھی تو یوسف نے اس کے بازو کو چھوا۔ وہ بولنا نہیں چاہتی تھی۔

"او......ں!"

یہ ریشماں کے جسم کی وہ آواز تھی جو بہت کم کسی نے سنی تھی۔

"اب اٹھو؟"

"رہنے دو! میرا دل ابھی جاگنا نہیں چاہتا" ریشماں کسمسائی۔

"ساری رات گزر گئی ہے۔ اٹھو۔ جاؤ! کسان کھیتوں کو پانی لگانے کے لئے آ رہے ہیں۔ پھر چھپ کر نکلنا مشکل ہو جائے گا۔" یوسف نے فکرمندی سے کہا۔

"ٹھہر جاؤ! یوسف! دیکھ نہیں رہے ہو ابھی تو چاند کی روشنی بھی ٹھہری ہوئی ہے۔ ایسی چاندنی میں دھرتی پر لیٹنے کا موقع نہ جانے پھر ملے یا نہ ملے۔" ریشماں کی آواز میں خمار تھا۔

"زمینوں کو اسی لئے تو دھرتی ماتا کہتے ہیں کہ اس کی آغوش میں بہت سکون بہت آرام ملتا ہے۔"

"میری ماں تو بچپن میں ہی مر گئی تھی۔ مجھے دھرتی کی یہ گود بہت سکون دیتی ہے۔" یہ کہہ کر ریشماں ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی بڑی جاندار تھی۔ اس میں بڑی کھنک تھی۔

یوسف نے گھبرا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "اتنا اونچا ہنستی ہو۔ تمہیں ڈر نہیں لگتا؟" یوسف نے اپنا رخ اس کی طرف موڑتے ہوئے کہا ر۔شماں سیدھی چت' بازو' ٹانگیں پسارے یوں لیٹی تھی جیسے اس نے اپنے جسم کو شعور کی ہرپابندی سے آزاد کر رکھا ہو۔

اس کی قمیض گیلی ہوکر کئی جگہ سے جسم پر چپٹی ہوئی تھی اس کے لمبے کھلے بالوں میں بھیگی مٹی کی نمی تھی مگر اس کا چہرہ رات کی چاندنی میں رات کی رانی کی طرح کھلا ہوا تھا۔ اس چہرے پر اضطراب' پشیمانی کی کوئی پرچھائیں نہیں تھیں۔ ر۔شماں اس رات سے جدا ہونا نہیں چاہتی تھی۔

شاید وہ جانتی تھی راتوں کے کئے گئے گناہوں پر خود رات ہی پردہ بن جاتی ہے۔ یا یہ کہ رات کو جو کچھ بندہ کرسکتا ہے وہ دن کو نہیں کرپاتا۔ وہ چاہتی تھی یہ رات اس پر چھائی رہے۔ اسے اپنی لپیٹ میں لئے یوں ہی خاموش' پرسکون' ٹھہری رہے۔

"تمہیں ڈر نہیں لگ رہا؟" یوسف نے اسے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

"جب آدمی اندر سے بھرتا ہے' مکمل ہوتا ہے' خوش ہوتا ہے' تو وہ کسی بات سے نہیں ڈرتا۔ لوگ تو ایسی حالت میں نظر ہی نہیں آتے" یہ کہتے ہوئے ر۔شماں نے اپنی بانہیں آسمان کی طرف یوں پھیلادیں جیسے وہ اسے بازوؤں میں بھرلینا چاہتی ہو۔

"یوسفے! تم نے مجھے بھردیا ہے۔ مکمل کردیا ہے۔ میں تو ویران کھیتی تھی۔ تمہیں پتہ ہے ویران کھیتی کا دکھ کیا ہوتا ہے؟"

یوسف خاموش رہا۔

"میں ماے' مامی' اور فیقے کو کاٹنے کو دوڑتی تھی مجھے دورے پڑتے تھے۔ میرے ہاتھ پاؤں ٹیڑھے ہوجاتے تھے۔ وہ مجھے پیروں فقیروں کے ڈیروں پر لئے پھرتے تھے۔ میں راتوں کو گھر سے باہر نکل جاتی تھی۔ کپڑے پھاڑ دیتی تھی۔ میرے اندر ویرانی جب جلتی تھی تو ساری ساری رات صحن میں نلکے کی دہار کے نیچے بیٹھی اپنی اس آگ کو ٹھنڈا کرتی رہی تھی۔ وہ کہتے تھے مجھے سایا ہوگیا ہے۔ تم نے میرا سایا نکال دیا ہے یوسفے! تم نے مجھے بچالیا ہے۔ تم میرا دکھ نہ بانٹتے تو پتہ نہیں میں کیا کرتی۔"

"تمہیں فیقے کا بھی ڈر نہیں؟" یوسف نے حیران ہوکر پوچھا۔

"میں کیوں ڈروں اس سے؟" وہ تو خود مجھ سے ڈرتا ہے۔ نشہ خریدنے کے لئے اسے جب پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ میرے پاؤں میں بیٹھ جاتا ہے۔ چاچا' چاچی' ماما' مامی سب میرے مجرم ہیں۔ وہ مانیں نہ مانیں' انہیں اس جرم کی سزا ضرور ملنی چاہئے جو انہوں نے میرے ساتھ کیا ہے۔ وہ سب فیقے کا علاج کرارہے ہیں۔ لیکن اس کی نسوں میں تو نشہ پتھر بن کر بیٹھ چکا ہے۔ ان سب کو پتہ ہے۔ کوئی فقیر' کوئی حکیم اب اس کا علاج نہیں کرسکتا' فیقا اب کسی کام کا نہیں۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔" ر۔شماں کی آواز میں عجیب طرح کا یقین تھا۔

"مگر یہ سب بھی تو جرم ہے۔ گناہ ہے؟" یوسف نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"یوسفے راتیں بنی ہی اس لئے تھیں کہ لوگوں نے جو بھی جرم اور گناہ کرنے ہوں کرلیں۔ تمہیں کیا پتہ اس وقت' کہاں کیا جرم نہیں ہورہا..."

یوسف چپ ہوگیا۔

ر۔شماں کی باتوں کا جواب ڈھونڈنا اسے مشکل ہورہا تھا۔ اسے پتہ تھا راتوں کو لڑکیاں اغواء ہوجاتی ہیں۔ ڈنگر کھل جاتے ہیں۔ چوریاں ہوتی ہیں۔

"تم نے ہیر کے بول سنے ہیں؟"

"ہاں! بہت اچھی آواز تھی" یوسف نے جواب دیا۔

"یہ ہیر گاؤں گاؤں گائی جاتی ہے۔ پنجاب کی ہر کڑی جوان ہوتے ہی ہیر بننا چاہتی ہے۔ ایسی ہیر جس کا اپنا ایک رانجھا ہو۔ یہاں

ہیریں رانجھا رانجھا کرتے رانجھا بننے کو تیار ہوجاتی ہیں۔ ویسے کون نہیں جانتا' ہیر کے چاچے نے اسے اس کی مرضی کے خلاف کھیڑوں میں بیاہ دیا تھا۔ پھر بھی وہ رانجھے کے ساتھ بھاگ گئی۔ لوگ اب بھی ہیر کے قصے گاتے ہیں۔ اس کے عشق کی مثالیں دیتے ہیں۔ پر وہ رانجھے کی جورو تو نہیں تھی۔" رشماں سانس لینے کو رکی اور پھر یوسف کے دھیان کا خیال کئے بغیر بولنے لگی۔

"مجھے پتا ہے میرے چاچے نے چوہدری کے کہنے پر فیقے سے میرا بیاہ کیا ہے۔ فیقا چوہدری کی حویلی کا کاما ہے۔ چوہدری کا غلام ہے۔ اور چوہدری مجھے بھی اپنی غلامی میں رکھنا چاہتا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ! یہ گناہ کس کا ہے؟ میرا؟ تمہارا؟ چاچے کا یا خود فیقے کا؟ یا پھر چوہدری کا؟ اسی لئے کہتی ہوں یہ جرم اور گناہ کا خیال چھوڑو! ہر بندے کو دوسرے کا حساب لینے کی بجائے اپنا حساب دینا چاہئے تب پتہ چلتا ہے سزا کس کو ملنی چاہئے۔"

یوسف نے رشماں سے پہلے ایسی باتیں کبھی نہیں سنی تھیں۔

"ہوسکتا ہے۔ پر اس نے مجھے یہ بات نہیں بتائی۔"

"اور اب تم ڈر رہے ہو"

یوسف واقعی ڈرا ہوا تھا۔ اتنی دیر میں اس کے جسم کا خمار اتر چکا تھا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ اسے لگتا تھا جیسے اس کا کوئی اختیار نہیں رہا تھا۔ وہ اتنا بے بس کیسے ہوگیا تھا؟ اس نے سوچنے کی کوشش کی۔

"میں تو نہیں ڈرتی" رشماں نے یوسف کو خاموش دیکھ کر کہا۔ "کسی سے نہیں ڈرتی۔ کوئی مجھ سے نہیں پوچھ سکتا۔ میں نے یہ سب اپنی مرضی سے کیا ہے۔ کوئی سزا اگر ہمیں بھگتنا پڑی تو تمہارے حصے کا الزام بھی میں اپنے سر لے لوں گی۔ میں بتاؤں گی تمہارا کوئی قصور نہیں۔ تمہیں تو میں نے بے اختیار کردیا تھا۔ فکر مت کرو۔ مرد بنو۔ بہت مرد ہیں جو راتوں کو وہ کچھ کرتے ہیں جو دن کی روشنی میں بھی نہیں کرسکتے۔"

رشماں کے لہجے میں عجیب حوصلہ تھا۔

"یہ بدن کا ترسیواں بڑی بھیڑی چیز ہے۔ بندے کو کسی قابل نہیں چھوڑتا۔ گناہ ثواب نظر سے چھپ جاتے ہیں۔ اللہ نے جسم بنایا ہی ایسا ہے۔ اس میں ہمارا کیا قصور" یوسف پھر خاموش ہوگیا۔

اس کے پاس رشماں کی باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ تو اس لمحے کو یاد کررہا تھا جس پر اس کا کوئی بس نہیں تھا۔

"یہ جسم میں اتنی طاقت کیسے آجاتی ہے کہ آدمی کے ہوش و حواس اس کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں؟"

اس کا جی چاہا رشماں سے اس سوال کا جواب پوچھے پھر اس کی باتوں کی تیزی سے ڈر گیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا رشماں کے وجود میں اتنی پیاس تھی۔ "تم تو بھولی بھالی جھلی سی تھیں۔ یہ تمہیں آج کیا ہوگیا ہے؟" یوسف پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"میں نے یہ سب زندگی سے سیکھا ہے۔ چاچے چاچی سے' مامے مامی کے رویے سے' فیقے کے بے رنگ وجود سے اور چوہدری کی لالچی نظروں سے اور پھر خود اپنے آپ سے۔ میں نے بہت دیر خود کو دبائے رکھا۔ بہت صبر کیا۔ فیقے کو مرد بنانے کی ساری کوششیں کیں۔ ساری ساری رات اس کا پنڈا سہلاتی رہتی۔ وہ ٹھیک نہیں ہوا۔ کبھی کبھی جی چاہتا تھا اس کا گلا گھونٹ دوں یا پڑوس کے جوان شیدے کے ساتھ بھاگ جاؤں جو روز صبح سویرے کوٹھے کی منڈیر کے ساتھ کھڑا میرا تماشہ دیکھا کرتا تھا۔ اسی لئے کہتی ہوں تم نے مجھے بچالیا ہے۔ وگرنہ ہوسکتا تھا میں بے ہوشی میں فیقے کا گلا دبادیتی۔ اب اسے قتل کرنے کی مجھ میں کوئی خواہش نہیں" یہ کہہ کر رشماں اٹھ کھڑی ہوئی۔ "مجھے تو واپس سسرال کے گاؤں پہنچنا ہے۔ تمہارا گاؤں تو یہ ساتھ ہی ہے۔"

"اکیلی چلی جاؤگی؟"

"ہاں! اگر اکیلی آسکتی ہوں تو اکیلی جا بھی سکتی ہوں میں تو انہیں یہی کہہ کر آئی تھی چاچے چاچی سے مل کر صبح آجاؤں گی" اس نے

دونوں ہاتھوں سے اپنے لباس کو درست کیا۔
"چلوں؟" اس نے یوسف سے پوچھا۔ یوسف دوسرے راستے پر قدم کھنے کو تیار کھڑا تھا۔
"اگلی جمعرات کو پیر عنایت شاہ کا میلہ ہے۔ میں اسی بہانے تمہیں ملنے آؤں گی۔ یہیں' انہیں کھیتوں میں پہنچ جانا! آؤگے نا؟"
یوسف متذبذب سا کھڑا تھا۔
"اسی طرح چھپ کر آنا ہوگا؟" یوسف نے جیسے خود سے سوال کیا۔
"ہاں! ہم زندگی کا کچھ حصہ چھپ چھپ کر بھی تو گزاردیتے ہیں" یوسف نے اس کی بات پر غور نہیں کیا۔ اس کی نظریں رشماں کے جسم پر پڑیں جس سے ہلکی قمیض کئی جگہ سے مٹی کی نمی کی وجہ سے چپکی ہوئی تھی۔
"تمہیں ٹھنڈ نہیں لگتی؟"
رشماں ہنسی۔
"میری مامی کہتی ہے میرے بنڈے میں آگ بھری ہے۔ میں سردیوں میں جب ہلکے کپڑے پہن کر صحن میں سوتی تھی تو وہ چیختی تھی۔ "نی! آکڑ جائیں گی۔ مجھے پتہ ہے تیرے اندر جو بھانبڑ جل رہا ہے۔ صبر کر۔ فیقے کو ٹھیک ہولینے دے۔ یہ شریفوں کے چالے نہیں" میں مامی کی ان باتوں پر ہنسنے لگ جاتی۔ یہاں تک کہ میری آنکھوں میں آنسو بھرجاتے۔ مامی کیسی عورت تھی عورت ہوکر میرا دکھ نہیں سمجھتی تھی۔ میں نے آج اس سے بھی بدلہ لیا ہے۔"
"چلو اب بس کرو!" یوسف نے اس کے گاؤں کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا
"جاتی ہوں بابا جاتی ہوں"
یہ کہتے ہوئے وہ کھالے کے کنارے بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر اس نے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے پہلے اپنے چہرے پر مارے' پھر دونوں بازو اوپر اٹھا کر انہیں کہنیوں تک دھویا اور پھر شلوار اوپر کرکے دونوں پنڈلیاں بہتے پانی میں ڈال کر کھالے کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ اور دونوں ہاتھ گیلے کرکے اپنی گردن پر اور پھر گریبان کے اندر پھیرنے لگی جیسے تپتی زمین کی پیاس بجھارہی ہو۔ پانی کی ٹھنڈک پنڈلیوں کی رگوں کے راستے اس کے اندر گر رہی تھی۔ گیلی مٹی جس پر وہ بیٹھی تھی اس کے جسم کو سکون دے رہی تھی۔
"یوسف! تم نے کبھی سوچا ہے جب ہم مٹی کے ساتھ ملتے ہیں تو کتنا اچھا لگتا ہے۔ لگتا ہے مٹی سے ہمارا گہرا رشتہ ہے۔"
"اوہ بابا اٹھ جاؤ! اپنی نہیں تو میری ہی عزت کا خیال کرو!" یوسف نے اس کی بغل میں ہاتھ دے کر اسے' اس کے قدموں پر کھڑا کردیا۔
"مرد تو رہتا ہی عزت دار ہے۔ اسے کبھی فرق نہیں پڑتا" یہ کہہ کر اس نے جھک کر زمین سے اپنا دوپٹہ اٹھایا' گلے میں ڈالا' ایک دوسرے سے دور پڑے سلیپر اٹھاکر پہنے اور اپنے گاؤں کے راستے پر چل پڑی۔
جن قدموں پر وہ چل رہی تھی وہ قدم اس کے اپنے نہیں تھے۔ اسے دور تک جاتے' یوسف دیکھتا رہا اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی تو وہ خود بھی اپنے گاؤں کو روانہ ہوگیا۔

جرم

سارا گاؤں خبر سے بھرگیا
گذشتہ رات یوسف نے سراج کو قتل کردیا تھا۔
سارا دن اس قتل کے متعلق قیافے' اندازے لگائے جاتے رہے۔ جگہ جگہ لوگ ٹولیوں کی شکل میں کھڑے' آنکھوں میں حیرت اور

عجیب سی چمک لئے دبی دبی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔

گاؤں کی زندگی میں ویسے ہی بڑی یکسانیت تھی۔ جب کوئی ایسی واردات ہوتی تو لوگ ڈرنے کے باوجود اندر ہی اندر عجیب طرح کی ایکسائٹ منٹ کا مزہ ضرور لیتے تھے۔

ماجاں جس دن اپنے چھ بچوں اور خاوند کو سوتا چھوڑ کر ممیمے ماشکی کے ساتھ بھاگ گئی تھی تو ہفتوں لوگوں نے اس واردات کا ذکر کرکے مزہ لیا تھا۔ ماجاں اغوا ہوئی تھی۔ تو اس کے والدین نے اس کے ماسے کے لڑکے وریام کے خلاف اغواء کا پرچہ کرادیا۔ پھر ماجاں کو پولیس نے برآمد کرلیا مگر جب وہ عدالت میں پیش ہوئی تو اس نے اپنی مرضی سے اپنے ماں باپ کے ساتھ جانے کی بجائے اپنے ماموں اور ماموں زاد وریام کے ساتھ جانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

ایسے ہی کئی جرم گاؤں کی زندگی میں ہوتے رہتے تھے۔ سراج کے قتل کی جو کہانی لوگوں تک پہنچی وہ یوں تھی کہ گذشتہ رات وہ اپنے کھیتوں کو پانی لگا رہا تھا' اس وقت یوسف نے قریب کے کھیت سے اس پر پستول سے فائر کیا۔ گولی مقتول کے دل کے قریب ہی لگی۔ وہ بری طرح زخمی ہوا۔ زمینوں کے ڈیروں پر سوئے ہوئے لوگ فائر کی آواز سن کر جاگ اٹھے اور اندھا دھند جائے واردات کی طرف بھاگے۔ کچھ لوگوں نے یوسف کو جائے وقوع سے بھاگتے دیکھا۔ رات چاندنی تھی لوگوں نے اسے پہچان لیا۔ کچھ لوگ زخمی کے پاس ٹھہر گئے اور باقی یوسف کے پیچھے بھاگے اور گاؤں کی آبادی کے قریب اسے جا پکڑا اور لے جاکر پولیس کے حوالے کردیا۔ زخمی کو چارپائی پر ڈال کر قریبی گاؤں کے ہیلتھ یونٹ میں لے گئے۔

لوگ حیران تھے آخر یوسف نے یہ قتل کیوں کیا؟ وہ ایک شریف' بھلا مانس کسان تھا۔ اس کے خاندان میں قتل' اغوا کی کوئی روایت نہیں تھی۔

"یوسف ایسا شخص قاتل کیسے ہوسکتا ہے؟ چہرے سے تو وہ کسی طرح قاتل نہیں لگتا!" ماسٹر عمردین نے کچھ لوگوں کی موجودگی میں کہا

"ماسٹر جی! دنیا بہت ترقی کرگئی ہے۔ لوگوں نے چہرے چھپانے کا فن سیکھ لیا ہے۔ آپ کو کیا پتہ ماسٹر جی! آپ نے تو ساری عمر منڈے پڑھائے ہیں اسکول سے باہر کیا کچھ بدل گیا ہے' آپ کو کیا پتہ؟"

گاؤں کے نمبردار کی بات پر بہت سے لوگوں نے سرہلایا حالانکہ وہ اب تک ماسٹر جی کو سب سے بڑا عالم اور عقل مند آدمی سمجھتے آرہے تھے۔ لیکن انھیں نمبردار کے تجربہ کا بھی علم تھا۔ نمبردار تھانے کچہری کا سارا علم جانتا تھا پھر اب تک کئی الیکشن بھگتا چکا تھا۔ عملی دنیا کو برت برت کے اس نے بہت سی عقل جمع کرلی تھی۔ پھر گاؤں کی ساری زمینوں کا حساب اس کی تحویل میں تھا۔

"لیکن ہر جرم' ہر قتل کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔" ماسٹر جی نے پھر اپنے علم کا سہارا لیا۔

"بغیر وجہ کے بھی قتل ہوجاتے ہیں۔ کچہری میں ایسے مقدمے آتے رہتے ہیں۔ حادثے' اتفاقات' اس دنیا میں سارے کام کسی نہ کسی وجہ سے ہی تو نہیں ہوتے۔"

اب ماسٹر عمردین کے پاس نمبردار کے تجربے کا کوئی جواب نہیں تھا۔ "آپ تو بھولے بادشاہ ہیں ماسٹر جی۔ کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے وہ آدھا سچ بھی نہیں رہ گیا۔"

چوہدری کا منشی بدردین ان لوگوں کو اکٹھا کھڑے دیکھ کر وہاں رک گیا۔

"اس قتل کی وجہ ہے جسے بہت کم لوگ جانتے ہیں۔" منشی کے اس انکشاف پر سب چونک گئے۔

"پچھلے سے پچھلے سال ساون بھادوں کی بات ہے جب سارے ندی نالے اپنے کناروں سے باہر آگئے تھے اور جامنوں میں کیڑا پڑ گیا تھا۔ اسی سراج نے گلی سے گزرتی یوسف کی جوان بہن پر آوازہ کسا تھا۔ یوسف جب شام کو کھیتوں سے لوٹا تھا تو اس نے گلی میں کھڑے ہوکر غصے میں کہا تھا اگر سراجا مجھے اس وقت مل جائے تو میں اسے گولی مار دوں۔ سراج' یوسف کی دھمکی سے ڈر کر دوسرے گاؤں اپنے

ماموں کے ہاں چلا گیا تھا اور تین مہینے بعد واپس آیا تھا۔"

منشی کی بات سن کر کئی لوگوں نے گزرے وقت کا یہ واقعہ یاد کرنے کی کوشش کی۔ گاؤں کے واقعات لوگ بھولتے نہیں تھے۔

"کیا پولیس کو اس بات کا علم ہے؟" نمبردار نے پوچھا۔

"تفتیش ہوگی تو سب باتیں سامنے آجائیں گی۔"

منشی کی بات سن کر ایک دیہاتی نے کہا "کمال ہے بھئی! پھر تو یوسف نے آخرکار اپنی بہن کی بے عزتی کا بدلہ لے ہی لیا۔"

"ہاں! ہوئی تھی ایسی کوئی بات۔ مگر سراج نے یوسف کے گھر جاکر اُس سے اور اس کی ماں سے معافی مانگ لی تھی۔ اور پھر پچھلے سال یوسف کی بہن کی شادی بھی ہوگئی تھی۔ اس کا تو ایک بچہ بھی ہے۔ بڑی پرانی بات ہے۔ یہ قتل کی وجہ نہیں ہوسکتی۔" ماسٹر عمردین کی بات بہت سوں کے دل کو لگی۔

ماسٹر جی مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان کا ایک لڑکا شہر میں سرکاری ملازمت کرتا تھا۔ اخبار ان کے گھر میں ہر دوسرے روز ضرور آتا تھا۔ شہر کے حالات کا انہیں علم رہتا تھا۔ اور وہ نمبردار کے سارے تجربے کے باوجود گاؤں میں سب سے زیادہ پڑھے لکھے سمجھے جاتے تھے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ پٹواری، منشی، نمبردار، تھانے دار، کی بات کو وزن زیادہ ملتا تھا۔

"ماسٹر جی! بے عزتی کے پھٹ اتنی جلدی نہیں بھرتے۔ ہمارے ہاں لوگوں کی غیرت شہر والوں کی طرح سو نہیں جاتی، یہاں تو سارا کھیل ہی غیرت کا ہے۔ جب بھی جاگ جائے۔ کچھ نہ کچھ کرکے دکھاتی ہے۔" نمبردار نے بڑے فخر سے کہا اور ایسا کہتے ہوئے اس کا سر یوں اونچا ہوگیا جیسے وہی سب سے زیادہ غیرت مند ہو۔

ماسٹر جی کہنے لگے۔

"میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ہر انسان پر ہر روز ایسے کئی لمحے آتے ہیں جب وہ بہت کمزور پڑ جاتی ہے۔ اس کے شعور کی گرفت اس کے حیوانی جذبوں پر بڑی کمزور ہوتا ہے۔ وہ کسی بھی بہانے انسان کے درجے سے گرنے کو تیار ہوتا ہے۔ بعض بندوں کو ان لمحات کا علم ہوجاتا ہے۔ وہ خود کو سنبھال لیتے ہیں اور بعض ان کمزور لمحوں کے جال میں پھنس جاتے ہیں اور وہ کام کرجاتے ہیں جو نارمل حالات میں وہ کبھی نہ کرتے۔ آدمی کی بچت تبھی ہوتی ہے جب وہ اس وقت کی کمزوری سے اپنے آپ کو نکال لے جائے۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ یوسف اندر سے کسی وقت اتنا کمزور ہوسکتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے پانچویں جماعت سے آگے تعلیم حاصل نہیں کی پر وہ ایک سچا کسان ضرور نظر آتا تھا۔"

نمبردار نے ماسٹر جی کی پوری بات سمجھنے کی تو کوشش نہیں کی پر فوراً بولا۔

"ماسٹر جی! انہیں کمزور دقتوں میں تو کئی لوگ بڑے تگڑے ہوجاتے ہیں۔ قتل کرنا کسی کمزور بندے کا تو کام نہیں۔"

یہ سب لوگ بازار کے قریب ایک بڑ کے درخت کے نیچے مٹی کے تھڑے پر بیٹھے تھے۔ یہاں ہی اکثر گاؤں کے بڑے بڑے حادثات و واقعات کو موضوع بناکر لوگ جمع ہوکر باتیں کرتے اور سنتے تھے۔

رفیق پٹواری بھی ادھر سے گزرا تو اس نے موٹر سائیکل کھڑی کرلی "کیا باتیں ہورہی ہیں ماسٹر جی؟"

"وہی رات والے قتل کا قصہ ہے۔" ماسٹر جی کی بجائے نمبردار نے جواب دیا۔

"چوہدری جی کیا بنا اس واردات کا؟" منشی بدردین نے پوچھا

رفیق پٹواری نے موٹر سائیکل اسٹینڈ پر کھڑی کردی اور ان کے درمیان آکر بیٹھ گیا۔ دوسرے لوگوں نے سمٹ کر اس کے لئے جگہ بنادی۔

"تفتیش ہورہی ہے۔ میں جائے وقوع کا نقشہ بنانے جارہا ہوں ایس ایچ او نے مجھے تھانے بلایا تھا۔"

"اور سراج کا کیا حال ہے؟" منشی بدردین نے بے چین سا ہو کر سوال کیا۔
"شہر کے ہسپتال جا کر مر گیا۔ لیکن مرنے سے پہلے بیان دے گیا ہے نقشہ موقع کا لے کر تھانے جاؤں گا تو پتہ چلے گا اس نے کیا بیان دیا ہے۔"

پٹواری نے حقے کے دو تین کش لئے اور جلدی میں موٹر سائیکل پر سوار ہو کر گاؤں کے اس طرف چلا گیا جہاں قتل ہوا تھا اور جسے گاؤں کے بہت سے لوگ جا کر دور دور سے دیکھ آئے تھے۔ وہاں ایک سپاہی ڈیوٹی پر کھڑا کر دیا گیا تھا۔

گاؤں کے مشرقی جانب تالاب کے کنارے آج بہت کم عورتیں کپڑے دھونے آئی تھیں جو تھیں وہ کچھ سہمی سہمی' ڈری ڈری لگ رہی تھیں۔

"نی سنا ہے! سراجا ابھی تک زندہ ہے۔ ہسپتال میں ہے" ایک عورت نے دوسری کے کان میں سرگوشی کی۔

"پر گولی تو اس کے دل پر لگی تھی۔ ابھی تک بچ کیسے گیا؟" دوسری نے حیران ہو کر کہا

"میرا مرد کہتا تھا سراج کے چچا اور اس کے بیٹوں نے یوسف کو فائر کرتے دیکھا تھا۔ ان کے للکارے پر ہی تو یوسف موقع سے بھاگ اٹھا تھا۔" تیسری نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

تالاب کے دوسری طرف تین چار آدمی سر جوڑے باتیں کر رہے تھے۔

"سنا ہے ابھی تک پرچہ درج نہیں ہوا۔ چوہدری صاحب شکار سے لوٹیں گے تو ان کی مرضی سے پرچہ درج ہو گا۔" غلام دین مزارعے نے سرگوشی کی۔

"وہ بابا جمال تھا نا! جس کی بیٹی اغوا ہو گئی تھی' آج تک اس کا پرچہ درج نہیں ہوا۔ بابا جمال درخواستیں دے دے کر تھک کر پاگل ہو چکا ہے۔ اب تو وہ کہنے لگ گیا ہے اس کی بیٹی حویلی میں ہے۔" دتو موچی بھی کچھ کہنا چاہتا تھا کہ رفیق پٹواری کی موٹر سائیکل دیکھ کر وہ اپنی اپنی راہ چل پڑے۔

کتنے ہی دن گاؤں کی فضا میں عجیب سی اداسی اور سہم پھیلا رہا۔ اس قتل سے اگلی شام کو لال آندھی بھی آئی تھی۔ لوگوں کو پتہ تھا کہیں' نہ کہیں کوئی خون ہوا ہے مگر یہ بات بڑی عجیب تھی کہ یہ خون یوسف جیسے خوبرو اور گھبرو جوان کے ہاتھوں ہوا تھا۔ بہت سے لوگوں کو اور خاص طور پر جوان لڑکیوں کو بالکل یقین نہیں آتا تھا کہ یوسف اتنا سنگدل بھی ہو سکتا ہے۔

گھر گھر سراج کے قتل کی تفصیلات پہنچ رہی تھیں اور ان میں اضافہ ہو رہا تھا۔

تشویش

گھر گھر قصہ یوسف بکھر گیا تھا۔

ماں حسیناں بستی میں سب سے سیانی سمجھی جاتی تھی۔ ایک تو اس کی عمر اسی سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ زمانے بھر کا سرد گرم اس نے سہ ایا تھا۔ پھر اس کی عادتیں ایسی تھیں جنہوں نے اسے ایک خاص مقام اور سمجھ عطا کی تھی۔

اس کی ان ہی عادتوں کی وجہ سے اس کی صحت ابھی تک قائم تھی چہرہ سرخ و سفید تھا۔ اس چہرے پر جھریاں ضرور پھیل رہی تھیں مگر پانچ وقت نماز' وضو اور صفائی ستھرائی کا اس نے ساری زندگی اہتمام کیا تھا۔ کم کھاتی تھی۔ اتنی عمر پا کر بھی اس کی زندگی میں لالچ اور حرص نام کو نہیں تھا۔ گندے برتنوں میں کھانا نہیں کھاتی' کھانے پر مکھی بیٹھ جاتی تو جھٹ ہاتھ کھینچ لیتی۔ کپڑے ہمیشہ صاف ستھرے رہتے۔ گندگی کا ایک چھینٹا بھی پڑ جاتا تو لباس بدل لیتی۔

ابھی تک دانت سلامت تھے۔ جب وہ ہنستی تھی تو وہ دانت چمکتے تھے۔ آنکھوں پر حال ہی میں نظر کی عینک اس لئے لگوائی تھی کہ

خواب میں جب مرحوم شوہر عبداللہ کبھی نظر آجاتا تو اس کی شکل صاف دکھائی نہیں دیتی تھی۔ عبداللہ دس سال پہلے ماں حسیناں کو اداس چھوڑ کر فوت ہوا تھا۔ تو اس نے غم کیا تھا مگر بین نہیں کئے تھے اور نہ ہی یہ غم دل کو لگایا تھا۔ اس نے اپنی ساری محبت کا رخ اپنے بچوں کی طرف موڑ دیا تھا۔ یہ کسی کو پتہ نہیں تھا کہ وہ گاؤں میں کب حسیناں سے ماں حسیناں بن گئی تھی۔ اب تو بڑی بوڑھیاں جو خود کئی لڑکیوں کی مائیں تھیں اسے ماں حسیناں ہی کہتی تھیں۔ وہ سارے گاؤں کی ماں بن گئی تھی۔ مرحوم خاوند کو یاد کرتی تھی تو بیک وقت آنکھوں میں نمی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی۔

"فرید کا ابا مجھے کہا کرتا تھا رات کو خود کو سنبھال کر سویا کر۔ تیری پنڈلی بھی ننگی ہوجائے تو ڈر سے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔" ماں حسیناں کے بوڑھے سینے میں بہت سے لوگوں کے راز ان کی امانتیں دفن تھیں۔ عورتیں' لڑکیاں اس سے مشورہ کرنے اکثر آتی تھیں۔ اپنے اعترافات کبھی کبھی یوں ماں حسیناں کے سامنے کرجاتی تھیں جیسی وہ کوئی پادری ہو جس کے سامنے اپنے دل کے سارے راز اگل کر وہ ہلکا ہونا چاہتی ہوں۔

یوسف کے ہاتھوں سراج کا قتل بہت عجیب واقعہ تھا۔ عورتیں' لڑکیاں ماں حسیناں کے گرد بیٹھی تھیں۔ ان میں وہ بھی تھیں جو بور آئے آم کے درختوں کی طرح جذبات سے' خوبصورتی اور جوانی سے لدی پھندی ہوئی تھیں۔ اور ایسی بھی تھیں جو اپنے خاوندوں سے اب تک ناخوش تھیں اور اندر ہی اندر گاؤں کے نوجوان مردوں کو دیکھ کر اپنی بدنصیبی کو ضرور یاد کرلیتی تھیں۔

"تم نے وہ لال آندھی دیکھی تھی صغری؟"

"اس قتل سے ایک رات پہلے ہی تو آئی تھی۔ میرا دل تو اسی وقت سے ہول کھانے لگا تھا۔ میں نا کہتی تھی ضرور کوئی خون ہونے والا ہے۔" ماں حسیناں کے پاس بیٹھی نذیراں نے اپنے پڑوسن سے کہا۔

"شکر ہے اللہ کا! میری بے بے نے یوسف کی ماں سے میرے رشتے کی بات نہیں کی۔ اگر یہ رشتہ ہوگیا ہوتا تو آج میرا کیا ہوتا؟" سائراں نے اپنے پاس کھڑی زینب کے کان کے قریب منہ لے جاکر سرگوشی کی۔

"اسے دیکھ کر میرا دل قابو میں نہیں رہتا تھا۔ جی چاہتا تھا اس کے ساتھ کھیتوں میں ہل چلاؤں۔ نیچے کی مٹی اوپر اور اوپر کی نیچے کروں اس کے ساتھ تازہ مٹی والے کھیتوں میں لوٹنیاں لگاؤں۔ پر نماناں اب تو خونی بن گیا۔ شکل سے تو بڑا معصوم' اور بھولا بھالا دکھائی دیتا تھا۔"

سائراں کی باتیں سن کر زینب کے کان سرخ ہوگئے۔ وہ بھی ان لڑکیوں میں سے تھی جو چھپ چھپ کر یوسف کو گلیوں' بازاروں میں آتا جاتا دیکھ کر چلنا بھول جاتی تھی۔

"کسے پتہ تھا وہ اندر سے خونی نکلے گا" زینب نے ٹھنڈی سانس بھری

"میرا دل نہیں مانتا۔ وہ شکل سے ایسا لگتا نہیں۔ قاتلوں' خونیوں کی شکلیں اتنی سوہنی نہیں ہوتیں۔"

"کیوں ماں حسیناں یہ تیرا دل کیا کہتا ہے؟"

ماں حسیناں نے یہ سب باتیں سنی تھیں۔ کہنے لگی "میرے ہاتھوں کا جم پل ہے۔ وہ اور کچھ کرے نہ کرے' خون نہیں کرسکتا۔ خون کرنے کے لئے بڑا جگرا چاہئے۔ میں نے کئی قاتل دیکھے ہیں۔ یوسف ایسا نہیں تھا۔ اسے ضرور کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ ہوسکتا ہے اس نے کبھی اپنی جوانی پر مان کرلیا ہو فرید کا ابا' اللہ اسے بہشت نصیب کرے کہا کرتا تھا۔ حسینہ اپنی جوانی پر غرور نہ کرنا۔ نہ کسی دوسری کو کچی سمجھنا' رات کو بھی کبھی جان بوجھ کر پنڈلیاں ننگی نہ کرنا۔ وہ اندھیرے میں بھی چمکتی ہیں۔ تم ایسی لڑکیوں کو بڑی جلدی نظر لگ جاتی ہے۔ وہ دن اور آج کا دن' میں رات کو بھی اپنا آپ سنبھال کر سوتی ہوں۔"

ماں حسیناں نے اپنی بات مکمل کی تو جیسے اس کی بوڑھی آنکھوں میں یادوں کے چراغ جل اٹھے۔ مگر اس کے ہونٹوں پر وہی مخصوص

مسکراہٹ تھی جو ایسی عورتوں کے لبوں پر آتی ہے جو اپنی زندگی سے بہت مطمئن ہوں۔
سائراں نے پھر زینب کے کان میں کہا۔
"میں اسے چھپ کر دیکھتی تھی تو میری رگوں میں خون تیز تیز دوڑنے لگتا تھا۔ سانس رکنے لگتی تھی۔ وہ تو میرے خوابوں میں بھی آتا تھا۔ پہلے میں ڈرتی تھی' کسی سے بات نہیں کرتی تھی ماں حسیناں ٹھیک ہی کہتی ہے۔ اسے ضرور کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمہاری نظر ہی اسے کھا گئی ہو۔"
زینب کی بات سن کر سائراں نے برا سا منہ بنایا۔
"لے دیکھ! محبت سے دیکھنے سے بھی کسی کو بھلا نظر لگی ہے' جھلی نہ ہووے تو' ماں حسیناں تو پرانے وقتوں کی بات کرتی ہے۔"
ماں حسیناں سائراں کی بات سن لی تنک کر بولی
"وقت ایک ہی رہتا ہے بھولئے! ہم ہی آگے پیچھے ہوجاتے ہیں۔ جوانی کا اپنا زور ہوتا ہے۔ لیکن جوانی کو لگام دے کر رکھنا پڑتا ہے۔ نہیں تو یہ سرپٹ دوڑتی ہے اور پھر کسی روز منہ کے بل گرادیتی ہے۔"
سائراں کو نہیں پتہ تھا ماں حسیناں اس کی سرگوشی بھی سن لے گی وہ جھینپ گئی۔
"اب یوسفے کا کیا بنے گا ماں حسیناں؟"
ماں حسیناں کے پاؤں دباتی ماجاں نے فکرمند ہوکر کہا "تفتیش ہوگی۔ مقدمہ چلے گا۔ گواہیاں اور پھر فیصلہ۔ کیا پتہ اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔ سزا بھی ہوسکتی ہے۔"
ماجاں اور بھی فکرمند ہوگئی۔
"ہاں! سزا بھی ہوسکتی ہے۔ پھانسی کی سزا"
ماں حسیناں کا جواب سن کر تمام عورتوں اور لڑکیوں نے اپنے سینوں میں دھڑکتے دلوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

تفتیش

تفتیش کے لئے پولیس گاؤں آئی تھی۔
نمبردار نے آبادی دیہہ کے قریب میز' کرسیاں' چارپائیاں بچھادی تھیں۔ لوگ کام کاج چھوڑ کر وہاں جمع ہوگئے تھے۔ تفتیش والی اس جگہ کے قریب ہی قبرستان تھا جس کے چاروں طرف سایہ دار درختوں کے نیچے لوگ ٹولیوں کی شکل میں ادھر ادھر بیٹھے پولیس کی کاروائی دیکھ رہے تھے۔ بڑا تھانے دار کرسی پر بیٹھا تھا جب کہ دوسرے سپاہی چارپائیوں پر بیٹھ گئے تھے۔اس جگہ سے کافی دور جہاں گاؤں کی آبادی تھی بہت سی عورتیں اور لڑکیاں چھتوں' منڈیروں سے چمٹی ہوئیں اپنی آنکھوں کے زور سے سب کچھ دیکھنے سمجھنے کی کوشش کررہی تھیں۔ یوسف کو ہتھکڑی لگی تھی۔ زنجیر کا دوسرا سرا جس سپاہی کی پیٹی کے کنڈے میں بندھا تھا وہ چارپائی پر بیٹھا تھا۔ یوسف اس کے نزدیک کھڑا اس منظر کا حصہ بنا ہوا تھا جس کی اسے سمجھ نہیں آرہی تھی۔ اس کے چہرے پر گرد تھی' حیرت تھی وہ سوچ رہا تھا یہ کیا ہورہا ہے؟ یہ سب مذاق میرے ساتھ کیوں ہورہا ہے؟ جب میں نے قتل ہی نہیں کیا تو یہ سب کاروائی' یہ تفتیش کیوں ہورہی ہے؟
پچھلے کئی دنوں سے وہ تھانے کی حوالات میں تھا۔ اس کا خیال تھا پولیس یہ سب کچھ کسی بہت ہی بڑی غلط فہمی کی بنا پر کررہی ہے اور وہ وقت آیا ہی چاہتا ہے جب انہیں اپنی غلط فہمی کا احساس ہوجائے گا اور اسے چھوڑدیا جائے گا۔ اس لئے تھوڑا بہت پریشان ہونے کے باوجود اسے امید تھی کہ کسی بھی وقت اس کی ہتھکڑی کھول دی جائے گی۔ تھانے میں پولیس کے سخت رویے کو بھی وہ اسی لئے برداشت کرگیا تھا کہ یہ بے چارے خواہ مخواہ اتنا تردد کررہے ہیں۔ انہیں اصل قاتل ملنے کی دیر ہے' اسے چھوڑ دیا جائے گا۔

۔ اب وہ اپنے گاؤں میں تھا۔ بے گناہی کے سارے ثبوت اس نے اپنی نگاہوں میں جمع کر رکھے تھے۔
پولیس پارٹی پہلے اسے جائے واردات پر لے گئی جہاں مقتول زخمی ہو کر گرا تھا۔ مٹی پر خون کے نشان سیاہ ہو کر جم گئے تھے۔ پولیس نے خون آلود مٹی اٹھا کر کپڑے میں باندھ کر اس کی ایک پوٹلی بنائی۔ کاغذوں پر نمبردار' پٹواری اور گاؤں کے چیئرمین نے دستخط کئے۔
پھر گواہوں نے اپنی اپنی اس جگہ کی نشاندہی کی جہاں سے انہوں نے بقول ان کے یوسف کو فائر کرتے دیکھا تھا۔
پٹواری کے ساتھ ایک اور آدمی تھا جو کاغذ پر لکیریں مارتا جارہا تھا اور گواہوں کے کھڑے ہونے کی جگہوں پر مختلف نشان لگا رہا تھا۔
پولیس نے گواہوں کے بیانات لکھے کہ کس طرح یوسف نے فائر کیا اور مقتول مضروب ہو کر کہاں گرا۔
ایک گواہ نے وہ واقعہ بھی بیان کیا جس میں مقتول نے یوسف کی بہن پر آوازہ کسا تھا۔ اور یوسف نے گھر سے باہر آکر سراج کو قتل کرنے کی دھمکی دی تھی۔
تفتیشی افسر سب گواہوں کے بیان لکھتا جارہا تھا۔ اس کی زنجیر نے یوسف کے ہاتھ باندھ رکھے تھے اور وہ خود لسی پی رہا تھا جو چوہدری کے ڈیرے سے آئی تھی۔
گاؤں کی روایت تھی کہ جب بھی پولیس کا کوئی افسر یا اہلکار اس علاقے میں کسی سرکار کے سلسلہ میں آتا تو اس کی خوراک کی ذمہ داری چوہدری کے ڈیرے پر ہوتی جہاں کا مختار کار منشی بدرالدین تھا۔ اب بھی وہاں دوپہر کا کھانا پولیس کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ بہت کم ایسا ہوا تھا کہ کسی پولیس اہلکار نے چوہدری کے ڈیرے کا کھانا کھانے سے پرہیز کیا ہو اور وہ زیادہ دیر اس علاقے کے تھانے میں تعینات رہا ہو۔
تفتیشی افسر کی کاروائی کے دوران ایک آدھ مرتبہ یوسف نے دخل دینے کی کوشش کی تو تفتیشی افسر نے ڈانٹ کر چپ کرادیا۔ اس کی تفتیش کے مطابق یہ سیدھا سادا قتل کا کیس تھا جس میں شک کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ تو بہت خوش تھا کہ ساری کڑیاں ملتی جارہی تھیں۔ زنجیر بنتی جارہی تھی اور وہ جلد از جلد اس کا چالان کرکے عدالت میں بھجوا کر خلاصی کرانا چاہتا تھا۔ اس کے کھاتے میں ابھی تک دو ایک قتل کے ایسے مقدمے بھی پڑے تھے جن کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ ایسے اندھے مقدموں سے اسے بہت ڈر لگتا تھا۔
"تمہاری بات بھی سن لیں گے۔ تمہارا بیان بھی لکھنا ہے پہلے مجھے ذرا اپنی کاروائی تو مکمل کرنے دو!"
کاروائی کے دوران وقفہ بھی ہوا۔ پولیس پارٹی نے وہیں ایک طرف بیٹھ کر کھانا بھی کھایا۔
چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹے لوگ اس ساری کاروائی کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے یہ کوئی ریچھ بندر کا تماشا ہو۔ کسی نے کہیں بھی دخل انداز ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔
یوسف کی ماں' ماموں اور بہن بھی ذرا دور ہٹ کر بیٹھے تھے ابھی تک انہیں بھی یوسف سے زیادہ بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ باقی لوگ تو تماشائی تھے۔
بہت دیر سے انہیں تماشائی بننے کی عادت ہوگئی تھی۔ اس سے بڑھ کر' بدل کر بھی وہ کچھ ہوسکتے تھے' انہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ ان کی سوچوں کے مخصوص راستے تھے مخصوص پگڈنڈیاں تھیں۔ نئے راستے انہوں نے بنائے نہیں تھے۔
کھانے اور چائے پانی کے بعد پولیس پارٹی تازہ دم ہوگئی "اب بتا بچو! وہ پستول کدھر ہے جس سے گولی چلائی تھی؟"
یوسف نے حیرانی سے تھانے دار کی طرف دیکھا "کون سا پستول؟"
"بڑے چالاک بنتے ہو' چلو! آگے لگو" تھانے دار نے اٹھ کر اپنی چھڑی گھمائی۔
"کہاں؟" یوسف نے حیرانی سے پوچھا
"جہاں سے تم پکڑے گئے تھے"

یوسف چپ کھڑا رہا تو منشی بدردین نے کہا۔
"چلو جی! میں دکھاتا ہوں وہ جگہ جہاں سے ہم نے اسے پکڑا تھا" ساری تفتیشی پارٹی گاؤں کی طرف چل پڑی۔
کچے کوٹھوں کی چھتوں پر ہل چل مچ گئی۔ "ہائے! وہ سب ادھر ہی آرہے ہیں۔" ایک عورت کے منہ سے چیخ سی نکل گئی۔ باقی سب جیسے منڈیروں سے لٹک گئیں۔ وہ یوسف کو قریب سے دیکھنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے اسے پہلے کئی مرتبہ دیکھا تھا۔ دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھا تھا۔ اب وہ اسے نئے روپ میں دیکھنا چاہتی تھیں۔ منشی بدردین پولیس پارٹی کو گاؤں کی آبادی کے قریب لے آیا۔
"یہ ہے وہ جگہ جناب جہاں ہم نے اسے پکڑا تھا" وہ کھڑا ہو کر کہنے لگا۔
تھانے دار نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو قریبی چھتوں پر کھڑی کئی لڑکیوں اور عورتوں نے اپنے سر نیچے کر لئے۔
تھانے دار کی نگاہیں اس جگہ کے قریب ہی ایک ویران سے ڈھارے پر رک گئیں جہاں کبھی کوئی اپنے مویشی باندھا کرتا تھا۔ ڈھارے میں گھاس پھونس کا چھوٹا سا ڈھیر دکھائی دے رہا تھا۔
"دیکھو! وہاں جاکر تلاشی لو" منشی بدردین نمبردار اور دو سپاہی آگے بڑھے اور ساتھ ہی تھانے دار بھی تیزی سے قدم بڑھاتا وہاں پہنچ گیا۔ دوچار قدم ہی تو تھے وہاں پہنچنے میں۔
تھانے دار نے چھڑی سے گھاس پھونس کی اس ڈھیری کو چھیڑا تو اس کے اندر سے پرانے گوبر اور جانوروں کے پیشاب کی سڑاندھ کا بھبکا سا نکلا۔ تھانے دار کے منہ سے ایک گالی نکلی۔ مگر ساتھ ہی اسے اس ڈھیر میں وہ پستول بھی نظر آگیا جس کی انہیں تلاش تھی۔
یوسف کو اس کا پیٹی والا سپاہی ساتھ لے کھڑا تھا۔
تھانے دار کے چہرے پر ناراضگی کی جگہ خوشی کی کیفیت فوراً پھیل گئی۔ تھانے دار نے جیب سے رومال نکالا اور اس کی مدد سے پستول پکڑ کر یوسف کی آنکھوں کے سامنے لایا۔
یوسف کی حیرانی بڑھتی جارہی تھی۔
"پر جناب میرا اس پستول سے کیا تعلق ہے؟"
"تعلق تو خود ہی نکل آئے گا۔ پکڑے جانے سے پہلے تم آلہ قتل کو یہیں پھینک سکتے تھے۔ آخر قتل تو ہوا تھا نا؟" یہ کہہ کر پولیس پارٹی تھانے دار کی سرکردگی میں ڈھارے سے باہر آگئی۔
سب کے چہروں پر رونق تھی۔ یوسف کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں اور منہ کھلا ہوا تھا۔
"یہ سب آخر کیا ہورہا ہے؟" اس نے زور سے کہنا چاہا۔ مگر وہ بول نہ سکا۔ دوسری بہت سی باتوں کی طرح یہ بات بھی اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ بہت سے لوگوں کے سامنے یہ پستول برآمد ہوا تھا۔ اور پھر یہ ڈھارا اگر یوسف کا نہیں تھا تو کسی اور کے استعمال میں بھی نہیں تھا۔ سب موجود تھے۔ نمبردار' پٹواری' چیئرمین' امام مسجد' چوکیدار شہادتوں کی کمی نہیں تھی۔ سامنے کی بات تھی۔ کون جھٹلاتا؟
شہادتیں مکمل ہورہی تھیں۔
قتل کا جو پرچہ درج ہوا تھا اس میں یوسف کو واضح طور پر نامزد کیا گیا تھا۔
مقتول نے مرتے وقت جو بیان دیا تھا اس میں بھی اس نے یوسف کا نام لیا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی زبان میں اس نے جو بیان لکھایا تھا۔ اس کے نیچے اس نے مرنے سے پہلے اپنے ہاتھ کا انگوٹھا ثبت کیا تھا۔ یہ بیان ڈاکٹر کی موجودگی میں لکھا گیا تھا۔ ڈاکٹر کے لئے اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ مضروب بیان دینے کے قابل ہے بھی یا نہیں۔ اس بیان کے بعد ہی اس کی آنکھیں پلٹ گئی تھیں لگتا تھا وہ یہی بیان دینے کے لئے کچھ دیر زندہ رہا تھا۔ وگرنہ جونہی اسے ہسپتال منتقل کیا گیا اس کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں۔ کسی کو نہیں پتہ تھا کہ ایسے میں اس کے دماغ کا کونسا حصہ کام کررہا تھا۔ اس نے مرتے سے جیسے اپنی ساری بکھرتی یادداشت کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی تھی۔

"میں نے یوسف کی بہن..... کو گالی نہیں دی تھی......وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ وہ بڑی خوبصورت تھی۔
مضروب کے ہونٹ مسکرانے کی کوشش میں پھڑپھڑائے۔
"وہ.....میں نے یوسف سے معافی مانگ لی تھی۔اس نے شاید مجھے معاف.....معاف نہیں کیا تھا.....پتہ تھا وہ مجھے ضرور گولی مار دے گا۔ میں ڈرتا رہا.....اس نے قسم کھائی ہوئی تھی۔ رات اس نے مجھے گولی ماردی.....میں نے اسے دیکھا تھا" بیان دیتے ہوئے اس کی سانس اکھڑ گئی۔
"اس نے کونسے کپڑے پہن رکھے تھے؟" تھانے دار نے اس کے کان کے قریب منہ لے جاکر پوچھا
مضروب نے بولنے کی کوشش کی۔ اس کی آنکھوں میں روشنی بجھ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر اس کی نبض چیک کی پھر سٹیتھو سکوپ سے اس کے سینے کی دھڑکن سننا چاہی۔ ڈاکٹر کے کانوں میں خاموشی سائیں سائیں کرنے لگی۔
اس نے مایوسی میں سرہلادیا۔
تھانے دار نے جلدی جلدی اس کے بے جان ہاتھ کے انگوٹھے پر سیاہی لگائی اور اس نشان کو کاغذ پر اتارلیا۔
مضروب کو نہیں پتہ تھا کہ اس کا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں ہے۔
"یہ ابھی زندہ ہے مگر مزید بیان دینے کے قابل نہیں"
"چلیں اتنا ہی کافی ہے" ڈاکٹر کی رائے کے جواب میں تھانے دار نے اپنے کاغذات سنبھالتے ہوئے کہا۔
تفتیشی افسر کے لئے مقتول کے اس نزعی بیان سے بہت سہولت ہوگئی تھی۔ سارا قانون جانتا تھا' کتابیں کہتی تھیں مرتے وقت انسان کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔
اب چشم دید گواہان کے بیانات اور آلہ قتل کی برآمدگی کے بعد تو تفتیشی افسر بہت خوش تھا۔ یہ اس کی نوکری میں شاید پہلا قتل کا مقدمہ تھا جس میں اسے ملزم پر کوئی تشدد کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی بلکہ وہ تو ملزم کے غیر معمولی اطمینان پر بعض اوقات حیران ہونے لگتا تھا۔ اس کے لئے یہ بات تو اور بھی تسلی کا باعث تھی کہ یہ مقدمہ ضرور اس کی سزا یابیوں کے ریکارڈ میں اضافہ کا باعث بنے گا۔ استغاثہ کی اتنی پکی شہادتوں کے بعد ملزم کا بیان اور صفائی محض رسمی کاروائی رہ گئی تھی۔
"لو! کاکا لی اب تم بھی اپنا بیان لکھوا ہی دو!"
یوسف نے اجازت ملتے ہی کہا۔
"جناب! میں تو کب سے آپ کو بتارہا ہوں میں نے یہ قتل نہیں کیا۔ میں بے گناہ ہوں۔ آپ نے ایسے ہی مجھے پکڑ رکھا ہے۔"
"سراج کو کیا فرشتے قتل کرگئے تھے؟ اور پھر اتنی گواہیاں جو تمہارے خلاف ہوئی ہیں؟" تفتیشی افسر نے غصے سے تلملاتے ہوئے پوچھا۔
"مجھے نہیں پتہ سراج کو کس نے قتل کیا ہے۔ میں تو اتنا جانتا ہوں میں نے یہ قتل نہیں کیا۔ مجھے کیا ضرورت تھی اسے قتل کرنے کی اور یہ سارے گواہ پتہ نہیں کس مغالطے میں میرا نام لئے جارہے ہیں۔" یوسف نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔
"تم قانون کو بے وقوف سمجھتے ہو؟"
"نہیں جی! میں نے یہ تو نہیں کہا"
یوسف کی بات سن کر تفتیشی افسر نے کرسی پر پہلو بدلا اور کاغذ قلم تیار کرتے ہوئے کہا
"اچھا یہ بتاؤ تمہاری زمین سراج کی زمین سے ملحقہ ہے یا نہیں؟"
"جی ہاں! وہ تو ہے"

"اور تم وقوعہ والی رات اپنی زمین کو پانی دینے گئے تھے یا نہیں؟" تھانے دار نے اگلا سوال پوچھا

"تم نے فائر نہیں کیا تھا؟" تفتیشی افسر نے براہ راست پوچھا۔

"نہیں جی! میں نے فائر کی آواز سنی تھی۔"

"اور فائر کی آواز سن کر تم نے کیا کیا تھا؟" تھانے دار نے اگلا سوال کیا۔ ساتھ ساتھ وہ یوسف کے جواب لکھتا جارہا تھا۔

"......میں فوراً بھاگ اٹھا تھا۔" یوسف نے کچھ سوچتے ہوئے کہا

"تم کدھر بھاگے تھے؟"

"جی! میں بھاگا تو جائے وقوع کی طرف ہی تھا لیکن جب بہت سے لوگ میرے پیچھے بھاگتے ہوئے آئے اور انہوں نے مجھے آبادی کے قریب پکڑلیا تو مجھے پتہ چلا کہ میں جائے وقوع کی بجائے دوسری سمت بھاگ رہا تھا جدھر گاؤں کی آبادی تھی۔"

تھانے دار اس کی بات سن کر ہنس پڑا "کیا بکواس کرتے ہو؟ بھاگے تم جائے وقوع کی طرف اور جب ہوش آیا تو تم گاؤں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ ایسا کبھی ہوتا ہے۔"

"پتہ نہیں جی! میرے ساتھ تو ایسا ہی ہوا تھا۔ مجھے تو خود بعد میں پتہ چلا تھا۔" یوسف نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

"اچھا یہ بتاؤ تم نے جائے وقوع کے قریب کسی اور کو دیکھا تھا؟"

"جی نہیں! مجھے تو کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ میں نے خیال ہی نہیں کیا"

جس اطمینان سے یوسف جواب دے رہا تھا اسے محسوس کرکے تفتیشی افسر چڑ رہا تھا۔

"پھر یہ پستول کیسے تمہاری نشاندہی پر برآمد ہوگیا؟" تھانے دار نے ایک اور سوال کیا۔

"پتہ نہیں جی! مجھے تو خود بھی پتہ نہیں چلا۔ وہ پستول وہاں کیسے پہنچا۔ میں نے کئی مرتبہ اس ڈھارے میں پیشاب ضرور کیا تھا۔ آپ کو بھی تو بو آئی تھی۔"

"تم اصل میں بڑے چالاک بنتے ہو؟ جتنے بھولے بھالے لگتے ہو اتنے ہو نہیں۔"

یوسف کے پاس تھانے دار کی اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ بس وہ تھوڑا سا مسکرا پڑا۔ یہ مسکراہٹ تھانے دار کو بہت کھلی۔

"ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے تمہارا بیان مکمل کرلیا ہے۔ اصل بات تو استغاثہ کی شہادتوں کی ہے۔ وہ سب کی سب تمہارے خلاف ہیں۔"

تفتیشی افسر اس کے جوابوں سے اکتاگیا تھا۔ اندر ہی اندر اس کی خواہش تھی کہ ملزم اگر اپنے جرم کا اقبال کرلیتا تو اس کی محنت اور بھی کم ہوجاتی ہے۔

"کوئی صفائی دینا چاہتے ہو؟" تھانے دار نے پوچھا

"نہیں جی! میں کہہ جو رہا ہوں میں نے کوئی قتل نہیں کیا" اب کے یوسف نے اپنے لہجہ میں تھوڑا وزن پیدا کرتے ہوئے کہا اور پھر رک کر کچھ دیر بعد بولا "ویسے یہ سب بہت اچانک ہوا جناب۔ فائر' مجھے تو ہوش ہی نہیں رہا کہ ایسے موقعوں پر کیا کرنا چاہئے۔ میں تو فائر کی آواز سن کر فوراً ہی بھاگ اٹھا تھا۔ بغیر سوچے سمجھے آدمی کا کیا ہے جی۔ کئی دفعہ اسے پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ کیا کررہا ہے۔ آپ کو بھی شاید کبھی تجربہ ہوا ہو۔"

تفتیشی افسر یوسف کی بات سن کر چند لمحوں کے لئے خاموش رہا۔ کئی ایک واقعات جیسے اس کی یادداشت میں تازہ ہونے لگے تھے۔

پھر اسے کوئی بات یاد آئی تو کہنے لگا ایک بات تم سے پوچھنی رہ گئی

یوسف متوجہ ہوگیا۔

"تمہیں یاد ہوگا دو تین سال پہلے مقتول نے تمہاری بہن پر آوازہ کسا تھا؟"

"جی ہاں یاد ہے"

"اور تم نے بھرے بازار میں کھڑے ہو کر کہا تھا اگر میرے پاس پستول ہوتا اور سراج مجھے مل جاتا تو میں اسے گولی مار دیتا؟"

یوسف نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں کہا تھا۔ میں اس وقت غصے میں تھا اور لوگوں کو بھی دکھانا چاہتا تھا کہ میں بھی غیرت مند بھائی ہوں۔ مجھے پتہ تھا میرے پاس کہاں سے پستول آنا تھا میں نے ایسے ہی بات کہہ دی تھی۔ سراج وہاں موجود نہیں تھا۔ پھر آدمی ہر وقت غصے میں تو نہیں ہوتا۔ اس نے مجھ سے بعد میں معافی مانگ لی تھی۔ وہ مجھ سے ڈرا ڈرا رہتا تھا۔ شاید اسی ڈر کی وجہ سے اس نے میرا نام لیا ہو۔۔۔"

"تمہاری بات کون مانے گا؟ اس وقت تمہارے پاس پستول نہیں تھا۔ جب تمہیں پستول مل گیا اور سراج بھی اکیلے میں تمہیں مل گیا تم نے اسے گولی ماردی۔" تفتیشی افسر نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"نہیں جی! یہ بات غلط ہے۔ قتل میں نے نہیں کیا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"اب اس کا فیصلہ تو عدالت ہی کرے گی۔ میں چند دنوں تک چالان عدالت میں بھیج دوں گا۔" یوسف کھڑا کھڑا تھک چکا تھا۔ وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ "تم اگر اپنا جرم مان لیتے تو شاید عدالت تمہارے ساتھ نرمی برتنے پر تیار ہوجائے ورنہ ایسے مکمل اور شک شبے سے پاک قتل کے مقدمے میں ملزم کو صرف پھانسی کی سزا ہوجاتی ہے۔ تمہارے پاس اپنا کوئی ثبوت ہے نہیں۔"

قریب کھڑے تمام لوگ تھانے دار کی بات سن کر جیسے کانپ گئے۔ سورج ڈوبنے کو تیار تھا۔

چوہدری کے کامے چائے لے کر آرہے تھے۔ یوسف سوچ رہا تھا۔ میں اب اس بات کا کیا ثبوت دوں کہ میں نے قتل نہیں کیا۔

وہ بہت حیران تھا کہ اس نے قتل نہیں بھی کیا تب بھی اس کے خلاف اتنے سارے ثبوت کیسے جمع ہوگئے۔ گاؤں کی عورتیں حیران تھیں کہ آج ڈوبنے والا سورج اتنا زیادہ سرخ کیوں نظر آرہا تھا۔

اندر باہر

عدالت میں یوسف کی آج پہلی پیشی تھی۔

پیلی سی بلند بلڈنگ کے بڑے سال خوردہ دروازے کے پاس' برآمدے میں' یوسف پولیس کی حراست میں بنچ پر بیٹھا تھا۔

لکڑی کی اس بینچ کی پچھلی ٹانگیں نہیں تھیں۔ ان نہ ہونے والی ٹانگوں کی کمی اینٹیں رکھ کر پوری کی گئی تھی۔

قریب یوسف کا وکیل' اس کا ماموں اور ماں کھڑے تھے۔ یوسف کی ماں کے ہاتھوں میں پراٹھوں کی پوٹلی تھی۔ سفید ململ رنگ کے رومال میں خالص گھی اور اچار کی ملی جلی خوشبو پھوٹ کر پھیل رہی تھی۔ رومال گھی میں بھیگ رہا تھا۔

جس حوالدار کی حراست میں یوسف تھا اس کی توجہ بار بار ہر چیز سے ہٹ کر اس رومال میں بندھے گھی میں نچڑتے پراٹھوں پر تھی' اور وہ اس وقت کا بے چینی سے انتظار کررہا تھا جب یہ پوٹلی کھلے گی۔ اسے پتہ تھا اس رزق میں اس کا بھی حصہ تھا

عدالت کا نائب قاصد پکار لگا رہا تھا۔

"سرکار بنام فلاں فلاں حاضر ہووے۔"

ملزمان' ان کے لواحقین اور کالے کوٹ پہنے وکیل اور ان کے پیچھے ان کے منشی قانونی کتابوں کے ٹرے اٹھائے داخل ہورہے تھے' نکل رہے تھے۔

جالی کا دروازہ بار بار کھلتا' بند ہوتا تو چوں چوں کی اونچی آواز میں احتجاج کرتا۔ دونوں پٹ بار بار آپس میں بجتے تھے۔ اندر باہر انسانی

اوازوں کا بھی کافی شور تھا۔ اس سامنے والی عدالت کے پیچھے اور ساتھ ساتھ دونوں طرف کے برآمدوں میں بہت سی دوسری عدالتیں بھی تھیں۔

یوسف کے وکیل نے اس کی ماں اور ماموں کی موجودگی میں کہا۔

"میں نے تمہارا مقدمہ بہت اچھی طرح پڑھا ہے' گواہوں کے بیانات' مختلف فردات دیکھی ہیں پھر تمہارا بیان بھی غور سے پڑھا ہے۔ لگتا ہے تمہارے مقدمہ کی اچھی طرح پیروی نہیں کی گئی۔ خاص طور پر تمہارا موقف ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ استغاثہ کی شہادتیں بڑی مضبوط ہیں۔ ان کے اعتبار کو توڑنا' ان کے درمیان تضادات تلاش کرنا بڑا مشکل کام ہوگا۔ میں نے آج تک جتنے بھی مقدمے لڑے ہیں' یہ مقدمہ ان سب سے مشکل ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس مقدمہ کی ایک ایک تفصیل مجھے بتادو۔ کوئی بات مجھ سے چھپانے کی ضرورت نہیں ویسے بھی کہتے ہیں ڈاکٹر سے اپنا مرض اور وکیل سے اپنا جرم نہیں چھپانا چاہئے۔"

یہ کہتے ہوئے وکیل نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"نہیں وکیل صاحب! میں آپ کو سارے واقعات بتا چکا ہوں۔ میں نے آپ سے کوئی بات نہیں چھپائی۔ سچ وہی ہے جو میں نے آپ کو اور پولیس کو بتایا تھا۔ حقیقت یہی ہے کہ میں نے قتل نہیں کیا۔ میں بے گناہ ہوں۔" یوسف کے لہجے میں اب بھی اعتماد کی جھلک تھی' وثوق تھا۔

یوسف کی ماں نے بڑی بے چارگی سے' گرد آلود آنکھوں میں آئے آنسو اپنے دوپٹے سے پونچھتے ہوئے کہا۔

"میں نے اپنی آدھی اراضی بیچ دی ہے۔ آپ کو منہ مانگی فیس دی ہے۔ آپ نے آج تک بڑے ملزم بری کرائے ہیں۔ آپ کی شہرت سن کر ہی تو ہم نے آپ کو اپنا وکیل کیا ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں! اللہ کرم کرے گا۔ میں تو اپنے اطمینان کے لئے کہہ رہا تھا کہ یوسف کو اچھی طرح اپنے ذہن پر زور دے کر ہر بات کو یاد کرلینا چاہئے تاکہ کوئی بات ایسی نہ ہو جو وہ مجھے نہ بتاسکا ہو۔ عدالت میں جو باتیں نہیں بھی کہی جاسکتیں' وہ بھی وکیل کے علم میں ہونی چاہئیں۔ اس سے مقدمہ جیتنے میں آسانی رہتی ہے۔" یہ کہتے ہوئے وکیل نے یوسف کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ خاموش تھا۔

وکیل نے پچھلے کئی دن بار بار اس مقدمہ کی فائل پڑھی تھی۔ استغاثہ کی شہادتیں اپنی جگہ مکمل تھیں۔ ان میں شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی۔ پھر ملزم کا بیان تھا۔ مگر وکیل کو اندر ہی اندر میں یہ احساس ہوتا تھا کہ کوئی حقیقت کوئی بات ایسی ہے جو اس مقدمہ میں نہیں ہے۔ لیکن اس کا تعلق اس قتل سے ضرور ہے۔

اتنے میں یوسف کے مقدمہ کی پکار ہوئی تو یوسف کی ماں کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ یوسف کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں دیکھ کر اس کا کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ وہ ماں تھی۔ اس نے یوسف کو اپنی کوکھ میں رکھا تھا۔ اسے پالا پوسا تھا۔ خاوند کی موت کے بعد' دوسری شادی کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ حالانکہ ابھی اس کے جسم میں جوانی تھی اور اس سے دو ایک جوان شادی کرنے کو بھی تیار تھے۔ اس نے اپنی باقی زندگی یوسف کی پرورش میں صرف کردی تھی۔ یوسف کے مزاج' اس کے خون کی گردش تک سے باخبر تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یوسف قتل نہیں کرسکتا۔ پھر بھی وہ اب ملزم بنا ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنے قانون کے سامنے موجود تھا۔ اسے اب بھی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ یوسف کی بے گناہی کیسے ثابت کرے۔

عدالت میں یوسف پر استفسار ہوا کیا تم نے فلاں تاریخ فلاں مقام پر سراج کو قتل کیا تھا۔ یوسف نے اپنے اوپر عائد کردہ الزام کو ماننے سے انکار کیا۔ جرم سے انکار اس کی آواز ہی نہیں' اس کے چہرے پر پھیلا اعتماد بھی کررہا تھا۔

عدالت نے آئندہ پیشی پر گواہوں کی طلبی کا حکم جاری کیا اور مقدمہ ملتوی ہوگیا۔ پیشی کے بعد' یوسف سپاہیوں کی حراست میں بڑی عدالت کے سامنے گھاس کے میدان میں بیٹھ گیا۔

یوسف کی ماں نے پراٹھوں کی پوٹلی کھولی اور پہلے ایک ایک پراٹھا اور اچار کی ایک ایک قاش دونوں سپاہیوں کو اور باقی پوٹلی یوسف کے سامنے رکھ دی۔

یوسف جب پراٹھا کھارہا تھا اس کی ماں اسے بے بسی اور پیار کی ملی جلی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

لقمہ منہ میں ڈالنے کے لئے یوسف دونوں ہاتھ چہرے تک لے جاتا تو اس کی ہتھکڑیاں بج اٹھتیں اور اس کی ماں کے کلیجے پر جاکر لگتیں۔ پھر اس کی ماں آنکھوں میں آنسو بھر کر اپنے ہاتھوں سے لقمے بنا بنا کر یوسف کے منہ میں ڈالنے لگی۔ اس کا ماموں کہیں سے ٹین کا ایک جگ اور ایلومینیم کا گلاس لے آیا جس کے کنارے استعمال کی زیادتی سے کبھی کے مڑ چکے تھے۔ اس نے پہلے دونوں سپاہیوں کو اور پھر یوسف کو پانی پلایا۔

"ماں صدقے! پتہ نہیں کس کی نظر لگ گئی میرے بیٹے کو؟" یوسف کی ماں سسکنے لگی۔ اس کا بیٹا اتنا گبھرو اور بانکا تھا کہ وہ اپنی بیوگی کا دکھ بھول گئی تھی۔

سپاہیوں نے جلدی جلدی اپنے حصے کی روٹی ختم کی' انہیں ڈر تھا کہیں چھوٹا تھانے دار ان کی خبر گیری کو نہ آجائے۔

حولدار نے زنجیر اکٹھی کی۔

اب چلو! کافی دیر ہوگئی ہے۔"

"وے پتر! تھوڑا وقت اور دے دے۔ بیٹے کو رجھ کر دیکھ لینے دے۔ اگلی پیشی میں تو بڑے دن ہیں۔ کتنا کمزور ہوگیا ہے میرا بیٹا!" یوسف کی ماں نے ترلا کیا۔

"چنگا بھلا ہے مائی!" حوالدار نے یوسف کی چوڑی چھاتی اور مضبوط کندھے دیکھ کر کہا۔

یوسف نے بیٹھے بیٹھے حوالدار کے پاؤں پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔ حولدار جیسے پگھل گیا۔ اس نے عدالتوں کے احاطے کے باہر گیٹ کی طرف دیکھا۔ حوالاتیوں کی لاری وہاں کھڑی تھی اور اس کی جالیوں سے لگے قیدی باہر کا منظر اپنی یادداشت میں اتار رہے تھے۔ حوالدار پھر بیٹھ گیا۔

"لے مائی! تو اپنا شوق پورا کرلے۔ ساڈی خیر اے"

ان کے قریب بہت سے لوگ ٹولیوں میں بٹے بیٹھے تھے۔ یہ مختلف مقدموں کے ملزم تھے' گواہ تھے' ملزموں کے عزیز رشتہ دار اور ساتھ حراست کی زنجیروں سے بندھے پولیس کے سپاہی بھی تھے۔ پولیس کے سپاہی جلدی جلدی قیمتی سگریٹوں کے سوٹے لگا رہے تھے۔ عدالتوں کے بڑے احاطے کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ وکیلوں کے ڈھارے تھے جہاں کرسیوں پر' پھٹوں پر' سائل' مقدمے باز اور ضرورت مند بیٹھے تھے۔ کالے کوٹ پہنے وکیل عدالتوں میں داخل ہورہے تھے' نکل رہے تھے۔ ان کی بغلوں میں خاکی لفافے تھے۔

بھاگ دوڑ کا عجیب سا منظر تھا۔ زنجیریں' ہتکڑیاں' بیڑیاں کھڑک رہی تھیں۔ عجیب دنیا تھی۔ عجیب سے تھا۔ کئی لوگوں کے چہروں پر غم تھا۔ وہ انصاف کی لڑائی لڑ رہے تھے۔ بعض چہروں پر مایوسی تھی' ناامیدی تھی بے چارگی تھی۔ بعض چہرے انتظار میں ترخ رہے تھے' ان کے نقوش بکھر رہے تھے۔

یوسف کا ماموں گولڈ لیف کی دو ڈبیاں لے کر آیا اور ایک حوالدار کو اور دوسری سپاہی کو دے دی۔ حوالدار نے ڈبی پکڑتے ہوئے کہا۔

"ہمیں اس طرح قیدیوں کو ان کے گھر سے آیا ہوا کھانا کھلانے کی اجازت نہیں۔ پر کیا کریں' اماں کا لحاظ آجاتا ہے۔ اس کا بیٹا لاکھ قاتل سہی پر یہ تو بے چاری ماں ہے۔"

حوالدار نے جب یہ بات مکمل کرلی تو عجیب سا محسوس ہوا جیسے اس کی بات کے کوئی گہرے معنی ہوں۔ حالانکہ اس نے ویسے ہی یہ

بات کردی تھی۔ سگریٹ کی ڈبی لیتے ہوئے اسے ایسی ہی کوئی بات ضرور کرنی چاہئے تھی۔ بس' اور تو کوئی خیال نہیں تھا۔

"میں نے تو اسے اپنا دودھ پلایا تھا۔ پتہ نہیں یہ قتل کا شوق اس کے خون میں کہاں سے آگیا؟"

یوسف اپنی ماں کی یہ بات سن کر تڑپ اٹھا۔

"تو تو مجھے قاتل' خونی نہ کہہ ماں! کیا تیرا خون گواہی نہیں دیتا کہ میں بے گناہ ہوں؟"

"دیتا ہے۔ ضرور دیتا ہے۔ میرا ایک ایک لوں کہتا ہے کہ تو بے گناہ ہے مگر......"

"مگر کیا ماں؟" یوسف کی آواز میں کرب گھلا ہوا تھا۔

"مگر یہ ہتھکڑیاں' یہ گواہ' ماں کے دل کو کون سمجھتا ہے؟ تمہارے اندر کیا ہوتا رہتا ہے' مجھے شاید اس کا پوری طرح پتہ نہیں چل سکا۔ یہ اندر ہی اندر کبھی کبھی بندہ کتنا بدل جاتا ہے۔"

"یہ کیا؟ کیسی پڑھے لکھے والوں کی سی باتیں کرنے لگی ہو بے کتے؟"

یوسف کے ماموں نے ہنسنے کی کوشش کی دور سے تھانے دار کو آتے دیکھ کر حوالدار اور سپاہی دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ یوسف زنجیر کی کھینچ سے خود بخود کھڑا ہوگیا۔ وہ شاید اس کا عادی ہوچکا تھا۔ جدھر زنجیر کھنچتی تھی' کھنچتا چلا جاتا تھا۔

آگے آگے حوالدار اور سپاہی' پیچھے یوسف اور یوسف کے ساتھ ساتھ اس کی ماں اور ماموں حوالاتیوں کی لاری تک پہنچے۔ یوسف کی ماں نے اپنے بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھا ہوا تھا اور اپنے ہاتھ کے دباؤ سے اسے حوصلہ دے رہی تھی خود اس کے بھائی نے اپنی بہن کے کندھے پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔

لاری میں داخل ہوتے ہی یوسف کی ہتھکڑی کھول دی گئی۔ یوسف دوسرے قیدیوں کے ساتھ پنجوں کے بل کھڑا ہوکر باہر کا منظر نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ لاری کے فرش پر بیٹھ گیا۔

لاری چلی تو باہر یوسف کی ماں سڑک کے کنارے بیٹھ کر رونے لگی۔ اس کے بھائی نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"ہم نے بڑا تگڑا وکیل کیا ہے۔ بھاری فیس دی ہے' وہ ضرور ہمارے یوسفے کو بری کرالے گا۔"

مگر یوسف کی ماں کا دل سنبھلتا نہیں تھا۔

جب تک یوسف اس کے سامنے بیٹھا تھا' اس نے خود کو سنبھالے رکھا تھا اب وہ رجھ کر رو رہی تھی۔ جب اس کے آنسوؤں کا زور ٹوٹ گیا' تو خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور آہستہ آہستہ شہر سے باہر کے راستے پر چل پڑی۔

مفروضے

چھٹی پیشی پر عدالت سے باہر نکلتے ہوئے وکیل نے یوسف کو برآمدے میں کھڑا کرلیا۔

"دیکھو برخوردار! اتنی پیشیوں پر بہت سے چشم دید اور دوسرے گواہوں کی شہادت قلم بند ہوچکی ہے۔ میں نے ان پر بڑی لمبی جرح کی ہے مگر وہ کہیں بھی تھڑکے نہیں ان کے بیان آپس میں ملتے ہیں۔ ان میں کوئی واضح فرق نہیں۔ ہوسکتا ہے سرکاری وکیل نے انہیں اچھی طرح یہ بیان پڑھائے ہوں لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہوں نے یہ وقوعہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ اگر باقی گواہوں نے بھی اسی طرح پکی شہادتیں دیں تو' مجھے ڈر ہے تمہیں سزا سے بچانا مشکل ہوجائے گا۔"

"وکیل صاحب! یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ گواہوں نے مجھے کیسے فائر کرتے دیکھ لیا جب کہ میں وہاں تھا ہی نہیں میں نے فائر کیا کرنا تھا مجھے تو سرے سے پستول چلانا ہی نہیں آتا۔ آخر ان گواہوں نے مجھے وہ کچھ کرتے کیسے دیکھ لیا جب میں وہاں تھا ہی نہیں؟"

"کیا بات کرتے ہو برخوردار؟ کبھی کبھی تمہاری بات بالکل میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"جناب! میری بات آپ کی سمجھ میں کیسے آسکتی ہے جب کہ آپ پر قتل کا کوئی الزام نہیں۔ جھوٹے الزام کا دکھ آپ کیا جانیں؟"

یوسف کی بات میں عجیب سی کاٹ تھی جو وکیل صاحب نے محسوس تو کی مگر وکیل تھے، برداشت کرگئے۔ پھر یہ ملزم کی بات تھی اس کا اثر دیرپا کیسے ہو سکتا تھا۔

"اچھا یہ بتائیں وکیل صاحب! جج صاحب نے تو مجھے قتل کرتے نہیں دیکھا؟"

"عجیب بیوقوف ہو؟ منصف تو گواہوں کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ ان کی اپنی آنکھیں کچھ نہیں دیکھتیں۔ اسی لئے تو کہتے ہیں قانون اندھا ہوتا ہے۔" وکیل صاحب نے ناراض ہوتے جواب دیا۔

"گواہوں کی آنکھیں دھوکہ بھی تو کھاسکتی ہیں۔ منصف کی تو اپنی نظر، اپنی آنکھ ہونی چاہئے تبھی اسے سفید، سفید اور کالا، کالا نظر آسکتا ہے۔"

"واہ بھئی! ہو تو دیہاتی باتیں کرتے ہو بڑی بڑی" وکیل صاحب نے تعجب سے کہا

"بس یہ سب باتیں ان ہی دنوں میرے دماغ میں آنا شروع ہوگئی ہیں۔ ورنہ مجھے تو باتیں سیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا" وکیل ہنس پڑا۔

"لیکن میرے بھائی! ان باتوں کی اس مقدمے کی کاروائی میں کوئی اہمیت نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ تمہارے مقدمے میں استغاثہ کی شہادتوں کو جھٹلانا ممکن نہیں، اور پھر تمہاری صفائی کا موقف بھی اتنا مضبوط نہیں کہ استغاثہ کی کہانی کے مقابلے میں زیادہ قدرتی اور قابل یقین تصور کیا جاسکے۔ اسی لئے میں ایک بار پھر کہتا ہوں۔ سوچو! یاد کرو تم کوئی بات بھول نہ گئے ہو۔ تمہیں کوئی غلط فہمی نہ ہوئی ہو۔"

وکیل کی بات پر یوسف اتنی زور سے چیخا کہ وہاں سے گزرنے والے بہت سے لوگ وہاں ٹھہر گئے۔

"نہیں! ایسا نہیں ہوا۔ مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ مجھے یقین ہے، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آدمی قتل کرے اور بھول جائے؟"

یوسف کا وکیل خاموش ہوگیا۔

یہ مقدمہ اب اس کے اعصاب پر سوار ہوچکا تھا۔ جس یقین سے یوسف بات کرتا تھا اس کو اس کا دل مانتا تھا۔ لیکن گواہوں کے بیانات سے لگتا تھا کہ قتل واقعی ان کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔

"اچھا یہ بتائیں اگر مجھے سزا ہوگئی تو کتنی ہوگی؟"

یوسف نے ایسے ہی پوچھ لیا۔ حالانکہ اس کا ایمان تھا، بے گناہ کو سزا نہیں ہوسکتی۔ ہو ہی نہیں سکتی۔ اب وہ برآمدے سے نکل کر سامنے گھاس والی کھلی جگہ پر آچکے تھے۔

"سزائے موت بھی ہوسکتی ہے" وکیل صاحب یہ کہہ کر خود ہی پریشان ہوگئے۔ ان کی عادت تھی کہ مقدمہ کے فیصلہ ہونے تک وہ کبھی مایوس نہیں ہوتے تھے۔ ویسے بھی یہ بات ان کے پیشہ وارانہ اخلاق کے خلاف تھی۔

یوسف کے جسم میں خوف کی سنسناہٹ سی تیرگئی وہ کانپ گیا۔

"لیکن میں تو بے گناہ ہوں" اسے فوراً سہارا ملا۔ "سزائے موت سے تو خیر بچا جاسکتا ہے۔" وکیل صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے زیر لب کہا۔ مگر یوسف ان کی یہ بات سن چکا تھا۔

"کیسے؟" یوسف نے جیسے اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کی غرض سے پوچھ لیا۔

"اقبال جرم کرنے سے"

یوسف کو غصہ تو بہت آیا مگر وہ چپ ہوگیا۔ وہ ضبط کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

"قانون یہ کہتا ہے کہ جب کوئی انسان، غصے، جوش یا غیرت جیسے کسی جذبے کے فوری اور شدید رد عمل کی زد میں ہوتا ہے تو اس

کے حواس نارمل نہیں رہتے۔ اس کے عمل پر اس کا کنٹرول کمزور پڑ جاتا ہے۔ ایسے میں جو عمل بھی وہ کرتا ہے' اس میں اس کے ارادے کا دخل نہیں رہتا۔ اس کیفیت میں اس کے جرم کی نوعیت ایسی نہیں رہتی جو کہ جرم کو باقاعدہ سوچ سمجھ کر کسی منصوبہ کے یا ارادہ کے تحت کرنے سے ہوتی ہے......"

یوسف بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وکیل نے ابھی بات مکمل نہیں کی تھی۔

"...... تمہارے مقدمہ کی شہادتوں میں یہ بات تو آچکی ہے کہ مقتول سراج نے وقوعہ سے دو تین سال قبل تمہاری بہن پر آوازہ کسا تھا اور تم نے غصے میں آکر کہا تھا کہ اگر تمہیں اس وقت سراج مل جاتا اور تمہارے پاس پستول ہوتا تو تم اسے گولی مار دیتے۔"

یوسف حیرت سے وکیل صاحب کی بات سن رہا تھا۔ اس کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔ "میں اپنی جرح اور صفائی میں یہ بات ثابت کرسکتا ہوں کہ تمہیں اس بات کا رنج تھا۔ اور تم نے غیرت میں آکر موقع ملتے ہی سراج کو گولی ماردی۔ مگر اس کے لئے تمہیں اقبال جرم کرنا پڑے گا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں زیادہ سے زیادہ عمر قید ہوجائے گی۔ سزائے موت سے تم بچ جاؤ گے۔"

یوسف' وکیل کی پوری بات سن چکا تھا۔ اس نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بڑے حوصلے سے کہا "میں تو اپنی بہن والے واقعہ کو کبھی کا بھول چکا تھا سراج نے بھی ایک دفعہ چھپ کر میرے گھر آکر مجھ سے معافی مانگ لی تھی۔ میری بہن کی تو سال ڈیڑھ سال پہلے ہی شادی ہوگئی تھی۔ یہ دھمکی والی بات تو میں نے ایسی ہی کہہ دی تھی صرف لوگوں پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ میں بھی بڑا غیرت مند ہوں۔ مجھے پتہ تھا کہ نہ کبھی میرے پاس پستول ہوگا اور نہ ہی مجھے قتل کرنے کی ضرورت محسوس ہوگی۔" یوسف نے وکیل صاحب کی آنکھوں میں پھیلی حیرانگی کو دیکھا اور کہا "وکیل صاحب! آپ سچ ثابت کرنے کی کوشش کریں میں بے گناہ ہوں۔ آپ اپنے علم سے' اپنے تجربے سے' سچ کے زور سے یہ ثابت کرکے دکھائیں کہ میں واقعی بے گناہ ہوں۔"

وکیل صاحب بھی شاید تھک گئے تھے۔

یوسف سے مزید گفتگو کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ حراست کی ڈیوٹی والے سپاہی بھی اکتا گئے تھے اور پھر یوسف کی ماں بیمار ہونے کی وجہ سے نہیں آسکی تھی اور اس کا ماموں اس لئے نہیں آیا تھا کہ گاؤں میں تحصیلدار کا دورہ تھا۔

قیدو بند

قیدیوں کی پیلیپر لاری شہر کی مصروف سڑکوں سے گزرتی ہوئی جیل کے ساتھ آباد پوش کالونی کی خوبصورت دو رویہ کوٹھیوں کے درمیان سے ہوتی ہوئی آئی اور اونچی اونچی موٹی دیواروں میں گھری جیل کے بہت بڑے پھاٹک کے سامنے رک گئی۔ پھاٹک کے اندر گھنٹیاں بجیں اور جیل کا بڑا مضبوط آہنی گیٹ بڑی خوفناک آواز پیدا کرتا ہوا کھل گیا۔ یہ آواز دور دور تک گئی لمبے لمبے ستونوں والی' خوبصورت پیشانیوں سے سجی کوٹھیوں کے مکینوں کو پتہ چل گیا کہ قیدی واپس آگئے ہیں۔

شروع شروع میں یہ جیل شہر سے دور تھی اور لوگ اس کی خوفناک حد تک اونچی موٹی دیواروں کو دیکھ کر ہول ہو جایا کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ شہر پھیلتا گیا اور اب شہر کی سب سے پوش کالونی جیل کے قریب والی جگہ پر آباد ہوگئی تھی۔ اب تو قبرستان تک آبادی کی زد میں آچکے تھے۔ لوگوں نے شاید قبروں اور جیل کی دیواروں سے ڈرنا چھوڑ دیا تھا۔

اس جیل کی تعمیر کے سو سال مکمل ہونے کو آرہے تھے۔ جیل حکام اس موقع پر ایک تقریب منعقد کرنے کا پروگرام بنارہے تھے۔ اس جیل کی بار بار مرمت کی گئی تھی۔ اندر باہر کچھ اضافے کچھ تبدیلیوں کی بھی کوشش کی گئی تھی۔ مگر اب تک جیل کا پرانا تشخص قائم تھا۔

دروازہ کھلتے ہی بہت بڑی ڈیوڑھی تھی جہاں واپس آنے والے قیدیوں کی گنتی کی جاتی تھی' تلاشی لی جاتی تھی اور پھر ڈیوڑھی کا اگلا

سیپ کراچی --- ۱۹۴

دروازہ کھول کر ان قیدیوں کو اندر اپنی بارکوں اور کوٹھریوں میں بھیجا جاتا تھا جہاں ایک علیحدہ دنیا ان کی منتظر ہوتی تھی۔
ڈیوڑھی کے دائیں بائیں جیل حکام کے دفاتر تھے۔ ڈیوڑھی کی دیواروں پر مختلف قسم کے نوٹس بورڈ آویزاں تھے۔ وہاں ہر وقت ہر قسم کی صورت حال سے نپٹنے کے لئے سخت حفاظتی اقدامات کئے گئے تھے۔
گیٹ کے ساتھ اندر بائیں طرف لمبا برآمدہ دور تک چلا گیا تھا جس کی باہر والی دیوار میں موٹی موٹی سلاخیں اور لوہے کی باریک جالی لگی ہوئی تھی۔ اس برآمدے کے باہر دوسری طرف ایک اور برآمدہ تھا۔ جہاں ملاقاتیوں کو لاکر قیدیوں سے ملایا جاتا تھا۔ ملاقاتیوں والے برآمدے میں آنے جانے والے دروازوں پر ملاقات کے وقت مسلح حفاظتی انتظامات کئے جاتے تھے۔ ملاقاتیوں کی سختی سے جامہ تلاشی لی جاتی تھی۔ اس برآمدے میں ملاقاتی گیٹ کی جانب سے داخل ہوتے تھے اور برآمدے کی دوسری طرف ان کے باہر نکلنے والا دروازہ تھا۔
جیل کے باہر چاروں طرف شہر کی سڑکیں تھیں جن پر سارا دن ٹریفک رہتی تھی۔ جیل کے عقب میں کچھ فاصلے پر شہر کا انگلش میڈیم سکول تھا جس کے کھلے میدانوں اور کلاس روموں کی کھڑکیوں سے بھی جیل کی دیواریں اور ان پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر قائم برجوں پر چوکس سپاہی دور سے نظر آتے تھے۔
جیل کے دائیں طرف کچھ رقبہ خالی رہ گیا تھا جو جیل کی ملکیت تھا اور اس پر ایک سرکاری کالونی بنانے کی تجویز منظور ہو چکی تھی۔ جیل کے قریب امیر کالونی کے گھروں میں جب کسی شادی بیاہ کے موقع پر بینڈ باجا بجتا تھا اور آتش بازی ہوتی تو بیرکوں' کوٹھریوں میں اور جیل کی دیواروں میں بند قیدیوں پر وحشت طاری ہونے لگتی۔ انہیں اپنے گھربار اپنی اپنی خوشیاں بری طرح یاد آنے لگتیں اور وہ اپنے مقدموں' اپنی قید کے ماہ و سال کا حساب لگانے لگتے۔ جب یہ جیل بنی تھی تو اس میں زیادہ تر وہ لوگ رکھے جاتے تھے جن کی آزادی انگریز سرکار کے لئے خطرے کا باعث بن سکتی تھی۔ اس وقت جرم اتنی دیدہ دلیری سے نہیں ہوتا تھا اور قیدیوں کی تعداد ان کی گنجائش سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ مگر اب جیل میں آنے والے مجرموں' قیدیوں کی ہزار قسمیں ہوتی تھیں۔ کچھ کردہ کچھ ناکردہ جرائم کی سزا بھگتنے کے لئے آتے تھے۔ کبھی کبھی بڑے بڑے لیڈر بھی آجاتے تھے۔ وہ جیل میں رہ کر بھی خود کو بڑا ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے۔ ایسے لوگوں کی سہولتوں کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ جیل حکام کو ڈر ہوتا تھا کہ نہ جانے کل کلاں وہ کیا حیثیت اختیار کرجائیں۔ ان کے ساتھ امتیازی سلوک کرنا جیل حکام کی مجبوری تھی۔
کچھ قیدی ایسے بھی ہوتے تھے جن کی قید ہی کے دوران کایا پلٹ جاتی تھی۔ انہیں اپنے ساتھ رہنے کا' خود کو جاننے کا بہت وقت مل جاتا تھا۔ خود شناسی کا یہ عمل ان پر نئے رنگ چڑھا دیتا تھا جو ساری عمر نہیں اترتے تھے' پھیکے نہیں پڑتے تھے۔
یوسف کے لئے یہ بالکل نئی زندگی تھی۔
شروع شروع میں وہ دوسرے قیدیوں سے الگ الگ' کھچا کھچا رہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ چند دن کا مہمان ہے۔ وہ بے گناہ ہے اور سرکار کی کسی غلط فہمی کی بنا پر یہاں آگیا ہے۔ آج نہیں تو کل اس کی بے گناہی تسلیم کرلی جائے گی۔
مگر آہستہ آہستہ وہ اس زندگی سے تھوڑا تھوڑا مانوس ہونے لگا۔ اس نے دیکھا ایسے بہت سے تھے جو خود کو بے گناہ کہتے تھے۔ مگر پھر بھی قید میں تھے۔ اس کی اپنی بیرک میں دلاور تھا۔ اس نے بھینس چوری نہیں کی تھی پھر بھی چوری ثابت ہوگئی اور اب وہ بہت سے دوسرے بھینسوں کی چوری کے مقدمات میں پیشیاں بھگت رہا تھا۔
اسلم تھا' وہ کہتا تھا اس سے کوئی اسلحہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ اس نے تو یونین کونسل کے الیکشن میں چوہدری کی مخالفت میں ووٹ ڈالا تھا اس پر بندوق ڈال دی گئی۔
"مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" یوسف نے حیران ہوکر پوچھا
"کیوں نہیں ہوسکتا؟"

"یہ بندوق مویشیوں کے ڈھارے سے برآمد ہوئی۔ میں وہاں اپنے مویشی باندھا کرتا تھا۔ بندوق وہاں بھوسے کے ڈھیر میں چھپی ہوئی تھی۔"

"تم نے پولیس کو نہیں بتایا؟ بیان نہیں دیا؟"یوسف نے پھر پوچھا

"بتایا تھا' بیان بھی دیا تھا۔ پولیس کے سامنے بھی اور عدالت کے سامنے بھی' مگر برآمدگی کے گواہ پیش ہوگئے۔ میں ان گواہوں کو نہیں جانتا تھا۔ ان گواہوں نے پیشی کے دن میری ماں سے کہا تھا اگر وہ بھاری رقم کا بندوبست کردے تو وہ گواہی سے منحرف ہوسکتے ہیں۔ میری ماں رقم کا بندوبست نہ کرسکی۔"

"مگر تفتیش......انصاف......عدالت یہ سب کچھ؟"یوسف کی حیرت اب خوف میں بدل گئی۔

اور اسلم اس کی باتوں' اس کی حیرانی کو نظر انداز کرکے اپنے دوسرے ساتھی سے مل کر سگریٹ پینے لگا جو بڑی مشکل سے انہیں حاصل ہوا تھا۔

اس کی بیرک کے باقی قیدیوں کے پاس اپنی اپنی کہانی تھی۔ اپنی اپنی بے گناہی تھی۔

اس رات اسے دیر تک نیند نہیں آئی۔

ملاقات

آج یوسف کی ملاقات آئی تھی۔

وہ ملاقات والے برآمدے میں داخل ہوا تو اسے موٹی موٹی سلاخوں اور لوہے کی باریک جالی کے اس طرف ریشماں دکھائی دی۔ خاموشی اور تھکے ہوئے قدموں سے چلتا ہوا وہ لوہے کی اس دیوار کے ساتھ جالگا۔ ریشماں آگے بڑھ کر جالی سے چمٹ گئی اس کے گرم سانسوں کی خوشبو نے یوسف کے نتھنوں پر یلغار کی تو اسے لحہ بھر کو کھالے کے ٹھنڈے پانی میں بھیگی مٹی اور پھیلتے' شکلیں بدلتے جسم یاد آگئے۔ اس نے چاندنی میں سوئی فصلوں' کھیتوں' سوئی سانس لیتی گھاس اور جسم کے نیچے چرچراتے پتوں کا لمس یاد کرنے کی کوشش کی۔ اردگرد چیختے آوازوں کے شور میں اس کا شعور دھندلانے لگا۔ ریشماں اداس بھری آنکھوں سے اسے تکے جارہی تھی۔

سارے برآمدے میں اندر باہر قیدی اور ان کے لواحقین شہد کی مکھیوں کی طرح لوہے کی دیوار سے چمٹے ہوئے تھے۔ ان کی بھنبھناہٹ دونوں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

زیادہ تر آدمیوں کی کوشش تھی کہ تھوڑے سے وقت میں زیادہ سے زیادہ باتیں کرلیں۔ خاص طور پر ملاقاتی قیدیوں کے پیچھے ہونے والے واقعات کو بار بار دہرا رہے تھے۔

اندر والے برآمدے میں جیل کا عملہ بڑا مستعد تھا۔ ہر قیدی پر ان کی نگاہ تھی۔ ملاقاتیوں والے برآمدے میں بہت سے ملاقاتی پتھر کے بنچوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ ان آوازوں میں کہیں کہیں نسوانی آوازیں بھی شامل ہورہی تھیں۔

ریشماں نے اپنے دونوں ہاتھ لوہے کی جالی پر اس جگہ رکھے ہوئے تھے جہاں دوسری طرف یوسف کے ہاتھ تھے۔ یوسف کو چھونا' محسوس کرنا اب اس کے بس میں نہیں تھا اگرچہ اس کے اپنے جسم میں یوسف کے جسم کا سواد ابھی تک ہمک رہا تھا۔ وہ اس حوالے سے یوسف کو جان پائی تھی۔

"کیسے ہو یوسفے" اس نے تھکی تھکی سی آواز میں جواب دیا۔ اور پھر ریشماں کے چہرے کو زیادہ توجہ سے دیکھنے لگا یہ وہ چہرہ تھا جو اکثر جیل کی اندھیری راتوں میں کبھی کبھی اس کے تصور میں آکر چاندنی بکھیر دیتا تھا۔ حالانکہ وہ اسے بھول جانا چاہتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا ریشماں سے اس کا جسمانی تعلق ایک حادثہ تھا جس پر اس کا کوئی اختیار نہیں رہا تھا۔

"تم کیوں آئی ہو یہاں؟ تمہیں کیا ضرورت تھی؟ ؟تمہارا میرا کوئی ایسا تعلق' کوئی رشتہ تو بنتا نہیں"
اس کی آواز میں ایک بیگانگی تھی۔ ایک اجنبیت تھی۔
"تعلق تو بن چکا یوسفے۔ بڑا پکا رشتہ جو باقی سارے رشتوں سے بھی مضبوط ہے۔ اب میں چاہوں بھی تو تم سے دور نہیں رہ سکتی تم اب سدا میرے ساتھ رہو گے میرے پاس......"
"کیا؟"یوسف کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔
اس کی اونچی آواز سن کر جیل کا سپاہی ان کے سر پر آکھڑا ہوا جس کے لئے دونوں کو کچھ دیر خاموش رہنا پڑا۔ جب وہ سپاہی اپنی تسلی کرکے ہٹ گیا تو ریشماں کہنے لگی۔
"......سچ کہہ رہی ہوں۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ لیقا سمجھتا ہے یہ سب اس نے کیا ہے یہ کسی پیر سائیں کی دعا سے ہوا ہے۔"
"تمہارا مطلب کیا ہے؟" یوسف نے پھر پوچھا
"کہہ جو دیا۔ میں تمہارے بچے کی ماں بنوں گی" یہ کہہ کر ریشماں نے اپنی چادر جسم سے کھسکائی
"مگر...مگر...یہ کیسے ہوا؟ کیوں...؟"
"کیسے' کیوں' کو چھوڑو اب تم اپنی بات کرو۔"
"تمہیں ڈر نہیں لگتا؟ کوئی خوف' افسوس"
"نہیں' اس میں میری مرضی شامل تھی۔ میں تو خوش ہوں۔"
یوسف حیران تھا۔اسے بچوں سے پیار تھا۔ اس کی بہن جب بھی آتی وہ اس کے بچے کو گود میں اٹھائے پھرتا تھا۔ وہ سوچتا تھا یہ بچہ باپ کا اپنا ہی وجود اپنی ہی فصل ہوتی ہے۔ اپنے وجود کو بانہوں میں لینا کتنا خوشگوار احساس ہوگا۔
مگر اب یہ بچہ جس کا ذکر ریشماں کررہی تھی اس کا اس سے کیا تعلق بنے گا۔
"بولو یوسفے! میں تم سے پوچھنے آئی ہوں' کیا یہ سچ ہے؟ مگر تم قاتل ہو نہیں سکتے۔ میرا دل کہتا ہے۔ قاتل ایسے نہیں ہوتے۔ معصوم' نرم اور ڈرپوک۔"
"لگتا تو مجھے بھی ایسا ہی ہے مگر کیا کروں اب تو......" یوسف کی آواز آہستہ تھی یا ارد گرد شور زیادہ تھا۔
"ذرا زور سے بولو یوسفے' تمہاری آواز مجھے صاف سنائی نہیں دے رہی۔" ریشماں نے چیخ کر کہا۔
"ریشماں تو تو اچھی طرح جانتی ہے۔ میں نے تیرے ساتھ سچا وقت گزارا ہے میں نے تجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ میں بے گناہ ہوں مگر کوئی مانتا نہیں۔"
"میں جانتی ہوں یوسفے۔ میں یقین کرتی ہوں۔ میرا دل تو پہلے ہی نہیں مانتا تھا۔ قتل کرنا اتنا آسان نہیں۔ تجھ جیسا بھلا مانس قتل نہیں کرسکتا۔ کسی دوسرے کی جان لینے کے لئے بڑا جگرا چاہئے کوئی بھی بندہ جس کے اندر قتل کی خواہش ہو اس کا اندر اتنا روشن نہیں ہوسکتا۔ میں نے تمہارا اندر دیکھا ہے۔ میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں تمہاری ماں سے بھی زیادہ۔"
ریشماں جہاں لوہے کی جالی سے لگی کھڑی تھی وہاں سے تھوڑے فاصلے پر بائیں جانب ایک دوسری عورت جالی پر دونوں ہاتھ دبادبا کر کہہ رہی تھی۔
"میں گئی تھی بڑے چوہدری کے پاس' ان کے پاؤں پڑی تھی میں جان گئی ہوں۔ وہ چاہتے ہیں میں ان کے پاؤں میں ہی رہوں۔ پاؤں کی جوتی بن کر' اب رہوں گی تمہاری خاطر' اپنے بچوں کی خاطر میں نے ان کی بات مان لی ہے۔ اگلی پیشی پر گواہ بیٹھ جائیں گے۔

چوہدری نے وعدہ کرلیا ہے۔"

اندر سے قیدی کہہ رہا تھا۔

"وہ پستول میرے قبضے سے برآمد نہیں ہوا تھا۔ دونوں پولیس کے ٹاؤٹ گواہ ہیں۔ جھوٹے ہیں۔ میں جانتا ہوں۔ لوگ بھی جانتے ہیں مگر مجھے پتہ ہے کوئی میری صفائی نہیں دے گا۔ چوہدری کی مرضی کے بغیر کوئی کسی کی صفائی بھی نہیں دے سکتا۔"

"میں راضی کرلوں گی چوہدری کو۔ تو فکر نہ کر۔ میں تمہیں چھڑالوں گی' بس ایک دو مہینوں کی بات ہے۔"

وہ عورت اپنے قیدی کو تسلیاں دے رہی تھی ریشماں کا دھیان چند لمحوں کے لئے ادھر چلا گیا۔

"پتہ نہیں کس قیمت پر یہ عورت اپنے قیدی کو چھڑائے گی؟"

تیکھے نقوش کے بھرے جسم والی اس عورت کے سر سے چادر ڈھلک گئی تھی اس کی گردن اور کندھوں سے نیچے جسم کسا ہوا نظر آرہا تھا۔

"میری بے گناہی کوئی نہیں مانتا ریشماں۔ لوگ گواہوں کا کہا سچ مانتے ہیں۔ شہادتیں ہوچکی ہیں۔ ابھی میری صفائی کی شہادت باقی ہے۔ میری طرف سے صفائی کا کوئی گواہ نہیں۔ اب تو میرا ماماں بھی کہتا ہے' سمجھ میں نہیں آتا کیا صفائی دوں۔ رہی میری ماں تو وہ کملی ہے۔ ماں کی شہادت تو عدالت ویسے بھی نہیں مانتی۔ مجھے نہیں پتہ تھا اپنی بے گناہی ثابت کرنا اتنا مشکل ہوگا۔" یوسف کے لہجے میں بے بسی کی جھلک تھی۔

"میں تمہاری طرف سے صفائی کی گواہ بننے کو تیار ہوں۔ وکیل جو بھی بیان مجھے پڑھادے گا' وہی عدالت میں دے دوں گی۔"

ریشماں کی بات سن کر یوسف ہنس پڑا۔ "یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ پھر میرے کیس میں تمہاری کیا حیثیت ہے؟"

"میں یہ گواہی دے سکتی ہوں کہ جب فائر ہوا تم میرے ساتھ دور کھیتوں میں موجود تھے اور وہیں سے تم ڈر کے بھاگ اٹھے تھے۔"

یوسف حیران ہوکر اسے دیکھنے لگا۔

باریک جالی کے سوراخوں میں سے ریشماں کا چہرہ بہت صاف تو نہیں دکھائی دے رہا تھا مگر پھر بھی اس کے چہرے پر ارادے کی پختگی دیکھی جاسکتی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" ریشماں نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

"یہ کہ جب فائر ہوا تو میں کہاں تھا۔ مجھے لگا تھا جیسے کسی نے مجھ پر ہی فائر کیا ہو۔ مجھے کچھ یاد ہے۔ میں ڈر گیا تھا۔ میں شاید اپنی جان بچانے کے لئے بھاگ اٹھا تھا۔ حالانکہ میں سراج کو بچانے کے لئے بھاگا تھا۔ پتہ نہیں یہ کیسے ہوا کہ میں نے جو سوچا تھا اس کے مطابق میں نے نہیں کیا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے جب آدمی کا جسم اس کے قابو میں نہیں رہتا جیسے اس دن تمہارے ساتھ وہاں کھیتوں میں ہوا تھا۔ ویسے یہ ہے بڑی عجیب بات۔ اس لئے کبھی کبھی یہ اتنے لوگوں کو دیکھ کر مجھے خیال آتا ہے کہ ان سب کو پتہ ہے وہ کیا کررہے ہیں۔ کیا ان کاموں میں ان کی مرضی شامل ہے؟"

یہ کہتے ہوئے یوسف نے اندر قیدیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جڑے بنچوں پر کھڑے دیکھا۔ وہ سب چیخ چیخ کر لوہے کی جالی سے ادھر اپنے عزیزوں سے باتیں کررہے تھے۔ تھوڑے وقت میں زیادہ سے زیادہ باتیں کرنے کی کوشش میں وہ ایک دوسرے کی بات کم سن رہے تھے۔

ریشماں کچھ سوچ کر بولی۔

"کیا پتہ یوسفے تم اس خوف سے بھاگے ہو کہ کوئی ہمیں اکٹھے وہاں نہ دیکھ لے۔ تم شاید بدنام ہونے سے ڈرتے تھے۔ تمہاری شادی ہونے والی تھی نا!"

یوسف نے بدک کر کہا

"تم کیا کہو گی؟ میرے ساتھ وہاں جائے واردات کے قریب تم کیا کر رہی تھیں کیا رشتہ ثابت ہوگا ہم دونوں کے درمیان؟"

"مجھے پتہ تھا تم یہی سوچو گے اس طرح سوچو گے' اسی لئے تم نے کبھی مجھے اپنی صفائی کا گواہ بنانے کے متعلق نہیں سوچا۔ تم چاہتے تو مجھے صفائی کا گواہ بنا سکتے تھے۔ مجھ سے بہتر سچا گواہ تمہیں کون مل سکتا ہے۔" ریشماں ناراضی ظاہر کرتے ہوئے بولی۔

"میں تمہارا نام لیتی تو سرکاری وکیل تم پر بڑی لمبی جرح کرتا۔ وہ ضرور پوچھتا کہ رات کے آخری پہر تم جائے واردات کے قریب کھیتوں میں میرے ساتھ کیوں تھیں۔"

"میں اس سوال کا جواب اس وقت خود دیتی۔ اور وہ میرے جواب کے بعد اگلا سوال نہیں پوچھتا۔ جھوٹ بولنا کبھی کبھی سچ بولنے سے بھی آسان ہو جاتا ہے اور سب مان لیتے ہیں اس لئے کہ وہ خود جھوٹے ہوتے ہیں۔ اب اگر میں کہتی پھروں کہ میرا خاوند اچھا ہے۔ مجھے اس سے محبت ہے اور میرے پیٹ میں اس کا بچہ ہے' تو سب خوش ہوں گے۔ لیکن یہ سچ تو نہیں۔ میں تو تمہاری وجہ سے سچ پر پردہ ڈال رہی ہوں لیکن تم کیوں نہیں سوچتے سچ بول کر تم اپنی بے گناہی ثابت نہیں کر سکتے۔"

یوسف ریشماں کی باتوں پر حیران ہو رہا تھا۔

وہ کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ مگر اس کے ارد گرد اندر باہر لوگوں کی اونچی اونچی آوازوں کا شور بہہ رہا تھا۔

"تم ڈرے ہوئے ہو۔ جیل میں رہ کر تمہارے دماغ پر اثر پڑا ہے۔"

ریشماں کی بات سن کر یوسف نے آنکھیں پھیلا کر اس کو دیکھا اور پھر کہنے لگا۔

"شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔ کبھی کبھی مجھے سمجھ نہیں آتی۔ دماغ خالی ہو جاتا ہے۔ لگتا ہے جاگ نہیں رہا ہوں۔ سو بھی نہیں رہا ہوتا ہوں" اب یوسف کی آواز میں جیسے نیند کی سی کیفیت آ گئی تھی۔ "میں انصاف چاہتا ہوں مگر مجھے انصاف تک پہنچنے کا راستہ نظر نہیں آتا"

اور پھر یوسف نے اس ماحول کی گھٹن سے گھبرا کر پوچھا۔

"تم اپنی بات کرو ریشماں!"

"میں تو تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں بنجر تھی اب ہری ہو رہی ہوں۔"

"لیقا کیا کہتا ہے؟"

لیقے کا نام سن کر ریشماں ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی میں زندگی کی کھنک تھی۔ "وہ تو خوش ہے۔ اپنے پیر کے مزار پر چادر چڑھانے کی سوچ رہا ہے۔ مرد ہونے کے باوجود وہ اتنا بے وقوف ہے۔ میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ اسے اصلی بات کی خبر نہیں ہونے دوں گی۔ عورت چاہے تو مرد کو اپنے اندر کی ذرا بھی خبر نہ ہونے دے۔"

"تم گھبراتی نہیں ہو؟" یوسف نے اس کے لہجے کے اعتماد کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"میں کس بات سے گھبراؤں؟ میں تو ہر بات جانتی ہوں۔ مجھے تو سارے سچ کا پتہ ہے۔ سچ کا پتہ ہو تو زندگی بھلے ہی جھوٹ موٹ کی گزرے' بندہ سکھی رہتا ہے۔"

یوسف خاموش ہو گیا۔ اس کے گرد شور بیٹھ گیا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" ریشماں نے اس کی آنکھوں کی ویرانی تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میں سوچ رہا ہوں یہ بچہ جس کی تم بات کر رہی ہو' اس کا کیا ہوگا؟ یہ کس طرح زندگی گزارے گا؟"

"تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ میرا بچہ ہوگا۔ دنیا اسے لیقے کا بیٹا بھی کہتی رہے مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مجھے لوگوں کی بھی کوئی پروا نہیں۔ میں اگر خود نہ چاہوں تو کوئی مجھے سچ بولنے پر مجبور نہیں کرے گا۔ پتہ نہیں کس طرح میرا سارا خوف اتر گیا ہے۔

کوئی مجھے کچھ نہیں کہہ سکتا میں اگر سچ نہیں بولوں گی تو اس بچے کے لئے' یا پھر تمہارے لئے۔"

"عجیب عورت ہو" یوسف نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"یہاں پر اور بھی بہت کچھ عجیب ہے۔ سب چلتا ہے۔ کم از کم میں نے تو دیکھ لیا ہے۔ تم بھی دیکھ لوگے تمہیں بھی یقین آئے گا۔ یہاں ہم عورتوں کی ہی نہیں' تم مردوں کی زندگی بھی بعض اوقات بڑی عجیب ہو جاتی ہے۔ اب تم اپنا مقدمہ ہی دیکھ لو' کتنی عجیب بات ہے جو جرم تم نے نہیں کیا' اس کی سزا تمہیں مل رہی ہے' کچھ سمجھ آئی ہے تمہیں؟"

اتنی دیر میں ریشماں کے بائیں جانب کوئی نیا ملاقاتی آگیا تھا وہ بھی ایک عورت آئی تھی۔ اس کا مرد لوہے کی جالی کے ادھر تھا۔

"اب تو چھوڑ دے انور یہ نشے کا دھندہ' اب تو تیری پانچ بیٹیاں ہو گئی ہیں۔"

دوسری طرف یوسف کے قریب ہی سے ایک قیدی بڑے ستے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "یہ بیٹیاں میری مرضی سے تو نہیں ہوئیں' تم نے ہی پیدا کیا ہے مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا۔ کیا پتہ میری ہیں بھی یا نہیں۔"

اس عورت نے اپنی نیلی چادر میں منہ چھپالیا اور چند لمحے اپنی گدلی آنکھوں کو چادر کے کونے سے صاف کرتے ہوئے بولی' "نہ کر اس طرح کی باتیں انور' تمہیں کیا پتہ کس طرح جان مار کر تیری ضمانت کا بندوبست کررہی ہوں۔ اب تو میں نے بڑی بیٹی کو بھی صفائی کے کام پر لگادیا ہے۔ خدا کے لئے چھوڑ دے نشے کا یہ دھندہ' وہ عورت پھر رونے لگی۔

"یہ اب کیسے چھوٹے گا۔ کون چھوڑنے دے گا۔ میں تو ان لوگوں سے ایڈوانس لے کر کھا چکا ہوں۔ پچھلی دفعہ' باہر آیا تھا تو گھر سے اٹھا کر لے گئے تھے۔ انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ وہ بڑے طاقت ور لوگ ہیں۔ وہ نہیں لے جائیں گے تو پولیس کسی نئے مقدمہ میں پکڑ لے گی۔ تم مجھے چھوڑ دو۔ مجھ پر اب یہ ٹھپہ لگ چکا ہے۔" اس قیدی کے لہجے کی مایوسی صاف سنائی دے رہی تھی یوسف کا دھیان اس کی باتوں کی طرف جارہا تھا۔

"تو جیسا بھی ہے انور میری بچیوں کے لئے ضروری ہے۔ تیرے بغیر ہم رل جائیں گے اب کی دفعہ تم باہر آجاؤ میں تمہیں چھپالوں گی۔ تمہیں پال بھی لوں گی۔ مجھ میں ابھی جان ہے۔ بس مجھے اپنے گھر میں ایک مرد چاہئے۔"

"رہنے دو شیداں! یہ اندر باہر اب میرے لئے برابر ہوچکے ہیں"

اور اس کی بات سن کر یوسف نے سوچا یہ کیسے ہوجاتا ہے۔ آدمی پر کیسے یہ مقام آتا ہے' اندر باہر اس کے لئے برابر ہوجاتے ہیں۔ فرق مٹ جاتا ہے۔ وہ اس بات کو سمجھنے کی کوشش کررہا تھا۔

ریشماں کی ملاقات کا وقت ختم ہوگیا۔

جانے سے پہلے وہ تیزی سے بات کرتے ہوئے کہنے لگی "میں پھر آؤں گی' یوسفے' میں تجھے بھول نہیں سکتی۔ یہ مشکل دن ضرور کٹ جائیں گے۔ جب بہت گھبرا جاؤ تو مجھے یاد کرلیا کرنا۔ تمہیں تسلی ہوجائے گی۔"

اس نے مڑنے سے پہلے لوہے کی جالی کو اس جگہ سے چوما جہاں یوسف نے اپنے ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔

یوسف کے چہرے کی سختی کو اس کی مسکراہٹ نے توڑنے کی کوشش کی مگر جلد ہی یہ مسکراہٹ اسی سختی میں ڈھل کر اس کا حصہ بن گئی۔ واپس اپنی بیرک کو جاتے ہوئے اسے لگ رہا تھا جیسے وہ خواب میں چل رہا ہو۔ اس کے ارد گرد بہت زیادہ روشنی تھی جیل کی سڑکوں پر' دیواروں کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ روشنی کا انتظام کیا گیا تھا۔ قیدیوں کی حرکات کو اندھیرے سے بچانے کی کوشش کی جاتی تھی۔

وہ سوچ رہا تھا ریشماں عجیب عورت تھی یا وہ عجیب مرد تھا یا ان کا چار چفیرا ہی ایسا تھا۔ جس میں کسی بھی خیال پر کسی بھی چیز پر زیادہ دیر تک توجہ رکھنا مشکل ہوتا جارہا تھا۔ یہ ذہن' دماغ' خیال سب بہاؤ کی حالت میں رہتے تھے کوئی چیز کہیں مستقل ٹھہرتی نہیں

تھی۔

اور یہ رشتہ بھی گناہگار تھی۔ اسے پتہ تھا مگر پھر بھی وہ گناہ کے احساس سے آزاد دکھائی دیتی تھی اس پر کوئی بار نہیں تھا۔ اس نے کس طرح خود کو قبول کر رکھا تھا۔ لیقیے کو' چوہدری رحمت کو اور خود اپنے آپ کو کس سہولت سے اس نے دھوکے میں رکھا ہوا تھا۔ تو کیا اس کے لئے زندگی کا کوئی اور راستہ نہیں تھا؟ ایسی صورت حال میں بھی وہ کتنی پر اعتماد تھی جیسے جو اس نے کیا ہو' وہی سچ ہو۔

ایسا کیوں تھا؟ اس نے سوچا

اس کے اندر کونسا جذبہ تھا؟ کون سی طاقت تھی؟ اسے کون اتنا حوصلہ دیتا تھا؟ مرد کے مقابلے میں 'کمزور' مخلوق' کیوں کر اتنی طاقت ور تھی۔ اور دوسری طرف وہ تھا جسے اپنی بے گناہی کا یقین تھا مگر وہ کتنا کمزور ہوتا جارہا تھا۔ اس کی بے گناہی کا احساس بھی اب فرد ہوتا جارہا تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ سے دور ہوتی جارہی تھی۔ اسے ابھی اس بات کا گیان نہیں ملا تھا کہ کتنی ہی حقیقتیں زندگی میں ایسی ہوتی ہیں جن کی تہ تک ہم ساری عمر نہیں پہنچ پاتے وہ اپنی بیرک کی طرف جارہا تھا۔ جیل کے سپاہی اس کے ساتھ تھے۔ اس نے اوپر' سر پر کھلے آسمان کی طرف دیکھا جہاں ستارے ٹمٹمانے لگے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ اسی آسمان کے نیچے چلتا جائے اور کبھی اپنی بیرک کی دیواروں تک نہ پہنچے۔ مگر کسی کے چاہنے سے زندگی اپنا راستہ تو نہیں بدل لیتی اور وہ تو پھر بھی قتل کے جرم کا قیدی تھا۔

پیشیاں

اب تو اس کو یاد بھی نہیں رہا تھا کہ عدالت میں آج اس کی کتنویں پیشی تھی۔ لگتا تھا اس کی ساری زندگی جیل اور عدالت کی دیواروں کے سایوں میں ہی گزر گئی ہو۔

عدالت کی اونچی بوسیدہ دیواروں کی پیلی سفیدی جگہ جگہ سے پھول کر اکھڑنے لگی تھی۔ اونچی چھتوں کے کونوں میں لٹکتے جالے پنکھے کی ہوا کے بغیر بھی لرزتے رہتے تھے۔ لمبے پائپ جھولتے تھے تو پنکھے ہوا دینے کے ساتھ ساتھ کئی طرح کی آوازیں پیدا کرکے یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے تھے کہ وہ اپنی عمر پوری کرچکے ہیں۔ جب تک یہ پنکھے چلتے رہتے ان کے پروں پر جمی مدتوں کی گرد نظر نہیں آتی تھی۔

ایک پنکھا اونچے پلیٹ فارم پر منصف کی کرسی کے اوپر چلتا تھا جب کہ دوسرا عدالت کے درمیان اس بڑی میز پر چلتا تھا جس کے گرد بہت سی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے دو ایک کرسیوں کے بازو ٹوٹ چکے تھے۔ ان کرسیوں پر وکلاء بیٹھتے تھے اور اپنے اپنے مقدمہ کی سماعت کا انتظار کرتے تھے۔ اس بھاری میز کے پایوں میں سے ایک میز کا پایہ آدھا ٹوٹا ہوا تھا جس کے نیچے اوپر تلے چار اینٹیں رکھ کر میز کی سطح کو برابر کیا گیا تھا پھر بھی ایک کونے سے میز ذرا سی جھکی ہوئی تھی۔ میز پر پڑی سفید چادر جس کو دھلے کئی مہینے ہوگئے تھے اور جس پر مٹی اور سیاہی کے داغ جمے ہوئے تھے' پائے والی جگہ پر لگی اینٹوں کا عیب چھپانے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ جب کبھی یہ چادر دھلنے کو جاتی تو ہفتوں یہ اینٹیں بے پردہ پڑی رہتی تھیں۔

منصف کی کرسی کے پیچھے دیوار پر قومی لیڈر کی بڑی رنگ دار تصویر اس طرح آویزاں تھی کہ جب فیصلے سنائے جاتے تو خواہ مخواہ نگاہ اس کی طرف ضرور اٹھ جاتی تھی۔ ایسے میں منصف کی پشت اس تصویر کو اس کی نگاہوں سے چھپائے رکھتی تھی۔

منصف کی میز پر موٹا اونی سبز کپڑا گرمیوں کے موسم میں پڑا رہتا تھا میز کے بائیں کنارے پر موٹے شیشوں کی چھوٹی عینک ناک کی پھننگ پر ٹکائے عدالت کا ریڈر فائلوں کو شیشوں کے اندر سے اور لوگوں کو شیشوں کے اوپر سے دیکھتا رہتا تھا۔

عدالت کی دیواروں کے ساتھ ساتھ دائیں بائیں لکڑی کی پرانی بنچیں پڑی تھیں جن کی چولھوں سے سفید آٹا سا نکل نکل کر فرش پر گرتا رہتا تھا۔ ان کی لکڑی کو دیمک چاٹ رہی تھی مگر ابھی یہ بنچ بدلے نہیں جارہے تھے۔ فنڈز کی کمی تھی۔

ان بنچوں پر ملزموں کے لواحقین اور مدعیوں کے گواہ بیٹھتے تھے۔ ان بنچوں کے نیچے عدالت کا افرش اکھڑ رہا تھا کبھی کبھی یہ

کرچیاں کسی کے پاؤں کے نیچے آکر کرچ کرچ کرنے لگ جاتی تھیں۔ ایسے میں ان پاؤں کے مالک چونک جاتے تھے۔

عدالت کے بڑے دروازے کے ساتھ اندر کی جانب لمبائی اور چوڑائی کے رخ والی دیواروں کے درمیان بننے والے کونے میں لوہے کی بڑی بڑی فائلوں سے بھری الماریاں خاموش کھڑی تھیں۔ ان کے اوپر فائلوں کے انباروں پر مٹی کی چڑھی تہیں دور سے بھی نظر آجاتی تھیں۔ کبھی کبھار کسی فائل کا ایک آدھ کاغذ باغیانہ طریقے سے سر اٹھاکر پھڑپھڑانے کی کوشش کرتا مگر فائل کی مٹی کا بوجھ اسے نیچے دبا دیتا۔

ان الماریوں کے درمیان میز کرسی، پرانی الماریوں سے ملتا جلتا وجود اپنے سے بھی پرانے ٹائپ رائٹر پر جھکا ٹک ٹک فیصلے ٹائپ کرتا رہتا تھا۔ اس کے ساتھ دوسری میز پر پولیس کا ایک سپاہی سمنوں کے پلندے سامنے رکھے گواہوں کی تعمیلوں کا حساب کتاب کرتا رہتا تھا۔ عدالت کا نائب قاصد بھاری ان دھلی و ردی میں معمول کے مطابق مستعد نظر آنے کی کوشش کرتا ہوا ہر آنے والے آدمی کو یوں دیکھتا رہتا جیسے اسے بتارہا ہو کہ میں تمہیں پہلے سے جانتا ہوں۔ نائب کورٹ کے ساتھ عدالت کا اہلمد اپنی فائلوں کا حساب کتاب کرتا رہتا تھا۔ یہیں کہیں ان کے قریب سرکاری وکیل کی کرسی میز تھی اور یہ سرکاری وکیل جو ہر روز پرانے سپاٹ چہرے اور بے زبان لہجے میں ہر ملزم کو دنیا کا خطرناک مجرم ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ بہت دیر سے اس عدالت میں ڈیوٹی سرانجام دے رہا تھا۔

یہ سب مناظر، یہ سب چہرے، در و دیوار یہ آوازیں سب اس کی یادداشت کا حصہ بن چکی تھیں کہ وہ آنکھیں بند بھی کرلیتا تب بھی یہ منظر اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ اس کے ذہن کے پردے پر ٹھہرا رہتا۔ اب تو وہ خود بھی اسی اکتادینے والے بے رنگ منظر کا حصہ بنا ہوا محسوس کرنے لگا تھا۔ یہاں تک کہ ملزم کے کٹہرے کے عقب میں دیوار پر ٹنگے پچھلے سال کے کیلنڈر کی نچلی پتری کاغذ سے پوری طرح علیحدہ ہونے کی کوشش کی آواز تک اس کی سماعت میں آجاتی تھی۔

اس کی بعض حسیں اب زیادہ تیز ہونے لگی تھیں۔ عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہوکر وہ اس منظر کو دیکھ سکتا تھا۔ عدالت کے اندر باہر سارے چہرے جیسے شناسا ہوتے جارہے تھے۔ وہ سوچتا کتنے لوگوں کو انصاف کی ضرورت ہوگی؟ ایسی کتنی ہی عدالتیں ہوں گی۔ ایسے کتنے لوگ ہوں گے جو ہر روز انصاف کی امید کے ساتھ بیدار ہوتے ہوں گے اور شام تک نجانے کون خوش نصیب ہوگا جس کے حصے میں انصاف کی دولت آتی ہوگی۔ اور یہ عدالت جو میرے انصاف کے لئے بنائی گئی ہے، اس کے نزدیک میری کیا اہمیت ہوگی؟

اب تک سب شہادتیں مکمل ہوچکی تھیں۔ سرکاری وکیل کا موقف تھا کہ چشم دید گواہان نے یوسف کو چاند کی روشنی میں فائر کرتے اور موقع سے بھاگتے دیکھا تھا۔

معزز گواہوں کے سامنے ملزم کے قبضہ سے وہ پستول برآمد ہوا تھا جس سے مقتول پر فائر ہونے کی تصدیق رپورٹوں سے ہوچکی تھی۔ مقتول کے جسم سے برآمد ہونے والی گولی اسی پستول کی تھی۔

مقتول نے اپنے نزعی بیان میں یوسف کا نام لیا تھا۔ اور یہ مرتے آدمی کا سچ تھا جسے قانون جھٹلا نہیں سکتا اور پھر ملزم کی مقتول کے ساتھ دشمنی بھی تھی۔ وجہ قتل موجود تھی۔ مقتول نے کچھ عرصہ قبل ملزم کی جوان بہن پر آوازہ کسا تھا جس کا ملزم کو بجا طور پر رنج تھا۔

وکیل استغاثہ نے گواہوں اور شہادتوں کے حوالے سے عدالت کو یہ بات باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ اس سے مکمل اور شک و شبے سے بالا کوئی اور مقدمہ کم ہی ہوسکتا ہے۔ ملزم نے قتل کیا تھا اور اس جرم کی پاداش میں تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۰۲ کے تحت وہ سزائے موت کا مستحق تھا۔

یوسف یوں سرکاری وکیل کی بحث سن رہا تھا جیسے ان واقعات سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ اس کے چہرے پر عجیب سی شان بے نیازی تھی اس میں تعجب کی ہلکی سی جھلک بھی موجود تھی۔ اسے یقین تھا یہ قتل اس نے نہیں کیا پھر بھی کس طرح جان بوجھ کر عدالت میں جھوٹ بولا جارہا ہے۔

وہ سوچ رہا تھا کیا عدالت کو پتہ ہے کہ اس کے سامنے جھوٹ بولا جارہا ہے؟ پھر وکیل' صفائی نے اپنے دلائل شروع کئے۔

"جناب والا! یہ بات درست ہے کہ قتل ہوا ہے مگر یوسف جیسا معصوم نیک دل نیک کردار اور صاف ضمیر انسان یہ قتل نہیں کرسکتا۔ اس کی زندگی اس کا کردار اس بات کا گواہ ہے کہ وہ قتل کرنے کا اہل ہی نہیں۔ اس کے خاندان کا کریکٹر دیکھ لیں۔ اس کے چہرے کی بے نیازی کہہ رہی ہے کہ وہ قاتل نہیں ہوسکتا۔ قاتلوں کے چہرے ایسے نہیں ہوسکتے۔

جناب والا! گواہوں نے محض مفروضے اور غلط فہمی کی بناء پر اس کا نام لیا ہے۔ میرا موکل فائر کی آواز سن کر گھبرا گیا تھا۔ وہ موقع سے اس لئے نہیں بھاگا تھا کہ اس نے قتل کردیا تھا بلکہ وہ سمجھا تھا کہ گولی اس پر چلائی گئی ہے۔ یہ ایک اضطراری عمل تھا جو اس کے اپنے اختیار میں نہیں تھا اور جو بھی عمل کسی کے اختیار میں نہ ہو اسے اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جانا چاہئے۔

گواہوں نے جناب والا! اسے بھاگتے دیکھا تھا اور تصور کرلیا کہ پہلے اس نے فائر کیا تھا۔ چونکہ اصلی قاتل نظر نہیں آیا اس لئے میرے موکل کو بڑی آسانی سے قاتل کی جگہ دے دی گئی ہے۔

پستول کی برآمدگی اس پر پلانٹ کی گئی ہے۔ نمبردار' پٹواری' چیئرمین' پولیس کے کہنے پر کبھی بھی کسی بھی کاغذ پر دستخط کرسکتے ہیں کوئی بھی آدمی' کوئی اور آدمی' ایسا ہوسکتا ہے' اس قتل کا ذمہ دار ہو' یہ محض واقعات کا ظالمانہ تسلسل ہے جس نے میرے موکل کو ملزم ٹھہرادیا ہے۔ اصل قاتل ضروری نہیں یوسف کا دشمن ہی ہو' مگر خود اس الزام سے بچنا چاہتا ہو۔ یہ کوئی پہلی مثال نہیں ہے کہ ایک بے گناہ کو ملزم ٹھہرایا جارہا ہے۔

وکیل صفائی نے رک کر پانی مانگا۔

عدالت کے نائب قاصد نے شیشے کے دھندلے سے گلاس میں پانی پیش کیا۔ جب تک وکیل صفائی پانی پیتے رہے' عدالت میں مکمل خاموشی تھی یہاں تک آخری بڑے گھونٹ کے وکیل کے حلق سے نیچے اترنے کی آواز بھی سنائی دی۔

اوپر پنکھوں کی "گھوں گھوں" یہ مسلسل تھی مگر اب وہ بھی اس خاموشی کا حصہ بن چکی تھی۔

اس بلڈنگ میں بہت سی دوسری عدالتیں بھی تھیں۔ یہ بلڈنگ خطرناک قرار دی جاچکی تھی مگر نئی بلڈنگ کی تعمیر ابھی شروع نہیں ہوئی تھی اس لئے ابھی یہی عمارت انصاف کے حصول کے لئے کام دئے جارہی تھی۔

جناب والا! میں نے جب یہ مقدمہ لڑنے کا فیصلہ کیا تھا تو شروع شروع میں مجھے بھی یہی لگتا تھا کہ ملزم قاتل ہے۔ حالات' گواہیاں' بیانات واقعات سب یہی کہتے تھے۔

مگر جناب والا! اتنی پیشیوں' اور اپنے موکل کے ساتھ اپنے قریب تعلق اور بات چیت کے بعد میں نے حالات و واقعات کا اچھی طرح جائزہ لیا ہے۔ مجھے یقین ہوچلا ہے کہ میرا موکل بے گناہ ہے۔ آپ بھی اپنے دل سے پوچھئے ملزم کی شکل دیکھئے' میرا موکل خطا کار ہوسکتا ہے۔ غلطی کرسکتا ہے۔

اس نے غلطی کی جو فائر کی آواز سن کر بجائے موقعہ واردات کے گاؤں کی جانب بھاگ اٹھا۔ مگر اس وقت اس کی ایسی کوئی نیت نہیں تھی' کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اگر وہ وہیں رہتا جہاں کہ وہ فائر چلنے کے وقت تھا تو شاید کسی کو نظر ہی نہیں آتا اور پولیس کو اصل قاتل کی تلاش کرنے کے لئے محنت کرنی پڑتی۔ اصل قاتل نہ بھی ملتا تب بھی یوسف آسانی سے قاتل نہ ٹھہرایا جاتا۔ گواہ اسے نہ پکڑواتے تو کبھی نہ کہتے کہ انہوں نے اسے ہی مقتول پر فائر کرتے دیکھا تھا۔

اور جناب والا! یہ محض اتفاق تھا' میرے موکل کی بدنصیبی تھی کہ ڈھائی تین سال قبل جب مقتول نے اس کی بہن سے مذاق کیا تو اس نے غصے میں کہہ دیا تھا کہ اگر اس کے پاس پستول ہوتا تو وہ سراج کو قتل کردیتا۔ اس نے تو ایسے ہی' دوسروں پر رعب ڈالنے کے لئے ایک بھائی کی غیرت کے جھوٹے اظہار کے لئے یہ کہہ دیا تھا ورنہ کبھی بھی اس کا ارادہ سراج کو قتل کرنے کا نہیں تھا۔ پچھلے ڈھائی

تین سال اس نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کی بہن کی شادی کو بھی کافی وقت گزر چکا ہے، اگر سراج قتل نہ ہوتا تو لوگ کبھی اس واقعہ کو دوبارہ یاد نہ کرتے۔

یوسف بڑے دھیان سے اپنے وکیل کی بحث سن رہا تھا اس کے چہرے پر ایسا اطمینان تھا جیسے اس کے دل کی بات کہی جا رہی ہو۔

وکیل صفائی نے ایک دفعہ پھر پانی پیا اور کہنے لگا۔

جناب والا! مقتول سراج تو خواہ مخواہ ہی ڈر گیا تھا۔ یوسف نے اسے کوئی دھمکی نہیں دی تھی۔ مگر مقتول اس دھمکی کے خوف کی زد میں رہا۔ حالانکہ اس نے یوسف کے گھر آکر چوری چھپے اس سے معافی بھی مانگ لی تھی۔

یہ سب باتیں گواہوں نے اپنی جرح میں بیان کی ہیں۔ مرتے وقت بھی سراج کے ذہن میں فوری طور پر یوسف کا ہی خیال آسکتا تھا اس کی آنکھوں میں یوسف کی تصویر ٹھہر گئی تھی۔ وہ جب بھی قتل ہوتا تو اس نے یوسف کا ہی نام لینا تھا۔ اسے خوف تھا یوسف اسے قتل کردے گا۔ مقتول خود ان بھائیوں میں سے تھا جو اپنی بہن کی عزت کے لئے خون کرنے پر تیار ہوجاتے ہیں۔ میرے بس میں ہوتا تو مقتول کی ماں کو بطور صفائی کے گواہ کے پیش کردیتا۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ مقتول سراج کی بہن کو ایک دفعہ قریبی گاؤں کے ایک جوان نے چھیڑا تھا تو مقتول نے اس کی ٹانگیں توڑ دی تھی۔ مگر فریقین میں راضی نامہ ہوگیا تھا اور وہ کیس پولیس کے پاس نہیں آیا تھا۔ مگر یوسف ایسا بھائی نہیں تھا۔ اپنی بہن کی شادی کے بعد وہ اس واقعہ کو ہمیشہ کے لئے بھول چکا تھا۔

جناب والا! مجھے اس بات کا احساس ہے کہ شہادت استغاثہ کے مقابلے میں ملزم کی بے گناہی ثابت کرنا مشکل کام ہے مگر جناب والا! آپ خود سوچئے کہ ہم میں سے جس پر بھی کوئی جھوٹا الزام لگادیا جائے۔ تو کیا ہم اپنی بے گناہی ثابت کر پائیں گے۔ کہتے ہیں شرِ ازل سے انسان کے خمیر میں شامل کردیا گیا ہے یہ انسان پر الزام ہے کیا ہم میں سے کوئی انسان اب تک یہ ثابت کرپایا ہے کہ ہم سراپا نیکی ہیں۔ یہ بے گناہی کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے جناب والا! اسی لئے کسی کی بے گناہی کا ثبوت دیکھنے سے کہیں بہتر ہے، ہم اس پر عائد کردہ الزام کے ثبوت میں شک ہی کو تلاش کرلیں خواہ یہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو اور یہی قانون کا بھی منشاء ہے۔

عدالت میں خاموشی تھی۔ پنکھے جھولتے جارہے تھے۔ دیوار پر لٹکتے کیلنڈر کی لوہے کی پتی کی دیوار سے رگڑنے کی آواز کچھ زیادہ ہوگئی تھی۔ یہ آواز یوسف کی پشت کو بری طرح چبھ رہی تھی ٹائپسٹ کی ٹک ٹک بھی ٹھہر گئی تھی۔

سب منصف کی آواز سننا چاہتے تھے۔

اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اس کا اندر سب سے چھپا ہوا تھا وکیل استغاثہ کے چہرے پر مخصوص طنزیہ مسکراہٹ ٹھہری ہوئی تھی۔ یوسف مطمئن تھا۔ اس کا یہی کیس تھا۔ وہ اپنے وکیل کی کارکردگی پر مطمئن تھا۔

بقیہ بحث اور فیصلے کے لئے مقدمہ آئندہ پیشی تک ملتوی کردیا گیا۔

فیصلے

یہ اگلی پیشی تھی۔

ہتھکڑیاں اور زنجیریں پہنے وہ عدالت کے ایک کونے میں لگا کھڑا تھا۔ اس کی پکار ہوچکی تھی مگر کسی اور مقدمے کا فیصلہ سنایا جارہا تھا۔

کٹہرے میں کھڑا ملزم فیصلے کا منتظر تھا۔ یوسف نے اس کو غور سے دیکھا اسے لگا اس کی شکل میں کوئی مانوس سا چہرہ ابھر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس ملزم سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا پھر بھی اسے یہ شکل جانی پہچانی لگ رہی تھی۔

وہ یہ بات سمجھنے کے لئے اپنے خیالات سے الجھ رہا تھا کہ جرم بھی رشتے، تعلق کا سبب بن سکتا ہے۔ شاید اس کے ذہن کے کسی کونے میں یہ خیال چھپا بیٹھا تھا کہ یہاں آنے والا ہر مجرم بے گناہ ہوتا ہے۔

منصف نے حکم پڑھ کر سنایا اور ملزم کو جرم ثابت ہونے پر پھانسی کی سزا دی۔ وہ ملزم چند لمحے کھڑا عدالت میں نگاہیں گھماتا رہا۔ ان نظروں میں روشنی نہیں تھی۔ پھر وہ ملزم خاموشی سے کٹہرے سے نکلا اور جونہی اس کے قدموں نے فرش کو چھوا اچانک وہ اپنی ہتھکڑیوں اور سلاخوں سمیت اس طرح زمین پر لیٹ گیا کہ اس کے ہاتھ جڑے ہوئے اور ٹانگیں پھیلی ہوئی تھیں اور شاید سجدہ شکر بجالا رہا تھا۔

عدالت میں موجود لوگوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس حیرت کے کچھ چھینٹے منصف کے چہرے تک جا پہنچے۔ انصاف جو کہ کتابی طور پر اندھا ہوتا ہے آنکھیں کھول کر اپنے فیصلے کا عجیب و غریب منظر دیکھ رہا تھا۔

حراست کی ڈیوٹی پر موجود سپاہی نے ملزم کی زنجیر کھینچی تو ملزم کے ہاتھ اٹھ گئے مگر اسے اپنی ٹانگیں سمیٹنے میں بڑی محنت کرنا پڑی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی پیشانی پر دھول جم گئی تھی مگر ایک سجدے سے جیسے وہ مطمئن ہوگیا تھا۔

اس نے جج کی طرف دیکھا اور بولا۔

"بہت مہربانی جج صاحب! میں تین سالوں سے اس سزا کو اڈیک رہا تھا۔ ان تین سالوں میں میرے بیوی بچے رل گئے تھے کبھی ایک جگہ کبھی دوسری جگہ چھپتے پھر رہے تھے۔ مخالفوں نے انہیں مار مکانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ انہیں ڈر تھا میں کہیں چھوٹ نہ جاؤں۔ مجھے سزا ہوگئی۔ ان کا کلیجہ ٹھنڈا ہوگیا۔ اب انہیں بدلہ لینے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ میرے بیوی بچے اب آرام سے زندگی گزار سکیں گے۔ میں نہیں رہوں گا۔ ان کی دشمنی بھی مٹ جائے گی۔ میری موت میرے بیوی بچوں کو زندگی دے دے گی۔ میں ان کے لئے آپ کا فیصلہ آپ کی سزا بخوشی قبول کرتا ہوں مجھے مرنے کا کوئی افسوس نہیں۔میں کسی عدالت میں آپ کے فیصلے کے خلاف اپیل نہیں کروں گا۔" اس ملزم نے یہ ساری باتیں ایک ہی سانس میں کہہ دیں۔ کوئی اسے روک نہ سکا۔

سب لوگ ایک دوسرے کی طرف حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔وکیلوں کے چہرے پر بھی حیرت تھی۔

جج صاحب کچھ دیر کے لئے ریٹائرنگ روم میں چلے گئے۔ آدھ گھنٹے بعد عدالت دوبارہ لگی۔

وکیل استغاثہ نے اپنی بحث کو سمیٹا۔ جج صاحب نے وکیل صفائی سے پوچھا۔

"آپ کچھ اور کہنا چاہیں گے؟"

"جناب والا! آپ یقین کیجئے بہت مضبوط شہادتوں کے باوجود میرا موکل بے گناہ ہے۔میں یہ بات دہرانا چاہوں گا کہ جرم ثابت کرنے کی نسبت بے گناہی ثابت کرنا زیادہ مشکل ہے۔یہ کاغذ جھوٹ بول سکتے ہیں۔گواہ جھوٹ بول سکتے ہیں۔یہاں تک کہ مرتے وقت بھی انسان جھوٹ بول سکتا ہے اگر اسے اپنے حواس پر قابو نہ ہو۔ابھی ابھی آپ نے ملاحظہ کیا۔ ایک ملزم کو آپ نے سزائے موت دی اور وہ ملزم سجدے میں گر پڑا اور شکر ادا کرنے لگا وہ خوش تھا۔پتہ نہیں وہ موت کو کیا سمجھ رہا تھا۔ کسی کو کیا پتہ اس کے کیا حالات تھے۔ کم ہی ایسا ہوا ہے کہ ایک زندہ انسان موت کی سزا اتنی خوش دلی سے قبول کرے۔ یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ اسی طرح جیسے میرا موکل استغاثہ کی تمام شہادتوں کے باوجود بے گناہ ہے" اس مرحلے پر سرکاری وکیل نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

"جناب والا! اس واقعہ کا اس مقدمے کے حالات و شواہد سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ وکیل صفائی کی بحث بے معنی اور فرضی ہے۔ اگر ہم ان گواہیوں' ان دستاویزات پر بھی اعتبار نہ کریں' تو ہمارے قانون کے پاس فیصلوں کے لئے کیا معیار رہ جاتا ہے؟ معزز وکیل صفائی کے دلائل سمجھ اور عقل سے بالا ہیں۔"

وکیل استغاثہ کی بات کا جواب دینے کے لئے وکیل صفائی نے بڑے اعتماد سے کہا "ہر بات سمجھ اور عقل کے سہارے ہی نہیں سمجھی جاسکتی۔ منصف کے پاس ایسی ان سائیٹ ہونی چاہئے جو اس کی آنکھوں کے سامنے انصاف مانگنے والے کی اندرونی کیفیت کھول کر رکھ دے۔منصف کے پاس الہام کی روحانی طاقت ہونی چاہئے۔ اس کے اندر سے آواز آنی چاہئے کہ کیا غلط ہے کیا صحیح ہے۔ منصف کو عام آدمی سے بہت بلند ہونا چاہئے۔ اس کا اندر آئینے کی طرح شفاف اور صاف ہونا چاہئے۔ اسے وہ کچھ نظر آنا چاہئے جو عام آدمی کو نظر

نہیں آتا تبھی انصاف ممکن ہے۔جناب والا! اگر میرا موکل مجرم ہے' تو ہم سب بھی مجرم ہیں یہ علیحدہ بات ہے کہ ہمیں اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے بوجھ سے آزاد رکھا گیا ہے۔ہم اگر دوسروں پر فیصلے صادر کرتے ہیں تو خود پر بھی یہ فیصلہ دینے کی ہمت ہونی چاہئے۔ ہم ایک طرف منصف ہوتے ہیں' وکیل ہوتے ہیں تو دوسری طرف مجرم بھی ٹھہرسکتے ہیں۔ کیوں کہ ہم ایک ہی تسلسل' ایک ہی بے انصافی کے عہد کا حصہ ہیں۔ ہم میں سے کوئی دوسرے سے الگ نہیں ہم سب عصر حاضر کے قیدی ہیں۔"

وکیل صفائی خاموش ہوئے تو وکیل استغاثہ ایک دفعہ پھر عدالت سے مخاطب ہوئے۔

جناب والا!میں حیران ہوں کہ اس مقدمہ میں میرے فاضل دوست کو پتہ نہیں کیا دلچسپی ہے جو وہ اتنے جذباتی ہو رہے ہیں۔ اس سے پہلے انہوں نے کبھی کسی مقدمے میں ایسی بحث نہیں کی۔"

وکیل صفائی نے جیسے تازہ دم ہوتے ہوئے کہا۔

جناب والا!میں نے اس سے پہلے بہت سی عدالتوں میں بہت سے مقدمے بری کرائے ہیں۔ حالانکہ ان میں سے بہت سے ملزموں میں مجھے ملزم کی بے گناہی کا یقین تک نہیں تھا۔ مگر اس مقدمہ کی بات دوسری ہے۔ میرا دل گواہی دینے لگا ہے اور شاید یہ پہلی بار ہوا ہے کہ میرا موکل یوسف بے گناہ ہے۔"

یہ کہہ کر وکیل صفائی ڈائس سے ہٹ کر اپنی سیٹ پر جا بیٹھے اور جیب سے رومال نکال کر ماتھے کا پسینہ پونچھنے لگے۔

عدالت میں خاموشی چھاگئی۔

آدھ گھنٹے کے لئے عدالت میں وقفہ ہوا۔

وقفہ کے بعد پھر عدالت لگی۔ مقدمے کی بحث کے دوران اتنی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی کہ بہت سے وکیل اور وہ لوگ بھی جمع ہوگئے تھے جن کا اس مقدمے سے براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔

یوسف فیصلے کے انتظار میں کٹہرے میں کھڑا تھک گیا تھا۔ تب اسے دور کہیں سے جیسے آواز سنائی دی۔

"گواہوں کے بیانات' شہادت استغاثہ اور حالات مقدمہ کے بعد قانون کی نظر میں ملزم یوسف کا جرم ثابت ہوتا ہے۔لہٰذا اسے جرم ثابت ہونے پر تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۰۲ کے تحت موت کی سزا دی جاتی ہے۔"

عدالت کا سارا منظر اس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔

یوسف نے اپنی نظر کو ٹکانے کی کوشش کی مگر اس کی نظر کسی جگہ پر ٹھہرتی ہی نہیں تھی۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش میں اس نے سوچنا چاہا میں تو بے گناہ ہوں۔ مگر ایک دھند سی اس کے اردگرد ہی نہیں اس کے حواس پر بھی چھارہی تھی۔

منظر منظر ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی نگاہوں کے سامنے بکھرتے رہے۔ اس نے اپنی ماں کے روتے چہرے کو دیکھا۔ پہچاننے کی کوشش کی۔

عورت کیوں رو رہی ہے؟ اسے خیال آیا۔ یہ وکیل استغاثہ اتنا خوش کیوں ہو رہے ہیں؟

اس نے دوسرا چہرہ دیکھا۔ وکیل صفائی کا چہرہ اتر گیا تھا۔

عدالت سے باہر نکلتے ہوئے اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ وہ اپنی اس حالت پر حیران ہورہا تھا۔کیا یہ سارا اہتمام سارا قانون اسی کے لئے بنا تھا اتنی مدت سے مجھے اسی فیصلے کا انتظار تھا؟یہ بات وہ سوچتا رہا تھا۔ خود سے پوچھتا جارہا تھا۔وہ شاید کسی سے پوچھنا بھی رہا تھا۔

اس کے ماموں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے تسلی دی "حوصلہ نہ چھڈ پتر! اسی اپیل کراں گے ابھی بڑی عدالتیں باقی ہیں"

اس کی لاری تیار کھڑی تھی۔

آج اس کا وکیل گاڑی تک اس کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"مجھے یقین ہے اپیل میں تمہاری بے گناہی ضرور ثابت ہوجائے گی۔ وقت کے ساتھ ساتھ خودبخود بے گناہی ثابت ہونے لگتی ہے۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں تمہیں سزا سے نہ بچا سکا۔ مگر یہ بات ضروری نہیں کہ ہر سزا یاب ہونے والا شخص لازما مجرم بھی ہو۔ میں تمہاری بے گناہی عدالت پر ثابت نہ کرسکا۔ مجھے اس بات کا دکھ رہے گا۔ شاید میں ابھی بہت بڑا وکیل نہیں بن سکا۔ لیکن یہ مقدمہ ہارنے کا مجھے بھی صدمہ رہے گا۔ شاید اللہ کو یہی منظور تھا۔"

وکیل نے یوسف کا کندھا تھپتھپایا اور شرمندہ واپس ہوگیا۔

سب لوگ یوسف کو ہمدردی سے دیکھ رہے تھے۔ ڈیوٹی پر موجود سپاہی بھی آج افسوس کررہے تھے یوسف نے عدالت سے باہر نکلتے ہوئے یوں محسوس کیا تھا جیسے انسان سے بڑی کوئی طاقت اسے اس راستے پر دھکیل رہی تھی۔ یہ سب کچھ ایسے ہی اتفاقا تو نہیں ہورہا۔

اسے خیال آیا۔وہ آواز جج کی نہیں تھی۔ کسی اور مقام سے آرہی تھی۔

جج کو کیا پتہ کہ میں نے یہ قتل کیا ہے یا نہیں

اس سے پہلے اس کے دماغ میں کبھی اتنے خیالات یوں جمع نہیں ہوئے تھے۔

اسے اپنی جسمانی حالت پر بھی شبہ ہورہا تھا۔

جب میں بے گناہ ہوں تو پھر یہ خوف؟ یہ ڈر؟یہ سب ایسا کیوں ہے؟

میری بے گناہی ثابت ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں نے واقعی ہی قتل کیا ہے۔

وہ خود کو سمجھا رہا تھا۔ بڑی مشکل بات تھی۔

شک شبے

لنگر خانے اور ہسپتال کی عمارتوں کے درمیان کھلے صحن میں گیارہ قیدیوں کو ایک لائن میں کھڑا کیا جارہا تھا۔ جیل کے لباس میں ملبوس ان قیدیوں کے حلیئے قد کاٹھ ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے۔ ان کے مماندرے بھی ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے۔ قتل کے ایک مقدمہ کے مجرم کی شناخت پریڈ کا بندوبست ہورہا تھا۔

یوسف بھی ان گیارہ قیدیوں میں شامل تھا۔

ایک ہی طرح کی بے بسی' کرختگی اور مایوسی ان کی شکلوں میں اور بھی مشابہت پیدا کررہی تھی۔ سب کی آنکھیں ایک ہی طرح ویران اور بے خواب تھیں۔ اپنے اور دوسروں کے گناہوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ایک ہی انداز میں جھکے جھکے لگ رہے تھے۔

ان میں ایک ملزم پر قتل کی واردات کا شبہ تھا۔

جن تینوں گواہوں نے اصل مجرم کی پہچان کرنا تھی انہیں جیل کی ڈیوڑھی میں کھڑا کیا گیا تھا۔ وہاں سے شناختی پریڈ والی جگہ نظر نہیں آتی تھی۔ جب سب انتظامات مکمل ہوگئے تو مجسٹریٹ' سپرنٹنڈنٹ جیل آکر قیدیوں کی قطار کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ان کے قریب جیل کے وارڈر اور سپاہی مستعد کھڑے تھے کارروائی شروع ہوئی۔

جس ملزم کو اس واردات کے شبے میں پکڑا گیا تھا اسے قیدیوں کی صف میں دائیں سے تیسرے نمبر کھڑا کردیا گیا۔ تمام قیدیوں کے نام اور ان کے کھڑے ہونے کے نمبر نوٹ کرلئے گئے۔ دائیں سے چوتھے نمبر پر یوسف کھڑا تھا۔

وہ بار بار اپنے دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔

مجسٹریٹ نے ہدایت کی کہ کوئی قیدی کارروائی کے دوران ادھر ادھر دیکھے گا نہ ہی اشارے کنائے سے گواہ کی کوئی مدد کرے گا۔

سب کی نگاہیں زمین پر رہیں گی۔

یوسف کو یہ کھیل بڑا دلچسپ لگ رہا تھا۔

مجسٹریٹ کی اجازت پر پہلے گواہ کو بلایا گیا اور اسے کہا گیا کہ وہ ان گیارہ قیدیوں میں اس ملزم کو تلاش کرے جس کو اس نے واردات کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اصل میں تین نمبر یا وہ مجرم تھا جسے پولیس نے قتل کے اس جرم کے شبے میں پکڑا تھا۔

گواہ نے دو تین مرتبہ چل پھر کر سب قیدیوں کو غور سے دیکھا' پہچاننے کی کوشش کی۔ پھر وہ یوسف کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ یوسف نے اپنے چہرے پر اس گواہ کی نگاہوں کی ٹکٹکی محسوس کی تو وہ نہ جانے کیوں ایسے ہی گھبرا سا گیا۔ اس نے گردن اٹھائی اس کی آنکھوں میں خوف تھا۔

گواہ نے یوسف کی طرف اشارہ کردیا۔

تین نمبرئے اصل ملزم کے چہرے پر فتح مندی کی مسکراہٹ پھیل گئی۔

مجسٹریٹ نے کاروائی لکھی' گواہ کے دستخط کرائے اور گواہ کو ہسپتال کے برآمدے میں بھیج دیا جہاں سے وہ اس منظر کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

دوسرے گواہ کو بلانے سے پہلے قیدیوں کے کھڑے ہونے کی پوزیشنیں بدل دی گئیں۔ مشکوک ملزم کو اب دائیں سے بائیں ساتویں نمبر پر بٹھاکر ان کی نئی ترتیب لکھ دی گئی۔

یوسف اب بائیں سے دائیں تیسرے نمبر پر تھا۔ دوسرے گواہ کو بلایا گیا اور اسے قیدیوں میں سے اصل مجرم کو شناخت کرنے کے لئے کہا گیا۔اس گواہ نے بھی آگے پیچھے دائیں بائیں چل پھر کر سب قیدیوں کا جائزہ لیا۔ بہت سوچ سمجھ کر وہ آگے بڑھا اور یوسف کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔یوسف جیسے سن ہوگیا۔

وہ حیران تھا۔ایک تو اصل ملزم پھر بچ گیا تھا۔ دوسرے اس گواہ نے بھی کسی مغالطے کی بنا پر اسے ہی اپنا مجرم سمجھ لیا تھا۔ عجیب خوفناک اتفاق ہے۔کیا کہیں میرے چہرے پر گناہ یا جرم کی ایسی علامت تو نہیں کہ مجھے ہی مجرم سمجھا جارہا ہے۔ اس نے بہت مجبوری اور بے کسی کی حالت میں یہ بات سوچی تھی۔ اصل ملزم خوش ہورہا تھا۔

اس گواہ کو بھی ہسپتال کے برآمدے میں بھیج دیا گیا۔

تیسرے گواہ کو بلوانے سے قبل قیدیوں کی ترتیب میں ایک مرتبہ پھر رد و بدل کیا گیا۔ اصل مجرم کو اس دفعہ دائیں سے بائیں پانچویں نمبر پر بٹھاکر ان کی ترتیب لکھی گئی۔

یوسف کو نئی ترتیب کے مطابق اب بائیں سے دائیں دوسرے نمبر پر کھڑا کیا گیا تھا۔

تیسرے گواہ نے بھی آکر آگے پیچھے پھرپھرا کر سب قیدیوں کو غور سے دیکھا۔ یوسف سب قیدیوں میں اب سب سے گھبرایا ہوا قیدی تھا۔ اصل مجرم اب پہلے سے بھی زیادہ بااعتماد ہوچکا تھا۔ دو گواہوں نے اسے نہ پہچان کر اس کے بچاؤ کا بہت سا سامان پیدا کردیا تھا۔

یوسف کے چہرے پر پسینہ آرہا تھا حالانکہ اصل واردات سے کسی طرح بھی اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اصل مجرم یہیں قریب ہی کھڑا تھا۔ اس کا جی چا رہا تھا کہ چیخ چیخ کر گواہ کو اصل مجرم کا پتہ دے دے مگر مجسٹریٹ نے انہیں نہ بولنے کا حکم دے رکھا تھا۔ یہ گواہ اصل مجرم کو کیوں نہیں پہچان رہے ہیں حالانکہ انہوں نے وقوعہ کے وقت اسے فائر کرتے وقت اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور رات اتنی چاندنی ضرور تھی کہ دور سے وہ آدمی کو پہچان سکتے تھے۔

اچانک اس گواہ نے بھی یوسف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

"یہ ہے جی ہمارا مجرم"

یوسف کی آنکھیں حیرت سے جیسے ابل پڑیں۔ اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ وہ سکتے میں آگیا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ تینوں گواہوں نے اصل مجرم کو شناخت کرنے کی بجائے یوسف کو اپنا ملزم سمجھ لیا تھا۔

وہ چیخ پڑا۔

"نہیں مجسٹریٹ صاحب! میں قاتل نہیں ہوں۔ میں نے قتل نہیں کیا میں بے گناہ ہوں۔ اصل قاتل کو تو اب آپ بھی جانتے ہیں۔"

"آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ آپ پر کسی بھی طرح اس جرم کا الزام نہیں آئے گا۔ اور نہ ہی آپ کے خلاف کاروائی ہو سکتی ہے۔ یہ تو ایک طریقہ کار تھا' ہاں البتہ اس کا فائدہ مشکوک آدمی کو ضرور ہوگا۔"

مجسٹریٹ کی بات سے یوسف کی تسلی نہیں ہوئی۔ اصل مجرم کے لئے اپنی خوشی چھپانی مشکل ہو رہی تھی۔ قانون کے ہاتھ اس تک نہیں پہنچ پائے تھے۔

"بچ گئے ہو بچو! اگر تمہیں پہلے ہی قتل کے الزام میں سزا نہ ہوگئی ہوتی تو ہو سکتا تھا اس قتل کا الزام بھی تم پر ہی آجاتا۔" یوسف کے ساتھ کھڑے قیدی نے اس کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

یوسف ابھی تک سن کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ اصل مجرم کی موجودگی کے باوجود آخر تینوں گواہوں نے اسے ہی کیوں قاتل سمجھا۔ ضرور میرے چہرے میں ایسی کوئی بات ہے جس سے مجھ پر قاتل کا شبہ ہوتا ہے اور شاید یہی وجہ ہو کہ عدالت نے بھی مجھے قاتل سمجھنے میں دھوکہ کھایا ہے۔ یہ خیال خوف کی لہی لکیر سی بن کر اس کے سر سے پاؤں تک تیر گیا۔

"مگر وہ ریشماں کہتی ہے میں قاتل ہو ہی نہیں سکتا۔ مجھ میں قاتل جیسی کوئی بات ہی نہیں۔ پھر یہ قانون' یہ گواہ۔" اس نے اپنا گھومتا ہوا سر پکڑ لیا اور زمین پر بیٹھ گیا۔

"عجیب اتفاق ہے۔" داروغہ جیل کو اس نے مجسٹریٹ سے بات کرتے سنا؟ "گواہ اصل مجرم کو شناخت نہ کرسکے۔ اس کے بجائے تینوں نے ایک ایسے قیدی کو غلط شناخت کیا جو اس واردات میں کسی طرح بھی ملوث نہیں۔"

مجسٹریٹ نے کاغذات سنبھالتے ہوئے کہا۔

"یہ زندگی بڑے کربناک اور حیران کن اتفاقات اور حادثات سے بھری پڑی ہے۔ ہم ہر وقت کسی حادثے' کسی نہ کسی اتفاق کی زد میں ہوتے ہیں۔ اللہ سے دعا مانگنی چاہئے کہ وہ ہمیں ایسے حادثوں سے محفوظ رکھے۔"

یوسف کے دل میں ایک اور خیال عجیب طرح کا اثر چھوڑتا چلا گیا۔

"کیا دعا مانگنے سے یہ حادثات' یہ اتفاقات ٹل جاتے ہیں؟"

جیلر نے ایک مرتبہ پھر اپنی حیرانی کا اظہار کیا۔

"ویسے یہ اتفاق ہے بہت حیران کن' میری زندگی کا یہ پہلا تجربہ ہے کہ سب گواہوں نے ایک ہی آدمی کو غلط طور پر شناخت کیا ہو۔"

"سزا اور جزاء کا قدرت کا اپنا نظام بھی ہے جو ہمارے فہم اور فراست سے بالا ہے۔ کوئی پتہ نہیں چلتا کہ جو سزا ہم ایک مجرم کو دے رہے ہیں وہ کس جرم کی ہے یا پھر کسی ایسے گناہ کی ہے جہاں تک قانون کی پہنچ نہیں تھی۔ کوئی پتہ نہیں چلتا۔ فیصلے ایسے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ یقین کے بغیر بھی۔ انصاف لینا انصاف کرنا دونوں ہی بہت مشکل ہوگئے ہیں۔ منصف اور ملزم دونوں کو کبھی کبھی ایک ہی قسم کے عذاب سے گزرنا پڑتا ہے۔"

مجسٹریٹ کی بات میں جو گہرائی تھی وہ جیلر کی سمجھ سے باہر تھی اس لئے وہ اپنے عملہ کو ضروری ہدایات دینے میں مصروف ہوگئے۔

شناخت پریڈ کی کاروائی مکمل ہوچکی تھی۔ قیدی اپنی اپنی بارکوں کی طرف جارہے تھے۔ ان میں یوسف بھی تھا جسے لگ رہا تھا جیسے وہ

کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہے۔ ایسا خواب جس میں جاگنے کے لمحے آتے تھے مگر وہ اس خواب کے سحر سے آزادی نہیں پاسکتا تھا۔

بہکاوے

شہر میں اصلاح معاشرہ کی تحریک چل رہی تھی۔۔ آئے دن سیمینار، ورکشاپیں، جلسے منعقد ہو رہے تھے۔ شہر کی دیواروں پر چاکنگ ہو رہی تھی۔ بینرز، اشتہار، پوسٹرز جا بجا نظر آ رہے تھے۔۔ بجلی کے کھمبوں پر عالموں، دانشوروں کے قول نیون سائینز میں ساری ساری رات روشن رہتے تھے تاکہ آنکھوں کے راستے ان کا اثر لوگوں کے دلوں تک اتر جائے۔ رشوت، سفارش کو برائی لکھا جا رہا تھا۔ اخلاقی تعلیمات کے قد آدم سائز کے بورڈ شہر کی چوکوں میں نصب کر دیئے گئے تھے۔

کچھ درد مند لوگوں نے مل کر سوچا تھا کہ جس تیزی سے ہم اخلاقی معاشرتی انحطاط کی طرف جا رہے ہیں اس کو روکنے کی ضرورت ہے اور اگر اس سیلاب کے آگے بندھ نہ باندھا گیا تو یہ سیلاب ہماری آزادی کے سب ثمرات بہالے جائے گا۔

پھر کہیں سے یہ تجویز آئی کہ جیل کی دیواروں کے اندر بھی اس تحریک کا پرچار کرنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ لوگ جب اپنی اپنی سزا کاٹ کر باہر معاشرہ میں واپس آئیں تو ان میں اچھے، شریف شہری بننے کی صلاحیت باقی رہے۔

جیل کے صحن میں بڑا اسٹیج بنایا گیا تھا۔ قیدیوں کو کھلے آسمان کے نیچے جمع کیا گیا تھا۔۔ آج پہلا موقع تھا کہ یہ قیدی کھلے آسمان کے نیچے اکٹھے ہوئے تھے اسی حساب سے وہاں سیکورٹی کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔

اسٹیج پر لیڈروں کے ساتھ جیل حکام بھی موجود تھے۔ تلاوت اور نعت کے بعد تقریریں شروع ہوئیں پہلے مقرر نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"بڑی مدت سے میری یہ خواہش تھی کہ جیل کے ان مکینوں سے خطاب کرنے کا مجھے موقع ملے۔۔۔ جیل حکام کا شکر گزار ہوں کہ ان کے تعاون سے آج کے اجلاس کا انعقاد ممکن ہوا۔

آپ لوگوں کو اس بات کا احساس ہو گا کہ آپ سے یہ جرم کیوں سرزد ہوئے۔ آپ اپنے جرموں پر، اپنے گناہون پر نادم ہوں گے۔ یہ ندامت اگر سچی ہو تو بہت بڑی دولت ہے ایک سچا احساس ہے۔ آپ اس طرح اس دنیا میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر جائیں گے۔ آپ کے گناہوں کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ پھر آپ کو جیل میں رہ کر زندگی سنوارنے اور زندگی کو سمجھنے کے بھی بہت سے مواقع حاصل ہوں گے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ اس جیل میں بہت سے قیدی قرآن حفظ کر گئے ہیں۔ یقیناً یہ لوگ ہمارے معاشرے کا نیک حصہ بنیں گے۔ جیلر صاحب نے بتایا ہے کہ انہوں نے حکومت کی ہدایات کے مطابق یہاں درس کا بھی بندوبست کیا ہے۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔ اللہ بڑا غفور الرحیم ہے۔اس کے ہاں توبہ کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ آپ دل سے توبہ کریں تو وہ ضرور معاف کر دے گا۔میرے پیرو مرشد نے مجھے کہانی سنائی تھی کہ ایک مجرم ناویں قتل کر چکا تھا جب اس کے دل میں ندامت کا جذبہ جاگ اٹھا اور اس نے توبہ استغفار کا اردہ کر لیا۔ اس نے گناہوں کی زندگی ترک کرنے کا ارادہ کر لیا اب اسے کسی کی رہنمائی کی ضرورت تھی۔

اسے کسی بزرگ کا پتہ چلا تو وہ ایک لمبا سفر کرکے اس بزرگ کے پاس پہنچا۔ اور عرض کی حضور ! میں بڑا گنہگار ہوں۔ ناوین قتل کر چکا ہوں مگر اب سچے دل سے توبہ کرنا چاہتا ہوں۔ میری رہنمائی کیجئے۔

اس بزرگ نے کہا تمہارے جیسے گناہ گار کے لئے توبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس پر وہ آدمی طیش میں آگیا اس نے کہا ناناویں قتل تو کر ہی چکا ہوں اب سوواں بھی کر ہی لوں اور یہ کہہ کر اس نے بزرگ کو قتل کر دیا۔

مگر اس کے اندر ندامت اور گناہ کا بوجھ اور بھی بڑھ گیا وہ سچے دل سے توبہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ پھر کسی بزرگ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا جو اسے انگلی پکڑ کر توبہ کے راستے پر چلا سکے۔ اس سفر میں اسے موت آگئی۔اب اسے لینے دوزخ کے فرشتے پہنچ گئے مگر ساتھ ہی

جنت کے فرشتے بھی پہنچ گئے۔ ان میں جھگڑا پڑ گیا کہ اس بندے کو دوزخ میں لے جانا ہے یا جنت میں۔ دونوں طرف کے فرشتے بضد تھے کہ یہ بندہ ان کا ہے۔

دوزخ کے فرشتے کہتے تھے کہ اس نے سو قتل کئے ہیں اس نے ابھی توبہ کی نہیں تھی اس لئے دوزخ کا حقدار ہے۔ جنت کے فرشتے کہتے تھے کہ یہ سچی نیت کے ساتھ توبہ کے راستے پر چلا تھا اور اسی دوران اسے موت آئی ہے اس لئے اب یہ دوزخ کا سزاوار نہیں۔

فیصلہ ہوا کہ فاصلے ناپے جائیں اور دیکھا جائے جتنا راستہ وہ گناہ والی جگہ سے چل کر موت والی جگہ پر پہنچا تھا وہ زیادہ تھا یا وہ فاصلہ زیادہ تھا جو اس نے توبہ کی نیت سے یہاں تک طے کیا تھا۔

زمین کو حکم ہوا سکڑ جاؤ اور اس بندے کا گناہ والی جگہ تک فاصلہ کم ہوگیا۔ اور اسے جنت کے فرشتے لے گئے کیوں کہ اس کے دل میں جو توبہ اور استغفار کے لئے جذبہ جاگا تھا وہ سچا تھا۔ وہ نیک نیتی سے توبہ کے راستے پر چلا تھا۔ چنانچہ اس کی نیت کی وجہ سے اس بندے کے گناہ اور جرم معاف ہوگئے مقرر نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔

اس مثال سے میں آپ کو یہ خوشخبری دینا چاہتا ہوں کہ گناہ کتنے ہی زیادہ ہوں اگر آپ سچے دل سے توبہ کرلیں اور آئندہ ان گناہوں سے اجتناب کرلیں تو آپ کی معافی ہوسکتی ہے آپ پر رحم کیا جاسکتا ہے۔

کچھ قیدیوں نے سر اٹھالئے اور امید بھری نظروں سے مقرر کی طرف دیکھا۔ انہیں اس بات پر یقین کی ضرورت تھی مقرر کی آواز میں رقت پیدا ہو رہی تھی۔

دنیا کی سزا ایک طرف' اگر آپ اب بھی گناہ کی زندگی سے توبہ کرلیں تو آپ کی دنیا ہی نہیں' عاقبت بھی سنور سکتی ہے۔ آج کے اس اجلاس کی غرض و غایت بھی یہی ہے کہ آپ کو نیکی کا راستہ دکھایا جائے۔ اللہ آپ کو اچھا اور شریف شہری بننے کی توفیق دے۔"

اسٹیج پر بیٹھے سب لوگوں نے "آمین" کہا۔

سب قیدیوں جیسے اپنے گناہوں کے احساس میں بھیگنے لگ گئے تھے ان کے چہروں کے خطوط پگھل رہے تھے۔ ان کے خدوخال کی کرختگی میں نرمی آنے لگی تھی۔ ان کے سر جھکے جارہے تھے۔ ان میں سے بہت سے تھے جو شرمندہ تھے' اپنے آپ سے دوسروں سے اور شاید اپنے خدا سے بھی۔

ان میں یوسف بھی تھا۔ اس کا احساس گناہ اور طرح کا تھا۔ ریشماں کا چہرہ اس کے تصور کی دھند میں ابھر رہا تھا۔

"کہیں یہ سزا میرے اس گناہ کی تو نہیں؟" وہ سوچ رہا تھا۔

دوسرا مقرر کہہ رہا تھا۔

"ہم گورنمنٹ سے سفارش کریں گے کہ جیل کے حالات بہتر بنائے جائیں۔ یہاں قیدیوں کو اچھا کھانا دیا جائے' ان کی دینی تعلیم کا بندوبست کیا جائے' یہاں ایک بڑی مسجد تعمیر کرائی جائے اور یہاں نشے کی سپلائی بند کی جائے۔"

جیلر نے مقرر کی طرف دیکھا اور رومال سے ماتھے کا پسینہ پونچھنے لگا۔

"ہم چاہتے ہیں کہ آپ جب اس جیل سے سزا کاٹ کر باہر آئیں تو بہتر شہری بن سکیں۔ آپ کے ماتھے پر بدنامی کا داغ نہ ہو۔ ہم جانتے ہیں اس جیل کی تاریخ بڑی پرانی ہے' بڑے بڑے مجاہد یہاں بند رہے ہیں۔ وہ بھی جنہوں نے جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنے کی جرائت کی تھی اور وہ بھی جو انسانی حقوق کی پاسداری کے علمبردار تھے۔ ان سب کی تاریخ مرتب ہونی چاہیے۔ ہم جانتے ہیں ان میں بہت سے بے گناہ تھے۔"

یوسف کے ذہن کو جھٹکا لگا۔

"میں بھی تو بے گناہ ہوں۔ مگر کسے پتہ ہے میری بے گناہی کا؟"

ایک اور اسپیکر نے کہا۔

"ہمارا ایمان ہے ہر جرم ہر گناہ کی سزا ملتی ہے۔ جو اس دنیا میں بچ جاتا ہے اسے اگلے جہاں میں سزا ملے گی۔ بعض اوقات انسان کو سمجھ نہیں آتی کہ اسے کس جرم کی سزا مل رہی ہے۔ بعض کہتے ہیں انہوں نے جرم نہیں کیا پھر بھی انہیں سزا مل گئی۔اصل میں اسے یاد نہیں ہوگا۔ اپنے گناہوں کا حساب رکھنا بہت مشکل کام ہے۔ ہم کسی نہ کسی شکل میں اپنے گناہوں کی سزا ضرور کاٹتے ہیں۔"

شہر کے ایک دانشور نے اپنی تقریر میں کہا

"کئی آدمیوں نے جیل میں رہ کر بہت فائدہ اٹھایا یہاں انسان کو اپنی ذات کے ساتھ گزارنے کے لئے وافر وقت مل جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو سمجھنے لگتا ہے۔

حضرت علیؓ کا قول ہے "جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔"

زندگی کی سمجھ اس وقت تک نہیں آسکتی جب تک انسان کو اپنی ذات کا شعور نہ ہو۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ جیل سے باہر آئیں تو بہتر انسان بن کر آئیں۔ ہمارے معاشرے میں اچھے انسانوں کی ویسے بھی بہت کمی ہے۔"

تقریب کافی دیر تک جاری رہی۔ آخر میں دعا ہوئی اور قیدیوں میں پھل اور مٹھائی تقسیم کی گئی۔

یوسف کو کافی دنوں بعد کھلے آسمان تلے بیٹھنے کا اتنا زیادہ وقت ملا تھا۔ جیل کی اونچی دیواروں کے باوجود آج آسمان بہت وسیع لگ رہا تھا۔ آخری گنتی سے پہلے اس نے کئی دفعہ اپنے بازو فضا میں بلند کرکے گہری سانسیں لیں۔ یوں اسے چند لمحوں کے لئے عارضی سی آزادی کا احساس ہورہا تھا۔ ورنہ اسے تو اپنی بے گناہی کے دھندلے یقین کے باوجود خوف کی فضا گھیرے رہتی تھی۔ وہ عام انسان تو کیا عام قیدی بھی نہیں تھا۔

قانون ہی قانون

آج اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں یوسف کی اس کے نئے وکیل کے ساتھ ملاقات ہونا تھی۔ یوسف کی ماں اور ماموں نے بھاری فیس دے کر یوسف کی سزائے موت کے خلاف اپیل کے لئے مشہور وکیل مقرر کیا تھا۔ جیل کے حکام انہیں جانتے تھے۔ ان کی عزت اور مرتبے کی وجہ سے انہیں اس خاص ملاقات کی سہولت مہیا کی گئی تھی۔

یوسف کو چکی سے بلوایا گیا تھا۔

سزائے موت کے حوالے سے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ اور وکیل صاحب کے درمیان بات چیت چل نکلی۔ ویسے بھی آج صبح ہی جیل میں ایک قیدی کو پھانسی کی سزا پر عمل درآمد ہوا تھا۔ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جیل نیا نیا نوکری میں آیا تھا۔ اس نے یہ منظر پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس کا علم زیادہ مگر تجربہ کم تھا اس لئے اس کے ذہن پر بوجھ تھا۔ وہ اس بوجھ کو کم کرنا چاہتا تھا۔ وکیل صاحب کی موجودگی اس کے لئے سہارا ثابت ہوئی۔

یوسف ابھی نہیں لایا گیا تھا۔

اس نے وکیل صاحب سے پوچھا۔

"آپ نے قانون پڑھا ہے۔ آپ کا تجربہ بھی زیادہ ہے۔ آپ تو جانتے ہیں۔ مغربی ممالک میں سزائے موت نہیں دی جاتی۔ ان کا خیال ہے قاتل مجرم نہیں بیمار آدمی ہوتا ہے۔ اس کا علاج ہونا چاہئے تاکہ اسے ختم کردینا چاہئے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

"آپ کی بات درست ہے۔ امریکہ کی اکثر ریاستوں میں بھی سزائے موت نہیں دی جاتی۔ بعض ریاستوں میں سزائے موت کا قانون موجود ہے۔ مگر وہاں گیس چیمبرز کے ذریعہ سزائے موت پر عمل کیا جاتا ہے۔ حال ہی میں کئی ریاستوں میں لوگوں کی رائے حاصل کی گئی

تو اکثریت نے اس بات کا حق میں فیصلہ دیا کہ قتل جیسے گھناؤنے جرم کے لئے موت کی سزا ضرور ہونی چاہئے۔ وہاں یہ بات اپنا اعتبار کھوتی جارہی ہے کہ قاتل سے اس کے حالات قتل کا جرم کرواتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی ارادہ قتل اس جرم کا لازمی جزو ہے اور میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ قتل کی سزا ضرور موت ہونی چاہئے۔"

اتنی دیر میں یوسف اندر آچکا تھا اور ایک کونے میں کھڑا یہ گفتگو سن رہا تھا۔

اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ اس موضوع پر مزید بات چیت کرنا چاہتا تھا۔ وکیل صاحب نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔

"بعض ممالک میں الیکٹرک شاک کے ذریعہ موت کی سزا پر عمل کیا جاتا ہے۔ امریکہ کی بعض ریاستوں میں اس بات پر بحث ہورہی ہے کہ سزائے موت دینی ہے۔ تو گیس چیمبرز کے طریقہ کی بجائے ملزم کو زہر کا ٹیکہ لگا کر موت کی نیند سلا دینا چاہئے۔ دراصل وہ لوگ ہر بات کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ قاتل کو اگر معاشرے سے ختم کرنا ہی ہے تو اسے کم سے کم تکلیف کے ذریعہ سے ختم کرنا چاہئے کیوں کہ قاتل کو زیادہ تکلیف دینے سے قانون کو براہ راست کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔"

"لیکن یہاں بعض حالات میں قانون کا تقاضا بھی ہوتا ہے کہ قاتل کو عبرت ناک سزا دی جائے تاکہ دیکھنے والوں کو سبق حاصل ہو اور وہ اس جرم کے ارتکاب سے پرہیز کریں۔ سخت سزا کا خوف بھی جرم میں کمی کا باعث بنتا ہے۔ پچھلے دنوں چند مقامات پر سرعام پھانسیاں دی گئی تھیں ان کا خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔"

"جی ہاں! آپ کی بات صحیح ہے مگر ہمارے ہاں ابھی قانون میں ایسے سقم موجود ہیں اور بے گناہ کو بھی سزائے موت ہوسکتی ہے' مثال کے طور پر میرے موکل کو عدالت نے قتل کے جرم میں سزائے موت دی ہے جب کہ ملزم کو یقین ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔ گواہوں نے اسے قتل کرتے دیکھا ہے۔ مقتول نے اپنے نزعی بیان میں اس کا نام لیا ہے مگر ملزم بڑے یقین سے کہتا ہے کہ اس نے قتل نہیں کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسے مجھ سے تو جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں' پھر اس کے لہجے' اس کے چہرے پر بات کرتے وقت جھوٹے آدمی کی بے اعتباری کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ ساری شہادتوں کے باوجود ہوسکتا ہے اس نے قتل نہ کیا ہو پھر بھی سزا ہوگئی ہو۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے سر؟" جیل کے جواں سال افسر نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"آپ نئے نئے نوکری میں آئے ہیں - چند سال گزار لیں تب آپ کو پتہ چلے گا' بہت سے پھانسی کی سزا پانے والے آخری وقت تک یہی کہتے رہتے ہیں کہ انہوں نے قتل نہیں کیا' وہ بے گناہ ہیں۔"

جیل کے سپاہی نے چائے کا ایک کپ اپنے افسر کو اور دوسرا وکیل صاحب کو لاکر پیش کیا۔

یوسف ایک وارڈر کی معیت میں اسی کمرے کے کونے میں کھڑا بڑی دلچسپی سے یہ باتیں سن رہا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ اسے سزائے موت ہوچکی ہے۔ اسے یہ بھی پتہ تھا کہ وہ بے گناہ ہے اور بالواسطہ طور پر آج کی اس دردناک گفتگو کا موضوع تھا۔

"ویسے سر' آپ ضرور اس بات سے اتفاق کریں گے کہ کسی بھی ملک میں جرائم کا اس ملک کے معاشی اور معاشرتی حالات سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ان حالات پر ریسرچ ہونی چاہئے جو جرم کا باعث بنتے ہیں۔ ان حالات کو بدلنا چاہئے' مگر ہمارے ہاں تو مشکل یہ ہے کہ تبدیلی کا عمل نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہم لوگ تبدیلی سے بہت ڈرتے ہیں۔" اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے چائے ختم کرکے پیالی میز پر رکھ دی۔

"جی ہاں' اتنے سال ہوگئے ہمارے ملک کو بنے ہوئے ہم ابھی تک اپنے لئے کوئی نیا قانون نہیں بناسکے اور جہاں جہاں جتنا بھی قانون بنایا ہے اس نے ہزار مسائل پیدا کئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انصاف کے حصول کے لئے یہاں بہت سی سطحوں پر بہت سی تبدیلیوں کی فوری ضرورت ہے۔"

وکیل صاحب کی چائے ختم ہوگئی۔

یوسف کا چہرہ پیلا ہورہا تھا۔اس کی ٹانگوں میں خوف رینگ رہا تھا اس کے ماتھے پر پسینہ آرہا تھا۔وکیل صاحب اٹھ کر اس کے پاس آگئے۔ یوسف کو بیٹھنے کے لئے اگر اسٹول نہ دیا تو جاتا تا شاید وہ گر پڑتا۔ اس کی ٹانگیں جواب دے رہی تھیں۔

وکیل صاحب کے لئے کرسی لائی گئی۔

یوسف کی ذہنی حالت کا انہیں اچھی طرح اندازہ نہیں تھا۔ وہ بولے "برخوردار! میں نے تمہاری فائل پڑھی ہے۔ غور کیا ہے' واقعات' شہادتیں سب کاغذات دیکھے ہیں۔ جج صاحب نے بڑی محنت سے فیصلہ لکھا ہے۔ اپیل منظور ہونے کے امکانات زیادہ روشن نہیں۔"

یوسف کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوگیا۔

"ماموں نے تو مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے اپیل کے لئے بڑا قابل وکیل کیا ہے جس نے بہت سے مجرموں کو پھانسی کے تختے سے اتار لیا تھا۔"

یوسف نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش میں اپنے بازو سے ماتھے کا پسینہ صاف کیا۔

"میں آپ کو مایوس نہیں کرنا چاہتا۔ مگر آپ کے مقدمے کی نوعیت اور حالات مختلف ہیں۔ آپ کے کیس میں جتنا یہ ثابت کرنا مشکل ہوگیا ہے کہ آپ بے گناہ ہیں' اتنا ہی یہ ثابت کرنا آسان ہے کہ آپ نے بجاطور پر یہ قتل کیا ہے' قتل کرنا آپ کی مجبوری تھی' آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی یہی کچھ کرتا' اور جب ہم یہ بات ثابت کرلیں گے تو آپ کو' سزائے موت سے بچایا جاسکتا ہے۔ زندہ رہنا مرنے سے تو ہر حال میں بہتر ہے۔ پھانسی کی موت ویسے بھی تکلیف دہ ہوتی ہے۔"

یوسف ایک بار پھر گھبرا گیا۔ کچھ دیر خاموش رہا وکیل صاحب اس کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کررہے تھے کہ وہ یوں بولا جیسے کوئی نئی بات اسے سوجھی ہو۔

"وکیل صاحب! عجیب بات ہے کہ میرے مقدمہ میں وہ بات ثابت کرنا آسان ہے جو میں نے نہیں کی اور وہ بات ثابت نہیں ہوسکتی جو حقیقت ہے' یہ کیسا قانون ہے؟ یہ سچ نہیں ہے کہ میں نے قتل کیا ہے۔"

اس کی آواز میں غصہ تھا جھنجلاہٹ تھی۔

وکیل نے بڑے تحمل سے اس کی بات سنی اور کہا۔

"ہوسکتا ہے جسے تم سچ سمجھ رہے ہو وہ دنیا کے نزدیک' منصف کے نزدیک سچ نہ ہو۔ ہمارے ہاں' قانون کے پاس سچ کی بڑی قسمیں ہیں۔ سچ وہ ہے جو ثابت کیا جاسکے۔ ہم صرف ثبوت پر' گواہی پر چلتے ہیں۔ ہمیں تو زندہ ہونے کی بھی گواہی دینا پڑتی ہے اور ہمارے پاس دوسروں کی گواہی سے بڑا کوئی علم نہیں۔ مجھے پتہ ہے تمہارے لئے یہ بات سمجھنا ذرا مشکل ہوگا۔ تم شاید زیادہ پڑھ لکھ نہیں سکے ہو وگرنہ تم سمجھ لیتے۔"

"جناب! جب پہلے وکیل صاحب نے میرا مقدمہ لیا تھا اور کاغذات دیکھے تھے تو انہیں بھی میری بے گناہی کا یقین نہیں آتا تھا مگر جب وہ مقدمہ لڑچکے تو انہوں نے کہا تھا میں اگرچہ عدالت میں یہ بات ثابت نہیں کرپایا کہ تم بے گناہ ہو مگر تمہارے واقعات لکھتے پڑھتے مجھے اس بات کا یقین آچلا ہے کہ تم واقعی بے گناہ ہو" یوسف کی بات سن کو وکیل صاحب ہنس پڑے۔

"تمہارے پہلے وکیل نے جس طرح تمہارا مقدمہ لڑا ہے اسے دیکھ کر تو میں سوچتا ہوں کہ اس نے تو یہ مقدمہ لڑا ہی غلط طریقے پر ہے میں اگر عدالت میں تمہارا وکیل ہوتا تو کوئی اور موقف اختیار کرتا اور تمہیں سزائے موت سے ضرور بچالیتا۔"

یوسف پر پھر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ وہ گھبرا کر بولا۔

"مجھے اب ڈر لگنے لگا ہے۔ سوچتا ہوں بے گناہ ہوکر بھی کہیں یہ سزا میرے کسی دوسرے گناہ کی تو نہیں۔"

یہ بات ابھی ابھی یوسف کے دماغ میں آئی تھی۔ وہ اس بات پر سوچنا چاہتا تھا۔ سوچتے ہی اس کے منہ سے یہ بات جیسے پھسل گئی۔

"قانون کی کتابوں میں تو ایسی کوئی چیز نہیں۔ گناہ، ثواب، نیکی بدی اور سزا اور جزا دوسرا معاملہ ہے۔ بہرحال میں تو آپ سے مشورہ کرنے آیا تھا کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اپیل میں بھی وہی موقف اختیار کروں جو ماتحت عدالت میں آپ نے اختیار کیا تھا؟"

یوسف نے کچھ دیر سوچا اور پھر بولا۔

"میں تو اب تک خود کو بے گناہ ہی سمجھتا آیا ہوں۔ آپ کہتے ہیں میرا قتل کرنا جائز بنتا ہے، ثابت کیا جاسکتا ہے، میری سزائے موت، عمر قید میں بدل سکتی ہے، مگر میرادل نہیں مانتا۔ میں اپنے موقف پر ہی قائم رہنا چاہتا ہوں۔ میں اپنی بے گناہی کے سہارے سے محروم نہیں ہونا چاہتا۔ بس آپ میری باتوں پر، میرے واقعات پر غور کریں۔ دل سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ مجھے انصاف نہ ملا تو یہ عدالتیں کس کام کی؟"

اب یوسف کی آواز میں اس کے اندر کا کرب اتر آیا تھا۔

"یہ عدالتیں، یہ قانون ایک فرد کے لئے نہیں بنے۔ ساری کائنات میں میری یا تمہاری کوئی اہمیت نہیں۔ قانون تو نسلوں کے لئے، قوموں کے لئے بنتے ہیں۔ اس کے عمل در آمد میں افراد سے بے انصافی بھی ہوسکتی ہے۔"

یوسف کی سمجھ میں وکیل کی بات نہیں آئی۔ وہ اپنے اندر سے اٹڈتی مایوسی پر قابو پانے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلتی مایوسی کو دیکھ کر وکیل نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"میں تمہیں بچانے کی پوری کوشش کروں گا۔"

کہنے کو تو وکیل نے یہ بات کہہ دی مگر سوچنے لگا اتنے سارے ثبوتوں کی موجودگی میں یہ شخص خود کو بے گناہ کہہ رہا ہے۔ بظاہر نارمل آدمی ہے۔ خدا جانے اصلیت کیا ہے؟

"ان کاغذات پر دستخط کردیں"

وکیل صاحب نے وکالت نامہ کے کاغذات اس کے سامنے پھیلادیئے۔

"میں انگوٹھا لگاؤں گا۔" یوسف نے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کو زبان پر رکھ کر لعاب لگایا۔

"آپ دستخط بھی تو کرسکتے ہیں۔" وکیل صاحب نے اس کے بیانات کی نقلوں پر دستخط دیکھے تھے۔

"کرسکتا ہوں۔ مگر ایسی چھوٹی موٹی تعلیم کا کیا فائدہ جب مجھے کسی بات کی سمجھ ہی نہیں آسکی۔ انگوٹھا لگانے سے ویسے بھی اتنا دکھ نہیں ہوگا۔"

یہ کہتے ہوئے یوسف نے انک پیڈ میں اپنا انگوٹھا تر کیا کاغذات پر نشان لگاتے ہوئے نہ جانے کیوں یوسف کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

"میں بچ تو جاؤں گا وکیل صاحب؟" بالآخر اس کی بے کسی بول پڑی۔

"اللہ کو منظور ہوا تو ضرور بچ جاؤگے۔" وکیل صاحب نے اٹھتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے حوصلہ دیا۔

یوسف نے سر جھکایا تو اس کے اندر درد کی لہر اٹھی جو سوچ بن کر اس کی دماغ میں جا ٹھہری۔

کیا یہ سب کچھ......جو کچھ ہمارے ارد گرد ہورہا ہے یہ سب اللہ کی منظوری سے ہورہا ہے؟

میری مرضی کا اس میں کتنا دخل ہے؟

یہ سوالات اس کے اندر جھنکار رہے تھے اس کے اندر یا اس کے پاس کوئی نہ تھا جو ان سوالوں کے جواب دیتا۔

بندی خانہ

بڑی عدالت سے یوسف کی اپیل نامنظور ہوئی تو اسے موت کی کوٹھری میں منتقل کردیا گیا۔ جیل کے احاطہ میں ایک علیحدہ چار دیواری میں یہ کوٹھریاں واقع تھیں۔

تین اطراف میں دس دس کوٹھریوں کی قطاریں تھیں جن کے سامنے برآمدہ تھا۔ برآمدے کی دو فٹ کی دیوار پر موٹی موٹی سلاخیں کھڑی تھیں۔ جو اوپر چھت والی عمودی سلاخوں سے جاملتی تھیں۔

چوتھی طرف اس چار دیوری میں داخل ہونے کا دروازہ تھا۔ جو اندر ایک چھوٹے سے صحن میں کھلتا تھا۔

آٹھ دس مربع فٹ کی کوٹھری کی تیرہ فٹ بلند چھت کے ساتھ ایک روشن دان تھا جس میں مضبوط آہنی سلاخیں لگی تھیں جس میں آسمان کی ہلکی ہلکی جھلک نظر آتی تھی۔ کوٹھری کے ایک کونے میں دو ڈھائی فٹ مربع کی جگہ گھیر کر کھڑی اینٹ کی دیوار بنائی گئی تھی اوپر رسی سے ٹاٹ کا ٹکڑا لٹکتا تھا۔ یہ جگہ قیدی کی رفع حاجت کے لئے تھی اور جمعدار کی دوسرے تیسرے دن صفائی کے باوجود یہ کوٹھری بدبو سے بھری رہتی تھی۔ قیدی اس بدبو کے اتنے عادی ہوجاتے تھے کہ انہیں کھانے کی خوشبو اور کمرے کی بدبو میں فرق کرنا مشکل ہوجاتا تھا۔

کوٹھری کا دروازہ مضبوط آہنی سلاخوں سے بنا تھا اور دروازہ بند ہونے کے باوجود قیدی کی ساری حرکات باہر ڈیوٹی پر موجود سپاہیوں کی نگاہ میں رہتی تھیں۔ ان قیدیوں کی زندہ انسانوں سے بھی زیادہ حفاظت کی جاتی تھی۔ یہ ذرا مختلف قسم کے انسان تھے۔

شام کا اندھیرا اترنے سے پہلے قیدیوں کو نکال کر صحن میں ٹہلائی کرائی جاتی تھی۔ ایسے میں جیل کا عملہ بڑا مستعد ہوکر ان کی چوکیداری کرتا تھا۔ باہر کی طرف کھلنے والے گیٹ پر بھی مسلح سپاہی پہرہ دیتے تھے۔

کھلے آسمان کے نیچے صحن میں یہ قیدی بار بار آسمان کی طرف دیکھتے۔ شاید ان کی خواہش ہو کہ اپنے حصے کے آسمان کے نظارے کو اگلی شام تک آنکھوں میں بند کرلیں۔

یوسف بھی صحن میں آکر بار بار دونوں بازو اوپر اٹھاتا' پہلوؤں سے نیچے گراتا اس طرح وہ اپنے وجود میں زندگی کا احساس تازہ رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ یہ بھی سوچتا تھا کہ اس محدود آسمان کے اس طرف کتنا اور آسمان ہوگا اور ان دیواروں کے اس طرف باہر کتنی زندگی ہوگی۔

ٹہلائی کے وقت یہ قیدی ایک دوسرے سے تھوڑی بہت بات چیت کرلیتے تھے مگر انہیں زیادہ دیر تک ایک دوسرے کے قریب ٹھہرنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ خاص قیدی تھے۔

اکثر کی قسمت کا فیصلہ ہوچکا ہوتا اور زیادہ تر خاموشی سے ایک دوسرے کو یوں دیکھتے جیسے انہیں پہچاننے کی کوشش کررہے ہوں۔

کچھ کی اپیلیں بڑی عدالتوں میں منظوری اور نامنظوری کے عمل سے گزر رہی ہوتیں اور بعض کو اپنی رحم کی درخواستوں کے جواب کا انتظار ہوتا۔ کچھ ایسے بھی ہوتے جن کے بلیک وارنٹ کے حکم اپنے اپنے راستوں پر چل رہے ہوتے۔

ایسے قیدیوں کی حالت سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا کہ وہ اپنے آپ کو زندوں میں شمار کرتے تھے یا مردوں میں۔ وہم اور خواب کی ملی جلی کیفیت حسرت بن کر ان کی آنکھوں سے ٹپکتی۔

یوسف جب ان قیدیوں میں شامل ہوا تو جیل کے عملہ کے برتاؤ میں واضح فرق آنے لگا۔ ان کوٹھریوں پر پہرہ دینے والے سپاہی یوسف کو یوں دیکھنے لگے۔ جیسے وہ انسان نہ ہو انسان کا سایہ ہو جو کسی بھی وقت اندھیرے میں گھل جائے گا۔

یہ قیدی یوں تھے جیسے ہونے کے باوجود نہ ہوں۔ مایوسی کی ساری حدیں پار کرکے وہ کسی ایسے مقام پر جا کھڑے ہوئے ہوں جہاں انہیں اپنا آپ پہچاننا بھی محال ہوجاتا۔ کبھی کبھار جب کسی قیدی کی رحم کی اپیل منظور ہوتی تو اسے کسی بھی دوسری حالت میں جانے کے

لئے کافی وقت لگ جاتا تھا۔

بعض لوگ کئی کئی سالوں سے ان کوٹھریوں میں بند تھے انہیں اپنی قسمت کے فیصلہ کا انتظار تھا ان کی زندگی اس بے کیف ویران سیلن زدہ' بدبودار فضا کا حصہ بنتی جارہی تھی۔

ان میں سے بعض قیدی تو ویسے بھی کبھی کے مرچکے تھے وہ زندہ ہونے کے قابل ہی نہیں رہے تھے۔ جب کسی کو معافی ملتی تو اسے گھسیٹ گھسیٹ کر اس کوٹھری سے باہر نکالا جاتا وہ ذہنی طور پر مردہ ہوچکا ہوتا یہاں تک کہ اسے اپنے جرم کی سچائی تک کا اتنا یقین ہوجاتا کہ اپنی رہائی کو بھی قبول کرنا مشکل ہوجاتا۔

ان کوٹھریوں میں آنے والا ہر نیا قیدی عجیب ذہنی اور جسمانی کشمکش سے دوچار ہوجاتا۔ تنگ' وحشت زدہ فضا اس کے اعصاب کی جڑوں میں اترجاتی۔ بعض تو رات کو اٹھ کر چیخنے لگتے مگر ان کی آواز سننے والا کوئی نہیں ہوتا تھا دوسری کوٹھریوں والے قیدیوں کو یہ آواز بہت دور سے آتی سنائی دیتی انہیں سمجھ ہی نہیں آتی کہ آواز کہیں باہر سے آتی تھی یا ان کے اپنے اندر سے۔

بے حسی سارے اعضاء میں بھر جاتی' پہلی راتوں کو قیدی سسکتے رہتے۔ بالآخر جیسے جیسے ان کی آنکھوں کا پانی خشک ہوتا جاتا تو ان کی آنکھوں میں ایسی ویرانی ڈیرے ڈال دیتی جو صحراؤں سے بڑھ کر ہوتی اور جس کی تیز دھول میں ببول کی جھاڑیاں اڑتی رہتیں۔

ہر کوٹھری کی چھت سے لٹکا بجلی کا دو سو واٹ کا بلب دن رات جلتا' اور اس کی مسلسل روشنی قیدی کی جسمانی قید کی اذیت میں اضافہ کرتی رہتی۔ پھر کوئی دن آتا کہ کسی قیدی کو تاروں کی چھاؤں میں اٹھایا جاتا۔ وہ خاموشی سے آنکھیں پھاڑے وحشت زدہ ہر چیز کو دیکھتا رہتا۔ دوسری کوٹھریوں کے قیدی لوہے کی سلاخوں سے چپٹے یہ تماشا دیکھتے رہتے۔

اس قیدی کو نہلا دھلا کا تیار کرایا جاتا۔ پھر اسے نماز پڑھائی جاتی۔

پھر جیل کے افسر کوٹھری میں جمع ہوکر کارروائی کرتے۔ قیدی کے ہاتھ اس کی پشت پر باندھ دیئے جاتے اور جب وہ اپنی کوٹھری سے نکل کر پھانسی کے چبوترے کی طرف نکلتا تو بعض قیدی خوفزدہ ہوکر چیخنے لگتے جیسے ابھی ابھی کسی ڈراؤنے خواب سے جاگے ہوں۔

اس دن کوٹھریوں کے قیدی سارا دن خاموش رہتے۔ ان کے کھانے پڑے پڑے سڑ جاتے۔ یہاں تک کہ انہیں پیشاب پاخانہ تک کی حاجت نہ رہتی۔ چھت کے بلب سے نکلتی تیز روشنی میں ان کے زرد چہروں پر مکھیاں بھنبھناتی رہتیں اور ان کی کھلی آنکھوں سے جیسے روشنی غائب ہوجاتی۔

مہینے میں ایک آدھ قیدی ان میں سے نکل جاتا اور اس کی جگہ کوئی دوسرا قیدی آجاتا۔

جس کوٹھری میں یوسف کو منتقل کیا گیا' دو روز قبل ہی اس کے مکین کو تختہ دار پر چڑھایا گیا تھا۔ اس کے جسم کی بدبو ابھی تک اس کوٹھری میں ٹھہری ہوئی تھی۔ یوسف کی کوٹھری سے ملحقہ کوٹھری والے غلام رسول نے یوسف کو بتایا کہ شمس دین ساری ساری رات قرآن کی تلاوت کرتا تھا اور اونچی اونچی آواز میں روتا تھا۔ اسے اپنی بیوی کو قتل کے الزام میں سزائے موت ہوئی تھی۔

یوسف کو کوٹھری کی سیلن میں اس کے آنسوؤں اور ہچکیوں کی نمی ٹھہری محسوس ہوتی تھی۔

یوسف کی کوٹھری کی دیواروں کی سفیدی بھربھری ہوکر گر رہی تھی۔ فرش پر بچھی جس چٹائی پر وہ سوتا تھا وہ سیلن زدہ فرش کے ساتھ چپک کر اسی کا حصہ بن چکی تھی۔ جو کمبل اسے اوڑھنے کے لئے ملا تھا اس میں عجیب سی باس تھی۔ اس کمبل میں نہ جانے کتنے جسم کتنی دیر کے لئے لپٹے رہے تھے۔ جب یوسف وہ کمبل رات کو اپنے جسم پر ڈالتا تو اسے لگتا اس کمبل میں ٹھہرے سانسوں کی ساری خوشبوئیں بدبوئیں اس کے لئے زندہ ہوجاتی تھیں۔ اور یہ سانس کبھی کبھی ننھے منے کیڑے' چیونٹیاں بن کر اس کے جسم پر اتر آتی تھیں۔

صبح کو جب یوسف ان کیڑوں کو رینگتے اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا تو سوچتا میں بھی تو ایک جان دار محض ایک کیڑا ہی تو ہوں جس کے جینے مرنے سے زندگی میں شاید کوئی فرق نہ پڑے۔

ایک صبح اس نے اپنی چٹائی کے قریب بہت سی چیونٹیاں اکٹھی دیکھیں۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس نے اپنا پاؤں اٹھایا اور چاہتا تھا کہ ان چیونٹیوں کے سر پر رکھ کر تماشہ دیکھے پھر اسے خیال آیا ہم انسان جو بہت بااختیار ہیں کیا پتہ اوپر کوئی طاقت ہمارے متعلق بھی ایسا ہی سوچ رہی ہو۔

راتوں کو جب اس کے اعصاب ٹوٹتے تو وہ روشندان کی سلاخوں سے اپنے حصے کے آسمان کی لکیر میں جھلملاتے ستاروں کو دیکھتا رہتا۔

پہلی رات ہی اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ کوٹھری میں اکیلا نہیں ہے۔ کوئی اور بے جسم وجود جیسے وہاں موجود تھا جس کے سانسوں کی آواز اسے سنائی دیتی تھی۔ اس کے جسم میں خوف کی تیز لہر اٹھتی تھی جو سنسناہٹ پھیلاتی اسے جھنجھنانے لگتی تھی اور اس کا پورا جسم لرزنے لگتا۔ وہ دم سادھ لیتا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا۔ وہ اپنا آپ سنبھالنے کی کوشش کرتا۔ یہ ڈراؤنا خواب اس کی کئی راتوں پر حاوی ہوتا چلا گیا اور اس کے سونے جاگنے کی درمیانی حدیں سکڑنے لگیں۔

کچھ دیر بعد جیل کے سپاہی نے کھانے کی تھالی دروازہ کی سلاخوں کے نیچے سے اندر کھسکائی۔

"ٹھہرو! بھائی مری بات سنو" یوسف اس سے کچھ کہنا' کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔

مگر وہ سپاہی وہاں ٹھہرا نہیں۔ سپاہیوں کو ان قیدیوں کے پاس رکنے' بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ اس کو اجنبی نگاہوں سے دیکھتا ہوا چلا گیا۔

کڑک ریتی ملی روٹی کا لقمہ یوسف نے پتلی بے رنگ سی دال میں بھگو کر منہ میں ڈالا۔ اس کی زبان میں جیسے کوئی ذائقہ ہی نہیں تھا۔ اس نے دانتوں سے لقمہ پیستے پیستے جبڑوں کو ہلانا شروع کیا تو اسے اپنے جبڑوں کی چرڑ چرڑ سنائی دی۔

وہ چند لمحہ رک گیا۔ لقمہ منہ میں لئے وہ بیٹھا رہا۔ جب دوبارہ اس نے جبڑوں کو حرکت دی تو وہی چرڑچرڑ کی آواز آنے لگی۔ یہ عجیب سی آواز اس کے لئے بالکل نئی تھی۔ اس کی بھوک مرچکی تھی پھر بھی وہ زندہ رہنے کے احساس کی خاطر وہ کچھ کھانا چاہتا تھا اور فی الوقت وہ اس کھانے کے ذریعے کسی مانوس احساس سے گزرنے کی کوشش کررہا تھا۔

چھت سے لٹکتے بلب کی روشنی میں اس نے خود کو بہت اجنبی محسوس کیا۔ اسے اتنی زیادہ رشنی کی ضرورت نہیں تھی اسے کچھ اندھیرے کی ضرورت تھی۔ روشنی اس کی سوچ کو مرتکز نہیں ہونے دیتی تھی۔ آنکھیں بند کرلینے سے بھی اندھیرا نہیں ہوتا تھا۔ روشنی اسے بری لگ رہی تھی۔ اس نے سر اٹھاکر بلب کو بڑی کڑوی نظر سے دیکھا اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی کہ اس بلب کو توڑ ڈالتا۔ چاروں دیواروں پر اس کی نظر دوڑنے لگی۔ کہیں کسی جگہ کوئی سوئچ بورڈ نہیں تھا۔ اس روشنی کو کہیں باہر سے کنٹرول کیا جاتا تھا۔ اپنی مرضی سے وہ اندھیرا بھی نہیں کرسکتا تھا۔ یہ سارا اہتمام اس کی حرکات پر نظر رکھنے کے لئے کیا گیا تھا۔

باہر برآمدے میں دو مسلح سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ چلتے چلتے کبھی کبھی وہ اس کی کوٹھری کے سامنے کھڑے ہوجاتے اسے گہری نظروں سے دیکھتے اور جب انہیں اس کے وجود میں کوئی غیر معمولی حرکت دکھائی نہ دیتی تو وہ آگے بڑھ جاتے۔

بے خیالی میں اس نے کچھ کھانا کھایا اور پھر پلیٹ اور دال والا برتن پرے دھکیل دیا۔ پہلی رات کے بعد ساری راتیں اسی طرح گزرنے لگیں۔ یکسانیت کے بھاری بوجھ تلے دبا وہ ایک رات کمبل لپیٹے سونے اور جاگنے کی درمیانی حالت میں اوپر روشندان کی سلاخوں سے پرے آسمان پر' ستاروں پر نظریں جمائے پڑا تھا جب ساتھ والی کوٹھری کو کسی نے اپنے ہاتھوں سے تھپتھپایا۔

یوسف جیسے چونک گیا۔ پہرہ دینے والے سپاہی برآمدے کے کسی کونے میں جاکے لیٹ گئے تھے۔

"کون ہو بھائی" یوسف دروازے کی موٹی سلاخوں کے پاس آکر بولا۔

"میں بھی قیدی ہوں آج ہی آیا ہوں۔ نیند نہیں آتی۔"

"سزا ہوگئی؟" یوسف نے پوچھا

"ہاں! آج ہی ہوئی ہے۔ دس سال بعد"
"کس جرم میں؟" یوسف نے پوچھا
"اب تو یاد بھی نہیں رہا کس جرم کی سزا ہے۔ دس سال مقدمہ چلا ہے۔"
"اپیل کی تھی؟"
"نہیں!"
"کیوں؟" یوسف نے حیران ہوکر پوچھا۔
"اور انتظار نہیں ہوتا" یوسف خاموش ہوگیا۔ سوچنے لگا
اتنی دیر میں ادھر سے پہرے پر موجود ایک سپاہی اٹھ کر ان کے پاس آگیا اور کرخت آواز میں کہنے لگا۔
"اب سوتا کیوں نہیں؟ کیوں بے آرام کرتا ہے دوسروں کو؟"
"نیند نہیں آتی" یوسف نے بے بسی سے کہا
"جا لیٹ جا ادھر' دوسروں کو تنگ نہ کر" سپاہی بیزاری سے بولا
"تم نے بھی رحم کی اپیل ضرور کر رکھی ہوگی" سپاہی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا
"ہاں! کی ہے۔"
"سبھی کرتے ہیں۔ کوئی بات نہیں" سپاہی نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا
"کسی کی درخواست کبھی منظور بھی ہوئی یا نہیں؟" یوسف نے بڑے مضطرب لہجے میں سپاہی سے پوچھا
"سنا تو نہیں۔ قاتلوں پہ کوئی رحم نہیں کھاتا" سپاہی کے لہجے میں بے رحمی تھی۔
یوسف کو جیسے فوراً اپنی بے گناہی یاد آگئی۔ "مگر میں تو بے گناہ ہوں"
سپاہی نے برا سا منہ بنایا۔ "یہاں سبھی اپنے آپ کو بے گناہ ہی سمجھتے ہیں۔"
یوسف نے چند لمحے خاموشی سے سپاہی کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔
کیا میں بھی...... میں بھی اوروں کی طرح بس ایک قاتل' ایک مجرم ہوں؟ مجھ میں اور دوسرے مجرموں میں کوئی فرق نہیں رہ گیا؟
سوال اس کے دماغ میں صلیبوں کی طرح گڑتے جا رہے تھے اس کا بے گناہی کا احساس کبھی کبھی بہت کمزور پڑجاتا تھا۔
"یہ رحم کی درخواست کا فیصلہ کتنی دیر میں ہوجاتا ہے؟" یوسف کی آواز میں واضح لرزش تھی۔
"بعضوں کی درخواستوں پر تو جلدی فیصلہ ہوجاتا ہے اور بعض لٹک جاتے ہیں۔ سال چھ مہینے لگ جاتے ہیں۔ رحم کرنے والے کی مرضی ہے چاہے تو غور کرے' چاہے تو نہ کرے۔ اسے کوئی مجبور نہیں کرسکتا۔ لیکن تم بس اب اللہ سے رحم مانگا کرو!"
اچانک سپاہی کو یاد آیا کہ وہ تو ڈیوٹی پر ہے اور اس طرح قیدیوں سے بات چیت کرنے کی انہیں اجازت نہیں۔ "اب پھر آوازیں نہ دینے لگ جانا۔ میں ادھر ذرا ٹانگیں سیدھی کرلوں۔ یہ افسر تو سمجھتے ہیں ہم انسان نہیں جانور ہیں۔ سارا سارا دن ساری ساری رات چلتے رہیں' پھرتے رہیں پہرہ دیتے رہیں۔ ان قیدیوں نے کیا کرلینا ہے؟ یہ تو پہلے ہی مرمک جاتے ہیں۔" سپاہی بڑبڑاتا ہوا برآمدے کے دائیں جانب چلا گیا۔
یوسف کتنی ہی دیر اپنی کوٹھری کے دروازے کی ٹھنڈی آہنی سلاخوں سے سر ٹکائے کھڑا رہا۔ اوپر برآمدے کی چھت کی سلاخوں سے پرے کہیں آسمان کا کچھ حصہ نظر آرہا تھا۔
اس نے نظروں کا سارا زور لگایا مگر کوئی ستارہ اسے آسمان کے اس حصے میں نظر نہیں آرہا تھا۔ رات کے پچھلے پہر بھی آسمان غبار

اپنے آپ کو تسلی دے رہی تھی۔
ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ ماں بیٹا حسرت سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے جدا ہو گئے۔
کوٹھری میں واپس آ کر وہ کتنی ہی دیر الٹا لیٹا اپنی سوچوں سے الجھتا رہا۔
"کیا کہیں میری بے گناہی بھی قبول کی جائے گی؟"
کتنی ہی دیر وہ اس سوال کی ٹکٹکی پر لٹکا رہا' پھر ایک اور سوال اس کے اندر کہیں سے اٹھا اپنا پھن پھیلا کر پھنکارنے لگا۔ اس کے پورے وجود میں خوف کی سنسناہٹ دوڑتی گئی۔ لہر در لہر وہ لرزتا رہا۔
"کیا واقعی میں بے گناہ ہوں؟"
اس سوال کی پکڑ سے نکلنے کے لئے اس نے بہت زور لگایا اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر بیٹھ گیا۔
اس کی کن پٹیاں تپ رہی تھیں۔ اسے لگتا تھا جیسے اس کا سر اس بوجھ سے پھٹ جائے گا۔ تنگ آ کر اس نے کئی دفعہ اپنا سر زمین پر مارا یہاں تک کہ وہ سر سن ہو کر جیسے اس کے جسم سے علیحدہ ہو گیا۔
اس کا سر زمین سے اٹھتا نہیں تھا۔ وہ اسے اٹھانا چاہتا تھا۔ پھر وہ جیسے اپنے سر کو اٹھانے کی کوشش میں اپنا ماتھا زمین پر بری طرح رگڑنے لگا۔ اس کے اندر کا سارا درد جمع ہو کر اس کی زبان میں اکٹھا ہونے لگا۔ سر درد سے نجات پانے کے لئے جیسے خود بخود سر کے اندر سے آواز آنے لگی۔
▲ "میرے مولا! مجھے نہیں پتہ کہ مجھے کس جرم کی سزا مل رہی ہے۔ اگر میں نے کوئی گناہ کیا ہے۔ تو تیری دنیا میں' میں اکیلا ہی گنہگار تو نہیں ہوں۔ مجھے بخش دے میرے مولا! مجھے اس طرح اتنی بڑی سزا نہ دے جسے میں برداشت نہ کر سکوں۔ تیری نظر میں کتنا ہی حقیر سہی پھر بھی میں سب سے برا تو نہیں۔ یہ دنیا چوروں' ڈاکوؤں' مجرموں' قاتلوں سے بھری پڑی ہے آخر مجھے ہی کیوں اتنی بڑی آزمائش کے لئے چنا گیا ہے؟ یا پھر مجھے بتا! یہ سب کیا ہے؟ تو کس طرح کس شکل میں گناہوں کی سزا دیتا ہے اور جنہیں تو معاف کرتا ہے وہ کون ہوتے ہیں۔" یہ آواز یہ گریہ زاری اس کی اپنی نہیں تھی۔ اسے کسی اور کی آواز آ رہی تھی۔

بلیک وارنٹ

رحم کی اپیل مسترد ہونے کے بعد زندگی اس کے لئے بہت بھاری بوجھ بن گئی یوں جیسے زبردستی اس پر لاد دی گئی ہو۔
اسے لگتا جیسے وہ پیدا ہونے سے اب تک موت کے انتظار ہی میں جی رہا تھا۔ خیال' سوچیں اس کے اندر سرسراتیں رہتیں وہ کسی کو کیسے بتاتا موت کے انتظار میں زندہ رہنا کتنا کربناک ہے۔
وہ اپنی کوٹھری کی محدود فضا میں اکیلا تھا۔ کبھی کبھی اس کا جسم بھی اس کا ساتھ چھوڑ جاتا۔ کچھ بھی اس کے کنٹرول میں نہ تھا۔ نہ ٹانگیں نہ بازو نہ آنکھیں نہ ہونٹ۔ سب پتھرا جاتے۔
وہ اچانک ڈر کر کسی بہت بڑے خوف کے احساس سے گھبرا کر اٹھتا' اچھل کود کر اپنے اندر زندہ ہونے کا احساس جگانے کی کوشش کرتا۔ اس کی ٹانگیں' اس کے بازو ہلتے تو اسے لگتا یہ اعضاء اس کے جسم کا حصہ نہ ہوں۔ وہ سب یوں علیحدہ لگتے جیسے انہیں عارضی طور پر اکٹھا کر کے جوڑا گیا ہو۔ حرکت کا یہ عمل بھی اسے غیر مانوس لگنے لگتا۔
آنکھوں کو ہونٹوں کو ہلانے کا عمل اب بہت شعوری کوشش میں بدلتا جا رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا اس کے جسم میں تبدیلیاں واقع ہو رہی تھیں۔ اس کا جسم اس کے قابو میں نہیں تھا۔
دن رات کا فرق آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا۔ وقت ایک تکلیف دہ تسلسل تھا جس میں کوئی وقفہ نہیں تھا جس پر اس کا کوئی اختیار نہیں

تھا۔ سے یاد نہ تھا وہ موت کا قیدی ہے۔ شروع شروع میں تو موت کے تصور سے اس کے اندر چاروں طرف جیسے ارتعاش پھیل جاتا تھا اور وہ اپنا ذہن کسی اور خیال کی طرف موڑ لیتا تھا مگر اب وہ اکثر موت کے متعلق سوچتا رہتا۔

دھیرے دھیرے موت کا احساس اس کی زندگی کا حصہ بنتا گیا گزری زندگی ایک خواب میں بدلنے لگی ایک ایسا خواب جسے آنکھیں بند کر کے بھی تصور میں لانا اب اس کے لئے مشکل ہوتا جارہا تھا۔ موہوم سی یادیں بے شکل سایوں کی طرح دماغ میں آتیں کچھ تصویریں بننے کی کوشش کرتیں اور پھر وہیں لکیروں میں بکھر جاتیں۔ شاں شاں ہونے لگتا۔

گزری زندگی بے وقت' بے رنگ و پھیکی اور بے معنی بنتی جارہی تھی جس کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ اسے لگتا سب کچھ بس یہی ہے۔ جو سامنے ہے جو موجود ہے مگر بڑا کربناک اور ناقابل قبول ہے۔

کبھی کبھی اس کی سرپٹ بھاگتی سوچیں ٹھہر جاتیں ایک دن سب نے مرنا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ آئے دن لوگ مرتے رہتے ہیں۔ کسی نہ کسی بہانے' کسی نہ کسی حادثے میں' کوئی بڑی عمر میں' کوئی کچی عمر میں۔ یہی بات سب سے بڑی بات ہے۔ یہی بات ہے۔ بہت درد ناک کہ ہر انسان مرنے ہی کے لئے پیدا ہوتا ہے۔ ہر انسان نے مرجانا ہے۔ کسی نہ کسی موت۔ فرق صرف یہ ہے کہ باری باری۔ میں چند دنوں میں مرجاؤں گا۔ کچھ میرے بعد اور باقی ان کے بعد' یا شاید کوئی مجھ سے بھی پہلے ہم سب نے اپنی اپنی موت مرجانا ہے۔ فرق صرف وقت کا ہے۔ وقت جس کا حساب بھی کبھی کبھی بڑا مشکل ہوجاتا ہے۔

وہ ٹھہر گیا۔ کسی سوچ کی زد میں آئے ہوئے لرزتا ہوا اٹھ کھڑا ہوگیا۔ دکھ تو یہ ہے کہ میں اپنی موت نہیں مررہا ہوں اس کی آنکھیں اچانک جیسے اپنے دکھ کے احساس سے چھلک اٹھیں۔ بے اختیار' خودبخود۔ وہ بیٹھ گیا۔ گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگا اور دیر تک روتا رہا۔

لوہے کی سلاخوں پر ٹک ٹک ہوئی تو اس نے سر اٹھایا۔

جیلر صاحب اپنی اسٹک کی ٹک ٹک سے اسے متوجہ کررہے تھے۔ اس کا اٹھا ہوا سر دیکھ کر جیلر نے پوچھا۔

"کیوں بھئی! کیسے ہو؟ زیادہ پریشان تو نہیں؟"

یوسف اٹھ کر دروازے کے پاس آگیا اور پریشان نظروں سے جیلر کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں بھرے سوال کو جیلر کیا سمجھتا' وہ بولا۔

"بس دو ایک دن کی بات ہے۔ تمہارا بلیک وارنٹ آنے ہی والا ہے۔" جیلر نے اسے یوں تسلی دی جیسے اس کے لئے یہ کوئی خوشخبری ہو۔

"رحم کی درخواست نامنظور ہونے کے کتنے دن بعد یہ موت کا پروانہ آجاتا ہے؟" سوال کرتے ہوئے اس کے گلے میں تھوک اٹک گیا۔

"ہفتہ دس دن تو لگ ہی جاتے ہیں۔ ہمت سے کام لو۔"

یوسف نے بڑی ہمت سے آنکھیں اٹھائیں گلے میں اٹکا تھوک نگلا۔ اس کا دل پسلیوں کے پنجرے میں پھڑپھڑا رہا تھا۔

"میں نے تمہاری رحم کی درخواست پڑھی تھی۔ اصل میں تم نے بڑی غلطی کی جو اس میں اپنی بے گناہی کی لمبی چوڑی کہانی بیان کی تھی۔ اب تمہاری بے گناہی والی بات کوئی نہیں مانے گا۔ یہاں تو ویسے بھی ہر مجرم خود کو بے گناہ سمجھتا ہے۔ دراصل رحم کی درخواست میں تمہیں صرف رحم مانگنا چاہئے تھا گڑگڑانا چاہئے تھا۔ بادشاہ کی تو نفسیات ہی یہی ہوتی ہے کہ درخواست کرنے والا اپنے گناہوں کا' اپنے جرم کا اقرار کرے' بڑے سے بڑا پارسا بھی اپنے مالک کے سامنے جھولی پھیلا کر یہی کہتا ہے کہ مجھے تیرا انصاف نہیں' تیرا رحم' تیری بخشش چاہئے۔ معاف کرنے والے کے جذبہ کو جگانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی رحمت کا دریا اگر جوش میں آجائے تو بڑے سے بڑا

سے دکھا لگتا تھا۔

وہ ساری رات بے چین اور مضطرب رہا۔ طرح طرح کے خیالات اور وسوسے ہیولوں کی طرح اس کے ارد گرد ناچتے رہے۔ وہ آنکھیں بند کئے کمبل لپیٹے لیٹا رہا۔ روشنی سے بچنے کے لئے وہ اوندھا ہو کر لیٹ گیا۔ اسے اندھیرے کی ضرورت تھی تاکہ اپنی اس حالت پر غور کر سکے۔ وقت کی بھاری سل اس کے جسم پر دھری تھی۔ وہ بار بار پہلو بدل کر اس بوجھ سے نکلنے کی کوشش کرتا اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کس طرح اس صورت حال کا مقابلہ کرے۔

اس نے اپنی گزری زندگی کے واقعات یاد کرنے کی کوشش کی مگر کوئی واقعہ واضح ہو کر اس کے دماغ میں نہیں ٹھہرتا تھا۔ بس وہی چراغ روشن ہو جاتے تھے جو اس نے قتل کی رات سے پہلے ریشماں کے ساتھ گزارے تھے۔ باقی ساری زندگی بہت دھندلی اور دور رہ گئی تھی۔

سہارے

آج یوسف کی ماں اس کی ملاقات کے لئے آئی تھی۔ اندر قیدیوں والے بڑے سے کمرے میں وہ جالی کے ساتھ لگ کر کھڑا ہونا چاہتا تھا مگر اس کی ٹانگوں میں آج جان نہیں تھی وہ فرش پر بیٹھ گیا۔

باہر ملاقاتیوں کے برآمدے میں اس کی ماں لوہے کی جالی کو دونوں ہاتھوں سے تھامے موجود تھی۔

یوسف کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اور ویرانی تھی۔ گزری رات کی بے چینی ابھی تک اس کی آنکھوں میں کانٹوں کی طرح چبھ رہی تھی۔

"میں صدقے جاؤں یوسفے! تو کتنا کمزور ہو گیا ہے" ماں سے بیٹے کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

یوسف نے غور سے ماں کو دیکھا۔ اس کا دکھ سمجھنے کی کوشش کی "تو بھی وہ نہیں رہی ماں۔ مٹھی بھر رہ گئی ہے۔"

اس کی ماں نے چادر میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ وہ اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ "تیری قید مجھے کھا گئی یوسفے۔ تیرا باپ مرا تھا تو میں نے تیرے سہارے اس کی موت کا اتنا بڑا صدمہ سہہ لیا تھا۔ پر اب تیری یہ قید مجھ سے نہیں دیکھی جاتی۔ مجھے سمجھ نہیں آتی تجھے کیسے رہائی دلاؤں' میں نے تو اپنی رہی سہی زمین بھی بیچ دی۔ تیری اپیل کے لئے بڑا تگڑا وکیل کیا۔ پھر بھی تیری اپیل منظور نہیں ہوئی۔"

آج غیر معمولی طور پر ملاقاتیوں کا اتنا رش نہیں تھا ماں بیٹا آسانی سے ایک دوسرے کی بات سن سکتے تھے۔

"میں گئی تھی تیرے وکیل کے پاس۔ کہتا ہے تمہارا بیٹا میرے مشورے پر عمل کرتا تو اس کی سزائے موت ضرور عمر قید میں تبدیل ہو جاتی۔"

"پر میں وکیل کے کہنے پر کیسے اس قتل کا اقرار کر لیتا جو میں نے کیا نہیں تھا۔" یوسف نے جھنجلاتے ہوئے کہا

یوسف کی ماں خاموش ہو گئی۔

وہ سوچ رہی تھی۔ وہ کیسے کہہ دیتی کہ وکیل کہہ رہا تھا کہ یوسف کے مقدمے کی فائل پڑھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ قتل اس نے نہیں کیا۔ خود وہ بھی سوچتی تھی آخر کسی بھی عدالت میں یوسف کی بے گناہی کیوں نہیں مانی گئی۔ کہیں سے بھی انصاف کیوں نہیں ملا۔

"کیا یوسف مجھ سے بھی جھوٹ بول سکتا ہے؟"

اس کے دل میں کئی مرتبہ یہ سوال اٹھا تھا جسے اس نے جھٹک دیا تھا۔ اپنی ماں کو خاموش دیکھ کر یوسف بے چین ہو رہا تھا۔ وہ ڈر رہا تھا پتہ نہیں اس کی ماں کیا سوچ رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"تو نے میرے لئے دعا کی تھی ماں؟ لوگ کہتے ہیں ماں کی دعا تو عرش ہلادیتی ہے۔" اس کے لہجے کی شکستگی جیسے تیز دھار بن کر ماں کے کلیجے میں اتر گئی۔

"میں نے بہت دعائیں مانگی ہیں۔ اللہ سچے کے سامنے جھولی پھیلا پھیلا کر ساری ساری رات گڑگڑاتی رہی ہوں۔ نذر نیاز بھی بہت دی ہے' ملاجی کے پاس بھی گئی تھی۔ ان کی منت بھی کی تھی ملاجی کہتے ہیں کہ سب نمازیوں کے سامنے ایسے مجرم کے حق میں کیسے دعا مانگ سکتا ہوں جسے قتل کے جرم میں سزا ہو چکی ہے۔ ملاجی کہتے ہیں یوسف کو کہو توبہ استغفار کرے اللہ سوہنے سے اپنے گناہوں کی معافی مانگے۔ توبہ کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے ہیں۔"

"پر ماں تو نے ملاجی کو بتایا نہیں کہ تیرا بیٹا بے گناہ ہے؟"

"بتایا تھا پتر۔" کہنے لگے اس کی بارگاہ میں کون بے گناہ ہے کون گنہگار یہ کوئی نہیں جانتا۔ بس ہر وقت اس کا فضل مانگنا چاہئے وہ چاہے تو چوروں کو قطب بنادے۔ وہ چاہے تو لکھوں لکھ کردے۔ میں نے تو پیر دستگیر کی قسم کھاکر ملاجی کو یقین دلایا تھا کہ یوسف میرا خون ہے میں نے اسے دودھ پلایا ہے وہ قاتل نہیں ہوسکتا۔ ملاجی بولے تھے "اللہ کے ہاں سزا و جزا کے طریقے نرالے ہیں۔ کیا پتہ یہ جو یوسف کو سزا ملی ہے وہ کسی اور جرم کی ہو" یوسف خاموش ہوکر ماں کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ شاید وہ اپنے گناہوں کا حساب کرنے لگا تھا۔

لے دے کے اسے اپنی ایک ہی لغزش یاد آئی تو کیا یہ اس گناہ کی سزا ہے' جو شاید میرے بس میں نہیں تھا۔ اور پھر......

اس نے جیسے یاد کرنے کی کوشش کی....اس کی ذمہ دار ریشماں بھی تو ہے بلکہ وہی ذمہ دار ہے اور اسے کوئی پچھتاوا کوئی افسوس نہیں' اسے تو کسی نے نہیں پوچھا۔ اس کا کیا ہوا؟ اس کا کیا بنے گا؟

اس کی سوچیں الجھنے لگیں۔

بظاہر وہ اپنی ماں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے تو اب اس گناہ کی تفصیل بھی یاد نہیں رہی تھی۔ اصل میں وہ خود کو بنیادی طور پر ایک شریف بھلا مانس آدمی سمجھتا آیا تھا۔ صاف ستھری زندگی گزار رہا تھا۔ کبھی کسی کو تکلیف نہیں دی تھی۔ کسی کا حق نہیں مارا تھا۔ کمزور آدمیوں کی مدد کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا۔ یوسف کو خاموش دیکھ کر اس کی ماں کا دل جیسے کوئی مٹھی میں پکڑ کر نچوڑ رہا تھا۔

"اللہ کرے تیری رحم کی اپیل ہی منظور ہوجائے۔"

"تیرا دل کیا کہتا ہے ماں؟" یوسف نے بڑی حسرت سے پوچھا۔

"ماں واری! اس دل کا کیا ہے' گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔ پر تیرا وکیل کہتا ہے تجھے اپیل' رحم کی اپیل میں انصاف نہیں رحم مانگنا چاہئے تھا۔ اپنی بوڑھی بیوہ ماں کی زندگی کا واسطہ دینا چاہئے تھا' اپنی جوانی کی بھیک مانگنی چاہئے تھی ہوسکتا ہے بادشاہ کے دل میں اللہ تیرے لئے ترس ڈال دے۔" یہ کہہ کر اس کی ماں اپنے بیٹے کے چہرے پر اترتے چڑھتے رنگوں کو تلاش کرنے لگی۔

"نہیں ماں! جو جرم میں نے نہیں کیا اس پر مجھے شرمندہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے اب بھی یاد ہے' اچھی طرح یاد ہے مجھے قتل کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ پھر میں کیسے جرم کا اقرار کرکے رحم مانگتا۔ میرے ساتھ انصاف ہوتا تو آج یہ دن کیوں آتا۔ اب میں انصاف چھوڑ کر رحم کی بھیک کیسے مانگنے لگ جاؤں۔ یہ وکیل بھی عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں"۔

"مجھے تو خود بھی ان باتوں کی سمجھ نہیں آتی' سوچ سوچ کر پاگل ہوجاتی ہوں۔ اگر تیری رحم کی اپیل بھی نامنظور ہوگئی تو؟"

اس کی ماں کی آواز میں زندگی کا سارا درد اتر آیا۔ وہ خود ہی اپنی سوچ پر' اپنی بات پر لرز اٹھی۔ یوسف بھی اپنی جگہ تڑپ اٹھا۔

"نہ ماں! تو تو ایسا نہ کہہ!" یوسف جیسے سسک پڑا۔

اس کا دل چاہا کہ ماں کے سینے پر سر رکھ کر خوب روئے مگر ان کے درمیان میں لوہے کی دیوار حائل تھی۔

"میں جاؤں گی شاہ جی کے مزار پر' چادر چڑھا کر آؤں گی۔ تیری زندگی کی خیر مانگوں گی۔ تو حوصلہ نہ ہار پتر!" وہ یوسف سے زیادہ

سوچوں سے جان چھڑانے کی خواہش نے زور مارا تو وہ بڑی مشکل سے ٹانگوں پر زور ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا اور دروازے تک پہنچا۔
وارڈر کھانا رکھ کر واپس جانے ہی والا تھا کہ یوسف کی آواز نے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔
"بھائی! خدا کے لئے ایک بات بتاتے جاؤ"
وارڈر کھڑا ہو گیا۔
"یہ پھانسی کس طرح دی جاتی ہے؟"
یوسف اپنے سوال کی وحشت پر خود ہی کانپ اٹھا' وارڈر نے اس کے چہرے پر پھیلی وحشت پر غور کئے بغیر بڑے سپاٹ لہجے میں کہا
"رات کے آخری پہر تمہیں اٹھاکر نہلائیں گے۔ نماز پڑھاکر تم سے وصیت لکھوائیں گے۔ تمہارے دونوں ہاتھ باندھ کر تمہیں پھانسی کے چبوترے پر لے جائیں گے۔ پھٹوں پر کھڑا کرکے تمہارے چہرے پر کالا تھیلا چڑھادیا جائے گا اور تمہارے سر پر لٹکتے رسے کا پھندا تمہارے گلے میں کس دیں گے۔ پھر مجسٹریٹ کے اشارے پر پھٹوں کے سرے پر کھڑا جلاد ہینڈل گھمادے گا۔ کڑک سے تمہارے قدموں کے نیچے سے پھٹے نکل جائیں گے اور تم نیچے دس پندرہ فٹ گہرے کنویں میں لٹک جاؤ گے۔ تمیں پتہ بھی نہیں چلے گا۔ تمہاری گردن کا منکا ٹوٹ جائے گا۔ تھوڑی دیر تمہارا جسم تڑپے گا پھر ڈاکٹر سیڑھیوں کے نیچے اترے گا تمہارے جسم کو چیک کرے گا اور تمہاری موت کی تصدیق کردے گا۔ بس اللہ اللہ تے خیر صلا۔"
وارڈر نے جلدی جلدی ساری کاروائی کا خلاصہ بناکر بول دیا۔ وہ شتابی سے اپنی بات مکمل کرکے وہاں سے جانا چاہتا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اسے قیدی سے باتیں کرتا دیکھ لے۔ یوسف سلاخوں کو مضبوطی سے تھامے کھڑا تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔اس کا پاجامہ بھیگ رہا تھا۔ اس وقت اسے اپنے جسمانی ردعمل پر کوئی اختیار نہیں تھا۔
"بس ڈر گئے" وارڈر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "جب قتل کرتے ہو' کسی کی جان لیتے ہو اس وقت موت یاد نہیں رہتی۔"
یوسف کا حلق خشک ہو رہا تھا۔وہ بولنا چاہتا تھا۔ کہنا چاہتا تھا۔
"میں بے گناہ ہوں۔ میں نے تو قتل نہیں کیا۔"
"تم بھی یہی کہو گے میں بے گناہ ہوں۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ یہاں سب یہی کہتے ہیں۔ کوئی اپنا جرم نہیں مانتا۔ اسی لئے انہیں پھانسی چڑھنے کا بہت خوف ہوتا ہے" وارڈر کی آواز میں طنز تھی۔ نفرت تھی ایسی نفرت ہر قاتل جس کا سزا وار ہوتا ہے۔
وارڈر کے جانے کے بعد یوسف وہیں دروازے کی سلاخوں کے پاس بیٹھ گیا۔ یوں جیسے اس کی ٹانگوں نے اس کے جسم کا بوجھ اٹھائے رکھنے سے انکار کردیا ہو۔ کھانا اس کے پاس پڑا تھا۔ دال روٹی' بے شکل بے سواد کھانا۔ اس کا پیٹ خالی تھا۔
اس کے پاس اس کے جسم کی بو پھیلی ہوئی تھی جو کھانے کی کمزور ہواڑ سے مل کر ایک تیسری بو پیدا کررہی تھی اس نے غیراختیاری طور پر چاہا ہاتھ بڑھاکر روٹی کا لقمہ توڑ کر اسے منہ میں ڈالے اور کسی ذائقے کسی سواد سے اپنی زبان سے چمٹی تلخی کو دور کرے۔ مگر اس کے ہاتھ نے اس کا کہا ماننے سے انکار کردیا۔
دونوں ہاتھ دونوں بازو اس کے پہلوؤں میں موجود تھے مگر یوں جیسے اس سے روٹھے ہوئے ہوں۔ کتنی ہی دیر وہ ہر احساس' ہر جذبے سے عاری اسی حالت میں بیٹھا رہا' یہاں تک رات کے پہرے کے نئے سپاہی ڈیوٹی پر آگئے۔ایک سپاہی نے آکر اسے دیکھا
"کیوں بھائی! تم کب تک اس طرح بیٹھے رہو گے؟"
یوسف نے سر اٹھاکر اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ اس کی نگاہوں میں ریت اڑ رہی تھی۔
"ہمت کرو بھائی! ایسے کب تک بیٹھے رہو گے؟"
یوسف ایسے نہیں رہنا چاہتا تھا مگر اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا اب اپنی اس حالت پر کس طرح قابو پائے۔ اس نے اٹھنے کی کوشش

گی۔ اس کی ٹانگوں نے پھر اس کا بوجھ سہارنے سے انکار کردیا۔ وہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گیا۔

پہرے والا سپاہی برآمدوں میں چکر لگاتا رہا۔

پتہ نہیں کس وقت یوسف دروازے سے اٹھ کر اپنے بستر پر پہنچا۔یہ رات اس پر بہت بھاری تھی۔

ساری رات وہ عجیب ڈراؤنے خواب دیکھ دیکھ کر تپک جاتا۔

بیداری کے علاوہ دوسری حالت جو بھی تھی اسے کسی طرح بھی نیند کا نام نہیں دیا جاسکتا۔

کبھی خواب کی حالت میں اسے لگتا وہ جاگ رہا ہے اور کبھی جاگتے ہوئے اسے لگتا وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ اس کے حواس پوری طرح اس کے قابو میں نہیں تھے۔ کبھی اسے لگتا وہ بدبو کے ڈھیر پر بیٹھا ہوا ہے۔ وہ بار بار کسی اونچی جگہ سے خود کو گرتے ہوئے محسوس کرتا۔ کہیں اس کے پاؤں نہیں ٹکتے تھے۔

صبح وارڈر اس کے لئے چائے اور سوکھی روٹی کا ناشتہ لے کر آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کا شام کا کھانا بھی اسی طرح دروازہ پر پڑا تھا۔

"تم نے رات کا کھانا نہیں کھایا۔؟"

وارڈر نے پرانے برتن اٹھائے اور نئے برتن اس کی جگہ رکھ دیئے۔ یوسف چٹائی پر لیٹا اسے دیکھ رہا تھا۔

"مجھے یاد نہیں۔ کھایا تو تھا شاید۔ ویسے بھوک نہیں رہی۔" وارڈر کو پتہ تھا ایسے قیدیوں کا کھانا پینا بس واجبی سا رہ جاتا ہے۔ اس کا جی چاہا اس سے ہمدردی کرے مگر یہ سوچ کر رک گیا کہ آخر وہ قاتل تھا' مجرم تھا۔

"یہ جمعدار کیوں نہیں آتا؟" یوسف نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"تمہارا وہ برتن بھی خالی رہتا ہے۔ تم کھاتے تو ہو نہیں" وارڈر نے اس سے کہا۔

"یہ پھانسی لگنے سے بہت تکلیف ہوتی ہے کیا؟" یوسف نے سر اٹھاکر اچانک پوچھ لیا۔

"پتہ نہیں' ویسے ایک دن جیل کا ڈاکٹر کسی کو بتارہا تھا کہ جب قیدی جھٹکے سے کنویں میں لٹکتا ہے تو اس کی گردن کا منکا ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے سر اور دھڑ کے درمیان تعلق کٹ جاتا ہے اور دماغ پر کسی تکلیف کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ساری تکلیف تو دماغ میں ہوتی ہے اور جب دماغ ہی کچھ محسوس کرنے کے قابل نہ رہے تو تکلیف کیسی؟"

"اچھا......اچھا!" یوسف اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اس کے جسم میں کپکپی طاری ہوگئی۔ ماتھے پر پسینہ آگیا۔ "ایک سپاہی کہہ رہا تھا" آنکھیں باہر نکل آتی' زبان لٹک جاتی ہے اور......" پھر وہ خاموش ہوگیا۔

یہ موضوع اس کے لئے بڑا تکلیف دہ تھا۔ مگر وہ اس پر بات بھی کرنا چاہتا تھا تاکہ کسی طرح اس کے بارے میں اپنے خوف سے رہائی پاسکے۔

"بس تو زیادہ نہ سوچا کر ایک دو دن کی تو بات ہے پھر تجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں رہے گی۔"

وارڈر نے اپنی طرف سے یوسف کو تسلی دی' وارڈر کے جانے کے بعد یوسف نے بے خیالی میں بے رنگ سی چائے میں خشک باسی روٹی کا ایک ٹکڑا بھگو کر منہ میں رکھ کر چبانا شروع کیا۔ اسے اپنے جبڑوں کے چلنے کی آواز واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔ اس نے دو ایک دفعہ روٹی کے ٹکڑے کو بھی دبا دباکر محسوس کیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کس طور پر اس کے حواس اپنی توانائی کھوتے جارہے تھے۔ اس کی زبان پر کوئی ذائقہ کوئی سواد نہیں تھا۔ ہر چیز ایک واہمہ بنتی جارہی تھی۔

جرم بھی معاف ہو سکتا ہے۔ مگر تم نے سارا وقت اپنی بے گناہی کا رونا رویا ہے۔ تمہیں کسی نے صحیح مشورہ ہی نہیں دیا۔"

یوسف نے جیلر کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ جس کا کچھ حصہ داڑھی میں چھپا ہوا تھا۔ جیلر نے یہ باتیں یونہی کہیں تھیں' شاید بے خیالی میں' دراصل وہ یوسف کو اپنی باتوں سے زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ پھانسی کے وقت تک۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یوسف پھانسی کے بغیر مرجائے۔ یہ بات اس کی نوکری کے لئے مسئلہ بن سکتی تھی۔

ایک دفعہ ایسا ہوا تھا کہ موت کا ایک قیدی سزا کے خوف تلے دب کر رات کو مرگیا تھا۔ جیل حکام کے لئے بہت مشکل بن گئی تھی۔ بہت وضاحتیں کرنا پڑیں۔ مرنے والا کا پوسٹ مارٹم کروایا گیا۔ ہارٹ اٹیک ثابت کرنا مشکل ہوگیا تھا۔ جیل کا ایک چھوٹا افسر اور ڈاکٹر معطل ہوگئے تھے کہ انہوں نے قیدی کی صحت کا خیال نہ کرکے اپنے فرض سے کوتاہی کی تھی۔

اس وقت سے جیلر صاحب بہت محتاط ہوگئے تھے۔ موت کے یہ قیدی قانون کی نظر میں آزاد انسان سے بھی زیادہ اہم تھے۔ یہ قیدی یوسف جو جیلر کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی سزا کی تکمیل جیل حکام کے فرائض میں شامل ہو چکی تھی۔ انصاف کو اس کے حتمی نتیجہ تک پہنچنا تھا۔

وسوسے

موت کی اس تنگ کوٹھری میں اس کے اعصاب مسلسل ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہورہے تھے۔ اس کے جسم پر اس کا کنٹرول ختم ہوتا جارہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اس کا اپنی بے گناہی کا یقین بکھرنے لگا تھا۔ ویسے بھی رحم کی اپیل کے مسترد ہونے کے بعد اس یقین کی کوئی اہمیت بھی نہیں رہی تھی۔ اس یقین کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

یہ سوال اب صلیب کی طرح اس کی نظروں کے سامنے گڑا تھا۔

"کیا میں واقعی بے گناہ ہوں؟"

اس کے اور موت کے درمیان اس کی مرضی کے بغیر فاصلہ کم ہوتا جارہا تھا۔ اسے پتہ تھا۔ موت کے قدموں کی آہٹ اب اسے سنائی دینے لگی تھی۔ اس نے بڑے کرب سے سوچا۔ اس دنیا میں اگر انصاف نہیں تو رحم بھی نہیں' رحم تو ایک رحمت ہوتی ہے۔ جہاں سے انصاف اٹھ جائے وہاں رحم کیسے رہ سکتا ہے۔ اور جب بندے ایک دوسرے پر رحم کرنا چھوڑ دیں تو اللہ بھی ان پر رحم نہیں کرتا۔

اسے اپنی ماں کی یاد آتی تو وہ جینے کی کوشش کرتا "بس بیٹا! اب توبہ استغفار کر' رب سچے سے معافی مانگ' شاید اس کو رحم آجائے۔ اس کے ہاں کوئی کمی نہیں۔ وہ بڑا غفور و الرحیم ہے" یہ ہنسی اس کے ہونٹوں پر آکر جم جاتی اور اس کے ہونٹ خشک ہوجاتے۔

وہ سجدے میں گرنا چاہتا' گڑگڑانا چاہتا۔ معافی مانگنا چاہتا مگر اس کی طبیعت عاجزی سے خالی رہتی۔ ایک طرف اگر آہستہ آہستہ اس کا بے گناہی کا یقین کم ہوتا جارہا تھا تو دوسری طرف ابھی تک وہ اپنے گناہ کے احساس میں بھیگ نہیں سکا تھا۔ کہیں نہ کہیں اس کے دماغ کے کسی حصے میں اپنی بے گناہی کی اکڑ باقی تھی جو اسے مکمل طور پر جھکنے سے باز رکھتی تھی۔ سونے جاگنے کی درمیانی حالت میں اسے کہیں سے کسی آواز کی بازگشت سنائی دیتی ۔ اللہ کی مرضی کے بغیر کہیں کوئی پتہ بھی نہیں ہلتا۔ جتنی کسی جاندار کی سانسیں لکھی ہیں اتنی ہی اسے پوری کرنی ہیں۔ ایک کم نہ ایک زیادہ۔ جہاں اور جتنا رزق اس کے لئے مقدر کردیا گیا ہے اس سے زیادہ نصیب نہیں ہوگا۔ پوری طرح جاگنے سے پہلے وہ اپنے گاؤں کی کچی جگہوں میں بھاگتا پھررہا تھا۔ کبھی اس کے ساتھ اس کی بہن ہوتی اور کبھی رشماں اور کہیں وہ اپنی ماں کے آگے آگے بھاگ رہا ہوتا جو دور سے اسے آوازیں دیئے جاتی۔

"ٹھہرجاؤ یوسفے"

اس کی ماں پکارے جاتی اور وہ دور بھاگتا جاتا اور پھر بھاگتے بھاگتے جیسے اس کی سمت کھو جاتی۔ اچانک اسے جھٹکا لگا وہ جیسے اپنی حالت میں لوٹ آیا۔ تو کیا میں نے ایسے ہی مرنا تھا؟ کیا انسان پیدا ہی اس لئے ہوتا ہے کہ مرجائے؟ پیدا ہونے کے ساتھ ہی وہ موت کی طرف بھاگنا شروع کردیتا ہے؟ یہ عدالتیں' انصاف' رحم کی کہانیاں سب بہانہ ہیں؟ ہر ایک نے اگر مرنا ہے اور انسان اتنا بے بس ہے کہ اپنی مرضی سے جی بھی نہیں سکتا تو پھر اتنے بڑے بڑے دعوؤں کا کیا فائدہ ہے؟ کیا اس منصف نے بھی مرنا ہے جس نے مجھے موت کی سزا دی تھی؟ اسے مکمل یقین تھا کہ میں نے یہ جرم کیا ہے؟ کیا ان سارے گواہوں کو بھی جنھوں نے میری خلاف شہادت دی تھی۔ پتہ ہے کہ انہوں نے بھی ایک دن مرجانا ہے؟

یہ سب سوال اس کے پتھر جسم میں جاگتے دماغ پر بری طرح یلغار کررہے تھے۔

اس کا دماغ پھٹ رہا تھا۔

اس نے کبھی اتنا سوچا نہیں تھا۔

بنیادی طور پر وہ ایک کسان تھا جو سوچتا کم اور عمل زیادہ کرتا ہے اس کی محنت زندگی کی سب سے بڑی رونق ہے۔ مگر آج وہ سوچنے پر بے تحاشا سوچنے پر مجبور تھا۔ یہ سوچیں اس کے قابو میں نہیں آرہی تھیں۔وہ ان سے بھاگ نہیں سکتا تھا۔

ہوسکتا ہے یہ قتل میرے ہی ہاتھوں سے ہوا ہو۔

وہ اپنے ہر خیال پر تھوڑی دیر کے لئے حیران بھی ہوا مگر اس نے خود کو سوچنے دیا۔ خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

آخر اتنے لوگوں نے مجھے قتل کرتے فائر کرتے دیکھا ہے۔ یہ ضروری تو نہیں کہ وہ سب جھوٹ بول رہے ہوں یہاں تک کہ مرنے والے نے خود کو میرے ہاتھوں قتل ہوتے دیکھا تھا۔ مرنے والے جھوٹ نہیں بولتے۔

ضرور میں نے کسی بے خبری میں یہ قتل کیا تھا۔

آخر ر۔شماں سے بھی تو میں نے ایسی ہی بے خبری میں گناہ کیا تھا جس کی گواہ خود ر۔شماں ہے۔ مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا۔ صرف ر۔شماں کو پتہ تھا۔ اور وہ بھی کہتی ہے میں بے گناہ ہوں۔

تو اس رات ر۔شماں کے ساتھ اگر میں نہیں تھا تو اور کون تھا؟

مجھے تو ر۔شماں نے بے خبری میں ڈال رکھا تھا۔ وہی اس کی ذمہ دار تھی اور اب بھی اس کو یہ ذمہ داری قبول ہے۔ ر۔شماں اس کے جسم کے ساتھ چمٹ کر رو رہی تھی۔ شاید وہ اپنے گناہ پر شرمندہ تھی۔ اسے لگا وہ بہتے پانیوں میں کسی سفر پر جا رہا ہو۔ کسی بے جان شے کی مانند بے بس بے اختیار کسی بھی مزاحمت' کسی بھی کوشش کے بغیر' اس نے خود کو ڈھیلا چھوڑ کر رکھا تھا۔ بس یہ سوچ اس کا بوجھ تھی جو اسے سطح آب پر آنے سے پہلے اور نیچے ڈوب جانے سے روک رہی تھی۔

جیل کی چار دیواری میں صبح کی اذان ہورہی تھی۔ اس نے چاہا اٹھے وضو کرے' مگر کوٹھری کی بدبو اس کے جسم پر بوجھ بن کر پڑی رہی۔ وہ اٹھ نہ سکا۔ اس کا وجود ڈھیٹ بنا لیٹا رہا۔

کیا اس سے کوئی فرق پڑے گا؟

اس کے کافر دل نے سوچا۔ میرے نصیب میں جو تھا وہ مجھے مل کر رہے گا۔ میں اس سے بھاگ نہیں سکتا۔ باقی سب بیکار ہے۔شاید میں بہت بدنصیب ہوں۔ شاید یہ بھی میری ہی سزا کا حصہ ہے کہ میرے اندر اندھیرا ہے۔ ایمان کی روشنی بھی نہیں۔ میرا دل بے نور ہے۔

اپنی تسلی کے لئے اس نے دور دور کوئی سہارا ڈھونڈنا چاہا کوئی تصور' کوئی خیال اس کی مدد کو نہیں آرہا تھا۔ جیل کے وارڈر نے کوٹھری کے دروازے کی سلاخوں کے نیچے سے کھانے کے برتن اندر کھسکائے تو اس نے چونک کر بیدار ہونے کی کوشش کی۔

اقبال جرم

دیوار سے پشت لگائے، آنکھیں کھولے وہ بے حس و حرکت موت کی کوٹھری کے گونجتے سناٹے کا حصہ بنا ہوا تھا۔ کھلی آنکھوں سے اسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ کوئی چیز فوکس میں نہیں تھی۔

"کیا حال ہے بھائی!" کسی نے دور سے اسے پکارا، اس کی آنکھیں جھپک اٹھیں۔ بائیں جانب کوٹھری میں کسی وقت کوئی نیا قیدی آگیا تھا۔ یہ اسی کی آواز تھی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر بولنے کو جی نہ چاہا۔

"کب سے ہو یہاں؟" اس قیدی نے پھر پوچھا

"پتہ نہیں، شاید ہمیشہ سے، شروع سے" وہ اپنے اس جواب پر حیران ہوا۔ اس کی آواز بڑی کمزور تھی۔ اس کے بے معنی بے جان سے وجود کی اس سے بہتر آواز نہیں ہو سکتی تھی۔

"کون سے جرم میں ہو؟" اس قیدی نے ایک اور سوال کیا۔

یوسف نے اندازہ لگایا وہ قیدی اپنی کوٹھری کے دروازے کی سلاخیں پکڑے کھڑا تھا۔

"یاد نہیں" اس نے سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ اس کا جرم کیا تھا۔ بس یہی کافی تھا کہ وہ یہاں تھا۔ "مجھے پھانسی کی سزا ہو چکی ہے۔" یوسف نے جیسے آخری بات کی۔ اب اس کی خواہش تھی کہ وہ قیدی خاموش ہو جائے کیوں کہ وہ خود خاموش ہونا چاہتا تھا۔

"تم بھی انتظار کر رہے ہو؟" وہ قیدی خاموش نہ رہ سکا۔ اس کا آج پہلا دن اور پہلی رات تھی۔ وہ بولنا چاہتا تھا۔ خاموشی سے اسے خوف آتا تھا۔ طرح طرح کے خیالات اسے تنگ کرتے تھے۔

وارڈر کھانے لے کر آیا تو یوسف وہیں سے تقریباً چیخ پڑا۔

"کب آئے گا میری موت کا پروانہ؟"

"تمہیں بہت جلدی ہے مرنے کی؟" وارڈر نے غصے سے کہا

"میں تو کبھی کا مر چکا ہوں۔ اب تم لوگوں نے رسم پوری کرنی ہے۔ چاہتا ہوں وہ بھی جلدی سے پوری ہو جائے مجھ سے اب اور انتظار نہیں ہوتا۔ یہ تو موت سے بھی بڑھ کر تکلیف دہ ہے۔"

یوسف کے لہجے میں بلا کی جھلاہٹ اور بے بسی تھی۔ وہ اپنی موجودہ حالت سے اتنا تنگ آچکا تھا کہ کسی بھی دوسری حالت میں جانے کو تیار تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ جو ہونا ہے اب وہ جلد ہو جائے۔

"یہاں تو ہر قیدی کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ایک آدھ دن اور جی لے۔ اسے آخیر تک کسی معجزے کا، کسی نئے قانون کا انتظار ہوتا ہے جو اس کی سزا معاف کردے۔ اس کی پھانسی کو عمر قید میں بدل دے۔ تم کیسے بے خبر انسان ہو؟" وارڈر نے اسے لرزش کرتے ہوئے کہا۔

"کتنے آدمیوں کو پھانسی لگتے دیکھ چکے ہو؟"

یوسف نے خوف میں لتھڑا ہوا ایک کیڑا جیسے اپنے دماغ سے نکال کر باہر اچھال دیا۔

"بہت سوں کو۔ ایک قیدی تو مجھے اب تک یاد ہے۔ اس نے پھانسی سے پہلی رات ڈٹ کر کھانا کھایا۔ صبح علی علی کرتا ہوا پھانسی کے تختے پر پہنچا اور ہنسی خوشی پھانسی چڑھ گیا۔ اسی طرح ایک اور قیدی پھانسی کے چبوترے پر کھڑا ہوا جب پھانسی کا پھندا اس کے گلے میں ڈالا گیا تو اس نے اردگرد کھڑے جیل کے سپاہیوں کی طرف دیکھ کر کہا، بھائیو! ان جانے میں مجھ سے کوئی بات ہوگئی ہو، کسی کو مجھ سے کوئی تکلیف پہنچی ہو تو وہ مجھے معاف کردے۔ وہ بڑی ہمت والا تھا۔ اس دن ہم سب بہت جذباتی ہوگئے تھے ہمیں اس پر بہت رحم آیا تھا۔ اس نے گردن جھکا کر پھندے کو چوم لیا تھا اور جب اس کی گردن میں پھندا ڈال کر کسا گیا اور کالا تھیلا اس کے چہرے پر چڑھایا گیا

تب بھی وہ جیسے ہنس رہا تھا۔ ایسے لوگ جنہیں اپنے جرم پر فخر ہوتا ہے انہیں کسی سزا سے ڈر نہیں لگتا۔ تم بھی شاید ان لوگوں میں سے ہو جو آخری دم تک خود کو بے گناہ ہی سمجھتے رہتے ہیں۔ یہاں اکثر ایسے ہی لوگ آتے ہیں کبھی کبھی کوئی ایسا ہوتا ہے جو برملا کہتا ہے اس نے جرم کیا ہے اور وہ موت سے نہیں ڈرتا۔"

وارڈر کی باتیں سن کر یوسف کا سر جھک رہا تھا۔ یوں جیسے وہ اپنے اندر جھانک رہا ہو' جیسے اپنے کئے پر شرمندہ ہو۔

وارڈر کے جانے کے بعد بھی وہ کتنی ہی دیر یوں ہی کھڑا رہا اس کے اعصاب پر عجیب بے بسی' بے حوصلگی طاری ہوتی جارہی تھی۔ اسے پتہ تھا وہ اس صورت حال سے نہیں نکل سکتا۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی اسے کیسے قبول کرے۔

ایک اور دن ایسی ہی کیفیت میں گزر گیا۔ اس کی موت کا پروانہ نہیں آیا۔

جیل کے حکام خود بھی پریشان تھے۔ کہیں کوئی غلطی نہ ہوگئی ہو رحم کی اپیل مسترد ہونے کے بعد کم ہی کوئی قیدی اتنے دن زندہ رہتا تھا۔انہیں بھی جلدی تھی۔

اگلے روز جیل حکام کو یوسف کا بلیک وارنٹ وصول ہوگیا انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

دو روز بعد اس کی پھانسی کا دن مقرر ہوا تھا۔ہیڈ وارڈر نے آکر اسے یہ خبر سنائی تو اچانک اس کا دل اچھل کر جیسے اس کے حلق میں آگیا۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ہیڈ وارڈر اسے بہت دور دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ اور اس کے پورے جسم میں عجیب سی بے طاقتی سناٹا بن کر دوڑ رہی تھی۔

اس نے کچھ کہنا چاہا بولنا چاہا۔ مگر اس کے پاس کوئی لفظ کوئی زبان ایسی نہیں تھی جو اس کی وہ بات کہہ سکتی' جو ابھی اس نے پوری طرح سوچی بھی نہیں تھی۔ سکتے کی سی کیفیت میں کھڑا وہ سامنے ہیڈ وارڈر سے بھی آگے کہیں دیکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ جہاں اس کی نگاہ نہیں پہنچتی تھی۔

ہیڈ وارڈر نے اس کی یہ حالت دیکھی تو بولا۔

"کیوں! روز پوچھتے تھے کب آئے گا میری موت کا پروانہ؟ اب کیا ہوا؟"

یوسف جواب دینے کی بجائے اپنے پیروں میں ہی ڈھیر ہوگیا۔ ہیڈ وارڈر گھبرا گیا۔ کہیں اسے کچھ نہ ہوگیا ہو۔ وہ بھاگا بھاگا دفتر گیا۔

جیلر' ڈاکٹر اور چھوٹے موٹے اہلکار چند منٹوں میں وہاں جمع ہوگئے۔

اس کی کوٹھری کا دروازہ کھولا گیا۔

یوسف کی آنکھیں کھلی تھیں مگر اس کے ہوش ٹھکانے نہیں تھے۔ ڈاکٹر نے جلدی جلدی اس کی نبض' دل کی دھڑکن چیک کی' آنکھوں کے پپوٹے اٹھاکر بیٹری کی روشنی میں اس کی آنکھیں دیکھیں۔ فوراً اسے چٹائی پر لے جاکر لٹادیا گیا۔ ڈاکٹر نے طاقت کا کوئی انجکشن دیا تو چند سیکنڈ بعد اس نے آنکھ جھپکی تو سب نے جیسے اطمینان کا سانس لیا۔ سب کے چہروں پر رونق آگئی۔

"بیوقوف! تم نے اچانک اسے بلیک وارنٹ کی خبر کیوں دی۔ کہیں اس کا ہارٹ فیل ہوجاتا تو ہمارے لئے مصیبت آجاتی۔"

جیلر نے ہیڈ وارڈر کو بڑی سختی سے ڈانٹا۔

یوسف کے حواس نے کام کرنا شروع کردیا تو پہلا خیال اسے یہی آیا کہ اس طرح اگر میں مرجاتا تو اب تک بات ختم ہوگئی ہوتی کم از کم یہ پھانسی کا مسئلہ تو نہیں رہتا۔

اس کی حالت بہتر ہوئی تو اچانک ڈاکٹر اپنی ناک پر رومال رکھ کر کھڑا ہوگیا۔ ساری کوٹھری بدبو سے بھرگئی۔

"پہلے اس کے کپڑے بدلواؤ"

جیلر کی بات پر یوسف نے اپنی جسمانی حالت پر غور کیا اور اس کی جسمانی حالت اس کے قابو میں نہیں تھی۔ اس نے کافی دنوں سے

بہت کم کھایا پیا تھا۔ بھوک نہیں لگتی تھی۔ مگر پھر بھی اس کے جسم نے اس کی اجازت کے بغیر اس کا معدہ خالی کردیا تھا۔

یوسف کے گھر والوں کو آخری ملاقات کی اطلاع کردی گئی۔

اگلے روز وہ اسے ملنے کے لئے آئے مگر یوسف نے ان سے ملنے سے انکار کردیا۔ جیل والوں نے اصرار کیا تو اس نے چیخ کر کہا۔

"انہیں کہہ دو میں مرچکا ہوں۔ میں کسی بھی زندہ شخص کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ اب میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ کوئی رشتہ نہیں۔"

باقی وقت بہت آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا۔ اس کے ایک ایک عضو کو گزرتے وقت کی چاپ یوں سنائی دے رہی تھی جیسے وہ ان کے اندر سے راستہ بناکر گزر رہا ہو۔ ہر چیز اسے اجنبی' بیگانہ اور بے شکل دکھائی دے رہی تھی۔ ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ' ایک پاؤں دوسرے پاؤں کے لئے اجنبی بنتا جارہا تھا۔ اس کا سارا جسم بے جان تھا' سن تھا۔ کئی دفعہ اس نے اپنی ٹانگیں ہلائیں ان کو بڑے غور سے یوں دیکھا جیسے وہ اس کی اپنی ٹانگیں نہ ہوں صرف اس کا دماغ زندہ تھا اور کام کررہا تھا۔ جسمانی بے حسی کی ایسی حالت میں بھی وہ سوچ سکتا تھا۔ مگر اب اس کی سوچ میں کوئی سلیقہ' کوئی ترتیب نہیں رہی تھی۔ آنکھیں کھولے وہ دیکھے جارہا تھا۔ وہ خود اپنے آپ کو کسی پر فائر کرتے دیکھ رہا تھا پھر وہ جان بچانے کے لئے بھاگ رہا ہے۔ لوگ اسے پکڑنے کے لئے اس کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ ایک آدمی تیزی سے اسے پکڑلیتا ہے۔ وہ اسے دیکھ کر حیران ہوتا ہے کہ اس کو پکڑنے والا خود اس کا مقتول تھا۔

اس نے آنکھیں جھپکیں تو ایک اور منظر اس کے سامنے تھا۔ اس نے دیکھا اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے ہیں۔ اسے پھانسی کے چبوترے کی طرف لے جایا جارہا ہے۔ اس کی ٹانگیں اس کا بوجھ نہیں اٹھارہی ہیں سپاہی اسے سہارا دے کر چلا رہے ہیں۔ اسے بازوؤں سے اٹھارہے ہیں۔ اس کی ٹانگیں گھسیٹی جارہی ہیں۔ بے جان پاؤں لٹک رہے ہیں۔ پھر اسے سہارا دے کر پھٹوں پر کھڑا کردیا جاتا ہے۔ اس کے چہرے پر کالا غلاف چڑھادیا جاتا ہے۔ پھر بھی وہ دیکھتا جاتا ہے۔

پھانسی کا پھندا اس کے گلے میں ڈال کر کس دیا جاتا ہے پھر کہیں قریب ہینڈل گھومتا ہے۔ کڑک کی آواز آتی ہے اس کے پاؤں کے نیچے سے پھٹے نکل جاتے ہیں وہ ایک جھٹکے سے نیچے کنویں میں لٹک جاتا ہے وہ حیران ہوتا ہے۔ سیڑھیوں سے ڈاکٹر کنویں میں اترتا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے اس کے دھڑ کو تھپ تھپا کر دیکھتا ہے تسلی کرلیتا ہے کہ اس کے جسم میں کوئی جان نہیں۔ یوسف ڈر کر چیخنے لگ جاتا ہے۔

چھت سے لٹکتے بلب کی تیز روشنی میں وہ پسینہ پسینہ ہورہا تھا۔

اس کے جسم پر لرزہ طاری ہوجاتا ہے۔ کوٹھری میں اس کی اپنی بدبو پھیل جاتی ہے۔ وہ سوچتا ہے۔

"شاید میں ابھی تک زندہ ہوں۔"

وہ اونچی آواز میں بولتا ہے مگر اس کی آواز اس کی کوٹھری سے باہر نہیں جاتی۔ اپنی ہی آواز سن کر اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کی زندگی کی آخری رات ابھی نہیں گزری تھی۔ پھر پتہ نہیں اسے کیا ہوا۔

وہ زور زور سے چیخنے لگا۔

"مجھے پھانسی ہی دینی تھی تو اتنے سال زندہ کیوں رکھا؟اگر یہ میرا جرم تھا تو پہلے روز ہی مجھے پھانسی کیوں نہ دی گئی؟"

وہ پاگلوں کی طرح چلا رہا تھا۔ مگر خاموشی اتنی زیادہ تھی کہ کوئی اس کے سوالوں کا جواب دینے نہیں آیا۔

شاید سب جانتے تھے صبح دم اس کو پھانسی لگنی تھی اور ایسے ہی قیدی بہت کچھ کہتے ہیں' چیختے ہیں' چلاتے ہیں۔ اور اس رات انہیں چیخنے چلانے کی پوری آزادی ہوتی ہے۔ کوئی ان کا نوٹس نہیں لیتا۔ یہاں تک کہ ملحقہ کوٹھریوں والے مکین بھی دم سادھ لیتے ہیں۔

اس نے سنا بہت سے لوگ اس کی طرف آرہے تھے۔

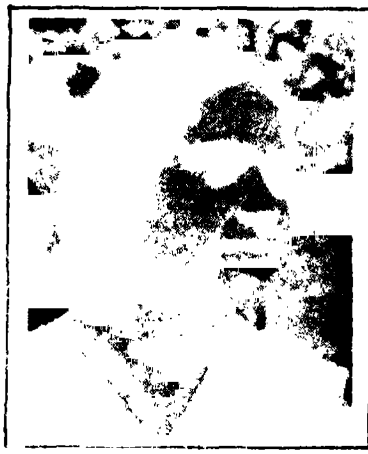
ان کے قدموں کی چاپ اس کی سماعت پر گر رہی تھی۔ اس کا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔وہ قدم اس کے نزدیک آگئے۔
بھدی اور بھاری آواز سے کوٹھری کا دروازہ کھلا۔
وہ سو نہیں رہا تھا۔جاگنے کی کوشش میں اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا' بہت سے لوگ اس کے نزدیک کھڑے تھے۔
بلب کی روشنی میں یوسف نے ان کے چہروں کو دیکھا پہچاننے کی کوشش کی۔
"اٹھو! تمہارا وقت آگیا ہے"اس نے کسی کو کہتے سنا
اس نے بلا ارادہ اٹھنا چاہا۔اس کی ٹانگوں نے حرکت نہیں کی۔اس نے اپنے بازوؤں کو اٹھانا چاہا جب وہ بھی نہ ہلے تو اس نے نظریں موڑ کر انہیں دیکھا وہ اس کے پہلوؤں میں بے جان پڑے تھے۔وہ مٹی کا بے جان ڈھیر لگ رہا تھا۔اس نے زور لگایا۔
"روز پوچھتا تھا "موت کا پروانہ کب آئے گا۔ اب دیکھیں ہلا نہیں جاتا۔"یہ ہیڈ وارڈر کی آواز تھی۔ اس نے پہلے بھی یہ آواز سنی تھی۔
"موت کو سر پر دیکھ کر بڑوں بڑوں کے اوسان خطا ہوجاتے ہیں۔ یہ غیر معمولی بات نہیں۔ اس کی حالت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔" یہ جیلر کی آواز تھی۔"اٹھاؤ اسے"
جیلر کے حکم پر دو سپاہی آگے بڑھے اور انہوں نے یوسف کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے کھڑا کردیا۔
اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔
سپاہی اگر اس کے بازو تھامے نہ رہتے تو اسی وقت کچی بھیگی دیوار کی طرح وہیں ڈھیر ہوجاتا۔
آہستہ آہستہ اس کی ٹانگوں پر اس کا بوجھ ٹک گیا۔
ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر اپنے طبی آلہ سے اس کی دل کی دھڑکن چیک کی' پھر اس کی نبض دیکھی۔ اور اطمینان سے سرہلایا جس کا مطلب جیل کا عملہ بخوبی سمجھتا تھا۔
افسر لوگ کوٹھری کے باہر کھڑے ہوگئے۔
پانی کی پوری بالٹی سے یوسف کو نہلا دھلا کر پاک صاف کیا گیا۔
یہ سب کچھ یوسف کے لئے ایک ڈراؤنے خواب کی طرح لگ رہا تھا۔جس سے وہ باوجود ہزار کوشش کے جاگ نہیں سکتا تھا۔
اس کا جسم سردی گرمی کے ہر احساس سے عاری تھا۔سپاہیوں نے اس کے ہاتھ پاؤں پکڑ کر اس کا لباس تبدیل کیا۔
یوسف یوں اپنے جسم کو دیکھ رہا تھا جیسے یہ اس کا اپنا نہیں کسی اور کا جسم ہو اور جسے وہ پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہو۔
"اب نماز پڑھو!"۔
انہوں نے اس کے لئے کھجور کے پتوں کی چٹائی بچھاکر اسے اس پر کھڑا کردیا۔ وہ دیکھتا جارہا تھا۔
اسے پتہ نہ چلا کہ کب وہ رکوع کے لئے جھکا' کب وہ سجدے میں گیا اور اس کی زبان سے کون سے الفاظ نکلے۔
اس کی زبان تو خاموش ڈری سہمی' تالو سے چمٹی ہوئی تھی۔ وہ نظریں گھماکر سب کو دیکھ رہا تھا' پہچاننے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ سب اجنبی تھے۔ اس نے پہلے کبھی ان لوگوں کو نہیں دیکھا تھا۔
جیلر کے حکم پر اس کے دونوں ہاتھ باندھ کر پشت پر کس دیئے گئے اور اسے ایک اسٹول پر بٹھادیا گیا۔
اس کی ٹانگیں لکڑی کی سوٹیوں کی طرح اکڑ رہی تھیں۔قطرہ قطرہ جیسے ان سے جان نکل رہی تھی۔
اس کا سارا وزن اب اسٹول پر تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت ناک حد تک پھیل گئی تھی۔
اردگرد کھڑے لوگوں کی شکلیں اسے غیر انسانی لگ رہی تھیں۔ وہ کٹھ پتلیوں کی طرح حرکت کررہے تھے۔ بول رہے تھے یوں جیسے وہ

سب کچھ اپنی مرضی سے نہیں کسی اور کی طاقت کے حکم پر کررہے ہیں۔
"لگتا ہے یہ چل نہیں سکے گا۔ اس کے لئے اسٹریچر کا بندوبست کرنا پڑے گا۔"
دو سپاہی جیلر کے اشارے پر اسٹریچر لینے چلے گئے۔ جیل کی مسجد کے خطیب جو خود ایک قتل کی سزا کاٹتے ہوئے جیل میں ہی نیک ہوچکے تھے' ہاتھ میں قرآن مجید لئے آگے بڑھے۔
"اسے چومو"
اس نے اپنے ہاتھوں کی رحل میں رکھ کر قرآن مجید' یوسف کے چہرے کے آگے کردیا۔
یوسف نے خاموشی سے دیکھا۔ اس کی گردن جھک نہیں رہی تھی۔
اس کا دماغ جو ارادہ کرتا تھا' اس کا جسم اس کو پورا کرنے پر تیار نہیں تھا۔
یوسف کی پشت پر کھڑے ہیڈ وارڈر نے یوسف کا سر پکڑ کر جھکایا' تھوڑی سی مزاحمت کے بعد' اس کا ماتھا قرآن مجید سے جالگا۔
اس کا ماتھا پتھرا چکا تھا۔
اس کی کوئی کیفیت اس پتھر میں سرایت نہ کرسکی' زندگی تو اس کی نگاہوں میں حیرت بن کر جمع ہورہی تھی۔ کوٹھری کے باہر ہلکی ہلکی بوندیں گرنے لگی تھیں۔ مگر اس کے لئے تو کوئی موسم نہیں تھا۔ اس کے اندر وقت سہما کھڑا تھا۔
اس نے ایک دفعہ پھر سخت جدوجہد کی کہ کسی طرح اس صورت حال کو اپنے شعور کی گرفت میں لے سکے۔ کچھ سمجھ سکے' کچھ کہہ سکے۔
"کلمہ شریف کا ورد کرو! آخرت کا سفر آسان ہوجاتا ہے۔"
مولوی صاحب نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے سمجھایا۔ یوسف نے نظریں گھما کر اسے دیکھا۔
"اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو! وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ آخری دم تک توبہ کے دروازے کھلے رکھتا ہے۔"
یہ الفاظ یوں اس کے دماغ کی سطح پر گر کر اچھل رہے تھے جیسے وہ پتھر کے فرش پر گررہے ہوں اس کے سارے وجود میں بے طاقتی' کمزوری بھری ہوئی تھی۔اس نے نظریں جھکا کر اپنی ٹانگوں کو دیکھا۔ انہیں حرکت دینے کی کوشش کی مگر ان کا سکوت نہیں ٹوٹا وہ جیسے اس کے ارادوں کے طابع نہیں رہی تھیں۔
اس کے ارادے' اس کا ہر احساس سب بے معنی ہورہے تھے۔
اتنی دیر میں مجسٹریٹ صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔
"کیوں بھئی سب تیاری مکمل ہے؟" انہوں نے آتے ہی پوچھا۔
جیلر نے ایڑیاں جوڑ کر سیلوٹ کیا۔ "یس سر"
"گڈ" مجسٹریٹ نے اطمینان سے کہا ان کے پاس وقت کم تھا۔ انہیں فارغ ہوکر کسی اور ڈیوٹی پر بھی پہنچنا تھا۔"لاؤ بھئی وصیت کے کاغذات"
ضروری کاغذات مجسٹریٹ کو پیش کردیئے گئے' مجسٹریٹ نے فائل کھولی۔
یوسف کو مجسٹریٹ کی آواز کہیں دور سے سنائی دی
"مسمی محمد یوسف ولد رحم دین تم پر الزام تھا کہ تم نے مسمی سراج دین ولد غلام محمد کو قتل کیا تھا۔ ماتحت عدالت نے تمہیں سزائے موت کا حکم سنایا۔بڑی عدالت سے تمہاری اپیل نامنظور ہوئی اور ماتحت عدالت کا فیصلہ بحال رکھا گیا۔تمہاری رحم کی درخواست بھی مسترد ہوچکی ہے۔ اب تمہیں عدالت کے حکم مذکورہ کے تحت پھانسی دی جارہی ہے۔مرنے سے پہلے اگر تم کوئی وصیت کرنا چاہو' تو میں لکھنے کو

تیار ہوں۔یہ وصیت تمہاری لاش کے ساتھ تمہارے وارثوں کے حوالے کردی جائے گی"
یہ الفاظ اور ان کی بازگشت یوسف کے پتھر وجود کی محرابوں میں دیر تک گھومتی رہی۔
اس نے بار بار آنکھیں جھپکیں' لب کھولنے کی کوشش کی۔
"تم شاید کچھ کہنا چاہتے ہو۔ ضرور کہو! اب جب کہ تمہارے اور تمہاری موت کے درمیان سب فاصلے ختم ہو رہے ہیں۔ تمہیں اپنے ضمیر پر کوئی بوجھ لے کر نہیں مرنا چاہئے۔" جیلر اسے زبان کھولنے کے لئے کہہ رہا تھا۔
یوسف کا جرم اب آخری وقت میں بہت واضح' بہت صاف اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ اپنی پوری اور مکمل شکل میں۔
موت اور جرم دونوں ساتھ ایک دوسرے میں مل کر ایک ایسے یقین کی شکل بن رہے تھے جسے توڑنے کے لئے اس کے پاس اپنی بے گناہی کا کوئی سہارا نہیں تھا۔وہ ان سے بھاگ نہیں سکتا تھا۔
کوئی قوت تھی جو اس کے اندر حوصلہ بن کر ابھر رہی تھی۔
"میں......"
اس کی زبان نے کھلنے کے لئے پورا زور لگایا۔
"بولو' شاباش" مجسٹریٹ نے حوصلہ دیا۔
یوسف نے اپنی بچی کھچی تمام قوتوں کو جمع کیا اور کہنے لگا
"مجسٹریٹ صاحب! میں اب تک اپنے آپ کو بے گناہ کہتا رہا۔ میں نے کسی منصف' کسی عدالت کے سامنے اپنے جرم کا اقرار نہیں کیا......"
وہ سانس لینے کو رکا' اور پھر زیادہ بھرپور ارادے اور عزم سے کہنے لگا
"...... آج مجھے پھانسی مل رہی ہے۔ موت میرے سامنے کھڑی ہے۔ اب میں اپنے دل کا سارا بوجھ اتار دینا چاہتا ہوں۔ آپ لکھ لیں۔ اور ساری دنیا کو بتادیں میں اپنے جرم کا اقبال کرتا ہوں۔بے شک یہ قتل میں نے کیا تھا۔ میں اپنی سزا اپنی تقدیر قبول کرتا ہوں۔"
جتنی دیر مجسٹریٹ صاحب یہ تحریر لکھتے رہے' یوسف کے اندر جیسے کوئی طاقت لوٹتی رہی مرنے سے پہلے بڑے پر اسرار طریقے سے' کسی نامعلوم' غیبی طاقت کے زیر اثر وہ زندہ ہوتا رہا۔ مجسٹریٹ نے اس کا بیان لکھ لیا۔
پشت پر بندھے اس کے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کو کسی نے سیاہی میں ڈبویا اور پھر یہ نشان اس کے بیان پر ثبت کرکے مرتے آدمی کے آخری سچ پر مہر تصدیق لگا دی۔
اسٹریچر آچکا تھا۔
سپاہیوں نے اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے اٹھانے کے لئے سہارا دیا۔
اس کی ٹانگوں میں سما' ٹھہرا ہوا خون کسی خفیہ جذبے کے زور پر گردش میں آچکا تھا۔ اس کے جسم میں حدت آگئی تھی' اچانک جان پڑ گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے جیسے زندگی لوٹ آئی تھی۔
اس نے کندھے جھٹک کر سپاہیوں کو پرے ہٹایا۔
اس کے چہرے پر عجیب حوصلے اور عزم کی پختگی پھیل گئی۔
وہ اٹھا۔
اس نے پورے ارادے سے پہلا اپنا دایاں اور پھر بایاں قدم اٹھایا۔ اور پھر بڑے ثابت قدموں سے جیل کے عملہ کی معیت میں پھانسی کے چبوترے کی طرف چل پڑا۔

اُمّ عمّارہ

یہ گزرے دنوں کا قصّہ ہے



"کوئی ادبی کانفرنس ہو رہی تھی شاید؟" اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔
شاید نہیں یقیناً وہ ایک ادبی کانفرنس تھی اور ڈھیروں ڈھیر ادیب دارالحکومت میں جمع تھے اور سارے بڑے ہوٹل ان سے بھرے ہوئے تھے۔۔ گویا ادباء شعرا کا میلہ تھا۔ ایک سے ایک پروگرام طرح طرح کے لوگ صبح ادبی مذاکرے شام کو رنگا رنگ تفریحی پروگرام اشتہا انگیز مزیدار کھانے اور رات کو ارباب حل و عقد کی طرف سے طعام کی دعوت اور دعوت کھلانے والے کا انداز' جیسے رازق اللہ نہیں بلکہ وہ ہے اور لوگ اپنے ملک کے خزانے سے نوازے نہیں جا رہے ہیں بلکہ اس کا نمک کھا رہے ہیں۔ کچھ خوش کچھ نا خوش۔۔ کچھ صرف اس لئے خوش تھے کہ چلو اتنی بڑی کانفرنس میں شریک ہیں۔ حکومت کے مہمان ہیں۔ کچھ بگڑے دل تھے ان کی رائے تھے ہم کسی کا نہیں کھاتے یہ ہمارا ہی پیسہ ہے جو ہم ٹیکس کی صورت میں دیتے ہیں۔ کوئی حال مست اور کوئی مال مست لیکن ایک بات ضرور تھی کہ وہ بے نیازی جو ادیبوں کی دنیا سے منسوب تھی وہ مفقود تھی۔لوگوں کو اپنے مقام کا احساس تھا۔
جو بڑے تھے۔ وہ سنجیدہ تھے ذرا الگ تھلگ سے جیسا کہ بڑے لوگوں کا طریقہ پر شفقت اور ہمدرد۔ ٹھنڈی چھاؤں جیسے' لیکن اپنے مقام سے باخبر۔
نوجوان اپنی کامیابی کے نشے میں چور۔ زمین و آسمان کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے۔ کچھ بڑھاپے کی وادی میں اترتے اپنے تجربوں ور مشقت کے ہاتھوں تھکے ہوئے۔
اس نے یاد کرتے ہوئے سوچا کانفرنسیں تو پہلے بھی ہوا کرتی تھی۔ لیکن اب ادبی کانفرنس میں جانا اس کے لئے ماضی کی داستان تھی کہ یہ سارے قصے واقعتاً اس کے ماضی سے تعلق رکھتے تھے اور یہ قصہ اس وقت کا تھا جب آتش سچ مچ جوان تھا۔ اور اب' اب تو پتہ نہیں کیسے ادب کے ٹھیکہ داروں نے اسے بلوا لیا تھا۔ سرکاری نوعیت کی کانفرنس تھی اور ہر مکتبہ فکر کے لوگ جمع تھے۔ بھانت بھانت کی بولی : بھانت بھانت کے انداز' کہیں سفید پگڑ' کہیں جنیز' کہیں رنگین لہراتے ہوئے آنچل غرض ماضی حال مستقبل سب اکٹھے' کہا جا رہا تھا ہر مکتبہ فکر کی نمائندہ کانفرنس ہے' مگر یہاں کشور ناہید نہیں تھیں نہ ہی منو بھائی۔ احمد ندیم قاسمی بھی منظر سے غائب پھر یہ کیسے ہر مکتبہ فکر کی نمائندہ کانفرنس ہے۔ اس نے سوچا اور وہ خود کس کی نمائندگی کر رہی ہے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ "ہاں واقعتاً" یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔وہ کون ہے' ادب کی دنیا میں کس گروپ سے وابستہ ہے۔ شہرت کے لئے اس نے کون سے کاوش کی۔ لوگ اسے

بھلا کہاں جانتے ہیں وہ تو اپنے گروہ سے بچھڑ گئی ہے اور اسے اچھی طرح پتہ تھا کہ جماعت کی بڑی طاقت ہوتی ہے اور اس کی جماعت ایک سوالیہ نشان اس کے سامنے کھینچ گیا۔

ہم اپنی ذات سے خود انجمن ہیں۔ غالب کا مصرع اسے زندہ کر گیا۔ ہاں بے شک ہم اپنی ذات میں خود انجمن ہیں کہ ہمار اپنا ایک نظریہ ہے اور اس طرح ہم اپنے خیالوں کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ اس کا بجھا ہوا چہرہ روشن ہو گیا۔ وہ دو قدم آگے بڑھی کاؤنٹر پر جا کر اپنے کمرے کا پتہ کیا۔ چابی پکڑی اور اوپر جانے کے لئے مڑی۔ دیکھا خالد احمد' امجد اسلام' جمیلہ ہاشمی' ان کی بہن سائرہ ہاشمی' ندرت الطاف' عبد اللہ ملک مسعود اشعر وغیرہ وغیرہ سارا لاہور ہے۔ کراچی والے دور سے رضیہ فصیح احمد کا رنگین آنچل لہرایا۔ ادا جعفری کسی سے بات کر رہی تھیں۔ ان کے ساتھ ہی ان کے عزیز شوہر نور الحسن جعفری صاحب کھڑے عالی صاحب کے ساتھ محو گفتگو تھے۔

دو قدم آگے بڑھی تاج سعید کی چکیلی مسکراہٹ نے راستہ روکا۔ ساتھ ہی' زیتون بانو' نسرین بھٹی' سیدہ حنا اور پشتو زبان کے ادیب' ارے ہاں خاطر صاحب بھی ہیں۔ واہ یہاں تو ڈھیروں اپنے جاننے والے ہیں وقت اچھا گذر جائے گا۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اندر بسے ہوئے ہراس نے کروٹ لی اور ایک خوشگوار احساس نے اسے ہلکا پھلکا کر دیا۔

عطا شاد' فرمان فتح پوری' ابو الخیر کشفی دور سے نظر آئے۔ لیکن ہو ہائی سے زیادہ اور کسی نے توجہ نہیں دی۔ اس کے دل میں پھر سناٹا سا چلنے لگا۔ وہ اداسی کی گود میں جھولا جھولنے لگی۔ ادھر ادھر دیکھتی قدم قدم چلتی دوسری منزل پر پہنچ گئی۔ اس نے کمروں کے نمبر پڑھتے ہوئے اپنا مطلوبہ کمرہ نمبر تلاش کر لیا۔ دروازے میں چابی گھمائی۔ اندر داخل ہو گئی ڈبل بیڈ والا کمرہ تھا۔ اور ایک بستر پر کوئی سر سے پیر تک چادر تانے سو رہا تھا۔ یہاں ہم نے ۵ راتیں گذارنا ہیں۔ پتہ نہیں یہ کون ہیں اس نے الجھن سے ان خاتون کی طرف دیکھا جن کا ہاتھ چادر سے باہر تھا جس میں سونے کی درجن بھر چوڑیاں چمک رہی تھیں پتہ نہیں کس زبان کی ادیب ہیں امیر معلوم ہوتی ہیں۔ خوبصورت بھی ہوں گی۔ رنگ گورا ہے۔ اس نے اپنا تھیلا ایک طرف رکھا' غسل خانے میں جا کر اس نے منہ ہاتھ دھویا۔ ڈھاکے سے آئی ہوئی ایک ساڑھی اپنے انداز میں باندھی۔ خوب ڈھیر ساری خوشبو انڈیلی لیکن اندر کی اداسی بڑے آرام سے اس کے دل کو تکیہ بنائے لیٹی رہی۔

"میں اتنی اداس کیوں ہوں کس چیز کی کمی ہے۔" اس نے میمن سنگھ کے پیازی موتیوں کے ٹاپس کان میں ڈالتے ہوئے سوچا۔

بال سمیٹ کے سیدھی مانگ نکالی اور بڑا سا بنگالی انداز کا جوڑا باندھ لیا۔ پھر کمرے میں دیوار سے لگے قد آدم آئینے میں جھانکا۔ اپنا آپ خوبصورت ہی لگا۔ اُداسی نے سر اٹھایا۔ اگر اس وقت غیاث ہوتا' تو مرمٹتا' تعریف کرتے اس کی زبان نہ تھکتی۔ اس کے کالے رنگ پر قصیدہ پڑھتا اور کہتا۔ "اگر تم گاتا' گانا جانتیں تو میں رنگ منڈلی سجا لیتا اور تمہارے ساتھ دیس دیس گھومتا۔ خوب پیسے کماتے ہم' تم بھی امیر ہو جاتیں اور میں بھی خوشیاں خرید سکتا"وہ مسکرائی۔

"خیر امیر تو میں نہیں ہو سکی لیکن محتاجی بھی نہیں ہے اور پتہ نہیں وہ اس لائق ہوا بھی کہ اپنی خوشیاں خرید سکے۔ غیاث الدین کو یاد کرتے ہوئے اس کی ہلکی ہلکی مسکراہٹ سارے چہرے پر پھیل گئی۔ غیاث' وہ جو اس کا دوست تھا' ہمدم تھا' اچھے برے میں کام آنے والا رفیق تھا۔ سچا' کھرا' اجلا آدمی پتہ نہیں کہاں ہو گا کیا کرتا ہو گا۔ اور' اور کیا پتہ زندہ ہے بھی یا نہیں۔ اس خیال کے ساتھ ہی چہرے پر چھائی مسکراہٹ سمٹ کر کراہ بن گئی۔ دل میں درد نے کروٹ لی۔ منہ کڑوا ہو گیا۔ اسے یاد آیا کہ وہ بھوکی ہے۔ اور یہ ڈھیروں اداسی خوف و ہراس سب خالی معدے کا قصور ہے۔ اس نے اپنی بلاوجہ پریشانی کے لئے وجہ جواز تلاش کیا۔

دن کے دو بج رہے تھے اور اس نے صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ اس نے ایک نظر کمرے میں سوئی مٹیار پر ڈالی جو چہرے سے چادر ہٹائے اپنی بڑی بڑی حیران آنکھوں سے اس کا جائزہ لے رہی تھی اس کا جی چاہا اس سے کوئی بات پوچھے لیکن خوبصورت متوالی آنکھوں نے پردہ گرا لیا۔ اور اس نےآنکھیں بند کر کے دیوار کی طرف کروٹ لے لی۔ اس نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا آئینے میں اپنے آپ کو

دیکھا۔ مناسب لباس اور سنگھار کے ساتھ اسے اپنا آپ اچھا ہی لگا۔ اس کا سنگھار جو صرف لپ اسٹک کے رنگ اور اچھی خوشبو تھا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ سامنے لفٹ کھلا پڑا ہوا تھا اس میں سا گئی۔ کئی ایک مندو بین بھی اوپر سے آرہے تھے لفٹ کا دروازہ بند ہوگیا۔ چند سیکنڈ کے مسفروں نے اسے غور سے دیکھا۔ لفٹ رک گیا اور وہ گراؤنڈ فلور پر آگئی۔ اسلام آباد ہوٹل کا بڑا پھاٹک منہ پھاڑے کھڑا تھا ایک جم غفیر آگے بڑھ رہا تھا اور ایک کونے تک پہنچ کر اچانک نیچے غائب ہوتا جارہا تھا۔ "نیچے ہے کیا" اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

"نیچے میس منٹ ہے جی۔ جہاں آپ لوگ اس وقت کا کھانا کھانے جارہے ہیں۔" ایک بڑے سے پگڑ والے چوکیدار نے کہا۔

"اچھا اچھا۔ مہربانی" اس نے غور سے میس منٹ میں اترتی سیڑھی کی طرف دیکھا۔ یہ تو گویا بڑی سی قبر ہے جو سب کو نگلتی جارہی ہے۔ کبھی نہ واپس آنے کے لئے جیسے ڈھاکے کے قریب بڑی سی مشترکہ قبر ہے۔ ساور میں اور جو بغیر کسی تخصیص کے ان سارے مردوں کو سمیٹے ہوئے ہے جن کی ذات پات زبان عمر کسی کا پتہ نہیں ہے۔ پھر بھی اس نے ماں کی طرح ان سب کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا ہے۔ "سچ ہے مٹی ماں بھی ہے مرقد بھی" اس کی سوچ نے اس کے قدم روک لئے۔

آگے بڑھیں جی زور کا ایک دھکا لگا۔ گرتے گرتے سنبھلی اور ادیبوں کی شائستگی کی قائل ہوگئی۔ جو اب نہیں ہے۔ کیا منظم قوم ہے ہماری' ایک ہی موٹو اپنائے ہوئے ہے "اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ۔ اس نے بھاگتے دوڑتے دانشوروں کو دیکھا۔ جو تیزی سے پلیٹ اٹھاتے اور کھانوں کی میز پر جم جاتے۔ جیسے قیامت تک وہیں کھڑے رہیں گے' لیکن جب پلیٹیں رنگا رنگا نعمتوں سے چوٹی تک بھر جاتیں تو جگہ چھوڑ دیتے۔ لوگ کھانے پر اس طرح ٹوٹ رہے تھے جیسے کھانا کم ہے اور اگر وہ نہ بھاگے تو بھوکے رہ جائیں گے۔ جگہ بناتی وہ جب کھانے کی میزوں پر پہنچی تو وہاں کھانا وافر تھا اور کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ اس نے آرام سے کھانا اپنے پلیٹ میں ڈالا۔ اور جی بھر کے ڈالا کہ اسے بھوک بہت لگی تھی۔ ایبٹ آباد سے چلتے ہوئے وہ وقت کی تنگی کی وجہ سے ناشتہ بھی نہیں کرسکتی تھی کھانے کی میز سے ہٹتے ہوئے اس کی نظر ایک نازک اندام پر پڑی جس کی پلیٹ میں چاول کے چند لقمے بڑی نفاست سے پڑے تھے اور وہ بڑی نزاکت سے مرغ کے بڑے سے ڈونگے میں کچھ ڈھونڈ رہی تھی اور اس کے مداح اپنی اپنی خدمات پیش کررہے تھے۔ جنھیں وہ بڑی مہربانی کے ساتھ نظر انداز کرتی جارہی تھی اس کی پلیٹ کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی نظر اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی رکابی پر پڑی انواع اقسام کی نعمتوں سے بھری ہوئی۔ اپنی رکابی دیکھ کے اسے شرم آئی۔ اس نے تو بہت بھرلیا ہے اور وہ نازک اندازم شاعرہ۔ اس نے شرمندہ شرمندہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھا کہیں اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی رکابی کو لوگ غور سے تو نہیں دیکھ رہے ہیں۔ لیکن کوئی اسے نہیں دیکھ رہا تھا کہاں وہ ماضی کی داستان کہاں یہ حال کی شاعری۔ اونہہ ہوگا یہ تو ایک چھکیلی ڈالی ہے۔ اور وہ خود اس نے اپنے لمبے چوڑے وجود کو دیکھا وہ مسکرائی۔ ہمارے اس تن و توش کو تو اسی توانائی کی ضرورت ہے۔ ایک کونے میں پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ کر اس نے میز اپنے سامنے کھسکائی پلیٹ رکھی اور آرام سے کھانا کھانے لگی۔

کھانے کی خوش بو جتنی اچھی تھی' مزاہ اتنا نہیں تھا' دو تین چمچے منہ میں ڈالنے کے بعد اس کے دل میں یہ خواہش مچلی کہ چمچہ ایک طرف ڈال کر وہ ہاتھ سے کھانا شروع کرے اس نے نظر اٹھا کے آس پاس دیکھا شاید کوئی اور انگلیوں کو استعمال کر رہا ہو۔ لیکن ہر طرف چھری کانٹے کھنک رہے تھے۔

ارد گرد جانے پہچانے لوگ تھے۔ لیکن کسی کی آنکھوں میں پہچان کی روشنی نہیں تھی۔ ہر ایک اس پر اچٹتی نظر ڈالتا اور آگے بڑھ جاتا۔ سب ہی چہک رہے تھے۔ لیکن کونے میں بیٹھی وہ اکیلے پن کا شکار تھی۔

ایبٹ آباد سے چلتے ہوئے ہلکا ہلکا سا سرور تھا اور ہلکا ہلکا سا غرور بھی تھا کہ اپنے ساتھیوں کے درمیان اپنی ذات کی بلندی کسے اچھی نہیں لگتی۔ مگر یہاں تو---- یہاں تو---- اونہہ خواہ مخواہ---- اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ لوگ پلیٹوں میں کھانے کے مینار بنائے

کھڑے تھے۔

"ہم تو بھئی اس کانفرنس میں تفریح کے لئے آجاتے ہیں"

"کچھ تفریح کچھ تجربہ"

"ہاں اور کیا۔ اور ہے کیا یہاں۔ یہ ہوٹل ہماری استطاعت سے باہر ہے اور ہمیں کچھ اچھا بھی نہیں لگتا ہے۔" دوسرے نے کہا۔

" تو یہاں ایسا لگتا ہے جیسے خیرات مل رہی ہے۔ اور یہ مانگے کی عیاشی ہمارا گلا گھونٹ دے گی۔ رات صدارتی تقریر میں سنا نہیں تھا۔

"ہم آپ کو رات کا بھی کھلوانے والے ہیں جیسے اپنی جیب سے کھلوانے والے تھے۔ ہم Tax Payer اور یہ ہمارا ہی پیسہ ہے۔"

"ہوں وہ تو ہے"

"پھر ہمارا ہی جوتا اور ہمارا ہی سر ہے نا" سرخ و سفید رنگ کے اُگ بجھوکا نوجوان نے کہا اور رکابی زور سے میز پر پٹخ دی۔ "میں نہیں کھاتا یہ کھانا زہر لگتا ہے مجھے"

"مگر کیوں اگر ہم Tax Payer ہیں تو یہ بھی ہمارا ہی پیسہ ہے' اور اس وقت کا کھانا یونیورسٹی گرانٹ کمیشن نے دیا ہے ہم تو ضرور کھائیں گے۔ سب کچھ ہمارا اپنا ہی ہے۔"

خالد احمد کا شفا سا چہرہ سامنے آیا۔

"ارے بی بی آپ یہاں اکیلی بیٹھی ہیں۔" اس نے محبت سے خالد احمد کو دیکھا۔ بامروت نوجوان ہر ایک کا بھائی۔ اچھا شاعر۔ باشعور آدمی۔

"ہم اکیلے کہاں ہیں خالد احمد آپ ہمارے ساتھ ہیں اور یہ ہال تو ویسے ہی بھرا ہوا ہے۔ پھر تنہائی کہاں" اس نے چاولوں سے بھرا ہوا چمچہ منہ میں ڈال لیا۔

لیکن نوالہ حلق میں اٹک گیا۔ یہ ادبی اجتماع صرف ایک خرید و فروخت ہے یہ صرف سوشل گیدرنگ ہے اور یہ کانفرنس ایک ایسی نمائش ہے کہ جناب صدر یہ ثابت کرسکیں کہ اس ملک کے شاعر و صورت گرو افسانہ نویس اور دانشور سارے کے سارے ان کے نیاز مند ہیں' اوہ وہ بیانگ دہل اپنی گہری گہری سرگیں آنکھوں میں فراست بھر کے عقل و دانش کے حوالے سے گفتگو کرسکیں' اور اپنے حق میں ادب و دانش کی طنابیں کھینچ دیں۔

واقعتاً کیا ہم اتنے سستے ہیں کیا ہمارا سچ مچ کوئی مقام نہیں ہے۔ ایک پچھتاوا اس کے ذہن پر چھارہا تھا۔ مقام تھا کب۔ میر بھی خوار پھرتے تھے اور کوئی پوچھتا نہیں تھا۔ انھوں نے عاشقی میں عزّت سادات کے جانے کا ماتم کیا تھا اور اب اچھی بری جیسی بھی ہے آج کی محبوبہ شہرت' ہے نام و نمود ہے دولت ہے اور پتہ نہیں کیا کیا ہے۔ وہ دل پرخوں کی اک گلابی والی بات اب قطعی نہیں رہی ہے۔ کیا ہمارے حل و عقد یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ہر مکتبہ فکر کے ادیب و دانشور ان کے ساتھ ہیں۔ سارا ملک ان کے ساتھ ہے۔ پھر وہ کون لوگ تھے کہ سچ بولنے کے جرم میں ان کے ہی قلم کی نوک ان کی زبان میں توڑ دی جاتی تھی۔ اور جنوں کی داستان لکھنے کی بدولت اپنے ہاتھ قلم کروادینے کے دعویدار تھے۔

اچھا تو اب یہ زمانہ ہے۔

"ہم بڑے سستے بک رہے ہیں" مارے صدمے کے اس کے ہاتھ سے چمچہ چھوٹ گیا۔ منہ میں بھرا ہوا نوالہ حلق کا پھندا بن گیا۔ اور وہ بدحواس ہوکر پانی کے گلاس کی طرف لپکی۔ ایک گھونٹ پانی سے گلا صاف کیا۔ اس کی آئی بھوک مرگئی تھی۔ کھانے سے بھری رکابی اس نے ایک طرف رکھ کے ادھر ادھر دیکھا۔ بہت سے لوگ ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ کھانے کی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اس نے اداسی سے گزرتے ہوئے ایک ایک آدمی کو دیکھا ان کے چہرے شناسا تھے لیکن آنکھوں میں شناسائی نہیں تھی۔

ہمیں شاید کوئی نہیں پہچانتا۔ یا پھر نظر انداز کیا جارہا ہے۔ شاید یہ صحیح ہے کہ انسان اگر اپنے پس منظر سے الگ ہوجائے تو صرف پرچھائیں رہ جاتی ہے۔ سو وہ اپنا سایہ آپ ہے اور سایہ صرف سایہ ہوتا ہے ہاتھ لگاؤ تو کہیں گم ہوجاتا ہے۔ اپنا ہی لکھا ہوا یہ جملہ اسے یاد آیا تو مسکراہٹیں اس کے خشک لبوں پر پھیل گئیں۔ سامنے مسعود اشعر اور سائرہ ہاشمی باتیں کرتے ہوئے گزرے اس کے ہونٹ مزید پھیل گئے آخر جانے پہچانے لوگ تھے لیکن وہ اپنی باتوں میں مگن اس کا نوٹس لئے بغیر ہنستے مسکراتے گزر گئے۔ "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" اسے فیض صاحب کا آدھا مصرع یاد آیا۔ اداسی اور پچھتاوا اس کے اندر سر اٹھانے لگا۔ ہم کو یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ ہم کو یہاں کوئی نہیں جانتا۔

سامنے اقبال عظیم کھڑے نظر آئے۔ ہاتھ میں جوٹھی رکابی دوسرے ہاتھ میں چھڑی اور آنکھوں پر سیاہ چشمہ۔

"کم از کم یہ ہمارے لئے اجنبی نہیں ہیں اور نہ ہی ہم ان کے لئے ہیں۔"

عظیم پور ڈھاکے کی سرکاری رہائش گاہ نظر میں گھومی اس کی اپنی نہیں اقبال عظیم صاحب کی رہائش گاہ۔ فردوس' تسنیم' آفتاب عظیم' مشکور عظیم' پیاری پیاری بیٹیاں' صاحبزادے اور بھائی وغیرہ' بھرا پرا گھر نظر کے سامنے گھوم گیا۔ "خوب ملے" اس نے بشاشت سے سوچا اور پھر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ان کے قریب پہنچ جاتی ہے۔

"اقبال بھائی یہ ہم ہیں" اس نے اپنا نام بتایا۔

"کیسی ہو۔" اقبال عظیم نے رکابی اسے تھماکے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"ٹھیک ہیں اقبال بھائی۔"

"ہم نے تمہارے بارے میں ایک بُری خبر سنی تھی۔ صحیح تھی یا یونہی۔"

"ہاں اقبال بھائی وہ خبر سو فی صد صحیح تھی۔ وہ قصّہ اب بالکل تمام ہوگیا ہے۔"

"بالکل ختم ہوگیا۔ اچھا۔ مگر یہ ہونا نہیں چاہئے تھا۔"

اقبال عظیم کے شگفتہ لہجے میں تاسف تھا۔

"جی بجایا فرمایا آپ نے یہ ہونا نہیں چاہئے تھا لیکن ہونی تو ہوکر رہتی ہے۔" اس نے دل بڑا کرکے قہقہہ لگایا۔

"خوش ہو"

"خوشی کیا اور غم کیا" اس نے سوچا اور ہنسی۔ "چلو کوئی بات نہیں اقبال عظیم صاحب تو ہمارے حال سے بہت باخبر ہیں۔" حالانکہ ڈھاکے میں تو۔ مگر یہ۔ یہ تو ڈھاکہ ہی بول رہا ہے۔ اس جم غفیر میں سے کس نے تمہیں گھاس ڈالی۔

"کسی نے بھی نہیں۔" حالانکہ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ کون ہے۔ جدھر سے گزرو لوگ ہلو کہہ کے گزر جاتے ہیں' اور ہم۔ ہم باتیں کرنے کے لئے ترس رہے تھے۔ اتنے ڈھیر سارے پڑھے لکھے لوگ اور ہم۔ دراصل ہم ہی نااہل ہیں شاید۔ اس نے چاروں طرف دیکھا سامنے ہوٹل کے لاؤنج میں جمیل الدین عالی بیٹھے اور ساہیوال کی ایک نمائندہ ہم قلم سے محو گفتگو تھے۔ وہ بھی وہیں جاکر بیٹھ گئی کہ چلو یہ تو "اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔ اور ان سے بڑی قربت رہی ہے۔" ڈھاکے کی جاندار محفلیں نظروں میں پھر گئیں۔ شوکت عثمان' ڈاکٹر حسین۔ بیگم صوفیہ کمال اور سب سے بڑھ کر اشک صاحب۔ احسن احمد اشک اب تو وہ بھی نہیں رہے۔ مگر دل میں تو ہیں۔

ایک بجلی سی نگاہوں میں کوند گئی۔ کیسے کیسے لوگ تھے وہ اجلے ذہن کے سانولے لوگ۔ کہاں گم ہوگئے۔ اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔

وہ وہیں ہیں جہاں تم انھیں چھوڑ آئی ہو۔ پھر یہ الجھن اور کڑھن کیسی۔ اور ڈھاکے کے لئے یہ تڑپ کیسی۔ وہ اپنے آپ ہی سوال و جواب کررہی تھی۔

ڈھاکہ تو اس کا حوالے تھا۔ اور آج بھی لوگ اسے وہاں کے حوالہ سے متعارف کراتے ہیں۔ سوچتے سوچتے اسے ASR کی وہ کانفرنس یاد آئی جو حال ہی میں لاہور میں ہوئی تھی۔ اور کشور ناہید نے اسے ڈھاکہ اور مشرق پاکستان کے حوالے سے ہی یاد کیا تھا۔ شاید کشور کو اس کا ماضی بہت عزیز تھا۔ جیسے وہ ماضی کے حوالے سے اپنے حال میں زندہ تھی لیکن اس کا قلم تو ماضی کی داستان طرازی نہیں کررہا تھا۔ بلکہ جس دنیا میں وہ تھی آج بھی اسی دنیا کی افسانہ نگار تھی۔ حال اور مستقبل کی تعمیر کی تمنا اس کے دل میں ہمیشہ زندہ رہتی تھی۔ ماضی تو اسے بھی عزیز تھا۔ لیکن اس کا حصہ بننا اس کے بس میں کہاں ہے۔ ماضی کو یاد رکھنا چاہئے۔ مگر اس کی پرستش نہیں کرنا چاہئے۔ اس کا خیال تھا کہ ماضی کو بھول جاؤ تو مستقبل کے خواب اور حال کی تعمیر سب ہی پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ترقی کے راستے پر چلنے کے لئے گزرے دنوں کا احتساب ضروری ہے اس کے اندر کا استاد بیدار ہوا۔ اسے مولانا حالی یاد آئے۔ جو خود احتسابی کے بڑے والہ و شیدا تھے اور اس وقت وہ بھی اپنے ماضی کو کھنگال رہی تھی۔ سامنے بیٹھے عالی صاحب نے بھنویں سکوڑیں۔ ناک چڑھائی۔ اور پھر اس کی طرف مخاطب ہوئے۔

"کیسی ہو۔" عالی صاحب اس کی طرف جھکے۔ "بھائی کہاں ہیں۔ کیسے ہیں۔"

"ٹھیک ہیں۔ سب لوگ بخیریت ہیں بھائی کراچی میں ہوتے ہیں"

"اچھا کراچی میں مگر ایک زمانہ ہوگیا ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔ کہاں ہوتے ہیں کراچی میں۔"

"پتہ نہیں عالی صاحب ہم تو ایبٹ آباد میں ہوتے ہیں۔"

"اچھا اچھا وہاں کیا کرتی ہو۔"

"جی پڑھاتے ہیں۔"

"اور بھئی"

"جی اور کچھ نہیں"

"خیریت سے ہو"

"بالکل خیریت سے ہیں" اس نے دیکھا عالی صاحب پھر اس شاعرہ سے مخاطب ہوگئے۔ دراصل اچھے دنوں کے حوالے سے عالی صاحب بھیا کے دوست ہوتے ہیں اور بھائی کے دوستوں سے اس سے زیادہ کیا گفتگو ہو سکتی تھی۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھی ادھر ادھر گھومتے ہوئے اس نے مانوس لوگوں کو تلاش کرنا چاہا۔ ہر طرف اپنے ہی لوگ تھے سارے چہرے ہی اپنے تھے کون تھا ان میں جسے وہ نہیں جانتی تھی۔ ادیبوں اور نمائندوں نے اپنے سینوں پر نام کے ٹیگ لگا رکھے تھے۔ کوئی چہرہ آشنا اور کوئی تحریر آشنا اور وہ خود۔ نگاہیں اشفاق صاحب پر جاکر رک گئیں پاس ہی ایک ہوچی من داڑھی چمکی۔

"کہاں دیکھا ہے انھیں۔ ارے یہ تو شہاب صاحب ہیں۔ قدرت اللہ شہاب" آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کونے میں چلی جاتی ہے۔ شہاب صاحب اشفاق صاحب کے ساتھ مصروف ہیں پتہ نہیں پہچانیں گے بھی کہ نہیں۔ اور پھر old I.c.s انکا تقرر بہار میں ہوا تھا اور انھیں بہاریوں سے شاید کوئی ہمدردی بھی ہو۔ اور ان کی پوسٹنگ سہسرام میں بھی ہوئی تھی۔ سہسرام یہ شہر اسے کیوں یاد آیا۔ وہ تو کبھی وہاں گئی بھی نہیں تھی ہاں البتہ پٹنہ گیا۔ سو گاؤں۔ ملاشی وغیرہ یہ سارے شہر اور گاؤں اسے یاد تھے۔ ڈھاکہ سے نکلنے کے بعد وہ کلکتہ سے ہوتی ہوئی ان تمام جگہوں سے بھی ہوتی ہوئی آئی تھی۔ پھر یہ سہسرام کیوں بیچ میں در آیا۔ کہیں اسی بھی نو دولتیوں کی ہوا تو نہیں لگ گئی۔

مگر رشتہ داروں کو یاد کرنا کون سا نو دولتیا پن ہے سہسرام شاید اس لئے یاد آیا کہ شہاب صاحب اس کا حوالہ تھے اور بس ایک بگڑے نواب بھی یاد آگئے کہ انھوں نے سہسرام میں مکان بنایا تھا۔ نواب نقی جان قمر گیاوی مرحوم جنھوں نے فرہنگ آصفیہ پر کام کیا تھا اور

اس کی اماں کے بڑے ماموں اور اس کے بڑے نانا تھے۔ اور یہ حوالہ ہی شاید نو دولتی پن کی نشانی تھی۔ ارے واہ گڑے مردے زندوں کا حوالہ بن کے کیا لیں گے جبکہ اس کا اپنا حوالہ بھی ہے۔ لیکن فرہنگ آصفیہ کا حوالہ تو بی بی بہار تمہارے نفس کی تسکین ہے کہ تمہارے افسانوں کو کون جانتا ہے" اس نے اپنے ذہن کو کریدا۔ اپنے آپ کو آئینہ میں دکھانا شروع کیا۔ اپنے آپ میں رہو مصنفہ صاحبہ ایران تو ران کے ہانکنے سے بڑائی نہیں ملا کرتی۔ اس نے خود ہی اپنی سرزنش کی۔۔ اچھا پھر۔۔

"پھر ہم بھی ام عمارہ ہیں" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ باخبرام عمارہ ہونے سے تم کو کون روک سکتا ہے تمہارے باپ کا دیا ہوا نام ہے لیکن تم بی بی ام عمارہ تو ہونے سے رہیں۔ تم تو اس بیسویں صدی کی ام عمارہ ہو اپنے تمام LUST کے ساتھ۔" اور صرف نام رکھ لینے سے تم نام کما تو نہیں سکتیں کہاں وہ آفتاب کہاں تم ذرہ۔ اپنے آپ میں رہنا ہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ اس نے اپنی سرزنش کی۔

"شہاب صاحب۔ اسلام علیکم" اس نے سارے فاسد خیالات جھٹک کے سلام کیا۔

"کیسی ہیں آپ' بھائی کیسے ہیں؟ بڑے دن ہوگئے ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"جی ٹھیک ہی ہوں گے۔ پچھلے ایک سال سے ہمارا بھی لاہور جانا نہیں ہوا۔" اس نے بے دلی سے کہا۔ کوئی بھی اسے اپنے حوالے سے جاننے کو تیار نہیں تھا۔

"اچھا آپ لاہور میں نہیں ہیں کیا کررہی ہیں آپ۔"

"پڑھا رہے ہیں"

"کہاں۔ کس جگہ ۔ کون سا کالج ہے۔"

"برن ہال کالج میں"

"اچھا ایبٹ آباد میں ہیں آپ مگر وہاں تو چھوٹے بچے ہوں گے۔"

"جی شہاب صاحب۔ چھوٹے ہی ہیں' سینئر کیمبرج اور انٹر کے بچے اور کیا ہوسکتے ہیں۔"

"ہاں وہ تو ہے لیکن وہ جگہ تو۔ میرا مطلب ہے ایبٹ آباد تو ذرا الگ تھلگ سا۔"

"شہاب صاحب جب میکدہ چھٹا تو پھر کیا جگہ کی قید۔ وقت ہی گزارنا ہے ناسو خوش و ناخوش گزر ہی رہا ہے۔" اس نے دل بڑا کرکے کہا۔ اسے اپنا ایڈن گرلز کالج ڈھاکے میں دھان منڈی کا مکان اور بیگم عفت شہاب بہت یاد آئیں کہ انھیں اس نے اپنے ہی گھر میں دیکھا تھا۔ اور اب کچھ بھی نہیں رہا تھا سب کچھ ختم اب تو شہاب صاحب بھی داستان بن چکے تھے۔

خیر اس دن اس کا وقت اچھا کٹ گیا۔ شہاب صاحب ہی سب سے اچھے ثابت ہوئے تھے کہ رسمی طور پر ٹرخایا نہیں بلکہ اپنے پن سے گفتگو کرتے رہے۔ اس کی بے سروپا باتیں سن کر انھوں نے کوئی اکتاہٹ نہیں ظاہر کی تھی اس کی ہربات پر سنجیدگی سے غور کیا بہت ساری مشکلات کے لئے سلجھے ہوئے راستے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ انکی باتوں سے خوش ہوکر ہلکی پھلکی ہوگئی۔ بہرحال پرانے اقدار کے نمائندے تھے ان کے لب و لہجے میں جو دھیما پن ۱۹۴۷ء میں تھا وہی ۱۹۸۳ء میں بھی موجود تھا۔

شاید حالی نے ان جیسے لوگوں کے لئے ہی کہا تھا۔ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔ اس نے شہاب صاحب کو کھانا کھاتے ہوئے محبت سے دیکھا اور آگے بڑھ کر رکابی میں اپنے لئے کھانا ڈالنے لگی۔ تو اسے احساس ہوا کہ وہ آج سارے دن تقریباً بھوکی رہی ہے۔ حالانکہ کھانا' چائے سب کچھ کی بڑی فروانی تھی لیکن بھوک ہی اڑ گئی تھی۔ بے اعتنائی کا دکھ اسے پریشان کررہا تھا۔ ذرا سی توجہ ملی تو بھوک معدے میں کلبلائی' رات کھانا لگا ہوا تھا اور لوگ کھانا کھارہے تھے۔ اس نے چمچے سے منہ میں نوالہ ڈالا۔ مزیدار ہے اس نے سوچا۔

"کیسی ہیں بہن آپ" فتح محمد ملک اس کی خیریت پوچھتے ہوئے گزر گئے۔

"لوگ اتنے بھی برے نہیں ہیں۔" اس نے جلدی جلدی منہ چلاتے ہوئے سوچا۔

"ہاں بالکل لیکن شہاب صاحب تم کو ڈھاکے سے جانتے ہیں" شناسائی کا دکھ گولا بن کر اس کے گلے میں اٹکا۔ ورنہ یہاں تم کو کون پوچھتا ہے۔

اس نے گلے میں اٹکے دکھ کے پھندے کو مزیدار فیرنی کی مدد سے اندر اتارتے ہوئے سوچا۔

سب پوچھتے ہیں' اس نے آرام سے فیرنی کھاتے ہوئے سوچا' سارے دن کی کلفت کے بعد اس وقت صرف بھوک اس کے حواسوں پر چھائی ہوئی تھی۔ اور وہ فیرنی کے بعد آئس کریم بھی کھانا چاہتی تھی۔ جو بہت بڑے بڑے بادیوں میں کھانے کی میز پر یہاں سے وہاں تک چنی ہوئی تھی لیکن لوگ دیوار بن گئے تھے حالانکہ کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔

ہاں صبر کی کمی تھی ہر ایک بے صبر ہوا جارہا تھا کہ کہیں اس طرح آئس پگھل نہ جائے اور صرف کریم ہی کریم رہ جائے ایک ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے اس نے سوچا۔

یہاں تو ویسی بھوک بھی نہیں جیسی ہمارے ہاں عام گھروں میں ہوتی ہے۔ اچھی طرح رہنے کی بھوک۔ اچھا پہننے کی بھوک اچھا کھانا کھانے کی بھوک۔ مگر۔ مگر اس وقت اس طرح لوٹ کر گرنا کیا معنی۔ یہاں تو انواع و اقسام کی نعمتیں بکھری پڑی تھیں ہر طرف آرام ہی آرام ہے۔ نرم و گرم بستر۔ رنگین لہراتے ہوئے آنچل خوبصورت لباس اور ساتھ ساتھ خوبصورت نظر آنے کی کوشش میں طرح طرح کے انداز۔ اس نے آئس کریم کھانے کا ارادہ ترک کردیا کہ لوگ ہٹ کر نہیں دے رہے تھے۔

بڑا وقت بہت گزر گیا ہے۔ اور اب لوگوں کی سطح کچھ اور ہے۔ یہاں تم کو کون پوچھتا ہے۔ سب پوچھتے ہیں۔ آخر شہاب صاحب' ملک صاحب یہیں کے تو ہیں۔ لیکن شہاب صاحب تو ڈھاکے سے تمہیں جانتے ہیں اور تم ہو کہ۔۔۔

اس کا دل اس کے خلاف جارہا تھا۔ بلکہ سرزنش کررہا تھا کہ تم۔ یعنی کہ تم اب وہ نہیں ہو جس کی پذیرائی کی جائے پذیرائی تو اب بھی سب کرتے ہیں۔ فرق صرف ہمارے سوچنے کا ہے۔ ہم جب ستر میں ڈھاکے سے لاہور آئے تھے تو ہم نے لاہور ایئرپورٹ پر محسوس کیا تھا کہ لاہور کی زمین اونچی ہے اور یہاں پانی کی سطح اتنی بلند نہیں ہے کہ مردے قبروں میں تیرنے لگیں۔۔۔

"ہاں مگر یہاں کبھی کبھی پانی پاتال میں بھی چلا جاتا ہے اور دریا بھی اور جھیلیں بھی سوکھنے لگتی ہیں۔" اس کا دل سب سے بڑا وکیل بنا ہوا تھا اور قدم قدم پر حقائق سے روشناس کرانے کی کوشش کررہا تھا "اونہیں" اس نے پھر دل کو دھتکارا۔۔۔ "لوگوں کی نگاہوں میں بڑا پانی ہے۔ مروت و محبت کا پانی۔ اور لوگوں نے تو ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔" ہاں کیوں نہیں ضرور لیا ہوگا۔ اس زمانے میں تم ڈھاکے سے آئی تھیں اور شاید تمہیں یاد نہ ہو کہ تم اس زمانے میں بہت مختلف تھیں بنگال کا جادو تمہارے سر چڑھ کے بولتا تھا اور اس پس منظر میں تمہاری اردو تمہارا لکھنا یہاں کے لوگوں کے لئے واقعتاً جادو کا اثر رکھتا تھا کہ بنگال میں ایسی اردو۔" یہ کیا بات ہوئی بنگال میں اردو تو پتہ نہیں کب سے تھی عبدالغفور نساخ۔ وحشت کلکتوی۔ اور پھر اپنے اشک صاحب۔ کیا غضب کے اردو داں تھے۔ ہم میں کیا خاص بات تھی اس نے اپنے دل کو سمجھایا۔ بھلا وہ کہاں کی بنگالن تھی کہ بنگال کی جادوگری کرتی۔ "بس یہ میرا دل بھی" اس نے عاجز آکر ادھر ادھر دیکھا۔ اب آس پاس کوئی نہیں تھا۔ لوگ ٹکڑیوں میں بٹے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ ایک ہجوم تھا کہیں چائے چل رہی تھی۔ کہیں کافی کا دور تھا۔ اور کہیں شعر و شاعری کا دور دورہ تھا۔ اور اب وہ ایک بار پھر یکہ و تنہا تھی۔ اب مان جاؤ عمارہ بیگم کہ تم اپنی جڑیں وہاں چھوڑ آئی ہو اور بے جڑ کے پودے امربیل ہوتے ہیں کہ اگر انہیں ختم نہ کیا جائے تو اس درخت ہی کو کھالیتے ہیں جس پر انہیں پناہ ملتی ہے۔ اور اسی لئے اب تم اس دھوم دھام کی توقع نہ رکھو جو تم کو ستر میں ملی تھی کہ اب تو وہ تمہارے ماننے والے پیارے پیارے لوگ بھی پردہ کرگئے۔ ریاض انور' شہاب صاحب' حسن حفیظ الرحمٰن۔۔۔

حسن حفیظ الرحمٰن۔ ہائے کیسے پیارے تھے اور ہاں وہ بھی ایک ادبی کانفرنس تھی۔ مگر وہ رائٹرز گلڈ کا جلسہ تھا۔ گلڈ ہاؤس میں اجلاس

ہورہا تھا وہاں بھی ہر زبان اور کینیڈے کے ادیب موجود تھے وہ خود بنگالی وفد کے ساتھ تھی اور مشرقی پاکستان کے اردو ادیبوں کی نمائندگی کررہی تھی۔ اور ہر زمانے میں تمہارے کام ڈھاکہ ہی آیا۔ اس نے اداسی سے اس شہر گل رخاں کو یاد کیا۔ ڈھاکہ۔۔ ہاں ڈھاکہ۔۔ خیر الکبیر۔ ڈاکٹر سجاد حسین، عتیق اللہ تولو، اللہ، تولو بیگم صوفیہ کمال، شوکت عثمان اور کس کس کو یاد کیجئے اور اب پچھلے دنوں ہاجرہ آپا جب ڈھاکے سے آئی تھیں تو انہوں نے کہا تھا۔

"اب اس ڈھاکے کو بھول جاؤ جو تمہارا تھا۔ وہاں بھی اب سب کچھ ایسا ہی ہے۔ زمانہ ہر جگہ اپنی چال چلتا رہتا ہے اور کبھی لوٹ کر پیچھے کی طرف نہیں جاتا۔ وہاں اب زندگی نمود و نمائش کا دوسرا نام ہے۔ بڑے بڑے بپلوبی (انقلابی) راستے بدل گئے۔ انور زاہد کو ہی لے لو۔ تمہارے بھائی کے تو بڑے دوست تھے۔ اب جب دیکھو حکومت کا دامن پکڑے ہوئے ہیں چاہے جنرل ارشاد ہو چاہے بیگم جنرل ضیاء الرحمٰن۔ اب تم ہی بتاؤ کیا تم ایسا بھی سوچ سکتی تھیں کہ انور زاہد۔" ہاجرہ آپا نے کہا جو ابھی کچھ دن پہلے داستان غم سناتے سناتے اپنی جان ہار گئیں۔ اور اب اس کے لئے اسلام آباد اجڑ گیا تھا۔ اگر وہ زندہ ہوتیں تو اس وقت وہ ان سے ضرور کہتی کہ۔

"ہاں وہ سوچ سکتی ہے کہ سب کچھ بدل جاتا ہے۔ نظریہ ضرورت اور مصلحت کوشی سب پر حاوی ہیں اور۔ اور پھر کیا ہوا نظریے تو بدلتے ہی رہتے ہیں۔"

کیوں نہیں نظریے نہ ہوئے جوتے ہوئے جب جی چاہا اتار پھینکا۔ ہاں بالکل جیسے لیلی کو چھوڑ کے انور زاہد نے ہاجرہ آپا پھر اس کے خیالوں در آئیں۔ "اور اب تم کو پتہ ہے کہ۔۔ اب جبکہ لیلی مرگئیں تو انور زاہد۔۔۔۔ یعنی کہ۔ یہ دیکھو ہاجرہ محمود علی نے ایک میگزین دیا۔ پاک چین چین میتری کمیتی نے لیلی کی موت پر کوئی نمبر نکالا تھا۔ اور جگہ جگہ قمرانہار لیلی کے ساتھ ساتھ انور زاہد کا ذکر تھا۔

اور انور زاہد کے ساتھ اس کا نکاح جیل میں ہوا تھا۔ اس نے جیسے اپنے آپ کو اطلاع دی۔ اور گواہوں میں جیلر بھی شامل ہوگا کیوں۔ کسی نے مذاق اڑایا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ سامنے صوفے پر ادیبوں کا ایک بڑا گروہ بیٹھا اپنے اپنے دوستوں سے مخاطب تھا۔ اس نے غور سے دیکھا خاصے مشہور لوگ تھے ان میں صدیق سالک بھی تھے تو امجد اسلام بھی۔ اور پروین شاکر اپنی غزل سنا رہی تھیں۔ کیسی اچھی شاعرہ ہے اور ماشاء اللہ شہرت بھی اچھی ہے تمہاری طرح نہیں ہے کہ۔۔۔۔ اونہہ۔۔۔ اس نے غور سے بنگلہ زبان کے پتریکا کو دیکھا جو اس نے آج ہی بیگم محمود علی سے لیا تھا کہ پڑھ کر دے دے گی۔ قمرالنہار لیلی اپنے وقت کی بڑی صحافی اور پھر بڑی ایڈوکیٹ۔۔ لطف عالم صاحب کے ساتھ، بیجنگ میں مشہور زمانہ تھمن اسکوائر میں کھڑی تھیں۔ انور زاہد نہیں ہیں اس نے غور سے تصویر کو دیکھا۔ اور ہمارے بھیا بھی۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ کیا۔ یہ سب ماضی کی داستانیں ہیں بھائی تمہارے روزی روٹی کے پھیرے میں ہیں اور تم یہاں۔ اسلام آباد ہوٹل میں۔۔۔ ماضی حال مستقبل کے چکر میں چرخے کی طرح گھوم رہی ہو۔۔۔۔

بے شک یہ اسلام آباد ہوٹل ہے۔ ادیبوں کا جم غفیر۔۔۔ ناموں کے بلے سینوں پر لگائے جانے انجانے لوگ۔ سامنے مجتبیٰ حسین کھڑے تھے۔۔ کوئٹے میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہاں یہ موتیا چودھری کے حوالے سے گفتگو کررہے تھے۔

اچھا تو یہ روس بادی ہیں (اور اب روس تو تھا لیکن وہ لین ڈوری ٹوٹ چکی جس کو سوویت یونین کہتے تھے) اس نے تب سوچا تھا۔ ہمارا لیڈر تو تو راشد خان مینن تھا۔ ایوب خان کے وائس پر۔سیڈنٹ عبدالجبار خان کا بیٹا۔ چین نواز طالب علم لیڈر۔۔۔۔۔

خوب تھی ہماری یونیورسٹی بھی۔۔ حال کے انداز نے اسے سرتاسر ماضی کی آغوش میں پھینک دیا تھا اور وہ بڑے آرام سے اپنے گوشہ عافیت میں بیٹھی ماضی کے جھولے میں بیٹھی جھول رہی تھی۔ وہ جھولا جو ۱۹۵۶ء میں اس نے ڈالا تھا اور ۱۹۷۱ء تک جس کی ڈور اس نے پکڑ رکھی تھی اور جس کی داستان ہی اس کا سرمایہ حیات تھی کہ جب موقع ملا اپنی جنت گم گشتہ کی یاد میں شترمرغ کی طرح سر گاڑ دیا پھر دنیا جنت میں جائے یا۔۔۔۔۔

سچی بات تو یہ تھی کہ خوب کردار تھا ڈھاکہ یونیورسٹی کا۔ طلبہ کی زندگی اور اس کے راستے کا تعین بھی ہوتا اور خیالات کی پختگی بھی

وہیں حاصل ہوتی۔ ملکی سیاست میں کون سی پارٹی مضبوط جارہی ہے اس کا اندازہ وہ اپنی یونیورسٹی سے لگاتی تھی کہ ہوا سائیبریا کی برف میں جھلی ہوئی چل رہی ہے یا شنگھائی کا ریشمی سایہ سرسرا رہا ہے۔ لیکن لوگ بھی خوب ہیں کیسے کیسے اور کس کس حوالے سے یاد رکھتے ہیں۔موتیا چودھری ہمارے لئے قصہ پارینہ بن چکی تھی اور ڈاکٹر مجتبٰی حسین اسی کو یاد کررہے تھے کہ انھیں اپنے نقطہ نظر کے مطابق سارا انقلاب نظر آرہا تھا۔ اور ہماری نظروں میں وہ ساری کی ساری پھر جاتی ہے۔ اس نے ماضی کو یاد کرنا شروع کیا۔۔۔

شانتی نگر میں ٹسٹر کا گھر ہے۔ سلطان بھائی چہک رہے ہیں (ایک اور انقلابی) بھائی کے دوست ہیں۔ اور موتیا چودھری کی شادی کا کھانا انھوں نے کیا تھا اور وہ سب وہاں گئے ہوئے تھے اور موتیا چودھری نئی بیاہی دلہن، ہنسا کی سفید ساڑھی باندھے سولہ سنگھار سے مبرا اپنے جرنلسٹ میاں کا انتظار کررہی تھی۔ وہ خود ابھی ایک سیاسی جلسے سے لوٹی تھی چہرہ اب تک گرد آلود تھا۔ خفیہ پولیس اس کا پیچھا کررہی تھی۔ اور وہ رکشہ سے اتر کر گلی در گلی ہوتی ہوئی یہاں پہنچ گئی تھی۔ اور اس کا باپ ایوب خاں کی سرکار میں پولیس کا ایک لائق فائق افسر سمجھا جاتا تھا۔ اور راشد خان مینن اس کا مخالف لیڈر عبدالجبار خان کا بیٹا ایوب خان کا دست راست۔ اور بیٹا بھاشانی گروپ میں۔۔ عجیب سر پھری تھی ہماری (generation) نسل بھی۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا او وہ زور سے ہنسی۔

"خیر تو ہے بہت خوش نظر آرہی ہو۔" زیتون بانو پاس سے گزریں۔

وہ چونک پڑی۔ ماضی کی یخ بستہ ہوا اس کے جسم کو کپکپا گئی۔ اس کے پھیلے ہونٹ سکڑ گئے اور وہ اپنے حال میں واپس آگئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا رات کا خاصہ حصہ گزر چکا تھا۔ لیکن ہوٹل میں وہی گہما گہمی تھی سب ہی آپس میں مشغول تھے سارے چہرے ہی جانے پہچانے لگ رہے تھے لیکن اسے کوئی پہچان نہیں پارہا تھا۔ ہاں بھلا اتنے بڑے مجمعے میں کون کس کو پہچانے۔ چلو ہم اپنے نام کا بلّا لگا لیتے ہیں۔ اس نے اپنے تھیلے میں سے شٹول کے وہ بیج نکالا جو کانفرنس کے شروع میں کسی نے تھمادیا تھا اور اپنے نام کی نمائش کے باوجود اگر کسی نے نہیں پہچانا تو۔۔۔ یہ اندیشہ بچھو کی طرح ڈنک مارتا ہے اس کا چہرہ مٹی ہوجاتا ہے۔ نام کا بلّا واپس رکھ کر خاموشی سے بیگ کا زپ بند کرلیتی ہے۔

"یہ جگہ بڑی اجنبی ہے" اس نے کڑھ کر سوچا

خواہ مخواہ ہی ہم آئے۔۔ کوئی بھی ہمیں نہیں پہچانتا۔ اور جو پہچانتا ہے وہ قابل اعتنا نہیں سمجھتا۔ اور اب گھنٹوں اس ہجوم میں تنہائی کا دکھ اٹھائے ایک ایک کا منہ تکنے کا فائدہ۔ چلو کمرے میں جاکر سوجاتے ہیں۔ اس نے ساڑی کا آنچل ٹھیک کیا لمبے بالوں کو سمیٹ کر پشت پر ڈالا اور قدم آگے بڑھائے۔ ایک شگفتہ چہرہ روبُرو تھا۔ ارے یہ تو محسن احسان ہیں۔۔۔۔ یہ تو۔۔۔۔ یہ تو شاید بھیا کے اچھے ملنے والوں میں ہیں۔ ان کی سرابندی کا کارڈ ڈھاکے میں۔۔۔۔۔ پھر وہی ڈھاکہ۔۔ وہی ماضی کے قصے۔ مٹی ڈالو۔ چلو ان سے باتیں کرتے ہیں۔

"آپ محسن احسان ہیں۔"

"ہاں بالکل آپ کیسی ہیں۔" انھوں مسکراکر خیریت پوچھی، لیکن آنکھوں میں اجنبیت کی الجھن بھی، "ہیں ہم۔ ہمارا نام اُم عمارہ ہے۔"

"ارے ہاں۔ خوب ملیں۔۔ صلاح الدین کیسے ہیں کہاں رہتے ہیں۔ کبھی ملتے ہی نہیں۔"

"جی وہ فی الحال کراچی میں ہیں۔"

"مگر میں نے تو سنا تھا وہ لاہور میں ہیں۔"

"بچے تو لاہور ہی میں ہیں۔"

"ارے ان سے کہیں ناکہ کبھی ہم سے بھی۔"

"جی بہتر" وہ سلام کرکے سیڑھیوں کی طرف مڑ گئی۔ دو چار مکالمے سے اس کے دل کا بوجھ جیسے ہلکا ہو گیا۔ جیسے وہ دریا کی موج تھی اور دریا میں مل کر زندگی حاصل کرلی ہو۔

اور اب اس وقت اس پر ایک گھبراہٹ سی طاری تھی۔ کانفرنس ختم ہو گئی تھی۔ ہر ایک منہ اٹھائے ادھر سے ادھر جا رہا تھا۔ کوئی لاہور کا مسافر کوئی کراچی کا۔ کچھ لوگ پنڈی جا رہے تھے۔ اور وہ بہت پریشان تھی کہ اتنے ڈھیر سارے دنوں کے بعد بھی اسلام آباد اور پنڈی کے راستے اس کے لئے مسئلہ بنے ہوئے تھے۔ اپنا بیگ اٹھائے بے نیازی سے لوگوں کو پھاٹک سے نکلتے گاڑی میں بیٹھتے اور ہوا ہوتے دیکھتی رہی--- لیکن کسی نے اسے گھاس نہیں ڈالی۔ کسی نے لفٹ نہیں دی۔ چلو ان سے لفٹ مانگتے ہیں۔

ایک جانے پہچانے افسانہ نگار گاڑی کی چابی تھامے کھڑے تھے۔

"آپ کی گاڑی میں ایک آدمی کی جگہ ہوگی۔ آپ پنڈی ہی جا رہے ہیں نا۔ آپ ہمیں ملک صاحب کے ہاں اتار دیجئے گا۔"

"ہاں جگہ خیر وہ تو ہو جائے گی۔ لیکن اتفاق سے یہ گاڑی میری نہیں ہے۔ میں پوچھتا ہوں۔"

افسانہ نگار صاحب نے شگفتگی سے کہا۔

ایک سرکاری مرسیڈیز پورچ میں آکر کھڑی ہوگئی۔ مہندی سے رنگے ہوئے سرخ بال چمکے۔

"یہ ہمارے ساتھ جانا چاہتی ہیں۔ انھیں ملک صاحب کے ہاں جانا ہے ہم بھی تو اسی طرف ———"

"اوں نہیں بھئی مشکل ہو گی ہم کہاں ڈھوتے پھریں گے۔"

اس کے کان میں کسی نے سیسہ پلایا۔

وہ اپنا تھیلا اٹھائے ساڑھی باندھے بڑے پھاٹک کے سامنے کھڑی ہر آنے جانے والے کو منہ اٹھائے دیکھتی جاتی ہے کہ شاید کوئی مروت کی نظر اس کی طرف بھی اٹھ جائے لیکن--- وہاں تو ہڑبونگ سی تھی۔ مندوبین ایک ایک کرکے نکل رہے تھے باتیں کرتے ہوئے ملتے رہنے کے وعدے وعید بھی ہو رہے تھے۔ لیکن ہر شخص بڑی جلدی میں تھا۔ اسے بھی بہت جلدی تھی۔ اسے ہر حال میں آج ہی کی تاریخ میں ایبٹ آباد پہنچنا تھا۔

"دھوپ ڈھلتی جا رہی ہے۔ اور سورج ڈوبتے ہی ایبٹ آباد کے لئے کوئی گاڑی نہیں ملے گی۔ یہاں سے راولپنڈی کیسے پہنچا جائے۔ وہ سوچتے سوچتے دو قدم آگے بڑھتی ہے۔

محسن احسان سامنے ایک گاڑی میں بیٹھ رہے ہیں۔ یہ ضرور پشاور جا رہے ہیں ہمیں پنڈی صدر میں ایبٹ آباد والے اڈے پر ضرور چھوڑ دیں گے۔ وہ گاڑی کے قریب جاتی ہے۔ محسن احسان گاڑی کا دروازہ بند کرکے بڑے اخلاق محبت سے ہاتھ ہلاتے ہیں اور گاڑی ہوا ہو جاتی ہے---" ان کے ساتھ وہ ضرور جا سکتی تھی۔ لیکن اس نے عرضِ مدعا میں دیر کردی"۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آیا——"کمال ہے-- یہ کیسا مسئلہ ہے جو اس نے کھڑا کیا ہے-- حد ہو گئی اس عمر میں انگلی تھامنے کی تمنا !———"

ادھر ادھر دیکھا۔ سارے لوگ ہنستے گاتے آ جا رہے ہیں--- اس کے دل کو کچھ ہو رہا تھا۔ اسے ۱۹۷۰ء بہت ہی یاد آ رہا تھا۔ سانولا سا گول مٹول چہرہ پان کی سیاہی دانت کے ریخوں میں اور چمکتے ہوئے دانت۔

"ہم آپ کے ساتھ پنڈی جائیں گے" اس کی اپنی آواز گونجی۔

"ہاں بالکل جائیں گے ہم نے ٹکٹ بھی منگوالیا ہے۔"

"اچھا !———" وہ خوشی سے چہکی تھی۔

ڈھاکہ ایئرپورٹ پر بھائی نے ان سے کہا تھا——"پہلی بار مغربی پاکستان جا رہی ہے خیال رکھنا۔"

ہاں ضرور ———" حسن حفیظ الرحمن کا سانولا خوبصورت چہرہ نظر کے سامنے تھا۔ کیسے اچھے تھے' یہ لوگ' کتنے اور کیسے چھوٹ گئے

اور اب تو یہ دنیا بھی چھوڑ گئے ---- آنسو دل میں قطرہ قطرہ ٹپک رہا ہے۔

ڈھاکہ ---- وہ شہر نگاراں ---- ڈھاکے کو وہ ایسے یاد کرے گی۔ ۱۹۷۲ء کی جنوری' فروری میں اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ شہر اس کے لئے شہر نا پرساں بن چکا تھا ---- مگر ۱۹۷۰ء میں حسن حفیظ الرحمٰن ---- انھوں نے اس کا کیسا خیال رکھا تھا۔ جیسے وہ ایک لکچرر اور افسانہ نگار نہیں بلکہ کوئی Teenager تھی جسے قدم قدم پر رہنمائی چاہئے تھی ---- " ویسے بھی وہ تھی بھی عقل کی پٹ پٹ کہ جا کر ٹھہرگئی فین روڈ پر اور اب بے چارے حسن حفیظ الرحمٰن ہیں صبح فون کر رہے ہیں شام فون کر رہے ہیں۔ اجلاس میں خیریت دریافت ہو رہی ہے شاید انھیں یاد رہتا تھا کہ وہ پہلی بار مشرقی پاکستان سے نکلی تھی ---- اور اب تو کچھ نہیں تھا۔ نہ مشرقی پاکستان اور نہ حسن حفیظ الرحمٰن ---- حالانکہ ابھی کچھ ہی سال پہلے وہ لاہور آئے تھے۔ اداس اداس سے ---- بھیگا ہوا لب و لہجہ ---- دھاکو تھے ---- وہ تو اس وقت بھی اس کے دھاکو تھے۔ ہاتھ کا چھالہ بنا کے راستے میں رکھا اور پھر پنڈی میں اسے فتح محمد ملک کو اس طرح Hand over کیا جیسے وہ جیتی جاگتی انسان سے زیادہ کانچ کی گڑیا تھی۔ انھوں نے بچ بچ اسے ہاتھ سے پکڑ کر ملک صاحب کے حوالے کیا تھا ---- اور سکھ کا سانس لے کر بنگلہ میں بولے تھے کہ "خدا کا شکر ہے وہ صلاح الدین کے آگے سرخرو ہوئے" کیسے ولدار لوگ تھے یہ اور مارے اہمیت کے اس کا برا حال ہو رہا تھا ---- جمیل ملک' احمد ظفر' ملک صاحب (خدا ان کو خوش رکھے ہمیشہ یکساں رہے) چائے' کھانا' ملنا ملانا ایک جم غفیر اور یہ معین صدیقی اس کے ڈھاکہ یونیورسٹی کے ہم جماعت ہر طرف محبتوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔

"اچھا تو یہ بی بی ڈھاکے سے آئی ہیں" پیچ در پیچ گلیوں والے مکان میں ایک مشفق خاتون ملیں۔ چہرہ چومنا شروع کیا تو چومتی ہی چلی گئیں۔

"یہ ہماری امی ہیں ----" جمیل ملک نے تعارف کرایا۔

"ہاں مائیں ہر جگہ کی ایسی ہی ہوتی ہیں ----" اس نے مسکرا کے جمیل صاحب کی امی کے گال چومے۔ "انھیں دیکھ کر مجھے اپنی سہیلی تیسیہ کی امی یاد آگئیں وہ بھی ایسی ہی ہیں۔" وہ ان کی کمر میں ہاتھ ڈالے ڈالے کمرے میں آگئی۔

"اچھا تو آپ اردو بول لیتی ہیں" ایک صاحب نے پوچھا یہ جمیل ملک کے بڑے بھائی تھے۔"

"ہماری مادری زبان اردو ہے" اس کے لہجے میں تفاخر تھا۔ انھوں نے حیرت سے اسے دیکھا "بھلا گھر میں کون سے زبان بولتی ہیں۔"

"جی گھر میں تو اردو ہی بولی جاتی ہے لیکن گھر سے باہر ہم صرف بنگلہ ہی بولتے ہیں کہ یہ ہمارے علاقے کی زبان ہے اور ہم مگر ----"

"کیا ہم بی بی ----"

"بھی ہم بہاری ہیں۔ بنگالی نہیں۔ لیکن بنگلہ زبان بھی ہماری پہچان ہے۔"

"ہاں ٹھیک بلکہ بالکل ٹھیک۔ بنگالی بہاری ایک ہی بات ہے آخر آپ مشرقی پاکستان سے آئی ہیں اور آپ کو بنگالی ہی کہا جائے گا ----"

"بہت خوب" وہ چہکی "مگر بنگالی تو ہمیں آبنگالی (غیر بنگالی) کہتے ہیں" وہ اداس ہو گئی تھی۔

کاش ---- اے کاش ----

اور اب ---- اب وہ خزاں کی اس بھیگی شام میں اسلام آباد ہوٹل کے پھاٹک پر کھڑی سوچ رہی تھی کہ کاش بنگالی بہاری ایک ہی بات ہوتی۔ اور آج وہ اس لمحے حسن حفیظ الرحمٰن کو اس طرح ٹوٹ کر تو نہ یاد کرتی کہ وہ بچ مچ اس کی پہنچ میں ہوتے اور یہاں اسے وی آئی پی Treatment ملتا لیکن افسوس ---- آج اس شہر میں کتنا سناٹا ہے وہ اوپر ہی اوپر تیر رہی ہے۔ اس کی جڑیں کہاں ہیں کہیں سے کوئی انکھوا پھوٹتا کیوں نہیں نظر آتا۔ یہ سارے چہرے کیوں اجنبی لگ رہے ہیں اور اس ریلے میلے میں دھکے کھاتے ہوئے کیوں

اس کا دل اداس ہو رہا ہے اور وہ خود اسے کیا ہو رہا ہے---- وہ جس نے کبھی کسی سے ہار نہیں مانی کس لئے قنوطیت کا شکار ہے۔ "چلو چلتے ہیں ام عمارہ سفر شرط ہے۔" وہ اپنا تھیلا اٹھاکر باہر نکلتی ہے اسے دیکھتے ہی ایک ٹیکسی رکتی ہے---- وہ دروازہ کھول کر بیٹھنے کے لئے قدم بڑھاتی ہے۔

"آپ بی بی اس سامنے کھڑی ویگن پر بیٹھ جایئے یہ بھی پنڈی جائے گی۔" ہوٹل کے ایک بیرے نے اس کی رہنمائی کی "یہ ٹیکسی والے تو کھال اتار لیتے ہیں۔"

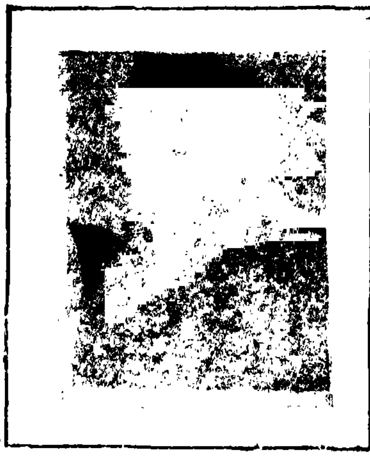
اس نے شکر گزار نگاہوں سے صاف ستھری وردی والے بیرے کو دیکھا۔

"ہمیں دار صل روٹ کا ٹھیک پتہ نہیں ہے کہ کون سی ویگن کہاں---- ورنہ ہم تو ہیں ہی اکیلے"

"بہت بہت شکریہ----" اس نے فرشتہ رحمت کو دیکھا---- اسے محسوس ہوا جیسے اس کے پاؤں زمین پر جم گئے ہیں اور وہ فضاؤں میں تیر نہیں رہی ہے بلکہ اس کی جڑیں آہستہ آہستہ زمین میں پھیل رہی ہیں اور عنقریب اکھوئے بھی پھوٹ پڑیں گے۔ اس نے غور سے شہزادے جیسے بیرے کو دیکھا "یہی ہماری جڑیں ہیں جو ہماری طرح زمین پر کھڑے ہیں--- اور ہم خواہ مخواہ ہی بھکاریوں کے ساتھ بھکاری بن گئے" اس نے مسکرا کے ہاتھ ہلایا اور ویگن میں سوار ہوگئی کہ اسے سورج ڈوبنے سے پہلے ایبٹ آباد کے لئے ویگن پکڑنا تھی۔

بلراج ورما

کابوس



جنوری ۱۹۴۰ء اماوس کی رات' گہرا خاموش اندھیرا۔

نیند انسان اور کائنات کی ہر چیز پر طاری ہوتی جارہی ہے۔ لمبی چوڑی سڑکوں اور گلیوں میں میونسپلٹی کی روشنیاں تک اونگھتی سی دکھائی دیتی ہیں۔ جنوری کے کہر نے انھیں کچھ ایسے دھندلا رکھا ہے گویا وہ بجلی کے قمقمے نہ ہوں مٹی کے بے سہارا دیئے ہوں یا ہوا میں لرزتی کانپتی نحیف و لاغر موم بتیاں۔

فضا میں ان روشنیوں کے ٹمٹماتے جگنوؤں اور بمبئی کی بڑی بڑی فلک شگاف عمارتوں کے علاوہ جو اس آدھی اندھیری رات میں بھی خاصی آب و تاب سے جگمگا رہی ہیں' زندگی کا کہیں کوئی نشان نہیں۔

جنوری کی یہ خنکی' آدھی رات' سناٹا اور دور سمندر کی مدہوش لہروں کی دھیمی دھیمی لوریوں ایسی آواز۔

نیند عمارتوں کے اندر بھی ہے اور باہر بھی۔ اس قبرستان ایسے بے آواز ماحول میں کہیں کوئی شور یا ہلچل ہے تو نیند کے خراٹوں میں' ان پر تکلف عمارتوں کے گورکھے اور پٹھان رکھوالوں اور گشتی پولیس کے سپاہیوں کو بھی نیند نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

شانتی سوچ رہا ہے' خدا کا شکر ہے کہ بمبئی میں جنوری کے موسم میں بھی کوئی ایسی سردی نہیں ہوتی ورنہ غضب ہو جاتا۔

"تم ان سپاہیوں کے بارے میں سوچ رہے ہو۔"

"سپاہی نہیں فوجی' اپنے سپاہی تو پڑے اونگھ رہے ہیں۔ میں ان گورے فوجیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو دنیا میں جمہوریت کے تحفظ کے لیے آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پہلا حق انھیں کا تھا۔ مہمان پرستی تو یوں بھی ہمارا روایتی شعار رہا ہے۔"

کیا منظر تھا وہ بھی۔

جنگلے کے پیچھے چھ بیڈ --- جیسے اکثر ہسپتالوں میں دیکھے جاتے ہیں' اور ان پر چھ جوان ہندوستانی عورتیں۔ اور ان کی خوش مزاج منیجر--- نرس جیسے کپڑے پہنے ہوئے--- ہاتھ میں سرخ پانی بھری سرنج .....وہ ہر گاہک سے مسکرا کر تپاک سے بولتی۔ لوگ بدتمیزی کرتے تو بھی برا نہیں مانتی۔

"گاہک ہمیشہ دوست ہوتا ہے۔"

جنگلے کے باہر درجن دو درجن کے قریب خریدار لائن بنائے کھڑے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہیں۔ جنگ کی باتیں۔ ہٹلر کی

باتیں- تقدیر و تدبیر کی باتیں-
ایک پادری قسم کا سپاہی دوسرے کو سمجھا رہا ہے-
"اس کا کیا ثبوت!"
"اس کا ثبوت ہمارا مسیحا ہے یسوع مسیح- عیسیٰ- خدا کا چہیتا بیٹا-"
"میں عیسیٰ کا بیٹا ہوں-"
"ہم سب عیسیٰ کی بھیڑیں ہیں-"
"عیسیٰ بنی نوع کو گناہوں سے بچانے کے لیے آیا تھا-"
"ہٹلر بھی تو عیسیٰ ہی کی بھیڑ ہے-"
بھیڑ نہیں بھیڑیا-"
"وہ بھی تو دنیا کو سود خور یہودیوں سے بچانے کے لیے آیا ہے-"
"سود لینا یا دینا اسلام میں منع ہے-"
"ہم مسلمانوں کا بھی دعویٰ ہے کہ آدمی خدا کی ساری تخلیقات میں افضل ہے اشرف المخلوقات"
"یہ نرنارائن دھیہ چوراسی کی سب سے افضل اور آخری منزل ہے"- پنڈت جی نے سمجھایا- "آدمی اس سے بچ کر نکل گیا تو سمجھ لو مکتی پا گیا-"
"ڈیم اٹ' اٹ ازمائی ٹرن-"
لائن میں پیچھے کھڑے سردار جی کو آگے بڑھتے دیکھ کر لائن میں آگے کھڑے آسٹریلین گورے نے اسے کالر سے پکڑ کر پیچھے دھکیل دیا-
"میں کوئی لائن تھوڑے ہی توڑ رہا تھا پہلوان- میں تو دیکھ رہا تھا کہ بیڈ نمبر پانچ کا وہ دبلا سکڑا مردود جانے کیا کھا کر آیا ہے جو ابھی تک ———"
ساری لائن قہقہوں سے گونج اٹھی-
گورا سپاہی بھی مسکرا دیا-
"سالا ہندوستانی- یہاں بھی کرتب دکھانے سے باز نہیں آتا-"
دوسرا گورا بولا "یوں بھی تو ہو سکتا ہے کہ سالے کے اندر کچھ ہو ہی نا-"
"ایسا ہوتا تو وہ عورت مستی میں نہ پڑی رہتی-"
تیسرا بولا- "لو وہ آگیا-"
پنڈت جی نے کہا- "جو آتا ہے جاتا بھی ہے- ہر چیز پیدا ہوتی ہے بڑھتی پھیلتی اور پروان چڑھتی ہے اور—— بالآخر مٹی ہو جاتی ہے-"
چھ باہر نکلے اور چھ اندر گھسے- اب ان کا معائنہ ہو رہا تھا- پہلی عورتیں اندر چلی گئی تھیں اور ان کی جگہ چھ تازہ دم نئی آگئی تھیں- حیرت تھی کہ باہر کھڑے لوگ تو ان کو ایک ٹک گھورے جا رہے تھے مگر ان میں سے کوئی بھی کسی کی طرف نہ دیکھ رہی تھی- وہی کیفیت جو تھیٹر کے اداکاروں اور سامعین کے مابین ہوتی ہے-
ان ٹچڈ- پانی میں کنول کی طرح-

کیچڑ میں کنول کی طرح

"یہ پاپ اور پنیہ سے ماورا ہیں۔" پنڈت جی سمجھا رہے تھے۔ "جب کوئی عورت دو وقت کی روٹی کے لیے یا اپنے نوزائیدہ بچے کے دودھ کے لیے جسم بیچتی ہے تو اسے فاحشہ نہیں کہتے۔ دھندا' دھندا ہے۔ البتہ جب کوئی عورت سوکھی روٹی کی بجائے پراٹھے کے لیے جسم کا بیوپار کرتی ہے تو وہ حقیقتاً فاحشہ ہے۔ بیسوا۔ رنڈی۔"

"ان عورتوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟۔"

"یہ غلام ہیں۔ بکی ہوئی' خریدی ہوئی' جنس' انھیں کسی برے یا بھلے شبد سے نہیں بہلایا جاسکتا۔"

پادری نما گورے نے کہا۔ "مگر خود پسند آدمی' جو خود اپنے ہی کو نہیں پہچانتا' اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا' صدیوں سے اپنے ہی بارے میں بکے جارہا ہے۔ ہزاروں لاکھوں کتابیں لکھ ڈالی ہیں اس نے' مگر اس کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی شاید۔ کبھی ختم ہوگی بھی نہیں——"

"یہی زندگی کا راز ہے۔"

"لو آگے بڑھو۔ اب تمھاری باری ہے۔"

مگر اس نے باری نہ لی تھی' بنگلے تک پہنچتے ہی لوٹ آیا تھا۔

باہر سڑک تھی' سناٹا تھا' نیند تھی۔

اندر کتنی ہمک تھی۔

مگر' نیند نہیں تھی۔

اسے میجر بمبا کی وہ تک بندی یاد آرہی تھی۔

باغ میں بولتی تھیں وہ بلبلیاں۔

دو تھیں' یا تین!

چار بھی ہوسکتی تھیں

پانچ بھی

وقت تھا شام کا

آرام کا

اور کام کا

کام——

"کام کہاں سوتا ہے۔"

"آدمی بیکار ہوتا ہے' نیند تبھی آتی ہے۔ کام میں نیند کہاں۔ اس بڑے صنعتی شہر کا سب سے بڑا اور اہم طبقہ ہم غریب مزدور لوگ ہیں' نیتا نے کہا تھا۔ تم جتنا ہو' تم ہندوستان کے ضمیر ہو۔ ٹھیک ہی تو کہا تھا نیتا جی نے۔"

"ہم معمار ہیں' یہ محل' یہ فلک بوس عمارتیں' یہ سڑکیں یہ فٹ پاتھ' بجلی کے قمقمے کس نے لگائے بنائے ہیں۔"

"ہم نے" سب نے بلند آواز نعرہ لگایا تھا۔

"یہ سب ہمارا ہے۔" دوسرا نعرہ۔

"یہ شہر ہمارا ہے۔" تیسرا نعرہ۔

"سارے جہاں سے اچھا......"
"یہ عمارت البتہ سیٹھ گھنشیام داس جی کی ہے۔"
"اور یہ گلی بھی سیٹھ گھنشیام داس اسٹریٹ کہلاتی ہے۔"
سیٹھ گھنشیام داس کون سا خاندانی رئیس ہے۔ بمبئی میں ایک لوٹا لے کر آیا تھا۔ اپنی محنت اور مشقت سے اتنا بڑا آدمی بن گیا۔"
یہ بمبئی ہے پیارے بمبئی۔ ہندوستان کا سب سے بڑا شہر۔ یہاں آدمی کی قسمت ایک پان کے پتے کے نیچے دبی رہتی ہے۔ پتہ اڑا اور قسمت جاگی۔ چھوٹے قصبوں میں تو قسمت ایک بڑی وزنی سل کے نیچے ہمیشہ ہی دبی رہتی ہے' سب قسمت کا کھیل ہے۔"
"پان کے پتے کی بات تم نے خوب کہی۔"
"اور لوٹے والی بھی۔"
"لوٹا اور لنگوٹ ہماری تہذیب کے واحد نشان ہیں جان من"
"تقدیر والی بات ٹھیک ہے مگر تدبیر ہو تبھی تقدیر بنتی ہے"
"غلط' تقدیر ہو تبھی تدبیر بنتی ہے۔"
"جب تک تقدیر نہیں بنتی ایسے ہی چپ چاپ پڑے رہو اور انتظار کرو۔ اپنی بنائی ہوئی ان بڑی بڑی عمارتوں کی دیواروں سے سٹ کر لیٹ جاؤ اور بن پڑے تو سو بھی جاؤ۔"
فٹ پاتھوں پر بکھری ہوئی مردہ لاشیں بھی خواب دیکھتی ہیں۔ کون جانے کب کوئی خواب وہ خبر دے جائے جس کا انھیں انتظار ہے۔
خواب عمارت کے اندر والوں کا ہی نہیں ہمارا بھی حق ہے۔
یہ حق تمہارا ہی ہے پیارے۔ ان بیچاروں کے پاس خوابوں کے لیے وقت ہی کہاں ہے۔
اتحادی زندہ باد۔
ہٹلر مردہ باد۔
اتحادی جیتے اور ہندوستان آزاد ہوا۔ سر سکندر حیات خان کا اعلان' پھر کیا۔ پھر آزادی۔ سب اپنا۔ یہ زمین' یہ آسمان' یہ محل' یہ کشادہ خوبصورت سڑکیں۔
بات زمین' آسمان اور فٹ پاتھ تک ہی محدود رہنے دو میرے عزیز----
کہرے کی چادر میں ڈھکا ہوا یہ چتکبرا' داغدار شہر کبھی کبھی کتنا اچھا' کتنا سہانا دکھائی دیتا ہے۔
اس کے یہ رنگ مخالف قوتیں ہیں۔ حیات کے منتشر اجزا جو ایک دوسرے پر حاوی ہو جانے کے لیے بے قرار ہیں۔ عارضی طور پر ہی سہی وہ آج ان سب رنگوں کو باہم ملائے گا' جوڑے گا' ایسے کہ وہ ست رنگی کمان بن جائیں۔ اندر دھنش' کام دیو کی کمان جس کے سارے تیر وہ اپنے سینے پر جھیلے گا۔
جینے کی تمنا---- بلرام جی کا ہل۔
ہل چلانا سازش نہیں۔ زمین کو جوتنے کے لیے ہی ہل چلایا جاتا ہے' ہل چیرتا پھاڑتا ہے مگر ناکارہ بنجر زمین سے خس و خاشاک نکال کر دور پھینکنے کا دوسرا کوئی طریقہ بھی تو نہیں۔
ایکا ایک اس کے ذہن میں نیا نقشہ' ایک نیا خاکہ ابھرنے لگا۔
باغ عدن سے مشابہ ایک باغیچہ جو بہاروں میں پھول اور خزاؤں میں پھل دیتا ہے۔
زمین کو ایک بار پوری محنت اور مشقت سے ہل چلا کر نرم کر لو۔ پھر چھوڑ دو سال بھر کے لیے۔ نرمی میں دودھ ممتا ہے۔

سفید سیال مادہ۔ میٹھے پانی کا ابھرتا اچھلتا دھارا۔ دریا کے دھارے کی طرح تیز مگر دبے پاؤں۔ خاموش، دریا کی سطح کی طرح۔
ابھی ابھی وہ اتنا خوش تھا اب پھر کیوں ٹوٹنے پھوٹنے لگا ہے۔
زندگی کے سارے دھاگے پھر سے الجھنے لگے ہیں۔ سب کچھ پھر سے بکھرنے لگا ہے۔
وہ ان دھاگوں کو پھر سے ملائے گا جوڑے گا، باہم بٹھائے گا تاکہ یہ ایک دوسرے سے پھر وابستہ ہوجائیں ہم رنگ اور ہم آہنگ ہوجائیں۔ اور زندگی کا ننگاپن ڈھک جائے۔ اپنے جامہ حیات کو وہ اب مزید پھٹنے نہ دے گا۔ تانے بانے ملانے کی ترکیب آجائے تہذیب خود بخود آجائے گی۔
وہ اپنے ان نئے تاثرات کو تہہ کرکے لپیٹ کر، جوڑ کر یکجا کرنے لگا۔
بغیر دکھ اٹھائے سکھ نہیں ملتا، سکھ کی قیمت دکھ ہے۔
کتا بھی کسی گندی جگہ پر بیٹھنا پسند نہیں کرتا تاوقتیکہ وہ اس جگہ کو دم سے صاف نہ کرے۔
زندگی کتنی سوہنی، کتنی دلدار کتنی خوش طبع صاف اور شفاف ہے۔
یہ زیر لب گنگناہٹ بھی کیسی بھلی لگتی ہے۔ بہتے پانی پر ناز و ادا سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی ناؤ۔
---منظر---
بڑے کوٹ کے کالر اٹھائے اور ہونٹوں میں ایک بڑا امریکی سگار دبائے دھیرے دھیرے چلے جارہے تھے۔ اپنے ساتھی کے پیچھے پیچھے وہ بھی چپ چاپ سر جھکائے چلا جارہا تھا۔
بمبئی میں ٹریفک کنٹرول کتنا اچھا ہے۔
ایک سڑک آنے والی گاڑیوں کے لیے۔ ایک جانے والی گاڑیوں کے لیے۔ آر پار اور بیچوں بیچ فٹ پاتھ۔ کھلے کشادہ فٹ پاتھ۔ رات کو آرام کرنے اور سونے کے لیے کتنی کھلی ہوا دار جگہ دستیاب ہے۔ گوری تہذیب کی برکتیں۔
کہیں کوئی معصوم بچہ ماں کی چھاتیوں پر اپنا ننھا منا ابودھ چہرہ رکھے سو رہا ہے۔ کہیں کوئی قریب المرگ بوڑھا اپنی بیمار تھکی ہوئی ہڈیاں سمیٹے گٹھری بنا اونگھ رہا ہے۔
جوان تو کبھی بھی کہیں بھی سو سکتا ہے۔
مرد عورتیں اور بچے، زندگی سے بے خبر بھی باخبر بھی مگر موت سے یقینی بے نیاز---
دونوں سڑکوں کے بیچوں بیچ لمبے لمبے ٹاپو پر بجلی کے قمقموں کی دھیمی تھکی مدہوش روشنی ایک چھیلا نقل نگار کی بانکی البیلی نفاست سے انجانے اشاروں میں بے آواز پینٹو مائم دکھا رہی ہے۔
موت اور زندگی ایک دوسرے کے اتنے قریب
مگر زندگی بہر حال زندہ تھی۔
شانتی نے ڈاکٹر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "وہ دیکھو"
"کام واسنا کبھی نہیں مرتے۔"
عورت کا پیار چیتن مایا ہے، جو اپنی ظاہری مٹھاس سے آدمی کو چھیلتی ہے، جسم ایک چھوٹی سی میلی کچیلی چادر میں اپنے آپ کو ڈھکنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ ان کی ٹانگیں ننگی تھیں۔
ایک کالی
دوسری سانولی

ایک پر بال تھے۔

اسے دھکا سا لگا۔ عاجز نگاہوں سے اس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہا ہو۔ آج بس اتنا ہی کافی ہے۔ چلو لوٹ چلیں۔

ڈاکٹر جو فلسفی تھا اور سب کچھ جانتا تھا مسکرا دیا۔ بے دل' حزیں مسکراہٹ جس کا منبع دل نہیں تھا' فلسفی کا ذہن تھا۔ منی پلانٹ کی طرح۔

کچھ اور آگے چل کر ڈاکٹر یکایک رک گیا۔ اس کے بوٹ کی ٹھوکر کھا کر ایک ادھ ننگا زنانہ جسم دھیرے دھیرے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ لیٹنے کی حالت سے بیٹھنے کی حالت میں آنے کی نحیف کوشش جس میں کشمکش تھی' الجھن بھی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ آنکھیں ملتی ہوئی بالکل بیدار ہو گئی۔

ڈاکٹر کے ہونٹوں کا امریکی سگار اس کے دانتوں کی جکڑ میں کچھ ایسے پھنس سا گیا تھا۔ جیسے عقاب کی چونچ میں کوئی چھوٹا پرندہ۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ اس چمک میں اجالا نہ تھا' ایک شعلہ تھا ایک ایسی لپکتی لو جو اس اندھیرے میں بھی دکھائی دے رہی تھی۔

بیدار ہو کر آدمی ہوشیار ہو جاتا ہے۔ کسی قدر نڈر بھی ہو جاتا ہے۔ عورت نے پہلے ڈاکٹر کا جوتا پھر اس کی پتلون کو پکڑا اور پھر ہاتھ اندر لے جا کر وہ اس کی ٹانگوں سے چمٹ گئی' بالکل ایک بچے کی طرح۔

ہر دکھی جیو بکاؤ ہوتا ہے۔ اس کی زندگی سے روشنی بھگا دو پھر اسے کال کوٹھری میں بند کردو--- پھر اسے نجات کی راہ دکھا دو۔

عورت نے رحم طلب نگاہوں سے اوپر دیکھا پھر اپنے گال ڈاکٹر کی ٹانگوں سٹا دیئے--- اور بڑی پر امید معصومیت سے اپنے نجات دہندہ کے چہرہ کی طرف دیکھنے لگی۔ جیسے وہ کسی ایسے ہی سانحہ کے انتظار میں تھی۔

انتظار بھی کام ہوتا ہے۔ ہر کوئی جو انتظار کرتا ہے جانتا ہے۔

"چلو گی؟"

عورت نے اقرار میں سرہلا دیا۔

"ذرا دور چلنا ہو گا' ڈاکٹر نے مزید کریدتے ہوئے کہا۔ "چل سکو گی"

عورت نے پھر اسی طرح سرہلا دیا۔

"بھوکی ہو؟"

عورت نے چپ چاپ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا پھر جیسے بڑی مشکل سے سرہلا کر کہا۔ "ہاں"

اس لفظ "ہاں" میں مجبوری تو تھی ہی امید بھی تھی۔

عورت کے خشک ہونٹوں سے السائے ہوئے دھوئیں کی طرح یہ لفظ نکلا اور فضا میں تحلیل ہوگیا' ساری فضا بوجھل ہوگئی۔

عورت وہ زبردست خطرہ ہے جس سے خبردار نہ رہا جائے تو آدمی ایسی دلدل میں پھنس جاتا ہے جس سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ عورت نڈر ہوجائے تو اس میں ہمت اور بے پناہ استقلال آجاتا ہے اور وہ چنڈی بن جاتی ہے۔

ڈاکٹر نے کوٹ کی جیب سے اخروٹ' بادام' سوکھی خرمانیاں' بھنا ہوا کاجو اور کشمش نکال کر عورت کی جھولی میں ڈال دیئے۔

اس نے یہ سب کب جیب میں رکھا تھا شانتی کو یاد نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد کا جو واجو کی بات کو غیر ضروری سمجھ کر وہ عورت کی طرف دیکھنے لگا جس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر چمکیلی تھیں اور اپنے محسن کو ایک ٹک گھورے جارہی تھیں۔

ہر چیز کی ایک مقررہ قیمت ہوتی ہے۔ جسے چکا دینے کے بعد ہی آپ اسے حاصل کرسکتے ہیں۔ قیمت کی ادائیگی آپ نقدی کی صورت میں کریں جنس کے روپ میں کریں یا کوئی اچھا کام کرکے۔

اندھیرے کی وجہ سے آنکھوں کی غیر معمولی چمک کے علاوہ عورت کے خدوخال واضح نہیں تھے۔ ڈاکٹر نے ذرا رک کر شانتی کی

طرف دیکھا گویا پسند ناپسند کی بات پوچھ رہا ہو' مگر اپنے نا تجربہ کار ساتھی سے کوئی مناسب جواب نہ پا کر وہ صرف مسکرا دیا۔

تو ٹھیک ہے چلے گا' اس نے اپنے ساتھی کو پسند کے کیش میں سمجھتے ہوئے کہا۔ رات بھی تو بے حد کالی ہے' پھر لڑکی کی طرف دیکھ کر بولا۔ "تم اسے کھاتے کھاتے ہمارے پیچھے چلی آؤ۔ ہم تیز نہ چلیں گے' مگر ہمارا تمہارا فاصلہ معقول رہے گا۔ کیوں کہ "ہم شریف لوگ ہیں۔"

شانتی حیران تھا۔ ایسا لگتا تھا گویا وہ مسکرانا ایک دم بھول گئی ہو اور اس کی ساری چتا جیسے سوگئی ہو۔ ڈاکٹر نے اسے کاندھے سے پکڑ کر جھنجوڑا اور اپنے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکال کر اس کے ہونٹوں میں ٹکادی اور لائٹر سے اسے سلگاتے ہوئے بولا۔ "تم ہوش میں تو ہو۔"

شانتی جیسے نیند سے جاگ اٹھا ہو۔ اس نے اکھڑے اکھڑے ڈھنگ سے اپنے راہبر کو دیکھا جیسے کہہ رہا ہو میں یہ سب کچھ نہیں سمجھتا۔ یہ سب اتنے جلدی کیسے ہوگیا۔ یہ بھی میری سمجھ میں نہیں آرہا مگر تم اسے ٹھیک سمجھتے ہو تو شاید یہ ٹھیک ہی ہے۔

اور وہ لوٹ چلے۔ دھواں چھوڑتے ہوئے وہ چپ چاپ چل رہے تھے۔ بیچ بیچ میں شانتی پیچھے مڑ مڑ کر اندھیرے میں نپی تلی دوری پر کسی قدر لڑکھڑا کر رینگتے ہوئے اس سائے کو بھی دیکھ لیتا تھا۔

"ہم نے اسے دیکھا بھی نہیں۔"

"ضرورت نہیں تھی۔"

"مطلب؟"

"بھوک میں مرغی کا بدن نہیں پرکھتے۔"

"مگر وہ تو ہمیں دیکھ سکتی ہے۔ ہم روشنی میں چل رہے ہیں اور وہ اندھیرے میں۔"

"وہ بھی اس کی ضرورت نہیں سمجھتی۔ وہ صرف ہمارا لباس دیکھ رہی ہے۔ ہمارے صاف ستھرے کپڑے جو ہمارے اچھے گاہک ہونے کے ضامن ہیں اور مقناطیس کی طرح اسے ہماری جانت کھینچے لیے آرہے ہیں۔"

اسے یاد آیا۔ مرشد نے کہا تھا۔ یہ جسم جس کی ہم اتنی آرائش و زیبائش کرتے ہیں۔ ہماری روح کی قبر ہے۔ اپنی ناسمجھی میں قبروں کے ملاپ کو ہم پریم ملن کہتے ہیں۔ دنیوی خواہشات کو کم کرو۔ من کا مقابلہ' دلیری اور مستقل مزاجی سے ایک بہادر سپاہی کی طرح کرو۔

بہادر سپاہی

کہاں ہے وہ بہادر سپاہی جو عورت کی حقیقت کو جھٹلا سکے۔ ہم سب کائر ہیں۔

کچھ دیر پھر دونوں میں سے کوئی کچھ نہیں بولا۔ اب ہوا بھی چلنا شروع ہوگئی تھا جس کی وجہ سے ماحول کسی قدر خنک ہو چلا تھا۔ سمندر کی لہروں کو چھو چھو کر آتے ہوئے ہوا کے جھونکے۔ کیا سوندھی سوندھی اور خوشگوار بو تھی فضا میں۔ شانتی نے محسوس کیا کہ وہ یکایک لمبے لمبے سانس لینے لگا ہے تاکہ اس کے خشک پھیپڑے ہوا کی اس مہک سے بھر جائیں۔ پھر ایک عجیب قطعی انوکھے خیال کے ذہن میں ابھرتے ہی وہ مسکرایا۔

کیا وہ اپنے آپ کو کسی ایسے کام کے لیے تیار کر رہا تھا۔ جس میں ان گنت سانسوں کے خرچ کا امکان تھا۔

"حیرت ہے" یکایک اس کے منہ سے نکل گیا۔

"تم نے کچھ کہا" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"میں سوچ رہا تھا۔"

"تم ضرورت سے زیادہ سوچتے ہو۔"

"سوچنے کی بات ہی ہے۔ میں سوچ رہا تھا۔ تم نے اس لڑکی کو پہچانا کیسے؟"
"وہ لڑکی ہے یا بھرپور عورت" ڈاکٹر نے اسے پھر الجھا دیا۔
اسے لگا ڈاکٹر شرارت پر اتر آیا ہے اور جان بوجھ کر اس کی جوان امنگوں کے ریتیلے گھروندے مسمار کیے دے رہا ہے۔ اسے ڈاکٹر کی یہ حرکت طفلانہ سی لگی۔ جیسے ریت سے کھیلتے ہوئے شریر بچے لات مار کر ایک دوسرے کے گھر توڑ دیتے ہیں۔
پھر کسی قدر سنبھل کر وہ بولا "میں سوچ رہا تھا کہ تم نے اسی کو ٹھوکر کیوں لگائی' وہاں ایسی کتنی ہی دوسری عورتیں بھی تھیں۔ کسی دوسری کو کیوں نہیں۔"
"یوں سمجھ لو کہ مجھے ایسے جسموں کی پرکھ ہے جو غیبوں کے پاؤں کی ٹھوکر کھا کر بگڑتے نہیں بلکہ ان سے لپٹ جاتے ہیں۔ ہر بھوکے کو بھوک مٹانے والی رکابی کی پہچان ہوتی ہے۔ بھوکا بھوکے کو پہچانتا ہے۔ سمجھ لو کہ ہم نے بھی ایک دوسرے کو پہچان لیا۔"
شانتی کی تسلی نہیں ہوئی۔ مگر ڈاکٹر چپ ہو گیا۔
شانتی نے دیکھا دھیرے دھیرے اس کے راہبر کے چہرے کے ہاؤ بھاؤ بدلنے لگے ہیں۔ اس کے ہونٹوں کی شریر مسکراہٹ بھی کافور ہوتی جا رہی ہے۔۔۔ اور پھر اسے ایسا لگا جیسے ڈاکٹر کا بزرگ و باوقار چہرہ ہزاروں سینکڑوں ریکھاؤں سے بھر گیا ہے۔ اور اس کے ہونٹوں کی خوشگوار مسکان ایکدم غائب ہو گئی ہے۔ ظاہر تھا کہ ڈاکٹر کے اندر اس کے ضمیر اس کی آتما میں کوئی انجانی اتھل پتھل مچ رہی ہے۔ اور اس کے ذہن کی گہرائیوں میں کوئی زلزلہ سا آگیا ہے جو اس کا سب کچھ الٹ پلٹ رہا ہے' توڑ پھوڑ رہا ہے۔
شانتی ڈر گیا۔
وہ جانتا تھا کہ اس کا ساتھی بڑا بااصول آدمی ہے اور جن اصولوں کا وہ اکثر ذکر کیا کرتا ہے انھیں بہت حد تک وہ اپنی نجی زندگی میں ڈھال سکا ہے۔
اصولوں کا تذکرہ ایک چیز ہے' اصولوں کی پابندی قطعی دوسری چیز ہے۔ آج وہ اصول یکایک کہاں چلے گئے۔
گوروں کو آزمانا کفر ہوتا ہے۔
مرشد' مرشد ہے۔
عمل با ادب خواہ کم ہی ہو' زیادہ علم سے زیادہ بہتر ہے۔
فقط اصولوں کا علم ہونے سے کیا ہوتا ہے جب تک آدمی ان کے مطابق اپنی راہیں متعین نہیں کرتا۔
بغیر عمل کے ہر عالم اس گدھے کی مانند ہے جس کی پیٹھ پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہو۔
خود زندہ مثال بن کر دکھانا اصولوں کے اپدیش سے بدرجہا بہتر ہے۔
اس نے کیا کچھ نہیں کہا تھا۔ آج اسے کیا ہو گیا ہے۔
شک' مرشد پر شک کفر ہے۔
مگر آج وہ دونوں' وہ اور اس کا مرشد ایک ایسی حرکت کے مرتکب ہونے جا رہے ہیں جس کا کفارہ ممکن نہیں ہوگا۔
"تم سمجھتے ہو وہ کوئی فاحشہ ہے' سستی بازاری رنڈی ہے" یکایک مرشد ابل پڑا۔
"عورت کو پیٹ بھرنے کے لیے کوئی دوسرا مناسب کام نہیں ملتا جبھی وہ جسم کا سودا کرتی ہے۔ تم پیٹ کی خاطر اپنی کلا تک بیچ دیتے ہو اور تمھاری وہ نیلا نسبتاً اچھی اور محفوظ زندگی کے لیے تمھارا پیار چھوڑ کر۔۔۔ مگر یہ ابھاگی لڑکی۔۔۔ جھوٹ' فریب خود نمائی اور خود ستائی کی بدبوؤں سے بھری لدی تمھاری تہذیب' جب اس غریب کو کوئی معقول کام نہیں دیتی۔ گھر نہیں دیتی' شوہر نہیں دیتی' عزت' آبرو اور حفاظت نہیں دیتی جو ہر عورت کا جنم ادھیکار ہے تو وہ صدیوں پرانی' جانی پہچانی اور آسان راہ اختیار کر لیتی ہے۔ صدیوں سے ایسا ہوتا

آیا ہے اور نہ جانے کب تک۔

مرشد کا گلا رندھ گیا' وہ چپ ہوگیا۔

زیادہ باتیں کرنے سے آدمی کی آتما کی شکتی ضائع ہوجاتی ہے۔

کم بولو جو بولو حلیمی سے میٹھا بولو' کھرا بولو' سچا بولو۔

عاجزی' انکسار اور شیریں زبان اچھی تربیت کی نشانیاں ہیں۔ طیش میں آکر جذبات سے مغلوب ہو کر بات کرنے سے بات کی خوشبو اڑ جاتی ہے۔

جو صدیوں سے چلا آرہا ہے اسے ہم کیسے روک سکتے ہیں۔ آپ ہی تو کہا کرتے ہیں کہ دنیا کو چلانے کا بوجھ ہم پر نہیں' یہ اوپر والے کا کام ہے۔

اپنے کام کو چلانا تو ہمارا کام ہے۔

مرشد کی باتوں میں دخل دینا میرا کام نہیں۔

وہ مسکرایا۔ "اچھائی برائی زندگی کے رنگ ہیں۔ مجھے تسلی ہے کہ اب بھی عورت کے ضمیر میں سیتا کا خمیر ہے۔ سنجوگتا کی شان اور ہیر کا وقار ہے۔ اس کے برعکس نیلا' نیلی آنکھوں والی لڑکی۔ تمہارے گرتے ہوئے سماج کی شرمناک نشانی۔۔۔" مرشد نے حقارت سے تھوک دیا۔

"نفرت کرنا برا عمل ہے یہ آپ ہی نے سکھایا ہے مجھے۔ رہی نیلا تو میری عرض ہے کہ آپ نیلا کو بلاوجہ ہین ثابت کر رہے ہیں۔ اس نے میری پڑھائی کی تکمیل تک میرا انتظار کیا جب مجھے پھر بھی کوئی نوکری نہ ملی تو اسے مجبوراً ایک اچھے برسرروزگار لڑکے سے شادی کرنا پڑی۔"

"تعلیم کی تکمیل معاش کی ضمانت نہیں ہوتی۔ جو پیار کرتے ہیں وہ عمر بھر انتظار کرتے ہیں' محبوب کی جدائی کا سوزوگداز انھیں عمر بھر تڑپاتا رہتا ہے پل پل کھاتے پیتے چلتے پھرتے سوتے جاگتے وہ زبان پر اسی کا نام اور آنکھوں میں اسی کی تصویر لیے پھرتے ہیں۔"

"آپ آدرشوں کی بات کررہے ہیں جب کہ میں اٹل سچائی دیکھ رہا ہوں۔ آخر وہ غریب کب تک امید کی اس بوسیدہ چاردیواری میں گھری رہتی کب تک یوں اس طرح اپنی ذات کو سمیٹے رہتی۔ میں ان کا واحد سہارا تھا جب میں ہی اس کو پناہ نہ دے سکا تو وہ کیا کرتی۔ اس نے بھوک اور افلاس سے نڈھال زندگیاں دیکھی تھیں۔ ہر آدمی موت سے ڈرتا ہے کیوں کہ لاش زندہ جسم کی نسبت بھیانک ہوتی ہے۔ نیلا نے مجھے بھی ایک زندہ لاش میں منتقل ہوتے دیکھا تو ڈر گئی۔ وہ جانتی تھی کہ میرے مفلوج ذہن پر ایک بوجھ اس کا بھی ہے وہ بچی کریھیں لڑکی تھی' اس نے جو کیا' میں سمجھتا ہوں ٹھیک ہی کیا اور خوف خدا کی وجہ سے کیا۔ یہ اس کی بچی مذہب پرستی کا ثبوت ہے اس کے ڈر کی وجہ وہ اذیت ناک جسمانی درد بھی تو تھا جو ایک صحت مند انسان کسی ایسے مرتے ہوئے انسان کو دیکھ کر محسوس کرتا ہے جو اسے عزیز ہو۔"

"میں درجنوں بار موت سے ہمکنار ہوا ہوں مگر کسی بھی حادثہ نے میرے ذہن پر کوئی ایسا اثر نہیں چھوڑا جو مجھے موت سے خوف دلائے۔ طوفان میں چٹان کی طرح جم کر کھڑے رہنے میں جو مزا ہے وہ ایک کشادہ خوبصورت بیڈ روم کے آرام دہ لحاف میں دھنسے رہنے میں کہاں ہوتا ہے۔"

"آپ جیسی نڈر شخصیتیں آج کل کتنی ہیں۔ کہاں ہیں۔ وقت برا ہوا تو اسے بدلنے کی جرات آج کس میں ہے۔ آج کل تو خود اپنی ذات کو بدل سکنے کی سکت بھی آدمی میں نہیں رہی۔"

"پیار کرنے والے جاتے جاتے بھی زندگیوں کو سنوار جاتے ہیں مرکر بھی اپنا نشان چھوڑ جاتے ہیں۔"

جسے مٹانے کے لیے میں آج تمھیں اس نئی ڈگر پر لایا ہوں۔ اس نشان کی صورت یہی تو ہے۔ تا کہ تم تمیں کے ہونے لگے ہو۔ مگر ابھی تک درجن ہو۔ نیلا جو ہے وہ ہے مگر یہ لڑکی نیلا نہیں ہے۔ یہ بمبئی کی بیٹی ہے۔ بمبئی جو نئی تہذیب نئے تمدن کا اتنا بڑا گہوارہ ہے۔ یہ تمھاری نئی تہذیب کی بیٹی ہے۔ یہ میری---- یہ تمھاری ---- مگر جانے دو۔ تم یہ سب نہیں سمجھو گے۔"

"مگر میں سمجھنا چاہتا ہوں۔ آپ یکایک اس قدر جذباتی ہوگئے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا جسم بھلے ہی عورت کا بھوکا ہوا مگر ایسا بھی نہیں کہ میں----"

"میں تمھاری بھوک کا خیال کب کا بھول چکا ہوں۔"

"تو پھر؟ یہ عورت؟"

"تم نے دیکھا نہیں اس کے سر کے بال فٹ پاتھ کی گرد سے کیسے الجھ گئے ہیں۔ نہ جانے وہ کب سے نہیں نہائی۔ آج وہ گرم پانی سے نہائے گی اور ڈھنگ کا کھائے گی---- اور----"

"اور کیا؟"

"ایک معمولی پس ماندہ بے سروسامان، گمنام زندگی، افلاس کی بدترین گھٹن کی پیداوار آج غالبا پہلی بار تمھارے شہر کی رنگین فضا اور تمھارے بستر کی جوان امنگ بھری شوخ و شنگ آسائش کا ذائقہ لے سکے گی۔اس کے بعد پھر وہی فٹ پاتھ، پھر وہی جدوجہد پھر وہی اذیت۔خواب لینے کا سلیقہ تو آجائے گا۔ خواب فٹ پاتھ پر بھی گوارا ہوجاتا ہے عزیز۔ لو ہم پہنچ گئے۔ اب تم اوپر جاکر فلیٹ کھولو اور گیزر آن کر دو۔"

شانتی کچھ جھجکا۔ پھر بغیر کچھ کہے چلا گیا۔

اب ڈاکٹر آنے والے مہمان کا انتظار کرنے لگا۔ دیوار سے سٹے ہونے کی وجہ سے اس کا وجود اندھیرے نے نگل لیا تھا مگر اس نے دیکھا کہ آنے والی ٹھیک اسی کی طرف آرہی ہے۔ وہ قریب آگئی تو اس نے دیکھا کہ اس کی جھولی خالی تھی۔

"سب کھا لیے؟"

"آدھے بابا کو دے دیئے تھے۔"

"بابا کو؟"

"ہاں!"

یہ کیسی عجیب "ہاں" تھی۔ یہ دوسری "ہاں" پہلی سے کس قدر الگ تھی۔

ڈاکٹر نے اپنے کانپتے بائیں ہاتھ سے عورت کے سر پر تھپکی دی۔ پھر اسے کھینچ کر گلے سے لگا لیا۔ پھر اس نے اس کے گالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرا بازوؤں کو سہلایا۔ بالکل پدرانہ ڈھنگ سے۔ اسے لگا وہ اس لڑکی کو جانتا ہے۔ اس کی اپنی لڑکی زندہ ہوتی تو آج اسی کی عمر کی ہوتی۔

بیتی زندگی کے منتشر اجزا دھیرے دھیرے اکٹھا ہونا شروع ہوئے اور ذہن میں ایک واضح نقشہ ایک باقاعدہ خاکہ کھنچتا چلا گیا۔

اس کی بیوی، اس کی بچی جو پیدا ہوتے ہی چل بسی اور ساتھ میں ماں کو بھی لے گئی پچیس سال پرانی بات۔

فلیٹ میں پہنچ کر شانتی نے اطلاع کے طور پر اپنے پانچویں مالے کی بالکنی میں روشنی جلادی اور خود باہر آکر کھڑا ہوگیا۔

جیسے ہی ڈاکٹر اور وہ لڑکی اندھیرے سے ابھرے اور گھر کی طرف بڑھے۔ بتی ہدایت کے مطابق پھر گل ہوگئی۔

لڑکی کو لے کر ڈاکٹر بے خوف و خطر اس عمارت کے فائر میں داخل ہوا۔ لفٹ نے منٹ بھر میں دونوں کو پانچویں منزل پر پہنچا دیا۔

جیسے ہی وہ اس تاریک فلیٹ میں داخل ہوئے لڑکی نے محسوس کیا کہ اندھیرے کے باوجود فلیٹ کی ترتیب و تزئین خاصی بانکی اور

آرام دہ ہے۔ اسے لے کر ڈاکٹر دوسرے کمرے میں چلا گیا اور الماری سے زنانہ قسم کا ایک گاؤن نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ پھر اس کو وہیں چھوڑ کر وہ باتھ روم میں گیا۔ اس نے گیزر کا پانی چیک کیا۔تولیے دیکھے۔ صابن' تیل' شمپو وغیرہ دیکھا۔ باہر آیا تو اس نے دیکھا کہ لڑکی کمرہ کے سب سے اندھیرے کونے میں شانتی سے سٹی کھڑی ہے۔

ڈاکٹر مسکرایا۔ دونوں کو یوں اس طرح ایک ساتھ دیکھ کر اسے واقعی مسرت محسوس ہوئی۔

"تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں اسے نہلا دھلا کر بھیجتا ہوں۔"

شانتی چلا گیا تو ڈاکٹر جو اپنے داہنے ہاتھ میں سرسوں کے تیل کی بوتل تھامے ہوئے تھا کرسی پر بیٹھ گیا اور لڑکی کو اپنے سامنے زمین پر بیٹھا لیا۔ اب لڑکی کا سارا بدن اس کی دونوں ٹانگوں کے بیچ بھنچا ہوا تھا اور سر اس کی گود میں۔ کتنی ہی دیر وہ لڑکی کے خشک مٹی سے اٹے بالوں میں تیل سے مالش کرتا رہا۔ اس کا سر اس کی کنپٹیاں سہلاتا رہا۔ ظاہر تھا کہ لڑکی کو بڑا سکون مل رہا تھا اور وہ' چپ چاپ بیٹھی اس قطعی انوکھی کیفیت کے تانے بانے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

کیسے عجیب لوگ ہیں یہ

بڑے لوگ واقعی بڑے ہوتے ہیں۔

اسکی سوچ کے دھاگے جو ہمیشہ الجھے رہتے تھے۔ یہ نئی ڈھیل پاکر الگ الگ ہونے لگے اس کا چھوٹا سا دماغ ان دھاگوں کے سرے ملانے جوڑنے اور انھیں کسی ترتیب میں لانے' کسی تکمیل تک پہنچانے میں مشغول ہوگیا۔

کیسے عجیب ہیں یہ لوگ۔

کتنے مہان

ڈاکٹر کا ہاتھ ایک ہل تھا جو اس کے سر کی کھردری' جھاڑ دار زمین سے خس و خاشاک نکال رہا تھا۔

اس نے سوچا وہ زمین ہے' دھرتی ہے۔ عورت دھرتی ہی تو ہوتی ہے۔ مگر کیا ہل چلانے کے بعد اسے بغیر بوئے ہی چھوڑ دیا جائے گا۔ ممکن نہیں۔ مگر ہالی یقیناً یہ بزرگ نہیں ہوں گے۔ وہ نوجوان چھوکرا ہوگا۔ وہی ہونا چاہیے۔

کوئی بھی ہو کیا فرق پڑتا ہے۔

زمین کا اپنا ایک دھرم ہے۔

ہل کا اپنا اور ہالی کا۔۔۔

لڑکی کا سر ملانے کے بعد ڈاکٹر اسے باتھ روم میں لے گیا۔ جہاں اس نے اس کے کپڑے اتارے۔ کپڑے کیا تھے ایک مختصر سی چولی اور دھوتی۔ دونوں میں جابجا پیوند لگے تھے۔ ڈاکٹر نے لڑکی کے جسم کو مل مل کر دھویا اس کی پیٹھ دھوئی' اس کے بالوں میں شمپو کیا۔ اس طرح نہلایا جانا۔ اس کے لیے قطعی نیا تجربہ تھا۔ اسے لگا اس کی داغ دار خیالی زندگی گنگا میا کے پوتر پانی میں دھل دھلا کر ایک دم اجول ہو گئی ہے اور اس کے جسم کا سارا کھردرا پن دھل کر صاف شفاف نکھر آیا ہے اور اس کی جلد ایک دم ریشم کی طرح ملایم ہوگئی ہے۔

اس نے غسل خانے کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ آسمان پر کئی قسم کے رنگ چھائے ہوئے تھے۔ کالے' سفید' نیلے' ہرے۔ ان رنگوں کی ایک دوسرے سے مواصلت عجب منظر پیش کر رہی تھی' وہ جانتی تھی کہ یہ ست رنگی کمان عارضی ہے اس کا تناؤ عارضی ہے اور چند ہی لمحوں میں سب ڈھیلا پڑ جائے گا۔

اسے یاد آرہا تھا کبھی ایک جہازی اسے سمندر کی سیر کرانے لے گیا تھا۔ وہ بمبئی میں جنمی پلی تھی۔ مگر سمندر کی سیر اس کا پہلا تجربہ تھا۔ ناؤ کا پانی کو چیر کر چلنا اسے بڑا عجیب لگا تھا۔ پھر جب وہ سپاہی ناؤ بن گیا تھا اور وہ خود پانی کی جامد سطح تو بھی اسے برا نہ لگا تھا پھر یہ

تکلیف پر لطف ہو گئی تھی اور اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ دھرتی ہی نہیں ہے' پانی بھی ہے۔
کتنا خوش مزاج تھا وہ سمندری لٹیرا۔ تب وہ کنواری تھی جبھی تو لٹیرا کا لفظ اس کے ذہن میں آیا تھا۔
اس کی صاف دل گفتگو اور معصوم ہنسی مندر کی گھنٹیاں تھیں' وہ بھرپور مرد تھا مگر اس کی باتیں اس کی آواز میں عورتوں جیسی لوچ تھی۔ توڑے مروڑے بغیر کس طرح اس نے اسے اپنے اردگرد لپیٹ لیا تھا اور امربیل کی طرح وہ اس کے گلے سے لگ گئی تھی۔ سپاہی کے تندرست اور توانا کسرتی جسم سے چمٹی ہوئی وہ کیسے ایک دم اتنی چھوٹی ہو گئی تھی۔
سپاہی کی گود اندھیری کی اس پہاڑی کی طرح تھی جس کے غاروں میں اس نے کبھی آنکھ مچولی کھیلی تھی۔ کیسا خوشگوار گوشہ تھی وہ پیار بھری گود اسے وہ سپاہی آج تک یاد تھا۔ جانے وہ اب کہاں ہے اس کی پہلی محبت جس کو بڑے سلیقے سے تہہ کر کے اس نے اپنی یادوں کے کسی کونے میں سمیٹ کر' سنبھال کر رکھ لیا تھا۔ ظاہر تھا کہ اس طرح تہہ کر کے اور کس کر مختصر بنائی وہ یاد آج کس حد تک شکن آلود ہو گئی تھی مگر اس کی دلفریب موہنی خوشبو میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ سپاہی کی یاد اس کی روح میں رچ بس گئی تھی۔
اور آج-----'
یہ دوسرا خوشگوار تجربہ تھا۔ آج اس کے دانت صاف تھے۔ زبان صاف تھی۔ سر کے بال صاف تھے اور اس کا سارا جسم اپنے گہری گندمی رنگ کے باوجود جوانی کی اس مہک میں معطر تھا جو کسی کریم یا عطر کی مرہون منت نہیں ہوتی۔
وہ یکایک کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
بلیک پینتھر' سپاہی نے اس کے ننگے جسم کو اپنی بانہوں میں جھولتے تولتے کہا تھا۔
"گدگدی ہو رہی ہے" ڈاکٹر نے پوچھا۔
"نہیں ایسے ہی کچھ سوچنے لگی تھی۔"
"کیا!!"
"یہی کہ مجھے نہلاتے ہوئے بلکہ دھوتے ہوئے آپ نے اپنے سارے کپڑے گیلے کر لیے۔"
"ایسا تو ہونا ہی تھا۔"
"سو تو ہے--- مگر"
"مگر کیا!"
"آپ مجھے ایسے نہلا رہے ہیں جیسے ایک عورت دوسری عورت کو نہلاتی ہے' یا پھر---"
"یا پھر؟"
"نہیں کہوں گی"
"کہو!"
"نہیں!"
"ارے بھئی کہہ بھی چکو میں برا نہیں مانوں گا۔"
"آپ ایسے نہلا رہے ہیں مجھے جیسے کوئی ماں یا شفیق باپ اپنے نو عمر بیٹے کو بیٹی کو نہلاتا ہے۔"
ڈاکٹر ہنس پڑا۔
"آپ نے برا نہیں مانا۔"
"اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے تم میری بیٹی کی طرح ہی تو ہو اب تم یہ گاؤن پہن لو۔ آج کی رات تم دلہن ہو اس ویران گھر کی

رونق۔ جس گھر میں کانچ کی چوڑیاں کبھی نہ کھنکناتی ہوں اس کی کنواری اداسی کا کون اندازہ کرسکتا ہے۔ آج یہ اداسی دور ہوجائے گی۔

"دلہن"۔۔۔ کیسا پیارا کتنا میٹھا لفظ ہے۔ ایک رات کی ہی سہی وہ دلہن بنی تو۔۔۔

وہ غسل خانے سے باہر آئے تو ڈاکٹر بلند آواز سے بولا۔ "میں بہت تھک گیا ہوں شانتی۔ اب ذرا سوؤں گا۔ تم لوگ نبٹ چکو تو مجھے جگا لینا اور ہاں کمرے میں بتی نہ جلانا یہاں اڑوس پڑوس۔"

اور فقرہ مکمل کیے بغیر ہی وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

شانتی نے جو آج شام سے ہی اپنے رہبر کا ہر حکم ایک نوزائیدہ بچہ کی سی حیرت سے سن اور مان رہا تھا کوئی جواب نہ دیا۔ ڈاکٹر کے غسلخانے میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنا بستر جھاڑ پونچھ کر ایسا صاف اور سیدھا کر دیا تھا کہ اب اس میں ایک بھی شکن باقی نہ رہی تھی۔ کپڑے اتار کر اب وہ اپنی دھلی دھلائی گدرائی نوجوان رات کی ساتھی کا بڑے اشتیاق سے انتظار کر رہا تھا۔ آج شام اس نے کتنے ہی سگریٹ پی ڈالے تھے۔ پچھلے کچھ منٹوں میں بھی اس نے چار چھ سگریٹ پھونک ڈالے تھے۔

غسل خانے کی چکا چوند روشنی سے باہر اندھیرے میں آکر لڑکی جو اب ایک اندھے کی طرح محسوس کر رہی تھی چپ چاپ شانتی کے بیڈ روم کی دہلیز پر کھڑی مزید حکم کا انتظار کرنے لگی۔ شانتی نے آگے بڑھ کر اسے شانوں سے پکڑا اور بڑی شوخی سے سگریٹ کا دھواں اس کے منہ پر چھوڑتے ہوئے اس کی ستواں ناک پکڑلی۔

" تمہاری ناک کتنی چھوٹی ہے۔ اور دھلی دھلائی تم کتنی خوشگوار لگنے لگی ہو۔"

"انھوں نے مجھے اپنے ہاتھوں سے نہلایا ہے۔"

"صرف نہلایا ہی نہیں۔"

لڑکی کو نہ جانے کیوں یہ جملہ اچھا نہیں لگا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

شانتی نے اپنے مرشد کی سوجھ بوجھ کی دل ہی دل میں تعریف کی۔ نہا دھو کر اور نائٹی پہن کر لڑکی واقعی بے حد چست لگ رہی تھی۔ سوکھے میوے کھا کر اور اس طرح گرم پانی سے نہا کر لڑکی کا جسم اور من کونپلوں کی طرح کھل اٹھے تھے۔

شانتی نے اس کی کمر پر ہاتھ رکھے۔ کمر پتلی تھی

"بلیک پینتھر" جہازی نے کہا تھا۔

پھر اس نے ہاتھ اوپر بڑھا دیئے' پھر اور اوپر بڑھا دیئے اور پھر کندھوں سے پکڑ کر اندھیرے ہی میں اسے دیکھنے کی کوشش کی۔

جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے لڑکی کے چہرہ کو دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کے ہونٹ چوم لیے۔ پھر اس نے اسے کئی بار چوما۔ ہونٹوں پر' جبیں پر' گردن کے خم پر' گالوں پر' ماتھے پر' سر پر' اس کے ہونٹ کچھ پالینے کی تلاش میں سرگرم تھے۔ اسے اس لڑکی پر واقعی پیار آرہا تھا۔ کتنا متناسب جسم تھا اس کا بھوک اور افلاس کے باوجود گٹھا ہوا مضبوط۔

بدن کے بھیدوں سے ناآشنا کنواری لڑکی کی طرح وہ شانتی کے ناتجربہ کار گرم ہاتھوں میں موم کی طرح پگھلنے لگی پگھلتی گئی تاوقتیکہ وہ ساعت آگئی جو تسلسل حیات کی ضامن ہوتی ہے۔ دونوں کو ایسے لگ رہا تھا گویا انھیں عمروں سے اسی ساعت کا انتظار ہو۔

عورت کا پیار چیتن مایہ ہے' جو اپنی ظاہری مٹھاس سے آدمی کو چھلتی ہے۔ وہ مایا سہی' موہ سہی' جوانی کا ولولہ سہی' مگر یہ جھوٹ نہیں ہے۔

یہ سچ ہے' اٹل سچ ہے۔

اے کاش یہ رات کبھی ختم نہ ہو

آفتاب کبھی نہ نکلے۔

زندہ رہنے کے لیے یہ ضروری ہے محض اسی کے لیے زندہ رہنا بھلے ہی معیوب ہو مگر زندہ رہنے کے لیے
آدمی اور عورت
عورت اور آدمی
ایک دوسرے کا نصب العین
وہ جاگ رہے تھے اور سو رہے تھے۔ جاگتے ہوئے سونا کیسی لطف آمیز کیفیت ہے۔ کیوں نہ وہ اسے مستقل طور پر رکھ لے۔ مرشد کو کوئی اعتراض نہ ہوگا اور مرشد کے علاوہ کسی کے اعتراض کی اسے پروا نہیں۔
وہ ایک دوسرے میں۔۔۔
یہ قبروں کا نہیں' دلوں کا ملاپ ہے۔
جب میں تھا نہیں تھی اب وہ ہے میں نہیں ہوں۔ دوری ٹوٹ رہی تھی اہم ٹوٹ رہا تھا تو اور میں کا جھگڑا ختم ہوگیا تھا۔ وہ چاہتا تھا اس کا وجود مٹ جائے ہوا ہو جائے۔ اور وہ سارے کا سارا ثابت و سالم اپنی ہم بستر کے وجو میں سما جائے۔
مگر انسان کے جذبات میں اتنی شدت کہاں ہوتی ہے۔ ہوتی بھی ہے تو کب تک۔
ہر چیز پیدا ہوتی ہے۔
بڑھتی پھیلتی اور پروان چڑھتی ہے
بالاخر مٹی ہو جاتی ہے
ازلی
ابدی
سرمدی
کچھ نہیں
ساڑھے تین بج رہے تھے جب شانتی نے ڈاکٹر کو جگایا۔
"وہ آپ کا انتظار کر رہی ہے۔"
"نہیں نہیں' شانتی ایسا نہ کہو۔۔۔ وہ ۔۔۔ وہ میری۔۔۔" مگر اس نے زبان کو تشریح سے روک دیا۔
ایک لمحہ بھر میں شانتی کے ذہن و ضمیر پر جیسے بجلی سی کوند گئی اور وہ سرتا پا لرز گیا۔ سڑک پر کہی ہوئی ڈاکٹر کی بات اسے یاد آنے لگی۔
تو کیا اس نے ڈاکٹر کی بیٹی سے' وہ شرم سے پانی پانی ہوگیا۔
نہیں نہیں ڈاکٹر صاحب بلاوجہ جذباتی ہوگئے ہیں۔ آخر بیچارے اتنے بوڑھے بھی تو ہیں۔
ہر تیس سال کے آدمی کو پچاس پچپن کا آدمی بوڑھا دکھائی دیتا ہے۔
جب وہ اپنے کمرے میں واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ لڑکی ڈاکٹر کی دی ہوئی نائٹی اتار کر پھر سے اپنی پرانی چولی اور ساڑی پہن رہی ہے جیسے اسے معلوم ہوگیا ہو کہ اس کا کام ختم ہوگیا ہے۔
ڈاکٹر بھی شانتی کے پیچھے پیچھے ہی چلا آیا تھا۔ دونوں نے ہی یہ منظر دیکھا۔ جب وہ اپنے چیتھڑے پہن چکی تو ڈاکٹر اسے باہر لے گیا۔
نہ دعا
نہ سلام

نہ پھر ملنے کا وعدہ

تھوڑی دیر بعد لڑکی کو نیچے سڑک تک پہنچا کر ڈاکٹر لوٹا تو اس نے دیکھا کہ شانتی تو غیر معمولی طور پر بوکھلایا ہوا کمرہ میں چکر پر چکر کاٹ رہا ہے۔ جب ڈاکٹر نے اس کی اس نئی بوکھلاہٹ کی وجہ نہ پوچھی تو وہ خود ہی چیخنے لگا۔

"آپ نے اسے دیکھا!؟!"

"میں نے اسے سو نمبر کے بلب کی روشنی میں خود اپنے ہاتھوں سے سلایا تھا ظاہر ہے کہ میں نے اسے دیکھا تو ہوگا ہی۔"

"ابھی ابھی جو ہوا آپ نے وہ بھی دیکھا؟"

"کیا ہوگیا اس بیچ!" ڈاکٹر نے کھینچ کر پوچھا۔

"آپ کہتے تھے وہ عورت فاحشہ نہیں ہے' رنڈی نہیں ہے' روٹی کے لیے جسم کا بیوپار کرنے والی عورت فاحشہ نہیں ہوتی' تاجر ہوتی ہے۔ وہ جیسے ہی نیچے اتری کسی اجنبی نے اسے دبوچ لیا اور وہ بلاحیل و حجت اس کے ساتھ بھی چلی گئی--- میں شرم سے مرا جارہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے جیسے میں نے ابھی ابھی گندے نالے کا پانی پیا ہو۔اور ابھی چند ہی منٹ پہلے اس کا بدن مجھے پھولوں جیسا دلکش لگا تھا--- اور اب۔"

"ایسا لگ رہا ہے جیسے کسی نے کیچڑ سے سنا ہوا ہاتھ تمہارے منہ پر تمہارے سارے جسم پر پھیر دیا ہو" ڈاکٹر طنزا غرآیا۔ "ایسی ہی بات تھی تو تم نے اسے جانے ہی کیوں دیا تھا ہمیشہ کے لئے رکھ کیوں نہ لیا اپنے ساتھ---"

"آپ"

"بکومت۔ تم بیمار ہو۔ تمہارا ذہن بیمار ہے تمہارا ضمیر بیمار ہے۔ اس لڑکی سے تمہارا رشتہ اس کے اس فلیٹ کی دہلیز سے باہر قدم رکھتے ہی ختم ہوگیا تھا--- اپنی شرمناک کمزوری اور بزدلی کو تم اس کی بے حیائی کہہ کر تسکین پانا چاہتے ہو--- تم نے اس کے ساتھ وہی کیا جو صدیوں سے اس کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔ پھر---مناسب یہی ہے کہ اب تم سوجاؤ--- اور بھول جاؤ"

وہ بستر پر لیٹ تو گیا' مگر کوئی شے تھی جو اس کے دل و ذہن کو کرید کر کھارہی تھی کچھ ایسی کیفیت جیسے وہ مرگیا ہو اور ننھے ننھے چوہے اس کا سارا وجود چپکے چپکے کترتے جارہے ہوں۔

ڈاکٹر نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ اب میرا اس سے کیا رشتہ ہے۔ توقع اسی سے ہوتی ہے جس سے کوئی رشتہ ناطہ ہو۔

صبح آٹھ بجے کے قریب شانتی کی نیند اچانک کھل گئی۔ کہیں کوئی شور تھا جس نے اسے جگا دیا تھا۔ اس نے دیکھا ڈاکٹر شب خوابی کا لباس اور گاؤن پہنے بالکنی میں کھڑا سگار کے لمبے لمبے کش کھینچ رہا ہے--- اور بے حد بے چین ہے۔ باہر آکر اس نے دیکھا کہ نیچے سڑک پر بہت سے لوگ جمع ہیں اور گہرے گندمی رنگ کی ایک بڑی ہی قبول صورت اور جوان لڑکی دھن پت رائے بلڈنگ کے چوکیدار کا گریبان پکڑے چلا چلا کر اسے گالیاں دے رہی ہے۔

حرا مزادے"

حرام خور"

ماں کے خصم"

دونوں کے چاروں طرف خاصی بھیڑ اکٹھی ہوگئی تھی جو بڑھتی جارہی تھی۔ لڑکی چوکیدار سے کچھ مانگ رہی تھی جو غالبا اس کے پاس نہیں تھا۔ تھوڑی دیر میں پولیس بھی آگئی۔

ڈاکٹر اندر آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا سر زانوؤں تک جھک آیا۔

وہ سوچ رہا ہے۔ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ آج اچانک اس بے پناہ ذہین فلسفی کو کیا ہوگیا ہے۔

اس نے بڑے احترام سے ڈاکٹر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کیوں بلاوجہ اتنے پریشان ہو رہے ہیں۔ دنیا میں کیا کچھ نہیں ہوتا۔ دنیا کے چلانے کا ذمہ ہمارا آپ کا ہی تو نہیں ہے"

جب دیر تک ڈاکٹر نے سر اوپر نہ اٹھایا تو شانتی پھر بالکنی میں چلا گیا۔

نیچے پولیس ان دونوں کو پکڑے لیے جارہی تھی اور لوگ قہقہے لگا رہے تھے۔ اڑوس پڑوس کی عورتیں اور سو حقارت سے ناک بھوں سکوڑ رہے تھے۔ شانتی نے دیکھا اس نفرت کے ایکسپریشن میں استاد سلطان احمد کی فلمی ایکسٹرائیں بھی شامل ہیں۔

چائے پیتے پیتے ڈاکٹر نے کہنا شروع کیا۔ "اس ہنگامے کی آواز سن کر میں پیچھے گیا تھا کیوں کہ میں ڈر گیا تھا کہ وہ لڑکی کہیں ہمیں بھی ساتھ نہ لپیٹ لے۔"

"سو کیوں؟"

"کیونکہ یہ وہی لڑکی تھی جو رات تمہارے ساتھ ---"

چائے کا پیالہ شانتی کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔

ڈاکٹر کہتا گیا" میں نے دیکھا کہ اس نے مجھے پہچان کر بھی پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ جیسے وہ اس سے پہلے مجھ سے کہیں نہ ملی ہو۔ جب یقین ہوگیا کہ وہ ہمیں اس نئی الجھن میں نہ گھسیٹے گی تو میں واپس چلا آیا۔ تم بھی اطمینان رکھو۔ اس نے تمہیں بھی معاف کر دیا ہے"

جب شانتی نے کوئی جواب نہیں دیا تو ڈاکٹر کہنے لگا "ہے نہ حیرانی کی بات۔ ایک غریب چوکیدار جس کو بمشکل دس روپیہ ماہانہ ملتا ہے۔ جس کا سارا جیون پیسہ پیسہ بٹورتے گزر جاتا ہے اور جس کے لیے ایک پورا روپیہ ایک معنی رکھتا ہے کسی سے کھوٹا روپیہ کیوں لے گا۔ کھوٹا روپیہ اس کے پاس کہاں سے آئے گا۔ اگر آئے گا نہیں تو وہ کسی کو دے گا کیسے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"صبح کی ساری لے دے کی وجہ ایک کھوٹا روپیہ تھا۔۔۔ وہ لڑکی بضد تھی کہ وہ کھوٹا روپیہ اسے اس چوکیدار سے ملا تھا۔"

"تو وہی اس چوکیدار کے ساتھ گئی تھی۔ اگر وہ اس کے ساتھ گئی تھی تو ظاہر ہے کس لیے گئی تھی۔ اور اگر چوکیدار نے اسے روپیہ دیا تو ظاہر ہے کہ کیوں دیا' کس کام کے عوض دیا اور اگر جو روپیہ اسے چوکیدار سے ملا۔ کھوٹا ہے تو ظاہر ہے کہ ---"

"کچھ ظاہر نہیں ہے تم کچھ نہیں سمجھے۔"

شانتی نے طنزاً مسکراتے ہوئے کہا۔ "کھوٹا روپیہ اس کے پاس کہاں سے آیا"

"وہ کھوٹا روپیہ اسے ہم نے دیا تھا۔"

شانتی ایک دم سرد پڑ گیا۔

"ایک روپیہ اسے ہم سے ملا۔ ایک اس غریب چوکیدار سے۔ ایک ہی رات میں ایک ہی کام کے عوض مگر اس نے بغیر سوچے سمجھے طے کر لیا کہ وہ کھوٹا روپیہ اسے ہم نے نہیں دیا چوکیدار نے دیا ہے۔ ہم بھلا ایسا کیسے کرسکتے ہیں۔ ہم جو معزز و معتبر آدمی ہیں۔ بڑے لوگ ہیں" کہتے کہتے ڈاکٹر کا گلا رندھ گیا۔

"میں نے اسے چاندی کے دس روپے دیے تھے اوپر آکر میں نے دیکھا کہ وہ نو روپے یہیں چھوڑ گئی تھی۔ غالباً ---- اور جو ایک روپیہ وہ لے گئی تھی وہ کھوٹا تھا۔ یہ وہی روپیہ تھا جو تم نے مجھے بنک سے بدلوانے کے لیے دیا تھا وہ کھوٹا تھا۔ ان دس روپیوں میں وہی ایک کھوٹا روپیہ تھا۔

شانتی کے دماغ میں ایک چھن سی آواز ابھری۔ جیسے گرم توے پر تیل کا قطرہ گرنے سے پیدا ہوتی ہے اور اس کے کانوں کی لویں

تک سرخ ہوگئیں۔ اس کے اعصاب تن گئے۔

"نہیں نہیں شانتی تم مجھے اس طرح نہ گھورو۔ یہ جان بوجھ کر نہیں غلطی سے ہوگیا۔ میں جھگڑا مٹانے گیا تھا۔ مگر کچھ نہ کر سکا۔ اپنے طبقہ کے جھوٹے نام و ناموس میرے راستہ میں آگئے۔"

اس کے بعد دونوں چپ ہوگئے اور دیر تک کچھ نہ بولے۔ دونوں ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔ ایک رات کی آسودگی۔ اور یہ دام

"جرم و سزا کا کوئی ناپ تول نہیں ہوتا۔" پروفیسر نے پائپ سلگاتے ہوئے شانتی کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔

"اب جب کہ ہم سب کچھ جان گئے ہیں تو بلاوجہ ملول ہونے سے فائدہ! چلو اندر---- چائے بناتے ہیں۔"

سیپ کراچی ۔۔۲۶۹

ڈاکٹر انور نسیم

رہِ خزاں میں تلاشِ بہار

آج جب رضوی صاحب نے پروپوز کیا تو ساجدہ کو ایسے محسوس ہوا جیسے کمرے کی چھت دھڑام سے اس کے اوپر آن گری ہو۔ چائے کی پیالی اس کے ہاتھوں میں کانپنے لگی "دیکھئے نا! مس ساجدہ! مجھے تو صرف اپنی بچی کا خیال ہے' یہ آپ سے اتنی محبت کرتی ہے۔ ہر وقت ساجدہ آنٹی' ساجدہ آنٹی کی رٹ لگائے رہتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ آپ اس کی دیکھ بھال خوب کریں گی۔ میں بھلا کب تک اس کے بال سنوار سکتا ہوں؟ کچھ گھر کی دیکھ بھال بھی ہوتی رہے گی۔ فرنیچر کی بھرمار ہے۔ مگر سلیقہ کہیں نام کو نہیں۔" رضوی صاحب یہ سب کچھ یوں رک رک کر کہہ رہے تھے جیسے مدتوں سے وہ اپنے آپ کو یہ سب کچھ کہنے کے لئے تیار کرتے رہے ہوں اور اس وقت ان کی کیفیت وہی ہو رہی تھی جیسے کوئی نو آموز اداکار اسٹیج پر اپنے مکالمے بھول گیا ہو۔

"جی ـــ جی" الفاظ جیسے ساجدہ کے گلے میں چپک گئے ہوں۔

"ہاں ـــ ہاں! اپ سوچ لیجئے' ایسی کوئی جلدی نہیں اور پھر آپ کو بھی آرام رہے گا۔" جیسے رضوی صاحب کو کوئی بھولا ہوا فقرہ پھر سے یاد آگیا ہو۔ "نوکری کے اس جنجال سے جان بچ جائے گی۔"

"اچھا تو اب مجھے اجازت ....." اپنا جملہ مکمل کئے بغیر وہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی اپنے گھر کو چل دی۔ دونوں گھروں میں فاصلہ ہی کون سا تھا۔ بس ایک بینفری ہی تو تھی درمیان میں۔ وہ آتے ہی کانپتے جسم کے ساتھ پلنگ پر گر پڑی۔ اور تکئے میں منہ چھپا کر زار و قطار رونے لگی۔

"مس ساجدہ۔ مس ساجدہ" کوئی بڑے ہی دھیمے لہجے میں اس کو پکار رہا تھا۔ مگر کمرے میں تو وہ بالکل تنہا تھی۔ "تو مس ساجدہ آج کئی برسوں کے انتظار کے بعد تمہارا وہ شہزادہ آن ہی پہنچا۔ تم جو مدتوں سے آس لگائے بیٹھی تھیں کہ ایک دن ان سنسان پگڈنڈیوں پر قدموں کی ایک دھیمی چاپ ہوگی اور پھر سپنوں کا وہ حسین شہزادہ بڑی آہستگی سے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر کہے گا "ساجدہ رانی! تم میری منتظر تھیں ناں۔ دیکھو میں آگیا ہوں۔ بھلا پہچانو تو مجھے۔" اور وہ ہنس دے گی۔ اس ہنسی سے اس کے پرانے

گھاؤ بھر جائیں گے۔ اس کی روح کی منجمد تنہائیوں میں شہزادے کے پیار بھرے پھول آن بسیں گے۔ "دلہن بھلا میں تمہیں نہیں پہچانتی۔ پر تم نے اتنی دیر کیوں کر دی؟ میں تو کب سے تمہاری راہ تک رہی تھی۔"

مگر رضوی صاحب تو چالیس سے بھی تجاوز کر چکے تھے۔ یوں تو وہ پڑھے لکھے بھی تھے۔ شہر میں فرنیچر کے سامان کا اچھا خاصا کاروبار تھا۔ ہزاروں کی آمدنی تھی اور صرف ایک پانچ سال کی چھوٹی سی بچی۔ پیاری پیاری آنکھوں والی۔ دو سال پہلے ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ کتنی اچھی عورت تھی وہ۔ بڑی گھریلو قسم کی۔ ساجدہ کی اس سے خاصی دوستی تھی۔ مگر رضوی صاحب جن کے سر پر اب چند گنے چنے بال تھے، گول مٹول سا چہرہ، کنپٹیوں پر بے ترتیب سے بکھرے ہوئے کچھ بال، اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں جن پر ہر دم موٹے شیشوں کی ایک عینک رہتی تھی۔ بھاری بھر کم جسم، ہر روز صبح سیاہ شیروانی اور سفید شلوار پہنے، منہ میں پان دبائے اپنی دکان کو چل دیتے۔ بچی کو راستے میں سکول چھوڑتے اور پھر دن بھر میں پانچ کرسیاں، فی کرسی آٹھ روپے، یہ ہوئے کل چالیس روپے۔ لکڑی بہت مہنگی ہو گئی ہے۔ اچھے کاریگر نہیں ملتے۔ رضوی صاحب زندگی سے مطمئن تھے۔ کیونکہ ان کے لئے زندگی کی معراج ایک بیوی، چند بچے اور کاروبار میں دن بدن بڑھتا ہوا منافع تھا۔ ان سے اعلیٰ اقدار کے وجود کا انہیں کبھی احساس نہ ہوا تھا۔ بیوی، بچے اور کاروبار میں منافع۔ یہ کیا کم ہے جو دوسری باتوں میں الجھتے رہیں۔

ان کی بچی رخشندہ دن بھر ساجدہ آنٹی کے پاس رہتی۔ آنٹی آج ہماری میڈم کہہ رہی تھیں کہ کل پوری اے، بی، سی لکھ کر لانا۔ آنٹی، میڈم بڑی اچھی ہیں، آپ کی طرح۔ اور یوں ساجدہ جو تین کمروں کے اسی مکان میں تنہا رہتی تھی، اس کا دل بہل جاتا۔ وہ کبھی اس کے بال سنوارتی، کبھی یونہی اس کے ہونٹوں پر بہت سی لپ سٹک لگا چھوڑتی اور کبھی بالکل بچوں کی طرح اس سے "لک چھپ جانا ۔ مکئی دا دانہ، راجے دی بیٹی آئی جے" کھیلنا شروع کر دیتی۔ جیسے وہ تیس برس کی لیکچرار نہ ہو بلکہ ایک ننھی سی معصوم لڑکی بھی ہو۔ رخشندہ بہت پیاری بچی ہے۔ رضوی صاحب بہت اچھے انسان ہیں مگر..... مگر اور روتے روتے ساجدہ کی ہچکی بندھ گئی۔

گذشتہ پانچ سال سے وہ اس شہر کے کالج میں سائنس پڑھا رہی تھی۔ شہر سے تھوڑی دور ایک تنہا سے گوشے میں اس کا ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ مختصر سے لان میں اس نے اپنے پسندیدہ نرگس اور سرخ گلاب کے پھول اگا رکھے تھے۔ باہر کے ڈرائنگ روم میں دیواروں پر ہر طرف ہلکے رنگوں کی پینٹنگ، سونے کے کمرے میں ہلکے چاکلیٹ رنگ کے مہین پردے، اس کو بچپن سے ہی چاکلیٹ اور تصویریں کتنی پسند تھیں۔ جب وہ بچی تھی تو وہ کتنے شوق سے چاکلیٹ کھاتی، رنگ رنگ کی تتلیوں اور جاپانی تصویروں کو جمع کرتی تھی۔

پلنگ پر اوندھے منہ لیٹے تکئے میں منہ چھپائے اب بھی وہ مسلسل سسکیاں لے رہی تھی۔ آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی آنکھوں کے سامنے جانے کتنی ہی تصویریں ابھرنے لگیں۔ جیسے یہ سب کچھ ابھی کل ہی کی بات ہے۔ وقت کی پرواز کتنی بے آواز ہے۔ حال اور ماضی کتنے قریب ہیں۔ ہر لمحہ حال کو ماضی اور مستقبل سے پیوست کئے ہوئے ہے۔ اور یادیں ذہن کے نہاں خانوں میں کتنی روشن

اور اجاگر رہتی ہیں۔ جیسے ذہن میں حال ' ماضی اور مستقبل کا کوئی وجود نہ ہو۔ بس وقت کا سیل رواں ہے۔ حادثات اور عدم حادثات میں معلق زندگی ہے۔ اور یہ سب کچھ ایک دوسرے سے گڈ مڈ ہوا جاتا ہے۔

تقسیم سے پہلے وہ انبالہ کی چھاؤنی میں رہتے تھے۔ اس کا باپ فوج میں میجر تھا۔ گھر میں وہ سب سے چھوٹی تھی اور ڈیڈی ممی اس سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ وہ دن بھر جو چاہے کرتی تھی۔ صبح صبح کانونٹ اسکول کی بس میں اسکول جاتی تھی۔ جہاں سب کی سب عیسائی استانیاں انگریزی پڑھاتی تھیں۔ تبھی تو ساجدہ گھر لوٹتے ہی کہتی تھی "گڈ ایوننگ ڈیڈی!" اور میجر صاحب خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ کتنی سمارٹ بچی ہے۔ کتنی ذہین ہے۔ شام کو وہ اپنے لان میں تتلیوں کے پیچھے بھاگتی پھرتی۔ بیڈ منٹن کھیلتی' بہن بھائیوں سے جھگڑتی اور کبھی کبھار بھولے سے اپنی کتاب لے بیٹھتی۔ تب زندگی اس کے لئے پریوں کے دیس کی طرح حسین تھی۔ بچپن میں بھلا کیسے خیال آتا ہے کہ دکھ اور غم کا بھی کوئی وجود ہے؟

مگر جب وہ ساتویں جماعت میں پڑھتی تھی تو شہر کی فضا ایک دم بدل گئی۔ لوگوں کو جانے کیا ہوا یہ سب کچھ تو اس کے ذہن میں ادھ مٹے نقوش کی طرح باقی تھا۔ شیلا جو اس کی اتنی پیاری سہیلی تھی اب اس سے بہت کم باتیں کرتی اور کہتی "شیلا ڈیر! آؤ میرے گھر چلو میں تم کو اپنی البم دکھاؤں گی۔" تو شیلا جانے کیوں ہمیشہ ہی ٹال دیتی۔ ساجدہ کا ذہن کبھی بھی اس تبدیلی کو نہ سمجھ پایا۔ مگر اف وہ خوفناک رات اس کے تصور سے وہ اب بھی کانپ جاتی۔ اس کے ڈیڈی کہیں شہر میں ڈیوٹی پر گئے ہوئے تھے۔ گھر کی ساری فضا میں ایک عجیب خوفناک سناٹا تھا۔ جانے یہ سب لوگ کیوں ہراسان اور خوفزدہ ہیں۔ ایک گھمبیر قسم کی خاموشی "ممی! ڈیڈی کیوں نہیں آئے؟ مجھے ان سے اگلا lesson پڑھنا ہے۔"

"ابھی آجائیں گے سجو رانی۔ تم اب ' سو جاؤ صبح سبق پڑھ لینا۔"

"نہیں! ہم ڈیڈی کو گڈ نائٹ کہے بغیر نہیں سوئیں گے۔" موٹر کے پہیوں کی آواز اب تک اس کے ذہن میں باقی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اس آواز کے نیچے خود کچلی جا رہی ہو۔ پہیوں کی صدا! ڈیڈی آگئے۔ وہ بھاگ کر دروازے تک گئی۔

"ہیلو ڈیڈی!....." اس کے ذہن نے اس سے آگے سوچنے سے انکار کردیا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا سانحہ تھا۔ اس کا دماغ جیسے بالکل ماؤف ہوچکا ہو۔ ڈیڈی کے بغیر زندگی کتنی نامکمل ہوگی۔ رات کو اتنے سارے اوٹ پٹانگ سوالوں کا جواب کون دیا کرے گا۔ آنسو بہاتے بہاتے اس کی آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں مگر جانے والوں کی یاد میں کوئی کب تک آنسو بہا سکتا ہے؟ ہم ہر قدم پر حادثات زمانہ اور آلام زندگی سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

چند ہی دنوں بعد وہ سب لاہور چلے آئے۔ اس کا بڑا بھائی تو خود ابھی فورتھ ایئر میں پڑھتا تھا۔ آمدنی کا کوئی معقول ذریعہ تو تھا نہیں۔ وہی بس کچھ پہلے کی جمع کی ہوئی رقم تھی۔ اب ساجدہ کیسے کانونٹ میں پڑھنے جاتی اور یوں بھی اب اس کا پڑھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ وہ دو سال یونہی بیکار گھر میں بیٹھی رہی۔ گھر کے کام کاج میں امی کا ہاتھ بٹاتی۔ کبھی کبھار "طلسمی باغ" اور "بہادر شہزادہ" پڑھنے

بیٹھ جاتی۔ یہ شہزادہ کتنا اچھا ہے۔ جو اتنی مصیبتیں اٹھا کر سنگلاخ چٹانوں اور مہیب جنگلوں سے گذر کر دیوؤں کی قید سے شہزادی کو چھڑا لاتا ہے اور پھر وہ دونوں شادی کر کے ہنسی خوشی زندگی گذارنے لگتے ہیں۔ "ہائے! اگر میں بھی شہزادے کو جانتی تو....." یہ معصوم سا جذبہ بے اختیار اس کے ذہن میں ابھرتا۔ "دیکھو سجورانی۔ تم اداس بالکل نہ ہو۔ میں ملازمت ملتے ہی تمہیں دوبارہ اسکول بھیج دوں گا۔" اس کا بھائی فرخ ہمیشہ اس سے یہی کہتا اور پھر کچھ عرصہ بعد واقعی وہ دوبارہ اسکول جانے لگی۔ پرانے زخم آہستہ آہستہ وقت کے ہاتھوں مندمل ہونے لگے۔ انسان کی ساری زندگی زخم کھانے اور پھر انہیں بھولنے کی کوشش میں بیت جاتی ہے اور پرانے زخم بھول جاتے ہیں تو نئے صدمے استقبال کرتے ہیں۔

ایک تو وہ دوسری لڑکیوں سے یوں بھی عمر میں کچھ بڑی تھی اور پھر ان محرومیوں نے اسے تنہائی پسند بنا دیا تھا۔ وہ اکثر سب سے الگ الگ رہتی تھی۔ لڑکیاں اسے چھیڑنے کو کہتیں "ہے۔ ہے۔ رانی کا مزاج ہی نہیں ملتا۔ کیسی نک چڑھی ہے۔"

اور اس محرومی اور تشنگی کے احساس سے فرار کی ایک راہ اسے کتابوں کی دنیا میں مل گئی۔ وہ تصویریں بناتی' نئی نئی کتابیں پڑھتی اور یوں وقت گذرتا رہا۔ اس نے صدمات سہنے اور انہیں بھولنے کی کوشش کا صدیوں پرانا کھیل پھر سے دھرادیا۔

کالج کا زمانہ تو اس کی زندگی کا حسین ترین دور تھا۔ اور پھر یونیورسٹی کے ہنگاموں میں تو وہ اپنے سارے دکھ درد بھول گئی۔ وہ کالج میں مصوری کی سوسائٹی کی سیکرٹری تھی۔ وہ مباحثوں میں ہمیشہ پہلا انعام لیتی۔ کالج میگزین کے لئے غزلیں لکھتی۔ موسیقی کی محفلوں میں شرکت کرتی اور تب اسے ہمیشہ یہ احساس ہوتا کہ اس کی ذات کائنات کا مرکز ہے۔ زندگی رنگین سایوں اور ہیولوں کا ایک دلچسپ اور حسین رقص ہے۔ اس کے اردگرد ہر طرف رنگینیاں تھیں۔

"اف اللہ' آج کتنی بوریت ہے۔ امی دن بھر کام کرنے کو کہتی رہتی ہیں۔" اس کی کوئی دوست جماہی لے کر کہتی اور خود ہی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتی "اور بھی سنا ہے۔ آج کل عابدہ کو ڈاکٹر صاحب کے لیکچر ذرا بھی سمجھ میں نہیں آتے۔ اس لئے تو بے چاری کو ہر روز ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں جانا پڑتا ہے۔"

"ہش۔ ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔" عابدہ بے چاری تو اپنی علمی تشنگی کے ہاتھوں مجبور ہے۔ جاننے کی یہ خواہش تو بہت پرانی ہے اور تم ہو کہ تمہاری Scandal nerve ہر لحہ پھڑکتی رہتی ہے۔" ساجدہ جواب دیتی۔

"یہ تو میں بھی کہوں گی کہ آج کل جب عابدہ کلاس میں انگڑائی لیتی ہے تو ڈاکٹر صاحب بے چارے بے حد نروس ہو جاتے ہیں۔ ساری ڈیمانسٹریشن بھول جاتے ہیں۔"

"اے' بے شرم کہیں کی۔ ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔"

"کالج کا تازہ اسکینڈل زیر بحث ہے۔ جلیل صاحب انگریزی شاعری پڑھاتے ہوئے اکثر بہک جاتے ہیں۔"

بھئی فوزیہ تم خدارا ان کی کلاس میں مت جایا کرو۔ خواہ مخواہ بے چارے لڑکوں کا بھی نقصان ہوتا ہے۔"

"تمہاری قمیص کا یہ اتنا شوخ پرنٹ تو مجھے اچھا نہیں لگتا ہے۔"

"ہائے، نہیں اتنا سویٹ ہے۔ تمہاری تو بس چوائس ہی عجب بے تکی ہے۔ خواہ مخواہ اپنے ہونے والے شوہر کو بھی مصیبت میں مبتلا کروگی۔ "اف" سبھی لڑکیاں ایک دبی دبی سی ہنسی ہنس دیتیں۔ بحث اب نازک ترین دور میں آن پہنچی تھی۔

زندگی میں رنگین سایوں کا رقص! کتنا حسین دور تھا وہ۔ اور

پھر عابد کا وجود۔ عابد جو کالج میگزین کا ایڈیٹر بھی تھا۔ جو افسانے لکھتا تھا۔ ستار بجاتا تھا۔ انتہائی ذہین، باتونی، خوش مزاج، ادب اور آرٹ کا شیدائی۔

"دیکھئے مس ساجدہ پلیز۔ میگزین کے لئے کوئی نئی چیز دیجئے۔"

"بھائی۔ فرصت ہی کہاں ہے؟"

وہ اترائی "نمائش قریب آرہی ہے۔ اتنی ساری تصاویر جمع کرنی ہیں اور پھر کالج کا سالانہ مباحثہ بھی قریب ہے۔"

"مس ساجدہ۔ آپ کی تصاویر کے متعلق ایک چیز جو بے حد نمایاں ہے" عابد پوری سنجیدگی سے تنقید کرنے کے موڈ میں آجاتا۔

"جی وہ کیا ہے؟" وہ دلچسپی کا اظہار کرتی۔

"وہ یہ ہے کہ آپ کی سب تصویریں انتہائی بے کار اور مقصد سے خالی ہوتی ہیں۔"

"جی ہاں، بالکل آپ کے افسانوں کی طرح۔" وہ چڑ جاتی۔

"اچھا، یہ کہئے۔ آپ کی ان عظیم تحقیقاتی کاوشوں کا کیا حشر ہوا۔ وہ جو آپ چند بیکار قسم کے کیمیکلز کو دن بھر ملاتی رہتی ہیں اور سمجھے یہ بیٹھی ہیں جیسے چند دنوں میں ہی آپ کا شمار "فلیمنگ" اور "مادام کیوری" جیسے لوگوں میں ہونے لگے گا۔ میرا خیال ہے اب کافی ہو چکا ہے۔ اب جانے دیجئے۔"

"جی وہ تو خیر ٹھیک ہے۔ مگر آپ جو فرائڈ اور یونگ کے جانشین بن کر انسانی ذہن کی گتھیاں سلجھانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اور آپ جو Normal behaviour of child پر تحقیقات کر رہے ہیں، یہ بھی تو خود کو دھوکا دینے کے مترادف ہے!"

"مس ساجدہ کیا خیال ہے آپ کا۔ غالب اردو کا عظیم ترین شاعر تھا؟"

"جی ہاں، میر کے بعد۔"

"مگر آپ اور شاعری تو دو متضاد چیزیں ہیں۔ ویسے میرا ذاتی خیال ہے کہ خواتین کو کلیات میر کی بجائے "رضیہ کا شاہی دسترخوان" پڑھنا چاہئے۔ اور آزاد نظم پر گفتگو کرنے کی بجائے سوئٹر کے نئے نئے نمونوں اور چھوٹے بچوں کی پرورش پر زور دار بحث کرنی چاہئے۔"

"جی۔ ادب کی جاگیر تو مردوں کے نام لکھی ہوئی ہے۔"

"دیکھیے ایک بات تو یقینی ہے کہ آپ غزل بہت اچھی کہتی ہیں۔"

"جی شکریہ۔ مگر آپ کی بلا جانے غزل کیا شے ہے۔"

"آپ کی غزلوں میں ایک شعر کے دو مصرعوں میں جو معنوی لاتعلقی اور بے نیازی ہوتی ہے' وہ یقیناً قابلِ داد ہے۔ یوں سمجھئے کہ وہ مختلف نظموں کے دو مصرعے دکھائی دیتے ہیں۔ اچھا خیر' یہ سب جانے دیجئے۔ ایک کام کی بات کہنے آیا تھا۔"

"اوہ' تو آپ بھی کام کی بات کیا کرتے ہیں؟ عجیب سا لگتا ہے۔ یقین نہیں آتا۔" ساجدہ نے پھر چوٹ کی

"نہیں سچ" شرارت کی وہ مسکراہٹ اب اس کے چہرے سے غائب ہو چکی تھی۔ "ہم سب کل پک نک پر جا رہے ہیں۔"

"جی مبارک ہو! مہمانوں کو مدعو کرنے کی اجازت ہے۔"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ آپ یقیناً عابدہ کو بلا رہے ہوں گے۔"

"تو یہ بے چاری لڑکیاں' کتنی حاسد ہوتی ہیں۔" ساجدہ کا موڈ بگڑ رہا تھا۔

"اوہ۔ اوہ۔ آپ تو ماشاء اللہ کافی سلجھی ہوئی خاتون ہیں۔ اچھا تو کل آیئے گا نا!

"جی سوچوں گی۔"

"شام سے پہلے فیصلہ کر لیجئے گا۔" اور وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔

راوی کے کنارے پر جب طوفانِ رنگ و بو اور بے فکر نوجوانوں کے ہجوم کو قہقہوں کے اس طوفان سے نجات ملی تو سب نے اصرار کیا کہ عابد ستار بجائے۔ دائرے کی شکل سب اس کے اردگرد بیٹھ گئے اور وہ ایک مشاق ماہر فنکار کی طرح تیزی سے ستار پر اپنی انگلیاں چلا رہا تھا۔ اس نے سوچا "اگر ساری زندگی ایسے ہی بیت جائے تو..." ستار کے تاروں میں ایک ارتعاش پیدا ہوتا اور پھر مدھ سر فضا میں بکھرنے لگتے۔

ساجدہ پہلے تو تھوڑی دیر خاموش رہی۔ اور پھر وہ بولی "اوہ۔ تو یہ آپ ستار بجا رہے تھے۔ میں تو سمجھی کوئی بچہ یونہی ستار کے تاروں سے کھیل رہا ہے۔"

"فنِ موسیقی کے متعلق آپ کی معلومات کا اندازہ تو اب خوب لگایا جا سکتا ہے۔"

تھوڑی دور یونیورسٹی کی بس ان کی منتظر تھی۔ وہ بڑی آہستگی سے قدم اٹھاتے ہوئے اس طرف جا رہے تھے۔ ہوا میں رچی ہوئی ہلکی ہلکی خنکی' ریت پر ان کے قدموں کی چاپ۔

"نہیں نہیں۔ اسے ایسا نہیں سوچنا چاہئے۔" ان کے تعلقات کی نوعیت تو کچھ عجیب سی تھی۔ اس کے جذبات اور ذہن' عابد کے ذہن اور جذبات سے پیار کرتے تھے۔ ان کا اندازِ فکر ایک سا تھا۔ وہ دونوں زندگی میں حسن کے متلاشی تھے۔ ادب' موسیقی اور مصوری کے شیدائی۔ اس لگاؤ میں تقدس کا بھی ایک عنصر شامل تھا۔ وہ جیسے مندر کے اس دیوتا کی داسی اور پجارن ہو۔ جو اس کے

قدموں پر چاہت کے پھول نچھاور کرنے کی خواہش مند ہو۔ اسے عابد کے گوشت پوست کے جسم سے پیار نہ تھا۔ اس کو اس کے ستار کے تاروں پر تیزی سے چلتی ہوئی نازک نازک انگلیوں سے لگاؤ تھا۔ اس کے ذہن کے تخلیقی صلاحیتوں سے پیار تھا۔ چاہت کا یہ انمول' اچھوتا اور نازک جذبہ گھائل ہو جائے گا۔ پھر وہ دونوں' لڑکوں اور لڑکیوں کے اس ہجوم میں شامل ہو جائیں گے جو دن بھر محض فلرٹ کرنے کی خاطر ایک دوسرے سے گپ لگاتے ہیں۔ اور میرا بائی کے مجنوں' کبیر کے دوہوں' میر کے شعروں کی یہ دیوانی لڑکی اس ہجوم سے یقیناً بہت مختلف تھی۔ ہو سکتا ہے وہ بھی لاشعوری طور پر اس ہجوم کا ایک فرد ہو اور یہ سب کچھ اس نے خواہ مخواہ اپنے ذہن پر مسلط کر رکھا ہو۔

یہ پردہ! مگر یہ پردہ ہی تو اس کی ساری شخصیت تھی۔ اگر یہ پردہ بھی اٹھ جائے تو اس کی ساری شخصیت بری طرح مجروح ہو جائے۔ وہ درد کے اس بوجھ سے کراہنے لگے اور ساری عمر سسکیاں لیتی رہے۔

نرم ٹھنڈی ریت پر آہستگی سے چلتے ہوئے وہ دونوں یوں خاموش تھے جیسے ان کی آواز سے فضا کا سارا طلسم ٹوٹ جائے گا۔

"ساجدہ" عابد نے بڑی مشکل سے کہا۔

"جی"

"تم بہت اچھی لڑکی ہو۔"

"جی"

"میں سوچتا ہوں کہ....."

خالد دور کھڑا چلا رہا تھا۔ "اوئے عابد۔ جلدی چلو یار۔ بس واپسی کو تیار ہے۔"

"میر اور غالب کا موازنہ اب ملتوی کردو۔"

امتحان قریب آرہا تھا۔ اس لئے وہ اور زیادہ شدت سے اپنی ریسرچ کے پیچھے لگ گئی۔ دن بھر وہ اپنی لیبارٹری میں بیٹھی مختلف کیمیکلز کو ملاتی رہتی۔ تھک جاتی تو تھوڑی دیر کے لئے یونیورسٹی کا ایک آدھ چکر لگالیتی۔ رنگین سایوں کے اس رقص کے باعث اس نے زندگی میں ایک Attitude بنالیا تھا۔ زندگی اس کے لئے میرا کے بھجن تھی' کیٹس کی نظم تھی' بیتھوان کا نغمہ' ستار کے تاروں میں سے نکلتی ہوئی آواز تھی۔ آسمان پر بکھری ہوئی کہکشاں تھی۔ زندگی بہاروں میں کھلنے والی کومل کلی تھی۔ غالب کا تخیل' پکاسو کی تصویر تھی۔ زندگی کے متعلق اس کے تصورات کتنے حسین تھے۔ زندگی جہاں چاہت ہے۔ موسیقی ہے۔ مصوری ہے۔ کیسی خوبصورت دوشیزہ ہے۔ زندگی جس کے انگ انگ سے جوبن پھوٹ رہا ہے اور اگر کبھی یہ سپنے ٹوٹ گئے۔ حقیقت کے بھیانک چہرے تلے رنگین سایوں نے دم توڑدیا تو..... یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

کبھی کبھار جب وہ بالکل تنہا بیٹھی اپنی ریسرچ میں مصروف ہوتی' لیبارٹری میں مکمل خاموشی ہوتی' وہ بڑی دل جمعی سے کیمیادی

مرکبات کے امتزاج سے پیدا ہونے والے رنگوں کو دیکھتی رہتی۔ دوپہر کی گرم لو کے باعث ایک اکتاہٹ اور بے حسی کا عالم ہوتا۔ وہ سوچنے لگتی جانے مستقبل میں کیا ہوگا؟ مستقبل کا سوچتے ہوئے اس کی آنکھیں بند ہونے لگتیں۔

"ہیلو ڈارلنگ۔ دیکھو مجھے آج شام ذرا کلب کے سالانہ ڈنر پر جانا ہے' اس لئے گھر ذرا دیر سے آؤں گا۔ ہاں' ہاں' برا مت مناتا۔"

"مگر وہ جو شام کو شاپنگ کا پروگرام بنایا تھا۔ آپ کو بھلا ہمارے ساتھ جانے کی فرصت ہی کب ہے۔ یہ بس کلب۔"

"نہیں ڈیئر۔ تم ایسے کرو کہ شام کو ڈرائیور کے ساتھ شہر چلی جاؤ۔ میں گاڑی بھجوادوں گا۔ اور ہاں میرے لئے کچھ مت لانا۔ اپنے لئے کتھئی رنگ کی ساڑھی ضرور خرید لینا۔ اور ہاں جمی کے لیئے کرکٹ کا چھوٹا بلا۔ وہ ہر روز مجھے تنگ کرتا ہے۔"

اس نے ٹیلی فون کا ریسیور رکھا اور خود اس نرم وگداز صوفے میں لیٹ گئی۔ کوئی ناول پڑھ رہی تھی شاید۔ اوہ تو جمی کے بچے شور ..... مگر وہ تو بے خیالی میں تیزاب کے قطرے ٹیوب کے بجائے اپنی انگلیوں پر گرا رہی تھی۔

یوں تو ہر نوجوان لڑکی کے گھر میں ایک آدھ کار' ایک خوبصورت ڈائننگ روم' ٹیلی فون کلب کے سالانہ ڈنر کی صدارت کرنے والا حسین شوہر ضرور ہوتا ہے۔ اگر خواب اور اس کی تعبیر میں اتنا شدید تضاد نہ ہوتا تو زندگی یقیناً بہت زیادہ حسین ہوتی۔

امتحان ختم ہوگیا اور اب وہ گذشتہ پانچ سال سے اس کالج میں سائنس پڑھا رہی تھی۔ اس کے معمول میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔ ابھی تک تو یونیورسٹی کی یادوں کا خمار باقی تھا۔ وہ کالج میں اسی شدت سے تمام سرگرمیوں اور ہنگاموں میں دلچسپی لیتی۔ مباحثوں میں شرکت کرتی۔ کالج میگزین کے لئے لکھتی۔ کالج کا ڈرامہ بھی اس کے سپرد تھا۔ گھر لوٹتی تو کمروں کی سجاوٹ میں نت نئے اضافوں کی فکر میں رہتی۔ پہلا سال تو یونہی بیت گیا۔ وہ رنگین سایوں کا رقص' ہنگامے اور زیادہ دلچسپ ہوگئے تھے۔

گرمیوں میں کالج بند ہوا تو وہ گھر لاہور چلی گئی۔ کیونکہ اس کا دل بھی اب خاصا اداس ہو چلا تھا۔ فرخ بھیا سے ملاقات کی خواہش۔ راشدہ جو اس کی بڑی بہن تھی' اس کی بچی کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ امی جانے کیسی ہوں گی؟

لاہور کے قیام کے دوران ایک بظاہر بڑا ہی معمولی واقعہ ہوا۔ مگر نہ جانے کیوں وہ واپس آکر بھی اب تک کوشش کے باوجود عائشہ آپا کے اس ایک جملے کو نہ بھول سکی تھی۔

عائشہ آپا اس کی کہیں دور پرے کی رشتے کی کزن تھیں۔ وہ سب لوگ کراچی میں رہتے تھے۔ ساجدہ کو تو یاد بھی نہیں تھا کہ اس نام کی اس کی کوئی کزن بھی ہے یا نہیں۔

تقسیم سے پہلے جب وہ شاید ۱۵ سال کی تھی اور اس کے ساتھ اس کی امی اور ایک گول مٹول سا گورا چٹا لڑکا دیکھا تھا۔ ساجدہ کی امی نے اسے بتایا کہ اسی لڑکے کا نام اعجاز تھا۔ وہ آج کل فوج میں کیپٹن ہے۔

"ہوگا میری بلا سے۔" امی نے لاپرواہی سے کہا۔ وہ لوگ حال ہی میں کراچی سے لاہور آئے تھے۔ شام ہوئی تو موٹر سائیکل پر

اعجاز صاحب فرخ بھیا سے ملنے آن دھمکے۔ ڈرائینگ روم میں بیٹھے وہ لوگ چائے پی رہے تھے۔ اس نے دروازے کی اوٹ سے جھانکا۔ "ہوں! ہے تو ہینڈسم لڑکا۔ جسم تو بے حد متناسب ہے۔ رنگ ذرا زیادہ ہی گورا ہے۔ مگر اس میں بھلا کیا برائی ہے۔ مگر بے چارہ کیسی بے کار سی باتیں کرتا ہے۔

"آج کل تو صبح چھ بجے پریڈ کے لئے جانا پڑتا ہے۔"

تو یہ ہے۔ ان بیچارے فوجیوں کو تو سوائے پریڈ کورٹ مارشل اور اپنے میسز کے علاوہ کوئی بات سوجھتی نہیں۔ چ چ! "کیوں بھئی۔ کیا تاک جھانک ہو رہی ہے۔ لڑکا پسند آیا"۔ یہ راشدہ کی آواز تھی۔

وہ ایک دم شرما گئی" ارے نہیں۔ میں تو یونہی ذرا فرخ بھیا کو دیکھ رہی تھی کہ اس بے چارے کو خواہ مخواہ متاثر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اعجاز جب چلا گیا تو فرخ بھیا نے اندر آتے ہی اعلان کیا" کل شام عائشہ آپا یہاں آئیں گی۔ آپ لوگ اتنے بے مروت ہیں کہ اتنا بھی نہ ہوسکا کہ انہیں کھانے پر ہی بلا لیتے۔ آخر اپنے رشتہ دار ہیں۔"

"ہاں جی بڑا گہرا رشتہ ہے' پہلے تو جب ہم پر مصیبت کے دن تھے تو کسی کو خیال نہ آیا۔ اب جانے کیا ہوا۔" راشدہ نے کہا۔

فرخ بیٹا۔ یہ سب لوگ ایسے با مروت تو نہ تھے۔ جانے اب عائشہ آپا کو کیا خیال آیا۔" امی بولیں۔

"مجھے یوں لگتا ہے کہ ہماری ساجدہ کے دن اب تھوڑے ہی ہیں۔" راشدہ نے حسب عادت چوٹ کی۔

"ہش" ساجدہ نے فرخ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے کنکھیوں سے دیکھا

کل نمائش آرہی ہے۔ تو کون سی قیامت ہے۔ فوجی آدمی سے شادی کرنا خواہ مخواہ دن بھر اپنا ہی کورٹ مارشل ہوتا رہے۔ مگر کون اس... مگر کون اس کے گلے آن پڑا ہے۔ انکار بھی کیا جاسکتا ہے۔ ویسے اعجاز ہے بڑا ہینڈسم۔ مگر محض خوبصورت ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ ذہن اور روح کی عظمت ہی انسان کی اصل عظمت ہے۔ وہ اعجاز کو بار بار اپنے آئیڈیل پر رکھ رہی تھی۔ اور اسی الجھن میں اسے نیند آگئی۔

شام کو عائشہ آپا آئیں گی۔ بڑی مدت کے بعد ملاقات ہوگی۔ گھر کی صفائی تو خوب کرلینی چاہئے۔ اپنا کوئی مقصد تھوڑا ہی ہے۔ پھر بھی رشتہ داروں میں اپنا وقار برقرار رکھنا پڑتا ہے۔ آج خوبصورت کپڑے پہن لینے اور ہلکا سا میک اپ کرلینے میں بھی کیا حرج ہے۔ بھئی لباس کا تو خیال کرنا پڑتا ہی ہے۔ کہیں اس کے شعور میں واقعی یہ خواہش تو نہ تھی کہ عائشہ آپا اسے پسند ہی کرلیں۔ توبہ! توبہ!

"لاجواب! واہ! آج تو ہجو رانی واقعی بے حد خوبصورت لگ رہی ہے۔ اب دیکھیں وہ کپتان صاحب بچ کر کیسے نکلتے ہیں۔" راشدہ نے پھر چوٹ کی

تم بات کا بتنگڑ بنانے میں خوب ماہر ہو۔ کون مرا جارہا ہے اس چینی گڈے پر۔ یوں ہی ذرا کپڑے پہن لیئے تھے سبھی کو دلہن بننے کا

ارمان ہوتا ہے۔ مگر ایسی جلدی اچھی نہیں۔ راشدہ یہ کہ کر ہنستی مسکراتی دوسرے کمرے میں چلی گئی

عائشہ آپا آگئیں۔ بالکل سانچے میں ڈھلی ہوئی تیس سالہ عورت۔ بھاری بھرکم جسم تیکھے نقوش اور ٹھہر ٹھہر کر گھریلو معاملات پر باتیں کرنے والی عورت ڈرائنگ روم میں ساجدہ اس کی امی اور عائشہ آپا بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ راشدہ باورچی خانے میں چائے بنانے میں مشغول تھی۔

"کراچی میں سبزی بہت مہنگی تھی۔ لاہور میں کالی مرچ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔ اعجاز کو تو سبزیاں بہت مرغوب ہیں۔ جب چند منٹ ایسی ہی باتیں ہو چکیں تو عائشہ آپا نے رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا "خالہ جان ساجدہ کہاں ہے؟ اس کو بھی تو بلایئے نا!"

ارے اس کی امی ایک دم گھبرا سی گئی تھی۔

"یہی تو ساجدہ ہے..."اور عائشہ آپا جیسے چونک گئی ہوں۔ "اوہ اچھا" میں سمجھی یہ راشدہ ہے"

"عجیب عورت ہے۔ ایک شادی شدہ عورت جس کا ایک بچہ بھی ہے۔ راشدہ اور ساجدہ میں جیسے کوئی فرق ہی نہ ہو۔ اوہ۔ بڑی آئیں بے چاری۔"

کیا وہ سچ مچ راشدہ ہے۔ کیا اس کی عمر ڈھل چکی ہے۔ نہیں۔ نہیں۔ خوہ مخواہ عائشہ آپا کا دماغ چل گیا ہے۔ وہ تو ابھی گڑیا سی لگتی ہے۔ وہ تھوڑی دیر بعد کوئی بہانہ بنا کر وہاں سے چلی گئی۔ اس کا وہاں بیٹھنے کو بالکل جی نہیں چاہتا تھا۔ اور آج بھی کئی سالوں بعد جب اسے خیال آتا۔ "اوہ میں سمجھی یہ راشدہ....." تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے ذہن میں چیونٹیاں رینگ رہی ہوں۔

لاہور سے واپس آکر وہ پھر اپنے کالج کے ہنگاموں میں مگن ہوگئی۔ لیکن اب اس کا رویہ کچھ بدل چکا تھا۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے جسم کے ہر حصے کو بغور دیکھتی۔ نہیں! نہیں! وہ تو ۲۷ سال کی قطعاً دکھائی نہیں دیتی۔ کل ہی تو مسز باجوہ سٹاف روم میں کہہ رہی تھیں' "ساجدہ تم یوں تو عمر میں مجھ سے چند سال ہی چھوٹی ہو مگر سچ بالکل گڑیا لگتی ہو۔" ہوں یہ مسز باجوہ بھی عجیب عورت ہے۔ بیچاری چالیس سال سے بھی کم کیا ہوگی' خواہ مخواہ سیٹنگ کٹوا کر....."

مگر اب انتظار تو کافی ہو چکا تھا۔ اس کا آئیڈیل اسے کیوں نہیں مل جاتا۔ انسان زندگی بھر اپنے آئیڈیل کی تلاش میں رہتا ہے اور جب کبھی یہ گمان ہوتا ہے کہ ہاں یہی تو میرا آئیڈیل تھا۔ میں نے اپنے آدرش کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ ذرا قریب جایئے تو محسوس ہوگا کہ یہ بھی محض شائبہ تھا اور ابھی شاید کچھ دور ہے مگر تلاش جاری رہتی ہے۔ اور یہی تلاش زندگی کا حاصل ہے۔

یوں تو مصروفیات کے اسی انبار تلے یہ تمام خیالات دبے رہتے مگر کبھی کبھار جب وہ رات کو تنہا اپنے برآمدے میں لیٹی سونے کی کوشش کر رہی ہوتی تو اسے عجیب عجیب خیال آتے۔ یہ جو یونیورسٹی میں اتنے سارے Gallant قسم کے لڑکے دن بھر اس کے پاس آیا کرتے تھے' کہیں ایسے تو نہیں کہ کسی ایسے درخت کی ٹھنڈی اور گھنی چھاؤں تلے جس میں رس بھرے پھل لگے ہوں' مسافروں کا منتظر رہتا ہے اور سال بیتنے کے ساتھ ساتھ پتے جھڑنے لگتے ہیں۔ پھلوں کا رس غائب ہونے لگتا ہے۔ درخت کی چھاؤں اب گھنی

نہیں رہتی۔ تا کھوکھلا ہوجاتا ہے۔ اور پھر کوئی مسافر..... وہ ایک دم چونک جاتی۔ میں بھی کتنی عجیب ہوں۔ یہ تصور اور تخیل بھی عجیب چیز ہیں۔ جانے کیسے کیسے بھیانک خیال اور خوشگوار سپنے ان کی مدد سے تخلیق ہوتے ہیں۔ اسے ایسا نہیں سوچنا چاہئے۔

چند دن بعد لاہور سے راشدہ کا خط آیا۔ سب خیریت سے ہیں۔ فرخ بھیا اچھے ہیں اور ہاں ایک دلچسپ بات وہ چینی گڑا تھا نا' کیپٹن اعجاز' اس کی شادی ہو رہی ہے' ایک لیڈی ڈاکٹر سے۔ آپا عائشہ بہت خوش ہیں۔ جانے کیوں اسے ایک دھچکا لگا "اوہ میں سمجھی یہ راشدہ ہے۔" یہ شاید زندگی میں اس کی پہلی شکست تھی۔ وہ تو جیتنے کی عادی تھی۔ کیپٹن اعجاز اسے پروپوز بھی کرتا تو وہ یقیناً انکار کردیتی۔ ذہن اور روح کی عظمت' لیکن یہ تو اس کی شکست تھی۔ عائشہ آپا تو کہتی ہوں گی کہ لڑکی کی عمر زیادہ تھی۔ کہنے دو۔ دنیا میں لوگ کیا کیا نہیں کہتے۔ لیکن جانے کیوں وہ دل برداشتہ ہو رہی تھی۔ اصل میں وہ ضرورت سے زیادہ حساس تھی نا۔ نہیں۔ ۲۸ سال کی عمر بھی تو کچھ کم نہیں ہوتی۔ اور پھر اس کا احساس تنہائی شدید ہوجاتا۔ اور سلگتی ہوئی یہ دھیمی آنچ کسی کے قرب کی یہ شدید خواہش' ایک خلا کی صورت اختیار کرلیتی۔ اسے یوں لگتا جیسے تنہائی کی ان زنجیروں میں جکڑی ہوئی وہ سسک رہی ہو۔

چاندنی رات میں وہ اپنے برآمدے میں لیٹی ہوتی۔ وہ آہستگی سے اپنی آنکھیں بند کرلیتی۔ تخیل کی بے راہ روی اسے پھر جانے کہاں کہاں بھٹکنے کے لئے لے جاتی۔ دن بھر میں کتنی مصروف رہتی ہوں۔ پھر کون جانے میرے دل کو تنہائی کیسے گھیرے رہتی ہے۔ دل کی ہر رہگزر سونی سونی سی ہے۔ کہیں قدموں کی کوئی چاپ نہیں۔ میرا دل تو اس خزاں زدہ پتے کی طرح تنہا ہے جسے پت جھڑ کی کسی شام تیز ہوا اڑائے لئے پھرتی ہے۔ یہاں ان کھنڈروں کی سی ویرانی ہے جہاں ڈر کے مارے کوئی قدم نہیں رکھتا۔ نیند کے کسی جھونکے کے ساتھ پھر انہی ویران پگڈنڈیوں میں قدموں کی ایک ہلکی سی چاپ ابھرتی' عابد مسکراتا ہوا چلا آتا۔ وہ قریب آرہا ہے۔ "ساجدہ بی۔ تم اتنی اداس کیوں ہو۔ تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا ہے۔ ان میں ناکام حسرتوں کے یہ دیئے کس نے جلا دیئے ہیں؟" وہ چونک کر اپنی آنکھیں کھول دیتی ۔ مگر وہ تو اپنے برآمدے میں تنہا لیٹی چاند کو تک رہی تھی۔ پھر ایک عجیب سا احساس اسے ہوتا۔ جیسے وہ بچپن کی کہانیوں کی شہزادی کی طرح کسی قوی ہیکل دیو کی قید میں ہو اور کوئی شہزادہ چٹانوں کو پھلانگتا ہوا اور جنگلوں کو روندتا ہوا آئے گا۔ مگر اس وقت تو سپنوں کا شہزادہ کہیں بھی نہ تھا۔ تنہائی کا دیو اسے زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھا۔ اس تنہائی کے دیو سے لڑنے والا شہزادہ دور دور تک کہیں نظر نہیں آتا تھا۔

تنہائی کے اس مسلسل احساس سے اکتا کر اس نے اپنے مشاغل کو نئے سرے سے ترتیب دینا چاہا۔ کالج کی مصروفیات کو اور بھی زیادہ کردیا اور پھر شام کو کالج سے واپسی پر اس نے کلب بھی جانا شروع کردیا۔ یوں تو کئی مہینوں سے اس کی چند لیکچرر دوست اصرار کررہی تھیں۔ مگر وہ چونکہ فطرتاً تنہائی پسند تھی' اس لئے وہ ہمیشہ انکار کرتی رہی۔ مگر اب اس تنہائی کے احساس سے کوئی اور راہ نجات اسے دکھائی نہ دیتی تھی۔

پہلے ہی دن اسے یہ معلوم ہوگیا کہ کلب میں آنے والے اکثر لوگ محض ذہنی عیاشی کی خاطر ادب' مصوری اور موسیقی کی باتیں

کرتے ہیں۔ تاش کھیل لیتے ہیں اور خواتین اکثر اپنی نامکمل Knitting سمیت محض اپنی اسکینڈل نرد کی تسکین کی خاطر کلب چلی آتی ہیں۔ اسے کلب میں آنے کے بعد ہمیشہ راشد کی نظم کا وہ حصہ ضرور یاد آتا:

"اے میری ہم رقص مجھ کو تھام لے' زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں"

پھر بھی یہ سب کچھ ایسا برا نہ تھا۔ کم از کم وقت گزارنے کے لئے ایک مشغلہ ہاتھ آگیا تھا۔

"ڈاکٹر آصف"

"مس ساجدہ"

مختصر سے تعارف کے بعد رقیہ جو اس کے کالج کی ساتھی تھی' کسی اور سے باتیں کرنے میں مشغول ہوگئی۔ ڈاکٹر آصف حال میں ہی آکسفورڈ سے فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر آیا تھا۔ اس کی اچھی خاصی شہرت تھی۔ کپڑوں کی کریز کو برقرار رکھنے سے لے کر مابعد الطبیعاتی موضوعات پر بحث کرنے تک وہ سبھی میں ماہر تھا۔ عمر بھی کوئی ۳۵ سال کی ہوگی۔ چھریرا بدن' سانولا رنگ' منہ میں ہر وقت ایک پائپ دبائے رہتا۔ فلسفے پر ایک آدھ کتاب بھی لکھ چکا تھا۔

"میری چند ایک کزنز آپ کے کالج میں پڑھتی ہیں۔ ان سے اکثر آپ کا ذکر سنتا رہتا ہوں۔"

"جی" ساجدہ کا جواب بے حد مختصر تھا۔

"آپ کے ادبی ذوق اور پینٹنگ کی بھی بہت تعریف سنی ہے۔"

"جی شکریہ۔"

"کبھی اپنی تصاویر دکھائیے گا۔"

"جی ہاں ضرور دیکھیں۔ مگر آپ کو مایوسی ہوگی۔"

"جی اس کی تو مجھے ابھی سے توقع ہے۔" ساجدہ کو یک دم عابد کا خیال آگیا۔

وہ بڑی آہستہ آہستہ باتیں کرتا۔ ساتھ ہی ساتھ پائپ کا دھواں بھی نکالتا رہتا۔ "آپ کو فلسفے سے بھی کچھ دلچسپی ہے؟"

"جی بہت معمولی سی۔" مگر جب آصف نے ساجدہ سے "کانٹ" اور "شوپنہار" کی باتیں شروع کیں تو اسے بے حد تعجب ہوا کہ ساجدہ کا مطالعہ تو کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ہے۔

"مس ساجدہ! آج زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے اپنی علمی بے بضاعتی کا احساس ہوا ہے۔ بعض لوگ تو ڈاکٹریٹ کیے بغیر بھی مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔"

"فلسفہ پڑھنے سے آدمی دوسروں کو بنانے میں بھی ماہر ہو جاتا ہے۔ مجھے بھی آج اس کا احساس ہوا ہے۔

اور رات کو جب وہ گھر لوٹی تو وہ پہلے کی نسبت بہت زیادہ مطمئن تھی۔ ڈاکٹر آصف بہت دلچسپ آدمی ہے۔ اس کی شخصیت میں

اسے عابد کا پرتو نظر آیا۔ مگر نہیں۔ آصف عابد کی نسبت بہت زیادہ Mature اور سلجھا ہوا ہے۔ اس نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ زندگی کے دل کی دھڑکن کو محسوس کیا ہے۔ اس کی شخصیت میں زیادہ وقار اور حکمت اور سلجھاؤ ہے۔ اب یہ اس کا معمول ہو چلا تھا کہ شام کو بڑی باقاعدگی سے کلب جاتی اور گھنٹوں آصف سے بحث کرتی۔ کبھی اخلاقیات پر، کبھی Supirtual sufferings پر، کبھی مسرت اور اس کے حصول پر، کبھی مہاتما بدھ کی شخصیت پر۔ جوں جوں وہ آصف کے قریب ہوتی جاتی، اسے محسوس ہونے لگتا کہ اب اس نے اپنے آدرش کو ڈھونڈ لیا ہے۔ آصف میں نہ صرف عابد کی ذہانت، خوش مزاجی اور حاضر جوابی تھی بلکہ اس کی شخصیت میں رچی ہوئی ایک عظمت بھی تھی۔ جب وہ باتیں کرتا تو یوں غور سے سنتی رہتی جیسے اس کی آواز میں پاکیزگی اور شیرینی گھلی ہوئی ہو۔ اس کا شعور کتنا بیدار ہے۔ اس کے جذبات کتنے شفاف ہیں۔

کالج میں اب مسلسل چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ آج کل ڈاکٹر آصف اپنا Spritualism کا فلسفہ مس ساجدہ کو خوب سمجھا رہے ہیں۔ لیکن وہ ان سب سے بے پرواہ، اپنی تلاش میں مگن تھی۔ ایک شام جب وہ کلب سے گھر لوٹ رہی تھی تو آصف بھی اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ دونوں مسلسل بہت جوش و خروش سے بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ مس ساجدہ خوبصورتی کو سراہنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان بے ترتیبی اور بد صورتی سے بھی آگاہ ہو۔ نیکی کا تصور بدی کے بغیر ممکن نہیں۔ اچھائی اور برائی یہ سب کچھ اضافی ہے۔ وہی اچھا ہے جسے ہم اچھا تصور کرتے ہیں اور وہی چیز جو آج گناہ تصور کی جاتی ہے، کبھی مذہب کا جزو ہوا کرتی تھی۔ انسان کے سوچنے کا انداز بدل جاتا ہے۔ ورنہ زندگی کے Fundamentals کی نوعیت تو نہیں بدلتی۔ کون جانے جسے میں اور آپ معیوب تصور کرتے ہیں، وہ حقیقت میں اچھائی ہو۔

ابھی وہ تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی۔ آصف کا گھر بہت قریب تھا۔ لہٰذا وہ دونوں وہیں چلے گئے۔ جونہی وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو اسے تعجب ہوا۔ دیواروں پر وہی ہلکے رنگوں کی پینٹنگز، مینٹل پیس پر سنگ مرمر کے دو خوبصورت مجسمے، کتابوں کی لائبریری، کونے میں پڑی ہوئی ستار۔ آئیڈیل کی تلاش مشکل سہی، لیکن ناممکن تو نہیں۔ آصف ـ ڈاکٹر آصف ـ جس نے فلسفے میں ڈاکٹریٹ کیا تھا۔ ہاں آصف کو اس نے ڈھونڈ لیا تھا۔ وہ دونوں اسی مقصد کے لیئے تخلیق کئے گئے تھے۔ کہ وہ زندگی میں حسن کی تلاش کو نکلیں اور پھر اچانک کسی موڑ پر ایک دوسرے سے آن ملیں۔ اور یوں ان دونوں کی تکمیل ہو جائے۔ دونوں اپنے اپنے آدرش کو ڈھونڈ نکالیں۔

باہر ابھی تک بارش ہو رہی تھی اور سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ صوفے میں بیٹھی کانپ رہی تھی۔ آصف قریب بیٹھا اس کے لئے کافی بنا رہا تھا۔ "سردی لگتی ہے تو میں انگیٹھی میں آگ جلا دوں۔"

"نہیں ـ کچھ ایسی بھی سردی نہیں ـ"

"پھر بھی آگ جلانے میں کیا حرج ہے۔" آصف نے آتشدان میں آگ جلا دی اور وہ دونوں آگ کے قریب بیٹھے باتیں کرنے

لگے۔

"مس ساجدہ کوئی بات کیجئے۔ آپ اس قدر چپ چاپ کیوں ہیں؟"

"جی" وہ یوں بولی جیسے اپنے خیال میں بہت دور جا چکی ہو۔ اس کے سوچنے کے تسلسل کی زنجیر اچانک ٹوٹ گئی تھی۔ وہ تو سوچ رہی تھی۔ کاش وہ زندگی بھر یونہی آتشدان کے قریب بیٹھی آصف سے باتیں کرتی رہے۔ اپنی چاہت کے سارے پھول اپنے اس دیوتا کے قدموں پر نچھاور کردے۔ یہ لمحات جاوداں ہوجائیں۔ اور زندگی میں بھلا کس چیز کی تمنا کی جاسکتی ہے۔

آصف نے وائٹ ہارس کے دو پیگ چڑھائے اور پھر وہیں قریب آکر بیٹھ گیا۔ "آپ کو پامسٹری سے کچھ دلچسپی ہے؟" آصف کی آواز میں کچھ عجیب سی لڑکھڑاہٹ تھی۔

"جی کچھ ایسی تو نہیں۔"

"لائیے میں آپ کا ہاتھ دیکھوں۔" جب کمرے کی اس نیم تاریکی میں جہاں گرم کافی میں سے بھاپ اٹھ رہی تھی اور آتشدان میں کچھ لکڑیاں سلگ رہی تھیں۔ آصف نے اس کا ہاتھ تھاما تو وہ ایک عجیب سی لذت سے آشنا ہوئی۔

"آپ کی قسمت بہت اچھی ہے۔ اور آپ کا ہاتھ بہت خوبصورت ہے۔" آصف کی آواز میں لڑکھڑاہٹ بدستور باقی تھی۔

"مس ساجدہ روح کے مسائل پر صرف بحث ہوسکتی ہے۔ مگر جسم کے اپنے تقاضے ہیں۔ ان تقاضوں پر اگر صرف بحث کی جائے تو تشنگی اور بھی شدت سے بھڑک اٹھتی ہے۔ اس تشنگی ....."

"نہیں۔ نہیں۔ تم کو اس ہجوم میں شامل نہیں ہونا چاہئے۔ تمہاری انفرادیت مجروح ہوجائے گی... تقدس گھائل ہوجائے گا... جذبے کی پاکیزگی مجروح ہوجائے گی۔" کوئی اس کے اندر چیخ پڑا تھا "نہیں۔ نہیں۔ آصف"

"آصف محض ایک فلسفی ہی نہیں، گوشت پوست کا انسان ہے۔" پجارن جب اپنے دیوتا کے چرنوں میں چاہت کے پھول نچھاور کرنے گئی تو دیوتا نے اپنا روپ بدل لیا۔ آصف کا کیا یہی وہ شاندار Spiritualism تھا۔ اسے رقیہ کے الفاظ یاد آنے لگے۔ یہ وہ آصف تو نہ تھا جو چند لمحے پہلے آتشدان کے قریب بیٹھا ساجدہ سے میٹھے لہجے میں فلسفے کی گتھیاں سلجھا رہا تھا۔

ہلکی ہلکی بارش اب تک ہورہی تھی۔ وہ بھیگتی رہی، لیکن اندھا دھند بھاگتی رہی اور پھر گھر پہنچتے ہی وہ مسہری پر گر پڑی اور کمرے میں صرف اس کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ یا باہر صحن میں سوکھے پتوں کے ساتھ بارش چیخ رہی تھی۔

متواتر دو تین دن تک وہ کالج نہ جاسکی۔ اس کے جسم کے روئیں روئیں میں درد ہورہا تھا۔ اس کا ذہن آصف کے اس نئے روپ کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس کی آنکھیں اس منظر کی حقیقت پر اعتبار لانا نہیں چاہتی تھیں۔ یہ زندگی میں اس کی دوسری شکست تھی۔ مگر یہ شکست پہلی کی نسبت زیادہ حوصلہ شکن تھی۔ اس کی قوت برداشت اب جواب دئے جارہی تھی۔ وہ نڈھال ہوگئی تھی۔ آصف جسے وہ جانے کیا کیا سمجھتی تھی، وہ تصور ریزہ ریزہ ہوچکا تھا۔ کیا وہ اپنی تلاش چھوڑدے؟ نہیں ... نہیں

مسلسل کئی دن تک اس کے ذہن پر کس مپرسی اور بے حسی طاری رہی۔ اس کا کچھ بھی کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ "ساجدہ! جسم کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ تم کب تک ان مصنوعی بندھنوں میں....." آصف کے الفاظ بار بار اس کے ذہن میں گونجتے اور وہ خود کو پہلے سے زیادہ اداس اور تنہا محسوس کرنے لگتی۔ مگر پھروہی صدمات سے سمجھوتہ کرنے والا رویہ عود کر آیا۔ وہ آصف کو بھولنے لگی۔ اب وہ پھر صبح صبح شوخ کپڑے پہن کر کالج کو چلی جاتی۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کبھی کبھی اسے احساس ہوتا کہ زندگی بیت چلی ہے۔ اب تو وہ تقریباً تیس برس کی ہو چلی تھی۔ مگر پھر وہ پوری تندہی سے اپنے بازوؤں کو کھینچ لیتی۔ قمیص کو تھوڑا بست اور تنگ کرلیتی۔ اس کے چہرے پر کہیں کوئی جھری نظر آجاتی تو وہ کپکپا اٹھتی۔ پوڈر کی ایک دبیز تہہ تلے اس جھری کو چھپا دیتی۔ سیاہ ریشمی بالوں پر اسے کتنا ناز تھا۔ اور جب کہیں کوئی سفید بال نظر آجاتا تو اس کی جیسے روح پرواز کرجاتی ہو۔ وہ ایک دم اسی بال کو اکھاڑ باہر پھینکتی۔ کالج کے ہنگاموں میں تو خیر اسے دم بھر کے لئے فرصت نہ ملتی۔ مگر وہ دن بھر کی ان تھکا دینے والی مصروفیات کے بعد آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اپنے گھر کو لوٹتی تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے جسم کا رواں رواں نڈھال ہوچکا ہے۔ جیسے وہ تھکاوٹ کے باعث دم توڑ رہی ہو۔ اس کا جسم اس پرانی اور مانوس دھیمی آنچ میں سلگنے لگتا۔ پھول جب شگفتہ ہو تو ہرپتی میں زندگی کا گرم لہو رواں ہوتا ہے۔ بھرپور جوبن اور مکمل شگفتگی اور پھر جب پھول مرجھا جاتا ہے تو اس کی ساری پنکھڑیاں دم توڑ دیتی ہیں۔ مرجھائے ہوئے پھول میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہتی۔ مگر یہ جو مکمل شگفتگی اور مرجھانے کے بین بین ایک کیفیت ہوتی ہے یہ بڑی عجیب ہوتی ہے۔جوبن آہستہ آہستہ ڈھلنے لگتا ہے۔ پتیوں کی کیفیت ادھ موئی سی ہوجاتی ہے۔ اس کی جوانی کے دن اب بیت چلے تھے اور تھوڑی دور بڑھاپا اپنی جھرمری گود سمیت اس کا منتظر تھا۔ چند سال بعد پھول کی پتیاں مکمل طور پر مرجھاجائیں گی۔ بے جان ہوجائیں گی اور پھر ارمانوں اور خواہشوں کے اس مدفن پہ آنسو بہانے کے لئے وہ اکیلی زندہ رہ جائے گی!

لاشعور میں ہرلحہ ایک مبہم سا خیال رینگتا رہتا کہ وہ آہستہ آہستہ بڑھاپے کی طرف قدم بڑھارہی ہے۔ یہ دھندلا سا ہیولا پھر اچانک پھیلنے لگتا اور اس کے دل و دماغ پر چھانے لگتا۔ اس کی روح پر مسلط ہوجاتا۔ آئینے میں جب وہ اپنا عکس دیکھتی تو اسے عجیب و غریب خدو خال نظر آتے۔ بالوں کا بیشتر حصہ سفید ہوچلا ہو' چہرے پر جھریاں اپنا تسلط جما رہی ہوں' آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے اور کمر بالکل جھکتی جارہی ہو۔

"یہ کون ہے؟" وہ اپنے آپ سے پوچھتی۔ "چند سال بعد کی مس ساجدہ۔ نہیں' نہیں' ایسا نہیں....." وہ پوری قوت سے اپنی آنکھیں بند کرلیتی۔ پھر تنہائی کی اس مانوس دھیمی آگ میں سلگنے لگتی' کاش سپنوں کا شہزادہ!! اس کا خون تیزی سے گردش کرنے لگتا۔ اور اس کے انگ انگ میں ایک درد اٹھتا۔

انہی خیالوں میں گم جب وہ گھر لوٹتی تو گھر کی تنہائی اس کو کاٹنے کو دوڑتی۔ آصف والے اس واقعہ کے بعد اب اس نے کلب جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ کیا کرے؟ "تمام عمر سہارے فریب دیتے ہیں" وہ گنگنانے لگتی۔ اس احساس سے نجات کی خاطر وہ اپنا رنگوں

کا بکس نکال لیتی اور کوئی نئی تصویر بنانا شروع کر دیتی۔ اب بھی جب وہ کاغذ کی سطح پر تیزی سے اپنے برش سے لکیریں بناتی تو پھر ایک بار رنگین سایوں کے اس رقص کی دنیا کو لوٹ جاتی۔ تصویر بناتے بناتے اکتا جاتی تو پھر ریڈیو گرام پر اپنے محبوب گیت بجانے لگتی۔ وہ تو بس مجنوں کی دیوانی تھی "گھونگٹ کے پٹ کھول دے تو ہے پیا ملیں گے"

یہ ریکارڈ اس نے کتنے چاؤ سے خریدا تھا۔ دن میں کتنی ہی دفعہ وہ بار بار یہی بھجن سنا کرتی تھی۔ "گھونگٹ کے پٹ کھول ....." پر تو اس نے اپنے من کی اداسیوں میں آشا کی ایک دھیمی لو والا دیپ کب سے جلا رکھا تھا اور دیپ تو اب بجھنے کو تھا۔ وہ کب سے پی ملن کی گھڑی کی منتظر تھی۔ پیا چلے آئیں تو وہ اپنی آشاؤں اور پریم کے سارے پھول ان کے قدموں پر نچھاور کر دے۔ برہا کی اگنی میں جلنے کی ایک کیفیت باقی تھی۔ پھر بھی ان سب محرومیوں' شکستوں کے باوجود وہ ہر لمحہ یہی کوشش کرتی کہ لاشعور کی تہوں میں چھپا ہوا خیال شعور میں ابھرنے نہ پائے۔ وہ مسلسل اس احساس کو بھولنے اور دبانے کے لئے اس سے برسرپیکار رہتی کہ اسے اپنی جوانی بیکار گزر جانے کا احساس نہ ہو۔ اور یہ کچھ کرنے کے لئے وہ ہر وقت مصروف رہتی ۔ کالج میں لڑکیوں کے ساتھ مل کر خوب قہقہے لگاتی' تصویریں بناتی' کالج میں ڈرامہ آرگنائز کرتی۔ شام کو اپنی سہیلیوں کے ساتھ مل کر نئے نئے پروگرام مرتب کرتی۔ مگر یہ خیال سائے کی طرح اس کے ساتھ ہی رہتا اور جب بھی اسے تنہائی میسر آتی تو پھر یہ خیال عود کر آتا ۔ اور اس کی روح پر مسلط ہو جاتا۔ اس نے یہ سب کچھ کرنے کے لئے کتنی ان تھک کوششیں کی تھیں۔ کتنی جدوجہد کی تھی۔ اور اب تو وہ تھکن سی محسوس کرنے لگی تھی۔ آخر کب تک...... مس ساجدہ تم کب تک تنہا یہ سب کچھ کرتی رہو گی؟

"مصنوعی بندھن' جسم کے تقاضے' آدرش کی تلاش اب بے کار...." آصف کے الفاظ اسے بار بار یاد آتے۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ یہاں سے کہیں دور بہت دور چلی جائے۔ بہت دور... بچپن کی کہانیوں کے پریوں کے دیس میں وہ کسی خوبصورت باغ میں کسی سایہ دار درخت تلے سو جائے ۔ مدتوں وہیں بے سدھ پڑی رہے۔ اسے کوئی نہ پکارے' کوئی اسے نہ بلائے اور پھر کوئی آجائے۔ "کوئی... سجو رانی' جاگو! دیکھو! کون آیا ہے ۔ خواہشات' سپنے!" انسان کی زندگی کا آدھا حصہ تو سپنوں میں اور حسین خواب بننے میں گزر جاتا ہے اور باقی حصہ وہ حقیقت سے سمجھوتہ کرنے میں گزار دیتا ہے۔

ایک دن جب وہ کالج کے مینا بازار سے واپس آئی تو ڈرائینگ روم کی میز پر ایک نیلے رنگ کا بڑا سا لفافہ اس کا منتظر تھا۔ اس نے جلدی سے کھولا تو وہ پوری طرح پڑھنے بھی نہ پائی تھی کہ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وہ صوفے پر گرتے گرتے بچی۔

۱۱ نومبر کو مسٹر عابد ایم اے کی شادی..... 'اعجاز' آصف' اور عابد۔ عابد سے شادی کر لینے کی خواہش تو شاید اسے کبھی بھی نہ تھی۔ نہیں' نہیں وہ کتنا اچھا لڑکا تھا۔ اس کے ساتھ زندگی گزارنے میں کتنا لطف رہتا۔ مگر ساتھی اور شوہر کے انتخاب کا معیار تو بہت مختلف ہوتا ہے۔ اچھا دوست ہم خیال ساتھی اور کامیاب شوہر' ایک ہی شخصیت میں یک جا ہو جائیں' کچھ ناممکن سا لگتا ہے۔ شاید اسی لئے یونیورسٹی بھر میں لڑکے اس سے باتیں کرنے کو ترستے تھے۔ اس کی تصویروں کی تعریف کرتے تھے۔ غزلوں کو سراہتے تھے۔ شاید وہ

محض ایک اچھی دوست تھی۔ ایک ایسی لڑکی جس سے باتیں کرنے میں چند خوشگوار لمحے گزارنے کی خواہش ہر کسی کو ہوتی تھی۔ لیکن اب اسے ایک دوست کی نہیں' شوہر کی خواہش تھی۔ شاید وہ بیوی کی حیثیت سے...... تصویریں بنانے اور بچوں کو پالنے میں بہت فرق ہوتا ہے نا... مس ساجدہ... نہیں' نہیں ۔ ایسی تو کوئی بات نہیں..... عابد نے بھی ایک اپنی میٹر آف فیکٹ قسم کی کزن سے شادی کرلی ۔ ہے نا۔ قیامت تو نہیں آگئی۔ اب وہ بھی... شاید سپنوں کا شہزادہ اسے دیو کی قید میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اب وہ ہنسی خوشی زندگی کیسے گزارے گی؟

اس چاندنی رات میں وہ اپنے برآمدے میں لیٹی چاند کو تک رہی تھی۔ وہ کس قدر تنہا تھی۔ بھری دنیا میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اس کا ہاتھ تھام لے' اور پھر وہ دونوں خنک چاندنی میں رات کے پچھلے پہر میں شفاف روشوں پر بے مقصد گھومتے رہیں۔ آپس میں باتیں کرتے جائیں۔ بے معنی اور بے ربط باتیں۔ ہمارے دکھ اور غم کا تصور کتنا خام۔ سطحی اور عجیب سا ہے۔ سڑک پر کوئی زخمی نظر آجائے۔ چ چ ' بے چارے' کو کتنی شدید چوٹ آئی ہے۔ کسی کا عزیز چل بسے تو ہم سب ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ جسے یہی غم اور دکھ کی معراج ہے۔ غم کا کتنا سطحی تصور ہے اور یہ جو ساجدہ دن بھر شوخ کپڑے پہنے سیاہ چشمے لگائے زندگی کے ہنگاموں میں اس جوش و خروش سے حصہ لیتی ہے ۔ قہقہے لگاتی ہے۔ اور جو اب برآمدے میں لیٹی اس بھیگتی ہوئی چاندنی رات میں اپنے بستر میں مسلسل کروٹیں بدل رہی ہے۔ کبھی کوئی اس کے دل میں جھانک کر دیکھے۔ اف وہاں کتنی وحشتناک تنہائی ہے۔ اس کے جذبات ' ارمانوں اور ولولوں؟ پر اس تنہائی میں کیا بیت رہی ہے۔ کبھی بھی تو کسی نے جاننے کی کوشش نہیں کی۔ کوئی اس سے پیار کے دو بول بھی تو نہیں بولتا۔ سب ہی جانتے ہیں کہ وہ تو بہت سکھی ہے۔ اس لیے کہ وہ قہقہے لگاتی ہے۔ اتنی دلچسپ باتیں کرتی ہے۔ اسے بھلا کیا غم ہے۔ کون سا روگ لگا ہوا ہے۔ وہ تو کوئی جاننے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ جانے اس کی روح میں کتنے گہرے گھاؤ ہیں۔ وہ ریت کا وہ ذرہ ہے جسے تیز ہوا جانے کہاں کہاں اڑائے لئے پھرتی ہے۔ اور جانے دن بھر میں سڑکوں پر کتنے ایسے لوگ ہوں گے جو خوبصورت کپڑے پہنے ' قہقہے لگاتے ہوئے گھوم رہے ہوں گے۔ پر کون جانے ان کے سینوں میں غم کا ایک سمندر موجزن ہے۔ چمکتی ہوئی سطح کے نیچے کیا ہے۔ یہ قہقہے کتنے کھوکھلے ہیں۔ یہ تو کوئی نہیں سوچتا! اس کا جسم پھر اسی دھیمی آنچ میں سلگنے لگا۔ مگر وہاں تو ایک مکمل اور پر ہول سناٹا تھا۔ رات بھر وہ کروٹیں بدلتی رہی۔ ایک لمحہ کے لئے بھی وہ سو نہ سکی تھی۔

صبح جب وہ آئینے کے سامنے بیٹھ کر میک اپ کررہی تھی تو اسے محسوس ہوا کہ وہ پہلے سے زیادہ اور کئی سال بوڑھی ہوچکی ہے۔ لاشعور میں رینگنے والا وہ خیال اب پوری شدت کے ساتھ اس پر مسلط ہوچکا ہے اور وہ اس بوجھ تلے دبی جارہی ہے۔ زنجیریں اس کو اور شدت سے جکڑے ہوئے ہیں' وہ کلبلا رہی ہے۔ مگر دیو سے لڑنے والا شہزادہ...

اس نے اس نئے حادثے سے بھی سمجھوتہ کرنے کی کوشش شروع کردی۔ شام کو کالج سے واپسی پر وہ رضوی صاحب کے گھر چلی جاتی۔ رخشندہ کھیلتی رہتی۔ رضوی صاحب بھی منہ میں پان دبائے آن نکلتے۔

"کہئے۔ مزاج کیسے ہیں مس ساجدہ؟"

"جی اچھی ہوں۔"

"چائے پیجئے گا؟"

"جی نہیں شکریہ۔"

"آپ کا کالج کیسا چل رہا ہے؟"

"بس ٹھیک ہی چل رہا ہے۔"

"بس یونہی کوئی نہ کوئی کام رہتا ہے۔ اب کالج میں ہم کرشن چندر کا ڈرامہ "سرائے کے باہر" اسٹیج کررہے ہیں۔" پھر اسے ایک دم خیال آتا کہ رضوی صاحب سے تو ڈرامے کے لئے جو فرنیچر درکار ہے اس سے مطلب ہے۔ "سرائے کے باہر" سے ان کو کیا تعلق۔

اور پھر رخشندہ آکر اس کی گود میں بیٹھ جاتی اور وہ اسے پیار کرنے لگتی۔ رضوی صاحب سے اس کی گفتگو اور ملاقات ہمیشہ بڑی رسمی قسم کی ہوتی۔

جب سے رضوی صاحب کی بیوی کا انتقال ہوا تھا' وہ بہت افسردہ اور غمگین رہنے لگے تھے۔ وہ اکثر ساجدہ کے سامنے مرحومہ کی صفات' اس کی بیماری کی تفصیلات' اس کے سلیقے اور قرینے کا تذکرہ کرتے رہتے۔

"اب تو میرا گھر بالکل سونا ہوگیا ہے۔ سوچتا ہوں کہ رخشندہ کی تعلیم کا کیا بنے گا۔ اس کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ ماں کے بغیر بچوں کی تربیت بھلا کیا ہوسکتی ہے۔" اور پھر رخشندہ اس کی توجہ کا تمامتر مرکز بن گئی۔ وہ اس کے بال سنوارتی۔ اس کے لئے فراک سیتی۔ اس نے تنہائی کو بہلانے کے لئے رخشندہ کا ایک نیا ذریعہ ڈھونڈ لیا اور پھر کبھی اس کے بھی اپنے ننھے ننھے پیارے پیارے بچے ہوں گے' وہ ان سب کو کانونٹ بھجوادے گی۔ نہیں۔ کانونٹ میں بچوں کو صرف انگریزی پڑھاتے ہیں اور پھر وہاں تو سبھی عیسائی استانیاں ہوتی ہیں۔ کوئی اچھا سا اردو اسکول زیادہ مناسب رہے گا۔ پہلے بچے کا نام ہوگا' عابد۔ نہیں' نہیں وہ تو اتنا بے وفا نکلا' مگر تھا بڑا ذہین۔

شام کو وہ اکثر لان میں کرسیاں بچھا کر بیٹھ جاتے۔ رخشندہ کی باتوں اور شرارتوں کا ذکر رہتا۔

وہ اب تک مسلسل اپنے بستر پر لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔ اس کے ذہن میں بے شمار دھندلے' ادھورے نقوش گڈمڈ ہو رہے تھے۔ زندگی میں بہت دفعہ یوں ہوتا ہے کہ انسان اپنے وجود کے بارے میں بہت زیادہ تجزیہ نہیں کرتا۔ بس وقت یونہی گزرتا جاتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی مسافر بے دھیانی میں راستہ بھول جائے اور پھر اس غیر یقینی اور تذبذب کے عالم میں یونہی بغیر سوچے سمجھے اسی راستے پر چلنا شروع کردے جو آنکھوں کے سامنے پڑ رہا ہو۔ بس ایسی ہی کیفیت ساجدہ کی ہو رہی تھی۔

عابد لاہور کے کسی پر شور بازار کی بھیڑ میں اپنی بیوی کی دی ہوئی طویل فہرست لئے دکان دکان گھوم رہا ہو گا۔ اور... اور کرنل اعجاز اپنے فوجی بچوں اور نٹ کھٹ بیوی کے ساتھ کسی چھاؤنی کے کسی بنگلے میں مقیم ہو گا اور اپنی بیوی سے خاکی یونیفارم میں دو بٹن جلد ٹانکنے کی تاکید کر رہا ہو گا۔

اور فلسفی ڈاکٹر آصف کلب میں کسی نو وارد خاتون کو Existensialism پر حوالوں کے ساتھ لیکچر دے رہا ہو گا۔ رخشندہ پھر اس کے پاس آکر بڑی شرافت سے بیٹھ گئی' وہ کیا کرے؟

سارے نقوش دھندلے ہوتے ہوئے بھی چمک رہے تھے۔ تنہائی اور سفید بالوں میں شدت آنے لگی تھی۔ اور پھر اچانک آج کی شام جب رضوی صاحب نے پروپوز کیا تو.....!!

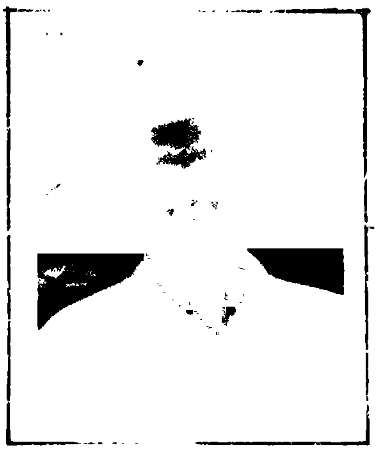
کوئٹہ میں ایک خاموش' اداس سے کیف دسمبر کی اتوار کو اس نے چند عزیز و اقارب کے درمیان شہر کے "ماڈرن فرنیچر مارٹ" کے اکلوتے مالک ایم ڈی رضوی صاحب سے شادی کر لی.....

گھونگٹ کے پٹ کھول .....

ضمیر الدین احمد مرحوم کے ناول کا ایک باب
ایک ناول، جو اب کبھی مکمل نہ ہو سکے گا

ضمیر الدین احمد

پہنچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی



"یہ جگہ دیکھ رہے ہو ، ساجد میاں !"

ساجد کی نظریں اُدھر اُٹھ گئیں جدھر اَدّا میاں کے ہاتھ نے اشارہ کیا تھا۔ ایک کُھلا میدان جس کے دائیں بائیں فوجی بارکیں ترچھی قطاریں باندھے کھڑی تھیں اور جو کسی چوڑے ، بھاری سینے ، پتلی کمر اور چوڑے بھاری کولھوں والی عورت کے جسم کی مانند ان بارکوں کے بیچ میں سے سمٹتا سکڑتا گزر کر پیچھے کی جانب پھر پھیل گیا تھا۔

"یہاں قیدیوں کو رکھا گیا تھا۔"

"کون سے قیدی ؟"

"آپ بھی کمال کرتے ہو ساجد میاں !" وہ تانگے کے اگلے حصے میں شبراتی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے جو گھوڑے کو رہ رہ کر بلا وجہ ٹکٹکا رہا تھا۔ انہوں نے پہلو بدل کر مُنہ ساجد کی طرف کیا۔" وہی۔ تمہارے پاکستانی۔ کیا کہتے ہیں انہیں ---- پرزنر دار قیدی اور کون !"

تانگے کا پہیہ کسی پتھر پر یا کسی گڑھے میں آگیا۔ ساجد اُچھلا اور اس کا سر تانگے کی چھت سے ٹکرایا جس کا فریم لوہے کا تھا۔ اس کے مُنہ سے اضطراری طور پر" سی" نکل گئی۔

شبراتی نے گھوڑے کے چابُک رسید کی اور پھر ساجد سے اپنے انداز میں معذرت خواہ ہوا۔" چوٹ تو نہیں آئی میاں ؟"

" نہیں !" ساجد ابھی تک سر سہلا رہا تھا۔" بات یہ ہے شبراتی کہ اب تانگے میں بیٹھنے کی عادت نہیں رہی۔ اس میں تو سواری کو ہر وقت چوکس رہنا چاہیئے۔ رستہ اُوبڑ کھابڑ ہو تو اور بھی۔"

"سو تو ہے۔ میاں !" شبراتی نے ان سے نظریں ملائے بغیر اَدّا میاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" اَپن نے تو کہا تھا ٹیشن والے رستے چلو۔"

"اَبے بند کرتا ہے اپنا بھونپو کہ لگادوں ایک !" اور اَدّا میاں نے چپت رسید کرنے کے انداز میں اپنا دایاں ہاتھ اُٹھا بھی لیا۔" یے سڑک کون سی خراب ہے۔ آگیا ہوگا کسی پتھر وتھر پر پہیا۔"

خالی ہاتھ سے اپنے سر کی، جس پر ایک میلی چیکٹ ٹوپی منڈھی ہوئی تھی ، ایسے آنکر لی جیسے میاں سچ مچ اس کے چپت

لگایا چاہتے ہوں۔ شبراتی کھی کھی ہنسا۔

اَدّا میاں نے مڑ کر شاہد کی طرف دیکھا جو پیچھے ساجد کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اور آنکھ مار کر مسکرائے۔ شاہد نے اُن کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا۔ گویا انہیں یقین دلا رہا ہو کہ اسے اُن کا یہ بزرگانہ مسخرا پن بھلا لگا ہے۔

اچانک ساجد کی سمجھ میں آیا کہ اَدّا میاں نے اِس راستے فرخ آباد جانے پر اصرار کیوں کیا تھا ۔۔۔ مجھے یہ پھیلتا سکڑتا اور پھر پھیلتا میدان دکھا کر میرا امتحان لینا چاہتے تھے۔

"آپ کے سر کی قسم اَدّا میاں! مجھے بالکل نہیں معلوم تھا کہ پاکستان کے جنگی قیدی یہاں بھی رکھے گئے تھے۔ مجھے تو بس یہ معلوم ہے کہ کوئی ایک لاکھ نے ہتھیار ڈالے تھے۔"

"سنا تو نے شبراتی! ساجد میاں کہتے ہیں انہیں بالکل پتا نہیں تھا۔ اور قسم بھی کھائی تو میرے سر کی۔ دنیا جہان کی باتیں انہیں معلوم رہتی ہیں۔ پر یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کے [redacted] یہاں بھی مہمان رہے تھے۔ ان کے اپنے فتحگڑھ میں!" اَدّا میاں کے لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ انہیں ساجد کی بات کو سچ ماننے میں دقت پیش آ رہی تھی۔

تانگہ اُلار ہو رہا تھا۔ شبراتی کھسک کر بم پر آ گیا۔ "ہزاروں میل دُور میاں کو ادھر کی ساری خبریں تھوڑی ملتی ہوں گی ۔۔۔ ہے نا۔ میاں؟"

"ہاں!"

اسی وقت دو تصویریں منہ پونچھتی، بال جھٹکتی، کپڑے جھاڑتی اس کی یاد کے تہ خانے سے نکلیں اور ساجد کو گویا اَدّا میاں کے تنک طنز کا جواب مل گیا۔

"واقعی۔ اَدّا میاں! مجھے بالکل نہیں معلوم تھا۔ شاید اس لئے کہ ان دنوں میں خبروں اور اخبار وغیرہ سے دور ہی رہتا تھا۔ بس کبھی کبھار ٹی۔ وی پر خبریں سن لیتا تھا۔ اور یہ خبر میں نے ٹی وی پر ہرگز نہیں سُنی۔"

اَدّا میاں چپ رہے۔

"ایک دن دیکھا ۔۔۔ یہ ہتھیار ڈالنے کے فوراً بعد کی بات ہے ۔۔۔ کہ ایک سڑک کے دونوں طرف بہت سے لوگ کھڑے ہیں جیسے لوگ باگ تماشا دیکھنے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں۔ ان کے بیچ میں سے پاکستانی ریلے کی طرح گزر رہے ہیں اور ایک ہندوستانی فوجی انہیں کسی چیز سے، کپڑے کی کسی چیز سے، شاید کسی فوجی ٹوپی سے ہر گزرتے ہوئے کو مار رہا ہے۔ اور ٹی وی پر یہ بھی دیکھا ۔۔۔ شاید اسی دن ۔۔۔ کہ ایک فوجی افسر، ہندوستان کا کوئی فوجی افسر کسی ٹینک یا کسی فوجی گاڑی پر کھڑا چلا چلا کر [redacted] گالی دے رہا ہے......"

شبراتی نے بے زبان جانور کی پیٹھ پر ایک چابک جڑ دیا ۔۔۔ بلا وجہ۔

"........ انگریزی میں"

اَدّا میاں نے ساجد کی بات کاٹ دی۔ "اتنی انگریزی تو ہمیں بھی آتی ہے، ساجد میاں.........."

انہوں نے کنکھیوں سے شاہد کو دیکھا۔ شاہد پھر مسکرایا۔ اَدّا میاں خوش نظر آئے۔

"میں تو اُن دنوں اِدھر سے گزرنے کا نام بھی نہیں لیتا تھا۔ پھر سنا ہے ایسی گالیاں تو یہاں اُن پر روز پڑا کرتی تھیں!"

"ہفتے میں ایک آدھ پھیرا ضرور یادگار اس راستے بھی ہوئی جاتا تھا۔" شبراتی چنکبرے گھوڑے کی کلغی سے مخاطب ہوا۔ "سواریاں اچھی خاصی چپ چاپ بیٹھی ہیں یا آپس میں باتیں کر رہی ہیں۔ یہ قیدیوں کا کیمپ آیا نئیں کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ، اچک کے اُدھر کر، دو ایک گالیاں سنانا نہیں چاہیے۔ آواز چاہے وہاں تک پہنچتی بھی نہ ہو۔ اور گالیاں بھی کیسی!" اس نے مڑ کر ساجد کو دیکھا، مگر کوئی نمونہ پیش نہیں کیا۔ "بڑی گندی گالیاں دیتے تھے جی! اپن کے تو کان جلنے لگتے تھے۔ اور اُدھر سے آتے ہوئے تو اپنی جبان میں گالیاں بکتے تھے ...."

"ابے۔ گالی اپنی زبانی میں مزا دیتی ہے۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ جسے دی جائے اُس کی زبان بھی وُئی ہو۔" اَدّا میاں شبراتی کو گالی دینے اور گالی کھانے کا نکتہ سمجھانے کے بعد ساجد سے مخاطب ہوئے۔ "تمہاری انگریزی ویسے چاہے کتنی بڑھیا زبان ہو، پر گالیوں کی زبان ایک دم نہیں۔ بلاڈی فول، یو باسٹرڈ!" وہ رُکے۔ مگر انہیں انگریزی کی کوئی اور گالی یا تو معلوم نہیں یا یاد نہیں تھی۔ "یہ بھی کوئی گالیاں ہوئیں! اس سے بڑی گالیاں تو میں پیار سے شبراتی کو اپنی اُردو میں دیتا ہوں۔" انہوں نے شبراتی سے تصدیق چاہی۔ "کیوں بے! دیتا ہوں کہ نئیں — ؟"

شبراتی نے مسکرا کر فخریہ سر ہلایا۔ "ہر دم!"

"اُلو کا پٹھا، تخم حرام، حرامی موت، گدھے کا بچہ!" — مثالیں پیش کرتے کرتے اَدّا میاں کو کچھ یاد آگیا۔ "کیوں بے شبراتی تجھے وُہ دن یاد ہے جب گالی بکنے پر خیراتی کو اندر کر دیا گیا تھا؟" اور اس سے پہلے کہ شبراتی جواب دے، انہوں نے کہا "نئیں۔ تجھے کہاں یاد ہوگا۔ تو تو بہت چھوٹا رہا ہوگا اس وقت!"

مگر شبراتی نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "مجھے اچھی طریوں یاد ہے۔"

"اچھی طریوں یاد ہے تو بتا۔" اَدّا میاں کا لہجہ تیز ہوگیا۔

"چھوٹا تھا۔ پر اتّا چھوٹا بھی نئیں تھا۔ دس سے اوپر کا تھا۔ مجھے اچھی طریوں یاد ہے۔ امّاں کا رو رو کے بُرا حال ہوگیا تھا۔"

اُسے یاد تھا کہ اس دن سارے قصبے میں اُس کے ابّا کی بات ہو رہی تھی۔ اور اُسے یہ بھی یاد تھا کہ جب اس کے ابّا حوالات سے چھُٹے تھے تو دیوان جی نے انہیں دو ایک موٹی موٹی گالیاں دے کر اور اُن کے چوتڑوں پر اپنا موٹا ڈنڈا برسا کر کہا تھا۔ "شکر کر کہ داروغہ جی اتنے رحم دل ہیں۔ کوئی اور ہوتا تو غداری کے جُرم میں دھروا دیتا۔"

"لیکن ہوا کیا تھا؟"

اور اس سے پہلے کہ شبراتی یا اَدّا میاں مُنہ کھولیں، ساجد نے شاہد کے سوال کا جواب دیا۔ "لڑائی کا زمانہ تھا۔ خیراتی — شبراتی کے والد — ترنگ میں رہے ہوں گے۔ کوئی سواری لے کر کچہری جا رہے تھے۔ گھوڑا مریل تھا۔ تانگہ رینگ رینگ کے چل رہا تھا۔ عین کوتوالی کے سامنے انہیں غصہ آگیا۔ بولے، ابے سالے! یہ کیا انگریزوں کی چال چل رہا ہے۔ ہٹلر کی چال چل! بس دھر لیے گئے!"

"کمال ہے!" شبراتی نے سچ مچ حیران ہو کر کہا۔ "ساجد میاں کو بھی یاد ہے۔"

ساجد نے کہا۔ "اچھی طریوں!"

ساجد نے آنکھیں کھول دیں۔ باہر درخت، باغ، کھیت، کچے گھروندے، پکے مکان، تار، کھمبے، ٹمٹماتی روشنیاں رقص کرتی ہوئی پاس آرہی تھیں، دُور جا رہی تھیں۔ دُھندلے شیشے میں سے سمٹتی ہوئی چاندنی اور سمٹتی نظر آرہی تھی — فراق حسن جہاں پر بہتے آنسوؤں

کا کفن --- وہ ٹرین کو کچھ دیر آنسوؤں کے کفن کی گت پر چلانے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر پہیوں نے اس کا کہنا نہ مانا۔ اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

"یہ تمہارے سگڑ دادا کی قبر ہے۔"

کالی پکی سڑک کے اس طرف حویلی کی چار دیواری اور اس کا بلند چوبی دروازہ اور اس طرف قبرستان۔ جس کے بیچوں بیچ املی کا ایک بوڑھا درخت جس کی شاخیں کئی قبروں پر سایہ کئے ہوئی تھیں۔ اور ان میں سب سے نمایاں اور اونچی ایک پکی قبر جس کے گچ پر کائی بھی ہوئی تھی اور جس کا تعویذ زمین سے کم از کم تین فٹ بلند تھا۔

"سگڑ دادا کتنے نمبر پہ آتے ہیں؟"

ساجد نے جلدی سے حساب لگایا۔ "تمہارے دادا کے دادا۔ ان سے شروع کریں تو تم چھٹے نمبر پہ آتے ہو۔"

"سب سے پرانی مالوم ہوتی ہے!" شاہد نے قبر کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا جس کا گچ دو ایک جگہ سے اکھڑ گیا تھا اور اندر سے ککیا اینٹیں جھانک رہی تھیں۔

"ہاں!۔ یہ ہمارے اس خاندانی قبرستان کی سب سے پہلی قبر ہے۔" ساجد نے احتراماً قبر کے ایک حصے پر سے املی کی سوکھی پتیاں ہٹاتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے جدِ امجد کا ذکر شاہد سے کئی بار بڑے فخر سے کر چکا تھا۔ اور اُسے بتا چکا تھا کہ "غدر" کے زمانے میں اس "انگریز دشمن" فخر خاندان کو پھانسی پر چڑھایا گیا تھا۔ مگر اس نے شاید یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ پھانسی کہاں گڑی تھی جس پر اس "سورما" کو چڑھایا گیا تھا۔ "ہاشم علی خاں کو یہیں پھانسی دی گئی تھی۔"

"یہاں؟۔ قبرستان میں؟"

"ہاں! تمہارے دادا جان بتاتے تھے کہ پہلے یہ جگہ قبرستان نہیں تھی۔ بس ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ انگریزوں نے غدر کے زمانے میں یہیں پھانسیاں گاڑیں۔ ہاشم علی خاں یہیں دفن ہوئے اور اس طرح یہ ہمارا خاندانی قبرستان بن گیا۔" ساجد چند لمحے چپ رہا۔ پھر اس نے کہا۔

"ہمارا سلسلۂ نسب ایران توران سے نہیں، اس قبر سے شروع ہوتا ہے۔!"

کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ پھر ساجد نے شاہد کا بازو پکڑ کر کہا۔ "آؤ!" اور دونوں ایک قبر کی جانب بڑھے جو ہاشم علی خاں کی قبر سے سات آٹھ گز کے فاصلے پر تھی۔ اور جس کا کتبہ ساجد نے قبرستان میں داخل ہوتے ہی پڑھ لیا تھا۔ "یہ تمہارے دادا کی قبر ہے۔"

قبر اچھی حالت میں تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ کل پرسوں ہی اس کی صفائی کی گئی ہے۔ ساجد نے پتلون کی جیب سے رومال نکالا اور کھول کر سر پر ڈال لیا۔ شاہد نے اس کی تقلید کی۔

"سورۂ فاتحہ یاد ہے؟"

جواب میں شاہد نے اسے خالی خالی نظروں سے دیکھا۔

"الحمدللہ!"

"ہاں!" شاہد نے جلدی سے کہا۔ "وہ تو یاد ہے۔"

دونوں نے ہاتھ اٹھائے۔ اور ساجد نے سوچا، نہ جانے اسے یاد بھی ہے یا یوں ہی مجھے خوش کرنے کے لئے کہہ دیا۔ اس نے

بے چینی سی محسوس کی۔ اس کے ہونٹ ہلنے لگے۔ اور بے صدا آیات فاتحہ اتنی باصدا ہو گئیں کہ صاف سنائی دینے لگیں۔ فاتحہ پڑھنے کے دوران میں ساجد کی نظریں کئی بار قبرستان کے اُس پار تکیے کی طرف اٹھیں جس کے ایک کچے گھر کے سامنے پڑے ہوئے چھپر کے نیچے ایک عورت ایک جھنگے پہ بیٹھی پہلے کچھ سی رہی تھی اور اب ہاتھ روکے بڑے انہماک سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ فاتحہ پڑھ چکنے اور منہ پر ہاتھ پھیرنے اور رومال کو سر سے اتار کر دوبارہ تہ کر کے پتلون کی جیب میں رکھنے کے بعد ساجد مڑا تو اس نے اُسی عورت کو لال چھینٹ کے پیوند لگے سیدھے پاجامے اور لال تول کی قمیض میں اپنے پاس کھڑا پایا۔ اس کے پاس ایک مرد کالی تہمد اور گاڑھے کے پیلے سپید کرتے پر کالی بنڈی پہنے کھڑا تھا۔ اس کا سر سپید تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں لال ڈورے تھے۔ دونوں نے اُسے ایک ساتھ سلام کیا۔

"پہچانا ــ ساجد میاں؟" مرد نے پوچھا۔

"بھئی معاف کرنا! یاد نہیں آرہا۔" حالاں کہ ساجد دیکھتے ہی دونوں کو پہچان گیا تھا۔

"میں بادشا ہوں، ساجد میاں۔ بادشا!"

تب ساجد نے "ارے بادشاہ!" کہہ کر اُسے کھینچا اور گلے لگا لیا۔ "تو پھر یہ تولن ہوں گی۔!" اُس نے جس تیزی سے بادشاہ کو کھینچ کر گلے لگایا تھا اسی تیزی سے اپنے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ بادشاہ کے کپڑوں سے چرس کی بُو آرہی تھی۔

تولن ساجد کے منہ سے اپنا نام سُن کر اس عمر میں بھی شرمائی، لجائی اور پھر ہنس دی۔

"سلام کر میاں کو۔" بادشاہ نے حکم دیا۔

تولن نے ساجد کو پھر سلام کیا۔

"اور یہ چھوٹے بھتیا ہوں گے!" بادشاہ نے کہا۔

"ہاں!" ساجد نے کہا۔ "ان کا نام شاہد ہے۔"

"بالکل میاں کی سکل ہے!" تولن بولی۔

شاہد نے دونوں کو ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔ دونوں کے چہرے کھل اُٹھے۔ دونوں نے اُسے بہت ساری دعائیں دے ڈالیں۔

"شہنشاہ کیسے ہیں؟" ساجد نے پوچھا۔

بادشاہ فوراً آنکھوں میں آنسو لے آیا۔ "ان کو گزرے تو دس اوپر دو، بارہ برس ہو گئے۔" اس نے ساجد کے والد کی قبر کی طرف دیکھا۔ "میاں کے انتقال کے کچھ ہی دنوں بعد چل بسے۔!" جیسے ساجد کے والد کا انتقال نہ ہوا ہوتا تو شاید اس کا باپ بھی نہ مرا ہوتا۔

تولن آنکھوں میں آنسو لانے میں ناکام رہی۔ اس نے اپنی خشک ناک سڑکنے پر اکتفا کیا۔

"بہت افسوس ہوا سُن کے!" ساجد نے کہا اور اُسے یاد آیا کہ باپ بیٹے میں کبھی نہیں بنی۔ اُٹھتے بیٹھتے لڑائی جھگڑا۔ تو تو میں میں

"ہاں میاں!" بادشاہ نے اپنے دائیں ہاتھ کی پشت کو دونوں آنکھوں پر پھیر کر کہا۔ "اب تو اپنی باری ہے۔!"

"نہیں، بادشاہ!" ساجد نے اخلاقاً اس سے اختلاف ضروری سمجھا۔ "تم ابھی اور بہت دن جیوگے!"

اب بادشاہ کی باری تھی۔ اس نے مصلحتاً ساجد سے اختلاف ضروری سمجھا۔ "نئیں ساجد میاں۔ اس سالی زندگی کا کوئی بھروسا نئیں۔ اب اپنے میاں ہی کو دیکھ لو۔ چٹ پٹ ہو گئے!"

نکیے کے گتے چُننے گھروندوں کے دروازوں میں جوان اور بوڑھی عورتوں کے سر نمودار ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اور کئی بچے بچیاں --- کسی کی آنکھوں میں کیچڑ، کسی کی ناک بہتی ہوئی، کسی کے گلے میں تعویذ، کوئی نیچے سے ننگا، سب کے سر میلے چیکٹ، سب ننگے پیر --- کھسکتے کھسکتے قبرستان کے قریب آ گئے تھے۔

ساجد نے محسوس کیا کہ حملہ ہونے والا ہے۔ اس نے جیکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ دو ہزار کے ایک نوٹ کو اندر ہی اندر تہ کر کے اس صفائی سے نکالا کہ بادشاہ کو بھی نظر نہ آیا۔ حالاں کہ اس کی آنکھیں اسی لمحے سے لگاتار ساجد کے ہاتھ کا تعاقب کر رہی تھیں جب یہ جیکٹ کی اندرونی جیب کی طرف بڑھا تھا۔ ساجد نے بادشاہ اور بتولن کی طرف پیٹھ کر کے تہ کیا ہوا نوٹ شاہد کو دیا۔ اور اس سے انگریزی میں کہا کہ یہ عورت کو دے دو۔ شاہد نے آگے بڑھ کر تہ کیا ہوا نوٹ بتولن کو دے دیا۔ بتولن نے نوٹ آدھا کھول کر دیکھا۔ پھر پورا کھول کر اسے اپنی آنکھوں کے پاس لے گئی۔ اس کی پیالی سی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے جلدی سے نوٹ کو پھر تہ کر کے مٹھی زور سے بند کر لی۔ اور جہاں کھڑی تھی وہیں سے ایک قدم بھی آگے بڑھے بغیر، ایک کھلے اور ایک بند ہاتھ سے، شاہد کی کنپٹیوں کو چھوئے بنا اس کی بلائیں لے ڈالیں۔ اور ایک بار پھر شاہد پر دعاؤں کی بارش ہوئی --- جگ جُگ اور ہزار برس جینے کی دعا۔ دودھوں نہانے اور پوتوں پھلنے کی دُعا، چاند سی بنو بیاہ کر لانے کی دُعا، بری "نجر" سے بچنے کی دُعا، "درو تجے" پر ہاتھی جھومنے کی دعا۔ اور اُو نچے "ہدّے" کی دُعا۔ اعلیٰ عہدے پر پہنچنے کی یہ آخری دعا بادشاہ نے دی تھی جو اس بار دعاؤں کے میدان میں بتولن سے قدم ملا کر نہ چل سکا تھا اور جس کی نظریں بار بار بتولن کی بند مٹھی کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

"اب چلیں میاں!" اس نے ساجد سے اجازت مانگی۔

"ہاں!"

"سب ٹھیک ٹھاک ہے؟" اس نے مڑنے سے پہلے ساجد کے والد کی قبر کی جانب ایک مبہم سا اشارہ کر کے پوچھا۔

"ہاں ---!"

دونوں نے دونوں کو سلام کیا۔ بادشاہ چلنے کے لئے مڑا۔ مگر بتولن ہچکچائی۔ شاید وہ مزید اظہارِ تشکر کرنا چاہتی تھی مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے کرے۔

"اب چلتی ہے کہ ---!" بادشاہ نے اسے غضبناک نگاہوں سے دیکھا۔

بتولن نے جلدی سے ساجد اور شاہد کو پھر سلام کیا۔ اور بادشاہ کے پیچھے ہولی، جو اُن بچوں کو ڈانٹ کر بھگا رہا تھا جو قبرستان کے کنارے جمع ہو گئے تھے۔

"اب دونوں میں لڑائی ہوگی۔" ساجد نے ہاشم علی خاں کی قبر کی جانب بڑھتے ہوئے موسم کی پیشین گوئی کے انداز میں کہا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

"کیوں؟"

"بادشاہ کہے گا نوٹ مجھے دے۔ بتولن کہے گی ہرگز نہیں۔ نشے پانی میں ڈبو دے گا! یہ ہاتھ ہٹائے گا۔ دیتی ہے کہ کروں دھنائی۔ وہ کہے گی چاہے ہڈی پسلی ایک کر دے پر تجھے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ دوں گی۔" ساجد قبر سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور شاہد بھی۔ "گالم گلوج ہوگی، شاید جوتم پیزار بھی۔ سارا تکیہ جمع ہو جائے گا۔ پھر بیچ بچاؤ ہوگا اور میرے خیال میں فیصلہ آدھے آدھے پر ہوگا۔ فیصلہ چاہے جو کچھ بھی ہو بادشاہ آج دَم لگانے کے بعد بالائی کا دونا ضرور چاٹے گا۔ فتح گڑھ کی بالائی بہت اچھی ہوا کرتی تھی۔"

"نٹ کرتا ہے؟" شاہد نے انگریزی میں پوچھا۔

"ایسا ویسا ۔ اور وقت بھی کیڑے ۔ سے برس کی ہو آ ہی گئی۔ ان لوگوں میں ---" ساجد نے تکیے کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "یہ عادت خاصی عام ہے"

"کوئی قانونی پابندی نہیں؟" شاہد نے پھر انگریزی میں پوچھا۔

ساجد مسکرایا۔ "گانجا، چرس، بھنگ، افیم کا ادھر خاص کر ایسے لوگوں میں ہزاروں برس سے رواج ہے۔ کوئی نوٹس نہیں لیتا، کوئی پابندی نہیں نہ قانونی نہ سوشل۔"

شاہد نے تکیے کی طرف دیکھا۔ اس کی نظریں ابھی تک اس کی اور ساجد کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے قبرستان پر ایک نظر ڈالی جس میں کوئی قبر کچی نہیں تھی۔

"قبریں پکی ہو کر ان کا کام چل جاتا ہے؟"

"خالی قبریں تھوڑی کھودتے ہیں۔ بھیک بھی مانگتے ہیں اور اب تو پتا نہیں، پہلے تو شادی بیاہ میں بینڈ باجا بھی بجاتے تھے۔ ڈھیلی ڈھالی یا اونچی ۔ ایک آدھ سائز بڑی یا ایک آدھ سائز چھوٹی، کنگلی ہوئی لال پیلی وردیاں اور بھنوؤں تک آتی ہوئی انگریزی ٹوپیاں پہن کر، نہ تال ٹھیک نہ سُر ۔ کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے کو جی چاہتا تھا۔ شادی بیاہ کا کھانا مل جاتا تھا پیٹ بھر کے کھانے کو، اور کچھ نقد بھی ۔ یہ الگ بات کہ بینڈ باجا والوں کو بہت انتظار کرنا پڑتا تھا۔ جب سب کھا پی چکتے تھے تب ان کی باری آتی تھی۔"

"اور یہ بادشاہ ۔ یہ کیا ان کا ہیڈ ہے؟"

"آفیشل نہیں تو ان آفیشل۔ اس کا خاندان برسہا برس سے اس قبرستان کی رکھوالی کرتا آرہا ہے اور بدلے میں اس خاندان کو ہم لوگوں کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ پہلے ان کا ماہانہ بندھا ہوا تھا۔ جمعرات، عید، بقرعید، شادی بیاہ الگ۔ اداامیاں بھی ہر مہینے کچھ نہ کچھ تو دیتے ہی ہوں گے --- اور کچھ نہیں تو حویلی کی روایت قائم رکھنے کے لئے۔ تم کیا سمجھے مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا تھا؟"

"لگا تو ایسا ہی تھا!"

ساجد ہنسا۔ "بہت بدمعاش ہے، اچھا خاصا ایکٹر! --- اداامیاں نے بتادیا ہوگا۔ ورنہ قبریں کہیں اتنی صاف ملتیں معلوم ہوتا ہے سارے قبرستان میں جھاڑو لگائی گئی ہے۔ تم نے ایک بات نوٹ کی؟"

شاہد چپ رہا۔

"اس نے تمہاری مم کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کی بیوی نے بھی نہیں۔ ورنہ چھوٹتے ہی پوچھتی بیگم صاحبہ بھی آئی ہیں؟ راضی خوشی ہیں؟ بلکہ پہلے ہی حویلی پہنچ چکی ہوتی بیگم صاحبہ کو سلام کرنے --- اور دونوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ تمہاری ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔"

"بھوا کہہ رہی تھی چاندسی بنو بیاہ کے لاؤ --- بنو کسے کہتے ہیں؟"

"بیوی کو --- لیکن یہاں معنی دلہن کے ہیں، بلکہ نئی دلہن کے۔"

یکایک ساجد کا حافظہ اسے بہت دور لے گیا۔

"اس کا باپ اس سے بھی بڑا ایکٹر تھا۔ ایک دن یہیں، اسی تکیے کے سامنے کسی سے لڑجھگڑ رہا تھا۔ بلکہ باقاعدہ مار رہا تھا اسے، جوتے سے۔ کہہ رہا تھا دو مہینے ہوگئے اس نے مجھ سے ایک روپیہ ادھار لیا تھا۔ بیسیوں بار تقاضا کرچکا ہوں، پر واپس دینے کا

نام نہیں لیتا۔ گالیاں بھی دے رہا تھا۔ پھر اس کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔ اسی سڑک پر۔ اُس وقت یہ کنکر کی ہوتی تھی۔ جگہ جگہ سے اُدھڑی ہوئی۔ کہہ رہا تھا اُٹھا کر نالے میں پھینک دوں گا۔" ساجد لمحے بھر کے لئے رُکا۔ اُسے وہ گالی یاد آئی جو بادشاہ کے باپ نے اس شخص کو نالے میں پھینک دینے کی دھمکی دیتے وقت دی تھی۔ گالی اس کی زبان تک آتے آتے رُک گئی۔" مجھے اچھی طرح سے یاد ہے۔ میں پاس ہی کھڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا اور مجھے سخت غصہ آرہا تھا کہ یہ شخص محض ایک روٹی کی خاطر ایک آدمی کو ایسے مار رہا ہے۔ جوتے سے۔ اُسے بے عزت کر رہا ہے۔ میں اس وقت زیادہ سے زیادہ آٹھ نو برس کا رہا ہوں گا۔ جب شہنشاہ اس آدمی کو گھسیٹتا ہوا بالکل نالے کے کنارے لے گیا اور میں سمجھا کہ وہ اُسے اب پھینکنے ہی والا ہے تو مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے ایک ڈھیلا اُٹھا کر اس کے دے مارا۔ اتفاق کی بات کہ ڈھیلا یا پتھر یا اینٹ کا ٹکڑا۔ جو کچھ بھی تھا، جا کر سیدھا اس کے سر پہ لگا اور اس کے سر سے خون بہنے لگا۔ بس پھر کیا تھا۔ اس آدمی کو چھوڑ چھاڑ اور کرتے کے دامن کو یہاں وہاں خون سے رنگ کر ہائے ہائے کرتا، سر پکڑے حویلی پہنچ گیا۔ میاں نے سر پھاڑ ڈالا، میاں نے سر پھاڑ ڈالا کی رٹ لگاتا ہوا۔ ابا جان اس وقت گھر پہ موجود نہیں تھے۔ لہٰذا معاملہ اماں جان کی عدالت میں پیش ہوا۔ کسی ملازم سے کہا گیا کہ باہر جا کر دیکھو کیسی چوٹ ہے۔ اس نے رپورٹ پیش کی کہ واقعی سر پھٹا ہے مگر چوٹ گہری نہیں۔ امی جان نے اُسے پانچ روپے بھجوائے۔ اور ملازم کو ساتھ کر دیا کہ لے جا کر ڈاکٹر پرشوتم داس سے جو اس زمانے میں فتح گڑھ کے واحد ڈاکٹر تھے، مرہم پٹی کرا دو۔ لیکن وہ بدمعاش کہیں اتنی آسانی سے ٹلنے والا تھا۔ پانچ تو بہت تھوڑے ہیں۔ بیگم صاب، بہت خون بہ گیا ہے۔ مہینے بھر روز آدھ سیر دودھ ملے تب کہیں جا کر اتنا بھر پائے گا۔ غرض جب تک اس نے امی جان سے پانچ روپے اور نہیں اینٹھ لئے تب تک نہیں ٹلا۔"

"آپ پر ڈانٹ پڑی ہوگی ؟"

ساجد مسکرایا۔ نہ جانے کیوں بچوں کو یہ جان کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ کبھی ان کے والدین پر بھی ڈانٹ پڑا کرتی تھی۔ خاص کر قبلہ و کعبہ ابا جان پر ـــ

"ڈانٹ ہی سمجھو لیکن ذرا مختلف قسم کی۔ میں اوپر برساتی میں تھا۔ تمہاری پھوپھی صاحبہ آئیں۔ تلئے بھائی جان، آپ کو امی جان بلا رہی ہیں۔ ساجدہ اس زمانے میں تتلایا کرتی تھی۔ تو جناب ہم امی جان کی عدالت میں حاضر ہوئے۔ تشریف رکھیے۔ ہمارے کان کھڑے ہوئے، کیوں کہ امی جان ہمارے ساتھ 'آپ جناب' سے صرف اس وقت پیش آتی تھیں جب ناراض ہوتی تھیں۔ ورنہ ہمیشہ 'تم'۔ ابا جان کا معاملہ اس کے بالکل برخلاف تھا۔ وہ جب ناراض ہوتے تھے تب 'تم' کہتے تھے ورنہ ہمیشہ 'آپ'۔ تو جناب ہمیں بتایا گیا کہ وہ فقیر شہنشاہ شکایت لے کر آیا تھا کہ میاں نے اس کا سر پھوڑ دیا۔ ہم نے فوراً اقبالِ جرم کیا۔ مگر لگے ہاتھوں انہیں یہ سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ ہم نے اسے ایک بہت بُری حرکت سے باز رکھنے کے لئے ایسا کیا۔ لیکن ہماری کوئی سنوائی نہیں ہوئی۔ اور فیصلہ ہمارے خلاف صادر ہوا۔ آپ کو دوسروں کے فضیتوں میں پڑنے کی کیا ضرورت۔ آپ اپنے کام سے کام رکھیے۔ دوسروں کے پھٹے میں پیر نہ اڑائیے۔ پھر کبھی ہم اس قسم کی کوئی شکایت نہ سنیں۔ ورنہ ہم سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ ہاں۔ اور عدالت برخاست۔"

ساجد تھوڑی دیر خاموش رہا۔

"واقعی بہت بڑا ایکٹر تھا بادشاہ کا باپ! بہت عرصے بعد ایک دن میں نے اُسے یاد دلایا کہ میری وجہ سے تمہیں دس روپے ملے تو معلوم ہے کیا بولا ؟ ـــ دس کیوں میاں، پورے گیارہ۔ میں کیا اپنا روپیہ چھوڑنے والا تھا۔ میں نے وصول کر کے چھوڑا ـــ اس زمانے میں دس روپے بہت ہوتے تھے اور وہ بھی کسی فقیر بھک منگے کے لئے۔ لوگ بھیک میں عموماً ایک پیسہ دیتے تھے۔ اور کسی نے اکنی دے دی تو مانو حاتم کی قبر پر لات مار دی۔ اکنی چار پیسوں کی ہوتی تھی۔ نئے نہیں۔ پُرانے چار پیسے، روپے میں چونسٹھ ـــ باپ بیٹے کی

کبھی نہیں نہیں۔ جب دیکھو آپس میں یک بک جھک جھک۔" وہ رکا۔ "کسے کہ نہ کہے؟ — جوان ہے، پڑھا لکھا ہے، اچھی دنیا دیکھے ہوئے ہے اور پھر جوان بیٹا تو دوست برابر ہوتا ہے — فیصلہ کہہ دینے کے حق میں ہوا۔" معلوم نہیں کہاں تک سچ ہے اور کتنا جھوٹ مگر لوگ کہتے تھے کہ شہنشاہ نے ایک رات اپنی بہو پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔ اسی تبولن پر۔ شاید نشے میں رہا ہو۔ اور کہنے والے تو یہ بھی کہتے تھے کہ اس کے تبولن کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے اور اسی لئے باپ بیٹے میں اَن بَن رہتی تھی۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔ ویسے نیچ ذات کے لوگوں میں اس قسم کی باتیں عام نہیں تو —"

"میں سمجھتا تھا کہ یہ باتیں صرف مغرب میں ہوتی ہیں۔" شاہد نے انگریزی میں کہا۔

"نہیں — مگر گورے اس معاملے میں بھی ہم لوگوں سے بہت آگے ہیں!" ساجد کو ٹی وی کا ایک پروگرام یاد آ گیا۔ "صرف برطانیہ میں ایسے کئی ہزار کیس ہر سال عدالتوں میں پیش ہوتے ہیں اور ماہرین کی رائے ہے کہ جو واقعات عدالتوں تک نہیں پہنچتے ان کی تعداد اور بھی زیادہ ہے۔ ادھر تو بیس پچیس برس میں ایک آدھ بات ایسی سننے میں آتی تھی۔ اور وہ بھی کون جانے کہ سچ یا جھوٹ!"

"امیریکا کا بھی یہی حال ہے۔"

"ایک بات اور۔" ساجد نے کہا۔ "یہاں کی سچ یا جھوٹ جو بھی سنی سنائی بات ہوتی ہے وہ زیادہ تر سسر بہو کی مگر اُدھر تو باپ، بھائی، دادا، نانا، انکل اور پانچ پانچ، چھ چھ برس تک کی بچیوں کے ساتھ۔ ایک کیس مجھے یاد ہے۔ تین بہنیں تھیں اور سگے باپ نے باری باری تینوں کو خراب کیا۔ لگاتار۔ برسوں تک۔"

ساجد جھرجھری لے کر چپ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے تین چار اور قبروں کا تعارف کرایا جن میں سے ایک اس کی بڑی بہن "نفیسہ آپا" کی تھی جو عمر میں اس سے دو ڈھائی سال بڑی تھیں اور جن کا کم سنی میں انتقال ہو گیا تھا۔ اور جب وہ حویلی واپس جا رہے تھے تو ساجد نے ہاشم علی خاں کی قبر کے پاس سے گزرتے ہوئے انگریزی میں کہا۔

"میں ان کے پائنتی دفن ہوں تو کتنا اچھا ہو!"

"پریاگ راج" کی رفتار بڑی تیزی سے کم ہونی شروع ہوئی اور گاڑی بالآخر بہیوں کے شدید احتجاج کے باوجود رک گئی۔ سامنے کی برتھ پر لیٹی ہوئی عورت نے کروٹ بدلی۔ اب اس کی پچھاڑی ساجد کی طرف تھی جس پر سے سپید چادر کھسک گئی تھی۔ عورت نے اپنے اُبھرے ہوئے کولھے پر ہاتھ پھیرا اور چت ہو کر بدن کو چادر سے گردن تک ڈھانک لیا۔

ساجد کی نظریں عورت کے ڈھکے بدن پر سے ہٹ کر کھڑکی کے دھندلے شیشے کے اس پار چلی گئیں۔ سارا منظر ٹھٹھری چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔ ریل کی آڑی ترچھی، ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی پٹریاں، اُن کے پیچھے ریلوے کے کوارٹروں جیسی دو عمارتیں۔ عمارتوں کے پیچھے دُور تک پھیلے ہوئے کھیت۔ کھیتوں کے بیچ میں رام لیلا کے راون جیسا ایک پائلون۔ کھیتوں کے اس پار کچھ کچے مکان۔ داہنے ہاتھ آموں کا ایک باغ۔ بائیں ہاتھ ایک چھوٹا سا خشک تالاب۔ جدھر نگاہ اٹھی سیر شبنمستان ہے۔ اس کا جی چاہا کہ گاڑی سے اُتر کر کھیتوں میں چلا جائے۔ ننگے پیر۔ مگر گاڑی کسی اسٹیشن پر نہیں رکی تھی۔ بلکہ سگنل کا انتظار کر رہی تھی۔ پھر بھی اس نے ٹانگیں برتھ سے نیچے لٹکائیں — اور اگر چھوٹ گئی تو! — وہ اپنے ارادے کی لغویت پر اندر ہی اندر ہنسا اور اس نے ٹانگیں پھر اُوپر کر لیں — مسافروں کو سواری چھوٹ جانے کا ہمیشہ ڈر لگا رہتا ہے، فلائٹ نہ مس ہو جائے، ٹرین نہ چل دے، بس نہ چھوٹ جائے۔ ہمیشہ خدشہ، ہمیشہ دھڑکا، کہیں چھوٹ نہ جائیں، پیچھے نہ رہ جائیں حالاں کہ ٹھنڈے دل سے سوچو تو چھوٹ جانے، پیچھے رہ جانے سے زیادہ خطرہ سفر میں ہے۔

لیکن منزل اشارے کرتی رہتی ہے، اپنے پاس بُلاتی رہتی ہے اور لوگ منزل کو پا لینے کے والہانہ شوق میں رواں دواں رہتے ہیں۔ اور منزل پا لیتے ہیں۔ لیکن جب شدتِ خواہش سے لرزاں ہاتھوں سے پیکرِ مراد کا کتانی ملبوس اُتارتے ہیں تو جو گولائیاں دُور سے دعوتِ نظارہ دلمس و ذائقہ دیتی نظر آرہی تھیں درحقیقت تپکتے پھوڑے نکلتی ہیں۔ وہ شگاف جو مُسکراتے نظر آرہے تھے دراصل زخم تھے جن سے خون اور پیپ رِس رہا ہے۔ اور متبسم آنکھیں جو ٹھنڈی روشنی کی جھیلیں نظر آرہی تھیں اصل میں دھڑا دھڑ جلتے الاؤ جن کے رقصاں شعلے انہیں جلا کر راکھ کر دینے کے لئے بے چین۔

گاڑی جب تال سے بے تال ہوئی تو شاہد کی نیند اچٹی۔ اور جب بالکل رُک گئی تو اس کی آنکھ کُھل گئی۔ اس نے کچھ دیر انتظار کیا۔ گاڑی نہیں چلی۔ اس نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ ساجد برتھ پر پیر پھیلائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ کھڑکی کی طرف تھا۔

"آپ سوئے نہیں۔ ابو ؟"

"نیند نہیں آئی !"

شاہد نیچے آگیا۔ ساجد نے پیر سکیڑ لئے۔ شاہد اس کے پیروں کے پاس بیٹھ گیا۔

"کون سا اسٹیشن ہے ؟"

"ابھی اسٹیشن نہیں آیا۔ سگنل پر رُکی کھڑی ہے۔"

"فتح پور۔" سامنے کی برتھ پر لیٹی ہوئی عورت نے کہا۔ "اب فتح پور آئے گا۔" اور یہ اطمینان کر کے کہ چادر اس کے بدن کو ٹھیک سے ڈھانکے ہوئے ہے، عورت نے کروٹ بدل کر بلا دھڑک پشت اُن کی طرف کر دی۔

"اُردو لٹریچر میں۔" ساجد نے کہا۔ "فتح پور کا نام خاصا جانا پہچانا ہے۔ تقسیم سے پہلے یہاں سے ایک مشہور ادبی رسالہ نکلا کرتا تھا۔ نہیں۔ نکلتا تو لکھنؤ سے تھا اور اس سے پہلے شاید بھوپال سے مگر اس کے ایڈیٹر یہاں کے رہنے والے تھے، نیاز فتحپوری۔"

"کیا نام تھا ؟"

"نگار ۔ بہت اچھا پرچہ تھا۔"

"بند ہو گیا ؟"

"ہاں ! ہجرت کر کے پاکستان چلا گیا تھا۔ مگر وہاں چلا نہیں !"

"کیوں ؟"

ساجد چند لمحے خاموش رہا۔ "معلوم نہیں۔"

"یہاں سے نہ جاتا تو؟"

ساجد کے ذہن میں ایک مصرع کوندا۔ پھر کچھ دیر چُپ رہنے کے بعد اس نے کہا۔ "پتا نہیں۔ شاید تب بھی بند ہو جاتا — کچھ دیر اور سو لو۔"

"آپ بھی تھوڑا سو لیجئے۔" شاہد نے اپنی برتھ پر واپس جاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" لیکن ساجد نے آنکھیں بند کرنے کی بجائے سگریٹ سلگائی۔

ٹرین حرکت میں آئی۔ اور جب فتح پور پیچھے رہ گیا تو ساجد نے سنا کہ گاڑی اُس مصرع کی گت پر جو ابھی اس کے ذہن میں کوندا تھا، سرپٹ بھاگی جا رہی ہے — غربت جن کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا — اُس نے سگریٹ ایش ٹرے میں

"یہی تو کمال ہوا، میاں! ایک بھی نہیں پکڑا گیا۔ جتنے بھاگے تھے سنا ہے سب کے سب صحیح سلامت پاکستان پہنچ گئے۔"

ساجد کو شبراتی کے الفاظ ہنستے ہوئے سنائی دیئے۔ "واقعی!"

"ہاں میاں! سنا ہے اندر ہی اندر سرنگ کھود کر لنگا پار نکلے۔ اس پار سواری کا پہلے سے انتجام تھا۔ اس میں بیٹھ یہ جا وہ جا!"

"یہ تو واقعی کمال ہوا!" شاہد نے ساجد سے انگریزی میں کہا۔ "جنگی قیدیوں کے کیمپوں سے برطانوی، امریکی اور دیگر اتحادی فوجیوں کے فرار کے جتنے فلم اور ٹی وی سیریل میں نے دیکھے ہیں ان میں زیادہ تر بھاگنے والوں کو جلد یا بدیر واپس کیمپوں میں دکھ گیا ہے۔"

"مگر یہاں کی بات دوسری ہے۔" ساجد نے بھی انگریزی کا سہارا لیا۔ "بھانت بھانت کی بولیاں۔ طرح طرح قسم قسم کے ناک نقشے۔ نہ زبان کا مسئلہ، نہ پوشاک کا۔ پہچانے جاتے تو کیسے! یہ نہیں کہ قومی زبان بولے اور پہچانے گئے پہنا نہیں کہ پہچانے گئے۔"

پھر ساجد نے شبراتی کو مخاطب کیا۔ "سواری کا انتظام کس نے کیا تھا؟"

"مالوم نہیں، میاں!"

تانگہ اب چھاؤنی کے اس علاقے میں سے گزر رہا تھا جہاں افسروں کے کشادہ بنگلے ہیں۔ ان میں سے ایک کے گیٹ ... ایک سکھ سپاہی، پوری وردی میں، ایک مونڈھے یا اسٹول پر بیٹھا ہوا بڑے غور سے تانگے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"میاں، آپ کو ایک بات بتانا تو بھول گیا!"

"کیا؟"

"چھاؤنی میں پاکستان سے آنے والوں کا جانا منا ہے۔" شبراتی نے سکھ سپاہی پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

"تمہیں پہلے بتانا چاہئے تھا۔" ساجد نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"مانف کرنا، میاں! ابھی یاد آیا۔"

"بڑے پھنسے!" ساجد نے سکھ سپاہی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو غیر یقینی انداز میں کھڑا ہو رہا تھا۔ "اب یہ تمہیں تانگہ روکنے کا آرڈر دے گا۔"

"موڑلوں؟"

"اب موڑنے سے کیا ہوگا!" ساجد نے ہر چہ بادا باد کے انداز میں کہا۔

تانگہ بنگلے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ شبراتی کی نظریں ناک کی سیدھ میں سامنے سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ سکھ سپاہی سیدھا کھڑا ہوا تھا۔ اس نے اٹینشن ہو کر سیلوٹ مارا۔ ساجد نے فوراً سیلوٹ کا جواب سیلوٹ سے دیا۔ شبراتی نے مڑ کر ساجد کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ ساجد مسکرایا۔ شاہد بڑی مشکل سے ہنسی روک سکا۔

"بال بال بچے!" ساجد نے کہا۔

"ہاں میاں!" شبراتی نے کہا۔ مگر وہ بدستور ساجد کو حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

اب ساجد سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ ہنسا۔ اس کے ساتھ شاہد بھی۔ ہنسی ان کے منہ سے ایسے نکلی جیسے پنجرہ کھلنے پر اس میں سے پنچھی پر پھڑپھڑاتے نکلتے ہیں۔

"کوئی ہماری پیشانی پر لکھا ہے کہ ہم پاکستانی ہیں۔" ساجد نے ہنسی پر قابو پا کر کہا۔

"نہیں۔ پر وہ جو اس نے سلوٹ مارا، وہ کاہے کو!" شبراتی کی حیرانی ابھی برقرار تھی۔

"احتیاطاً!" ساجد نے کہا اور شبراتی کو تفصیلاً سمجھایا۔

تب شاہد نے شبراتی کو بتایا کہ فکر کی کوئی بات نہیں تھی کیوں کہ ہمارے پاس پاکستانی نہیں، انگریزی پاسپورٹ ہیں۔"

"میاں نے بلادجہ ہی ووہ پلی خون خشک کروا دیا!"

"اتنا مت ڈرا کرو!" ساجد نے کہا۔

"ڈرتا کون ہے، میاں!" شبراتی نے چابک لہراتے ہوئے کہا۔ "شبراتی کسی سے نہیں ڈرتا، سوائے اوپر والے کے!"

ساجد مسکرا دیا۔

ایک شعر کئی منٹ سے ساجد کے ذہن کے تہ خانے سے باہر آنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ کبھی ایک ٹکڑا سر نکالتا، کبھی دوسرا لیکن باہم مربوط نہ ہو کر رہتے۔ بالآخر ایک ٹکڑا ابھرنے اور ڈوبنے کی کشاکش سے چھٹ کر سطح پر ایسا آیا کہ پھر اس نے روپوش ہونے کا نام نہیں لیا۔ — آنکھ بھر آئی — لیکن باقی ٹکڑے ابھی تہ خانے میں بند تھے۔ اس نے قافیوں کی تلاش شروع کی — گھر آئی، کترائی، بھر آئی — سامنے برتھ پر لیٹی ہوئی عورت نے کروٹ بدلی۔ اب اس کی پیٹھ ساجد کی طرف تھی اور سپید چادر بدن پر سے اتنی ہٹ گئی تھی کہ ساری میں لپٹے ہوئے گداز کولہوں اور چولی میں پھنسی ہوئی پیٹھ کے درمیان کا حصہ ساجد کو دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔ — نظر آئی، کمر آئی، کترائی — اس کا ذہن نظر آئی کی جانب واپس آ گیا — وہ پو پھٹی — ساجد نے دیکھا کہ باہر چاندنی اب پھیکی پڑ چلی ہے — وہ پو پھٹی۔ وہ پو پھٹی وہ نئی زندگی نظر آئی — یہ اس شعر کا مصرع نہیں تھا جس کے ٹکڑے جوڑنے کی وہ اتنی دیر سے کوشش کر رہا تھا۔ اس نے مصرع کو تھوڑی دیر اپنے ذہن میں گھومنے دیا۔ لیکن دوسرا مصرع پھر بھی یاد نہیں آیا۔ — نئی زندگی، رمانٹ، فٹ! — اس نے اپنی جھلاہٹ کی خاموش گونج سنی۔ اس کی نظریں عورت کی سوئی سی مگر ننگی کمر پر جم گئیں۔ عورت جھپاک سے کروٹ بدل کر چت ہو گئی۔ گویا اسے اپنی عریاں کمر پر ساجد کی نظروں کے لمس کا احساس ہو گیا ہو۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ساجد کی آنکھیں بند تھیں۔ عورت نے پھر چادر سے اپنے جسم کو گردن تک ڈھک لیا۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ ساجد نے آنکھیں کھول دیں۔ عورت پیر پھیلائے بالکل سیدھی لیٹی ہوئی تھی اور چادر اس کی ٹانگوں کے بیچ میں دھنسی ہوئی تھی۔ کسی چھوٹے سے اسٹیشن کی مدھم روشنیاں تیزی سے گزریں۔

جہاں ساجد اور شاہد کھڑے ہوئے تھے وہ جگہ دریا کی سطح سے کوئی پچیس تیس فٹ بلند تھی۔ بائیں جانب پستہ قد درختوں کی ایک باڑھ کے اس طرف ڈیڑھ دو سو گز کے فاصلے پر کچھ سپاہی والی بال کھیل رہے تھے۔ دائیں جانب اور پیچھے کی طرف بیس پچیس گز کے فاصلے پر فوجی افسروں کے تین چار بنگلے تھے۔ سامنے نیچے گنگا بہہ رہی تھی۔ خاموش، تھکی تھکی سی، نرم رَو۔ شام کا وقت تھا۔ سورج ڈوبا چاہتا تھا۔ اس کی پیلی کرنیں گنگا کے پانی میں لچک رہی تھیں۔

"یہ جگہ" ساجد نے اس بنگلے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا جس کی جانب اُس کی پشت تھی "پہلے خالی ہوا کرتی تھی۔ یہ بنگلے بعد کے ہیں۔ کتنی آئیڈیل جگہ ہے۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے گنگا کا نظارہ کر لو! — آؤ نیچے چلیں۔"

لال اینٹ کی بیس پچیس سیڑھیاں اتر کر وہ دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ پانی جو اوپر سے ٹھہرا ٹھہرا نظر آ رہا تھا اب باقاعدہ بہتا

نظر آیا۔ دریا پار حد نظر تک ایک میدان سا پھیلا ہوا تھا جو سورج کی ماند پڑتی روشنی میں سنہرا نظر آ رہا تھا۔

"اس وقت تو پیدل پار کر سکتے ہیں۔" ساجد نے کہا۔ وہ دونوں گنگا کنارے گیلی ریت پر ٹہل رہے تھے۔ "لیکن برسات میں گنگا کا پاٹ میلوں تک نظر نہیں آتا۔"

"کتنی پیس فل جگہ ہے!"

"ہاں! ساجد رک گیا۔ اس کی نگاہیں اس بلندی پر اُگے ہوئے درختوں کی طرف اُٹھ گئیں جہاں سے وہ چند منٹ پہلے اُترے تھے۔ "یہاں میں بہت آیا کرتا تھا۔ کوئی کتاب اُٹھائی اور ادھر آ نکلے۔ اور ان پیڑوں میں سے کسی کے نیچے بیٹھ کر گھنٹوں پڑھتے رہے۔ سکون کے معنی شاید اسی جگہ نے مجھے پہلی بار سمجھائے۔"

وہ مڑے تو شاہد کو وہ مندر نظر آیا جو سیڑھیوں کے اس طرف ایک چبوترے پر رکھا ہوا ایک بڑا سا گڑیا گھر لگ رہا تھا اور جس کے اندر رکھی ہوئی مورتی اور مورتی کے قدموں میں بکھرے ہوئے عقیدت کے پھول شام کے دھندلکے میں بھی صاف نظر آ رہے تھے۔

"ابو! یہی تو ہے وہ گھاٹ!" شاہد کے لہجے میں دریافت کی خوشی کھنک رہی تھی۔

"کون سا گھاٹ؟"

"وہی جہاں وہ پجاری اپنا انسٹرومنٹ بجایا کرتا تھا۔ کیا کہتے ہیں اُسے؟"

"اکتارا؟"

"ہاں۔ ایک تارا!"

"تمہیں کیسے معلوم؟"

"مم بتایا کرتی تھیں۔ دادا جان نے اپنے کسی خط میں لکھا تھا۔"

—بغیر کسی کو بتائے، چپکے سے واپس آ گئے اور یہاں سے یہ نہایت اہم اطلاع بھیجی کہ وہ پجاری جو رانی گھاٹ کے مندر کے چبوترے پر بیٹھ کر شام کو اکتارا بجایا کرتا تھا وہ مر گیا— "ہاں!" ساجد نے کہا۔ اس کا چہرہ مندر کی طرف نہیں، ڈوبتے سورج کی جانب تھا۔

وہ واپس جانے کے لئے مڑے تو ایک شخص نے جو مندر سے کچھ قدم آگے ریت کے ایک ٹیلے کی آڑ میں اکڑوں بیٹھا ہوا تھا اور جس کا گھٹا سر اور چوڑی لمبی چٹیا ٹیلے کے اوپر سے جھانک رہی تھی، کھڑے ہو کر اپنے کان میں لپٹا ہوا دھاگا اتارا۔

"یہ اس نے اپنے کان میں کیا لپیٹ رکھا تھا؟" شاہد نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے پوچھا۔

"جنیئو! برہمن پہنتے ہیں۔ اور ایسے موقعوں پر کان میں لپیٹ لیتے ہیں۔" ساجد نے سوچا یہ پوچھے گا کیوں، لیکن شاہد چپ رہا۔ "طہارت کی خاطر، عقیدے کی بات ہے۔ پرانے ایران کے فائر ورشپرس، آگ کی پوجا کرنے والے بھی ایسا ہی دھاگا پہنا کرتے تھے اُسے زُنّار کہتے تھے۔ سورج کی پوجا کرتے تھے تو زُنّار کو دونوں ہاتھوں کے بیچ میں لے کر، دونوں انگوٹھوں کے بیچ میں لے کر جیسے ہندو دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کرتے ہیں۔ ان کی اس پوجا کو "نماشت" کہتے تھے۔ جب بعد میں ایران میں اسلام پھیلا تو یہی "نماشت" بگڑ کر لفظ "نماز" بن گیا۔ نماز، جائے نماز، روزہ نماز یہ سب ہی فارسی کے لفظ ہیں۔ عربی کے نہیں۔" اب وہ آخری سیڑھی پر تھے۔ ساجد نے کہا: "اور خدا بھی۔ یہ بھی ایک قدیم ایرانی لفظ کی موجودہ شکل ہے۔"

ساجد کے پپوٹے بھاری ہو رہے تھے۔ اس نے سوچا نیند آ رہی ہے — یہ بھی کوئی سونے کا وقت ہے۔ زیادہ سے زیادہ گھنٹہ سوا گھنٹہ اور — اس نے کوشش کر کے آنکھیں کھولیں مگر پپوٹے پھر بھاری ہونے لگے۔ وہ نیند کے غلبے اور نہ سونے کے ارادے کے درمیان معلق ہو کر رہ گیا۔

"اس محلے کا نام گاڑی خانہ ہے۔" ساجد نے کہا۔ "اور اس گھر میں" اس نے دائیں ہاتھ ایک مکان کی جانب اشارہ کیا "کسی زمانے میں میرا بہت آنا جانا تھا۔"

بڑا سا برآمدہ، لوہے کے کھمبے، ہرے رنگے ہوئے، دو دروازے — ایک بڑا ایک چھوٹا۔ وہ بھی۔ برآمدے میں ڈھول کی تھیں جمی ہوئی تھیں، مکان کے سامنے نالی بہ رہی تھی۔ مکان سے متصل ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ "پیدی بی بولی۔" پتا نہیں اب کون رہتا ہے اس زمانے میں ایک زمیندار صاحب رہا کرتے تھے۔ ان کی بیوی اور امی جان کی بہت گاڑھی چھنتی تھی۔ میں انہیں خالہ کہتا تھا — خالہ بی۔ اُن کی ایک بیٹی تھی، انجم۔ علی گڑھ میں پڑھتی تھی۔ میں اُسے اپیا کہتا تھا — بے چاری کا انتقال ہو گیا۔"

"انجم کا؟"

"نہیں۔ زمیندار صاحب کی بیوی کا — اور انہوں نے دوسری شادی کر لی۔ دوسری بیوی اپیا سے زیادہ سے زیادہ چھے سات سال بڑی تھیں۔ اپیا تب سے بجھی بجھی سی رہنے لگی تھیں۔ پھر ان کی شادی ہو گئی، لکھنؤ میں، کسی رشتے دار سے۔" ۲۸

اپیا گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر آئی ہوئی تھیں۔ اور میرا زمیندار صاحب کے ہاں پھر آنا جانا بڑھ گیا تھا اور اس دن میں ان کی چھت پر پتنگ اُڑا رہا تھا کہ نیچے سے اپیا کی آواز آئی، ساجد۔ جی اپیا۔ ذرا یہاں آنا۔ اور میں جلدی سے پتنگ اتار کر اور ڈور کو چرخی پر چڑھائے بغیر نیچے آیا۔ اپیا صحن میں نہیں تھیں۔ نور نصیبن باورچی خانے میں مٹی کے کونڈے میں آٹا گوندھ رہی تھیں۔ انہوں نے سندے ہوئے ہاتھ سے اپیا کے کمرے کی طرف اشارہ کیا اور میں کمرے میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ ڈھیلے پاجامے میں ازار بند ڈال رہی ہیں اور ایک مچنا ہوا دوپٹہ کنڈلی مارے پلنگ پر پڑا ہوا ہے اور پاس ہی دھلا ہوا کلف لگا کرتہ اور ایک تولیہ رکھی ہوئی ہے جس کی تہ میں سے ایک گلابی فیتہ جھانک رہا ہے۔ جی اپیا۔ میں جا کے اپیا کے بالکل پاس کھڑا ہو گیا۔ اُن کے بدن سے پسینے کی بُو آ رہی تھی۔ مجھے اُن کے پسینے کی بُو بہت اچھی لگتی تھی۔ میرا ایک کام کر دو گے میرے اچھے بھیا؟ بس حکم کی دیر ہے۔ وہ ہنسی تھیں۔ شریر کہیں کا۔ اور انہوں نے مجھے اپنے بدن سے لگا لیا تھا۔ اسے اتنا لمبا ہو گیا ہے میرا بھیا۔ میرا سر اُن کے سینے کو چھو رہا تھا اور اپیا نے میز پر پڑا ہوا بٹوہ اُٹھایا تھا اور اس میں سے ایک چونی نکال کر مجھے دی تھی اور جلدی سے ایک نظر کھلے دروازے پر ڈال کر جس میں سے صحن نظر آ رہا تھا آہستہ سے کہا تھا، مجھے ایک بلیڈ لا دو دوڑ کے۔ اور میں اچھا کہہ کر دروازے کی طرف لپکا تھا مگر فوراً پلٹ کر میں نے چونی میز پر رکھ دی تھی۔ میرے پاس ہیں پیسے۔ واہ بہنیں کہیں چھوٹے بھائیوں کے پیسے خرچ کرواتی ہیں۔ تو پھر جائیے ہم نہیں لاتے اور انہوں نے کہا تھا، بُری بات۔ ضد نہیں کرتے۔ اور میں نے کہا تھا، اُونہنہ۔ اور انہوں نے کہا تھا، اچھا بابا مگر جلدی آنا۔ اور دیکھو، اُن کا منہ میرے کان کے بالکل پاس آ گیا تھا۔ کسی کو بتانا نہیں۔ میں کتنا خوش تھا کہ اپیا نے مجھے اپنا رازدار بنایا اور میں دوڑتا ہوا گیا تھا اور دوڑتا ہوا واپس آیا تھا اور میں نے اپیا کو بلیڈ ایسے چھپا کے دیا تھا کہ رازداری کا حق ادا ہو گیا تھا اور جب اپیا کرتہ پاجامہ اور تولیہ اٹھا کر غسل خانے میں چلی گئیں

تب مجھے خیال آیا تھا کہ آپا بلیڈ کا کیا کریں گی۔

"کیا یہ لوگ بھی پاکستان چلے گئے تھے؟"
"نہیں۔ سنا تھا کہ گھر بیچ کر بیٹے کے پاس اٹاوہ چلے گئے ہیں۔" ساجد نے مڑ کر مکان پر ایک آخری نظر ڈالی۔ "پکے مسلم لیگی تھے۔"

جاڑوں کے دن سہ پہر کا وقت۔ میں شاید نویں کلاس میں تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا حالاں کہ عموماً کھلا ہوتا تھا۔ کھٹکھٹایا زمیندار صاحب کی دوسری بیوی نے کھولا تھا۔ آج کیسے راستہ بھول گئے۔ امی جان نے کہا تھا پوچھتے آنا آپا کب آرہی ہیں۔ وہ نہیں آرہیں۔ خط آیا ہے۔ لکھا ہے فائنل کی تیاری کرنا ہے۔ ان چھٹیوں میں نہیں آسکوں گی۔ گھر میں سناٹا تھا۔ خالو کہاں ہیں۔ اٹاوہ گئے ہیں اور انہوں نے خود ہی بتایا تھا کہ سلامو بابا کو ساتھ لے گئے ہیں۔ اور نصیبن بوا نانی سے ملنے ہاتھی خانے گئی ہیں اور کہہ گئی ہیں چراغ جلے سے پہلے نہیں لوٹوں گی۔ چنے کی دال کا حلوہ بنا ہے، کھاؤ گے۔ اور میں نے جی کہا تھا تو انہوں نے کہا تھا، نہالوں پھر دوں گی گرم کرکے۔ اور انہوں نے گرم پانی سے بھری بالٹی اٹھائی تھی تو میں نے جھپٹ کر بالٹی ان کے ہاتھ سے لے لی تھی اور لے جا کر غسل خانے میں رکھ دی تھی اور وہ میرے پیچھے پیچھے غسل خانے میں آئی تھیں، تنگ پاجامہ کرتہ پہنے، دوپٹہ غائب۔ اور میں غسل خانے سے باہر آرہا تھا تو ان سے رگڑ کھا گیا تھا۔ اور انہوں نے کہا تھا دیکھ کے چلو میاں۔ میں شرما گیا تھا اور وہ مسکرائی تھیں۔ اور میں نے آپا کے کمرے میں جا کر کوٹ کی جیب سے بازاری حسینہ نکالی تھی جس پر اخبار کا کاغذ چڑھا ہوا تھا اور اُن کے بستر پر پیٹ کے بل لیٹے ہوئے صفحے سے پڑھنے لگا تھا۔ اور پھر کھلے ہوئے دروازے میں سے چھل چھل کی آواز آنی شروع ہوئی تھی جسے میں کچھ دیر کان لگا کر سنتا رہا تھا اور پھر میں نے اٹھ کر دروازہ بھیڑ دیا تھا۔ اور مسہری کے پاس پڑی ہوئی آرام کرسی پر بیٹھ کر بستر پر اوندھے منہ پڑی بازاری حسینہ پھر اُٹھالی تھی مگر چند سطریں پڑھنے کے بعد میں نے بازاری حسینہ کو پھر بستر پر اوندھا لٹا دیا تھا۔ اور بھڑے ہوئے دروازے کو تکنے لگا تھا۔ اور پھر میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا تھا اور کھلے دروازے میں کھڑا کچھ دیر غسل خانے کے کواڑ کو دیکھتا رہا تھا اور پھر چوروں کی طرح دبے قدموں کواڑ کی طرف بڑھا تھا اور جھک کر کواڑ کی درز میں سے اندر جھانک کر دیکھا تھا۔ اور دیکھا تھا کہ زمیندار صاحب کی دوسری بیوی ایک چوکی پر بیٹھی ہوئی ہیں اور اُن کا دایاں ہاتھ اُٹھا ہوا ہے اور اٹھے ہوئے ہاتھ میں تانبے کا ایک قلعی کیا ہوا لوٹا ہے اور لوٹے کی ٹونٹی میں سے پانی ان کے بالوں پر گر رہا ہے اور ان کے ملگجے اندھیرے میں چمکتے ہوئے اعضا پر سے پھسلتا ہوا نیچے آرہا ہے اور اُن کی آنکھیں بند ہیں۔ اور ان کا منہ تھوڑا سا اوپر کی طرف اٹھا ہوا ہے اور تھوڑا سا کھلا ہوا ہے اور پھر لوٹے کا پانی ختم ہوگیا اور انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ اور میں سیدھا ہو کر تیزی سے لوٹا اور پیچھے سے آواز آئی کون ہے۔ مگر میں واپس آپا کے کمرے میں پہنچ چکا تھا اور جلدی سے مگر آہستہ سے دروازہ بھیڑ کر کرسی پر بیٹھ کر بازاری حسینہ اُٹھا کر اُس سے اپنا چہرہ چھپا چکا تھا۔ اور میرا سانس پھولا ہوا تھا اور میں سہما ہوا تھا مگر میرا جی چاہ رہا تھا کہ پھر غسل خانے میں جھانک کر دیکھوں۔ پھر دروازے کے اُدھر سے آواز آئی تھی، ساجد، اور میری جی کے جواب میں دروازہ کھلا تھا اور وہ اندر آئی تھیں اور میں نے کتاب کے اوپر سے ڈرتے ڈرتے جھانک کر دیکھا تھا کہ وہ کندھوں سے گھٹنوں کے نیچے تک ایک چادر میں لپٹی ہوئی تھیں جو جگہ جگہ سے بھیگی ہوئی تھی اور جہاں جہاں بھیگی ہوئی تھی وہاں ان کے بھرے بھرے بدن سے چپکی ہوئی تھی اور اُن کی سڈول پنڈلیاں نظر آرہی تھیں۔ اور ان کا چہرہ دمک رہا تھا اور سارا کمرہ ایک مہک سے بھر گیا تھا جو شاید ان کے بدن سے آرہی تھی اور انہوں نے کہا تھا کپڑے پہن لوں، پھر دیتی ہوں اور اچھا کہہ کر اور کتاب بند کرکے میں جگہ جگہ سے بھیگی چادر کو صحن پار کرکے

دالان میں داخل ہوتے اور پھر دالان کے پیچھے جو کمرہ تھا اس میں غائب ہوتے دیکھتا رہا تھا۔ مگر تھوڑی دیر بعد جب باورچی خانے میں سے کھڑ بڑ کی آوازیں آنی شروع ہوئی تھی تو میں نے بازاری حسینہ کو بند کر کے پھر جیب میں رکھ لیا تھا اور چپکے سے باہر جانے کے ارادے سے اٹھا تھا لیکن میں اسی وقت زمیندار صاحب کی دوسری بیوی نے مجھے آواز دے کر بلایا تھا کہ آؤ ساجد میاں حلوہ گرم ہوگیا اور میرے قدم باورچی خانے کی طرف مڑ گئے تھے حالانکہ حلوہ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ انہوں نے کہا تھا بیٹھو اور میں ایک پیڑھی پر بیٹھ گیا تھا اور انہوں نے ایک سینی میں رکھ حلوے کی طشتری میری طرف بڑھائی تھی اور میں نے ایک چمچہ بھر کر منہ میں ڈال لیا تھا۔ حلوہ بہت گرم تھا۔ میں جلدی سے نگل گیا تھا۔ اور انہوں نے کہا تھا جلدی کاہے کی ہے، ٹھنڈا کر کے کھاؤ اور وہ منہ پر ہاتھ رکھ کے ہنسی تھیں اور پھر انہوں نے ہاتھ بڑھا کر میرا گال آہستہ سے تھپتھپایا تھا اور دوسرا چمچہ میں نے دو تین بار پھونک مار کر کھایا تھا اور وہ ابھی آئی کہہ کر ایک صحن پار کر کے باہر کی ڈیوڑھی کی طرف چلی گئی تھیں اور واپس آئی تھیں تو میں پیڑھی چھوڑ کر کھڑا ہو چکا تھا اور انہوں نے طشتری میں پڑے ہوئے حلوے پر ایک نظر ڈال کر پوچھا تھا کیوں، اچھا نہیں بنا کیا اور میرے منہ میں جو آیا تھا وہ میں نے کہہ دیا تھا۔ نہیں۔ یہ بات نہیں۔ سر میں درد ہو رہا ہے، پھر کھا لوں گا کسی دن۔ اور انہوں نے کہا تھا کہ پہلے کیوں نہیں بتایا اور پھر میری کلائی پکڑ کر کہا تھا، آؤ میرے پاس سر درد کی ایک بہت اچھی دوا ہے۔ اور میں اپنی مرضی سے اور اپنی مرضی کے خلاف زمیندار صاحب کی دوسری بیوی کے ساتھ صحن پار کر کے دالان میں سے ہوتا ہوا اس اندھیرے کمرے میں داخل ہو گیا تھا جس میں دس پندرہ منٹ پہلے میں نے جگہ جگہ سے بھیگی چادر کو غائب ہوتے دیکھا تھا اور انہوں نے میری کلائی چھوڑ کر سامنے کی دیوار میں بنی ایک چھوٹی سی الماری کھول کر اس میں سے اور نٹل بام کی ایک شیشی نکالی تھی اور مجھ سے کہا تھا لیٹ جاؤ۔ اور میں بستر پر لیٹ گیا تھا جس کے سرہانے رکھے ہوئے تکیے کے غلاف پر ہری بیل کے بیچ میں لال گلاب کڑھا ہوا تھا اور جس کے پیتانے چھپا ہوا ریشمی لحاف تہ کیا رکھا ہوا تھا حالاں کہ جی میرا یہ چاہ رہا تھا کہ بھاگوں اور جا کر سڑک پر دم لوں۔ وہ آہستہ سے ہنسی تھیں تمہیں کیا ہو گیا ہے ساجد میاں۔ کوٹ تو اتار دو۔ اور میں نے کوٹ اتار دیا تھا اور وہ بستر پر سرہانے کی طرف میرے سر کے پاس بیٹھ کر اور میرے اوپر تھوڑا سا جھک کر میرے ماتھے پر بام ملنے لگی تھیں۔ کیا پڑھ رہے تھے۔ کورس کی ایک کتاب اور میں نے جلدی سے آنکھیں کھول کر دیکھا تھا کہ کوٹ ویسے کا ویسا تہ کیا ہوا پاس ہی ایک کرسی پر رکھا ہوا تھا۔ اتنا مت پڑھا کرو۔ زیادہ پڑھنے سے بھی سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اب مجھے اپنی پیشانی اور کنپٹیوں پر ان کی نرم چکنی انگلیوں کا لمس بھلا لگ رہا تھا اور میری آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ اور ان کے کپڑوں سے مٹی کے عطر کی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ انہوں نے پوچھا تھا، کچھ فرق پڑا۔ اور میں نے جی اب بالکل نہیں ہو رہا کہہ کر ان کی کانچ کی چوڑیوں سے بھری کلائی پکڑ کر ان کا ہاتھ اپنی پیشانی پر سے ہٹا دیا تھا اور انہوں نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی تھی بلکہ میں نے خود اچھا یا ہے کہ کر ان کی کلائی چھوڑ دی تھی۔ لیکن جب اٹھنے لگا تھا تو انہوں نے وہی ہاتھ میرے سینے پر رکھ کر مجھے پھر لٹا دیا تھا اور کہا تھا، تھوڑی دیر آرام کر لو پھر چلے جانا۔ اور انہوں نے مسہری پر سے اتر کر دروازے کے پٹ ایک دوسرے سے بھڑا دیئے تھے۔ اور کمرے میں بالکل اندھیرا ہو گیا تھا۔ سر میں درد ہو تو روشنی بری لگتی ہے آنکھوں کو۔ اور انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں بھی کمر سیدھی کر لوں تھوڑی دیر۔ اور وہ اسی بستر پر لیٹ گئی تھیں اور انہوں نے تہ کیا ہوا لحاف کھول کر اپنے اور میرے اوپر کمر تک کھینچ لیا تھا۔ حالاں کہ کمرے میں اس مسہری سے تین چار گز کے فاصلے پر ایک اور مسہری بچھی تھی اور مجھے ایسا لگا تھا جیسے بجلی کی ایک لہر ان کے بدن سے نکل کر میرے جسم میں داخل ہو گئی ہے اور مجھے وہ خواب یاد آ گیا تھا جو دو تین دن ہوئے میں نے دیکھا تھا اور جس میں میں نابینا وکیل صاحب کے گھر کے ٹین کے سائبان کے اونچے گول اور بہت چکنے کھمبوں میں سے ایک پر چڑھتا پھسلتا کسی نہ کسی طرح بالکل اوپر پہنچ گیا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ پھسلوں نا ویسے ہی کھمبے سے چپکا رہوں کہ مجھے محسوس ہوا تھا کہ کوئی شے میرے سارے جسم سے کھنچ کر ایک نقطے پر جمع ہو گئی ہے اور ابھی بندوق کی نال سے گولی کی طرح نکلے گی۔ اس

خواب کی لذت اتنی تکلیف دہ تھی کہ میری آنکھ کھل گئی تھی۔ ویسی ہی تکلیف دہ لذت نے اس وقت بھی مجھے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ کروٹ بدلنا چاہا، نہیں بدلی گئی۔ کھسکنا چاہا نہیں کھسکا گیا۔ اٹھ کر بیٹھنا چاہا نہیں اٹھا گیا۔ چلانا چاہا آواز نہیں نکلی۔ ایک ڈراؤنا خواب میں نے بار بار دیکھا تھا کہ کسی بہت ہی اونچی چھت کی منڈیر پر کھڑا ہوں کہ پیر پھسل جاتا ہے اور میں گرتا ہوں اور گرتا چلا جاتا ہوں گرتا چلا جاتا ہوں مگر گر نہیں چکتا۔ چیخنا چاہتا ہوں پر آواز نہیں نکلتی۔ بالآخر میری آنکھ کھل جاتی ہے اور میں بستر پر چت لیٹا جلدی جلدی سانسیں لے رہا ہوتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ کب اور کیسے میں شکنجے سے آزاد ہوا تھا۔ مگر میں نے اپنے آپ کو مسہری کے پاس کھڑا جلدی جلدی سانسیں لیتا پایا تھا اور دوسرے ہی لمحے کرسی پر تہ کر کے رکھا ہوا کوٹ اٹھا کر اور بھڑا ہوا دروازہ کھول کر کمرے سے باہر تھا۔ اور پھر صحن، ڈیوڑھی اور باہر کا دروازہ اور اس کی چٹخنی اور میں نے سڑک پہ جا کر دم لیا تھا اور تب مجھے یاد آیا تھا کہ جس وقت میں گھر میں داخل ہوا تھا، اس وقت نہ میں نے نہ انہوں نے دروازے کی چٹخنی چڑھائی تھی۔ سڑک سنسان تھی اور میں نے کوٹ پہننے کے بعد جیب ٹٹول کر اطمینان کر لیا تھا کہ بازاری حسینہ اس میں ہے اور جب میں چلنے لگا تھا تو میری نظر مکان کے اوپر لہراتے ہوئے ہرے جھنڈے پر پڑی تھی اور سپید مسجد سے عصر کی اذان کی آواز بلند ہوئی تھی۔

ٹرین کے پبلک ایڈریس سسٹم پر کسی انجن کا ٹیپ بجنا شروع ہوا تو ساجد نے سوچا کہ شاید اب پاکستان کی ٹرینوں میں بھی اس قسم کا سلسلہ شروع ہو جائے، حمد یا نعت سے سفر کا آغاز، حمد یا نعت پر سفر ختم۔ اس نے حافظے پر زور ڈالا مگر اُسے کسی حمد یا نعت کا کوئی شعر یاد نہیں آیا۔ سوائے دو ایک نعتیہ اشعار کے جو جمعرات کو فقیر گلی گلی گایا کرتے تھے۔ ساجد کو میلاد کے خاتمے پر گا کر پڑھے جانے والے دو ایک سلام بھی یاد آئے مگر اسے تو ایسے اشعار کی تلاش تھی جن کا ادبی مقام اور رتبہ بھی ہو۔ اُسے تعجب ہوا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اُردو میں ادبی اہمیت کی کوئی حمد یا نعت موجود نہ ہو اور مجھے اس کا قطعاً کوئی علم نہ ہو۔ استعجاب انکشاف میں بدل گیا ـــ یعنی اردو کا سارا نہیں تو بیشتر اعلیٰ شعری سرمایہ سیکولر ہے! ـــ مرثیے، قصیدۂ لامیہ "مدو جزرِ اسلام"، "شکوہ"، "جواب شکوہ"۔ وہ ورق پر ورق اُلٹتا چلا گیا۔ ٹرین کی رفتار دھیمی پڑ رہی تھی۔ ساجد نے جلدی سے فیصلہ کیا کہ اسے اپنی رائے بدلنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ لیکن عین اس وقت اس کا حافظہ اچانک حالی کی مناجات کی طرف مڑا اور اُسے مطلع یاد آیا

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے   اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

وہ مسکرایا۔ حالی بھی کمال کے شاعر تھے۔ ان کی بہت سی قومی اور ملی شاعری کی مانند یہ شعر آج بھی اتنا ہی برمحل ہے جتنا سو سوا سو سال پہلے تھا۔
ساجد نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ عورت اب سامنے والی برتھ پر پیر لٹکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ باہر اُجالا ہو چکا تھا۔ اس نے کھڑے ہو کر شاہد کا کاندھا ہلایا۔

"جی؟"

"اُٹھو! الہ آباد آ رہا ہے!"

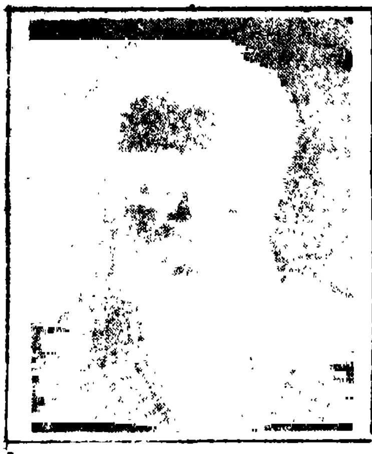
اور جب ساجد نے برتھ پر بیٹھ کر سگریٹ سلگائی تو اس منتشر در شعر نے جو اتنی دیر سے اس کے حافظے کی گرفت میں نہیں آ رہا تھا اپنے آپ کو اس کے ذہن کے حوالے کر دیا ـــ

نفضا تبسم صبحِ بہار تھی لیکن
پہنچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی

مگر اس کی آنکھوں میں صرف جلن تھی ـــ بے خوابی کی جلن۔

ڈاکٹر سلیم اختر

انکل سام اور بھتیجے



"دامریکی وائرس"

اگر امریکہ کو مرجع خلائق کہا جائے تو اسے مبالغہ نہ جانئے۔ امریکہ کیونکہ تارکین وطن اور آباد کاروں کی قوت بازو ہی سے امریکہ بنا اس لئے اصولی طور پر ہر وہ شخص جو آبادکاری کے قوائد و ضوابط پر اترتا ہو یہاں آباد ہوکر امریکی شہریت حاصل کرسکتا ہے۔

میں بڑی دیر تک اس غلط فہمی میں مبتلا رہا کہ صرف پاکستان کے مسلم بھائیوں کے سرمیں گرین کارڈ کا سودا سمایا ہے۔ غریب غربا اور کمین کی بات تو چھوڑیے امراء' وزارء' سرمایہ دار' جاگیردار' خوشحال آسودہ۔ سبھی سبز ہلالی پرچم کے گن گانے والے' علامہ اقبال کی تلقین' قہاری و جباری و قدوسی و جبروت اور تصور خودی کے باوجود ہر ایک اسلامی رنگ کے سبز پاسپورٹ کو گرین کارڈ میں تبدیل کرنے کا خواہاں نظر آتا ہے۔ (لطیفہ یہ ہے کہ گرین کارڈ کا رنگ بھی' سبز نہیں ہوتا) لیکن وہاں جاکر اندازہ ہوا کہ دنیا کی ہر قوم نسل اور زبان بولنے والے ادھر ہی کا رخ کرتے ہیں۔ اگر امریکہ کسی وائرس کانام ہے تو بلاشبہ اس وقت یہ وائرس دنیا بھر کے ممالک میں پھیلا ہوا ہے۔

ہر سال لاکھوں افراد کو امریکہ آنے کی قانونی اجازت ملتی ہے مگر ہر سال لاکھوں ہی ناجائز ذرائع اختیار کرتے ہیں۔ کچھ پکڑے جاتے ہیں کچھ بے نیل رام' لوٹ کے بدھو گھر آتے ہیں۔ کچھ کامران ثابت ہوتے ہیں۔ منزل سب کی ایک' امریکی بننا!

۱۸۲۶ء سے لے کر ۱۹۵۴ء تک دنیا بھر کے مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے 18971794 افراد کو اقامت نامے ملے جبکہ ۱۹۸۶ء کے بعد سے تارکین وطن کی اوسط 48000 سالانہ بنتی ہے۔ ادھر امریکی سفارت خانہ اسلام آباد کی ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۹۱ء میں 6 لاکھ افراد کو امیگرنٹ ویزوں پر قانونا امریکہ میں آباد ہوئے۔ ۱۹۹۲ء میں اس میں مزید 2 لاکھ کا اضافہ ہوا۔

آپ یہ نہ سمجھئے کہ ناجائز طور پر جانے والوں میں صرف پاکستانی ہی شامل ہیں اگرچہ اس ضمن میں ہمارے کارناموں سے بھی اچھی خاصی داستان امیر حمزہ تیار کی جاسکتی ہے تاہم دیگر اقوام اور بالخصوص لاطینی امریکی ممالک کی غربت و افلاس اور جبرو تشدد کے لحاظ سے ہم سے بھی بری حالت ہے اس لئے وہاں سے (جائز یا ناجائز طور پر) جانے والوں کی تعداد بہت زیادہ بنتی ہے۔ میکسیکو تو خیر امریکہ کے ساتھ ہے اس لئے وہاں سے افراد کی اسمگلنگ نے تو باقاعدہ خرکاری جیسی صورت اختیار کرلی ہے۔ غیر قانونی طور پر آنے والے افراد کا ہر ممکن طریقہ سے استحصال کیا جاتا ہے۔ ان سے کم سے کم اجرت پر کام لیا جاتا ہے۔ جس میں سے ان کے "سرپرست" کٹوتی کرتے ہیں۔

مقامی پولیس کو پیسے کھلانا (اگر وہ اس ریکٹ میں شامل ہو) اور طرح طرح کے جگا ٹیکس!

"کولمبیا"

لوگ ہر قیمت پر امریکہ پہنچنے کے ئے کیا کیا پاپڑ بیلتے ہیں اس کا اندازہ کولمبیا کے ایک تیرہ سالہ لڑکا گولیر موزو زیلز کے سفر سے لگایا جاسکتا ہے اس کی غربت کا یہ عالم ہے کہ وہ کوڑے میں پھینکی گئی اشیاء سے پیٹ بھرتا تھا۔ وہ اس زندگی سے تنگ آگیا اور ایک دن کسی نے کسی طرح چھپ چھپاکر ایک کارگو طیارے کے ٹائروں کے اوپر گلے خلاء میں چھپ گیا۔ اس نے تین گھنٹے کا یہ سفر 28 سے 34 حتی درجہ حرارت پر 35 ہزار فٹ کی بلندی پر کیا۔ اس کا بچ جانا اس لحاظ سے معجزاتی ہے کہ طیارہ کا ٹائر اسے کچل بھی سکتا تھا وہ جب میامی پہنچا تو سردی سے اکڑ چکا تھا مگر ہسپتال میں اسے بچا لیا گیا۔ اس سے قبل بھی ایک اور نوجوان نے یہ حرکت کی تھی مگر وہ دوران سفر ہلاک ہوگیا تھا بالعموم یوں آنے والوں کو واپس بھیج دیا جاتا ہے مگر اس کی ناداری اور کم عمری کی بناء پر اسے رہنے کی اجازت دی جارہی ہے۔

"ڈالر فیور"

امریکن وائرس نے جس ڈالر فیور کو جنم دیا اس نے پاکستان میں کیسے وبا کی صورت اختیار کرلی اس کا اندازہ جعلی ویزوں کے کاروبار سے لگایا جاسکتا ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے ناجائز کاموں میں پاکستانی جینئس ثابت ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں بڑی بڑی جدتیں اور فن کارانہ اسالیب پیدا کئے گئے ہیں۔ واضح رہے کہ ہر سال قانونی طور پر کوئی آٹھ ہزار پاکستانیوں کو امریکہ میں رہائش کی اجازت مل جاتی ہے جبکہ کوئی نصف لاکھ کے لگ بھگ نان امیگرنٹ ویزے پر جاتے ہیں ان میں سے ہم جیسے احمق تو کم ہی ہوتے ہیں جنہوں نے مال بنایا نہ میم کو اپنے عشق میں مبتلا کئے اور جسے لنڈورے گئے تھے۔ویسے ہی واپس آگئے لیکن ایک محتاط اندازہ کے مطابق وہاں یوں جانے والوں میں سے ایک چوتھائی سے لے کر نصف تک کسی نہ کسی بہانہ وہیں اٹک جاتے ہیں اور اٹکنے کے لئے ہر ممکن ذریعہ اختیار کیا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل جعلی ویزوں کا ایک ماہر پکڑا گیا جو امریکی کونسلیٹ کے افسراں کے اس ماہرانہ انداز سے دستخطوں کی نقل بناتا تھا کہ خود متعلقہ شخص بھی انہیں حقیقی تسلیم کرنے کو تیار ہوگیا۔

ہم کہ قومی سطح پر ہر نوع کی منافقت' مکاری' دغا بازی' بے ایمانی' جھوٹ' فریب اور حرام مال کے چیمپئن ہیں تو بھلا جعلی ویزوں اور نقلی پاسپورٹوں کے کار زر سے پرہیز کیسے ممکن ہوسکتا ہے آپ لاکھ دو لاکھ خرچیں سب کچھ ممکن ہے اس کام میں ہم فانی گناہ گار انسانوں کا ملوث ہونا تو خیر سمجھ میں آجاتا ہے کہ بد لوگوں نے تو کار بد بھی کرنا ہے مگر اللہ کے نیک پاک اور دیندار بندے بھی اپنی سی کر گزرتے ہیں روزنامہ جنگ (۷ دسمبر ۹۳ء) کی اسلام آباد کی خبر کے مطابق لاہور کے ایک عالم دین کو جعلی ویزے پر برطانیہ جانے کی کوشش میں فرانس میں گرفتار کرلیا گیا جسے فرانس کے امیگریشن حکام نے ڈی پورٹ کرکے اسلام آباد بھجوایا۔ وہ 23 نومبر کو کراچی سے پاکستانی پاسپورٹ پر استنبول گیا جہاں اس نے پاکستانی پاسپورٹ ضائع کردیا اور ایک برٹش پاسپورٹ پر فوٹو تبدیل کرکے وہاں سے فرانس چلا گیا مگر فرانس میں پکڑا گیا۔

30۔ اکتوبر ۱۹۹۳ء کے جنگ کی خبر کے مطابق تبلیغی جماعت کے 8 اراکین کو فلپائن میں "زائد مدت قیام پر گرفتار کرلیا گیا"

امریکی سفارت خانہ کی ایک رپورٹ (جنگ ۱۰ جون ۱۹۹۳ء) اس سرخی کے ساتھ شائع کی گئی ہے "جعلی ویزے پر امریکہ جانے والے پاکستانی سب غیر ملکیوں پر سبقت لے گئے" خبر درج ہے۔

"جعلی ویزوں کے ذریعہ امریکہ میں داخل ہونے کی کوشش کرنے والوں میں پاکستانی دنیا کے دیگر تمام ممالک کے مقابلے میں سبقت لے گئے ہیں۔ امریکہ کے صرف ایک ہوائی اڈہ کینڈی انٹرنیشنل ایرپورٹ سے جعلی ویزوں کے ذریعہ امریکہ میں داخل ہونے کی کوشش

کرنے والے پاکستانیوں کی ماہانہ اوسط تعداد 167 تک پہنچ گئی ہے اسلام آباد میں امریکی سفارت خانہ کی ایک رپورٹ کے مطابق ماضی میں جعلی ویزوں کے ذریعہ امریکہ جانے والوں میں چینی سب سے آگے تھے تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق ویزے حاصل کرنے کے بعد امریکہ پہنچنے والے پاکستانیوں کی بڑی تعداد ویزوں کی معیاد ختم ہونے کے بعد پاکستان واپس نہیں آئی"

پاکستانی جو دنیا بھر میں بدنام ہیں اور یورپ میں لفظ "پاکی" گالی کے مترادف ہے تو اس کے دو بڑے اسباب ہیں۔ منشیات کی اسمگلنگ اور امریکہ یا دیگر یورپین (اور سعودی عرب یا دوبئی جیسے) ممالک میں ناجائز ذرائع سے داخلہ اور سکونت! عام لوگوں کو اندازہ نہیں کہ پی آئی اے کو اس کی کتنی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے کہ بطور جرمانہ ہر جعلی مسافر پر ۴۳ ہزار ڈالر موقع ہی پر ادا کرنے پڑتے ہیں۔ اس جرمانہ پر مستزاد ہوٹل کابل' سیکورٹی کے اخراجات اور واپسی کا کرایہ۔۔۔ اس کا مطلب ہے کہ سال بھر میں پی آئی اے کے لاکھوں ڈالر جعلی مسافروں کی وجہ سے ضائع ہوجاتے ہیں۔

ترک وطن کرکے امریکہ یا کسی بھی یورپی ملک میں جانے کا سب سے کارگر بہانہ سیاسی جبر و تشدد اور مذہبی عقوبت ہے۔ ضیاء کی آمریت کے دور میں پیپلز پارٹی کے لاتعداد "مظلوم" امریکہ میں آباد ہوگئے تھے۔

امریکہ یا یورپ میں ہر قیمت پر آباد ہونے والوں میں اکثریت ان تعلیم یافتہ ذہین اور محنتی نوجوانوں کی ہے جن کی ڈگریاں اس لئے کاغذ کا بے معنی ٹکڑا ثابت ہو رہی ہیں کہ سیاسی سفارش اور رشوت نہ ہونے کی وجہ سے ان کا یہاں کوئی مستقبل نہیں جب نائب قاصد سے لے کر ڈاکٹر اور لیکچرار سب کو ایم بی اے اور ایم این اے نے ملازمت دینی تو پھر بے کار اور فرسٹریٹڈ افراد کیا کریں گے وہ ادھر ادھر کا رخ کرتے ہیں۔ جہاں سونے کی گنگا بہتی ہے۔ جس میں ڈالر مچھلیاں تیرتی ہیں اور جس کے کنارے سنہری زلفوں اور نیلی آنکھوں والی حسینائیں اور سرخ لبوں پر خیر مقدمی مسکراہٹیں۔ لئے خود سپردگی کے عالم میں کھڑی ملتی ہیں۔ یہ تو ہے خواب جس کی تعبیر بعض اوقات یوں نکلتی ہے کہ نیویارک کی کسی ویران سڑک پر حبشی کے ہاتھوں قتل ہوجانے والے کی لاش ہی گھر واپس آتی ہے۔

لیکن ان سب کے باوجود ڈالر فیور پیدا کرنے والا وائرس بہت قوی ہے۔ ایڈز کے وائرس سے بھی زیادہ توانا!

"چار پہیوں پر دینا"

میں نے امریکہ کی لڑکیوں معاف کیجئے سڑکوں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا لیکن جب تک ان پر سفر نہ کیا تھا ان کی منصوبہ بندی کا اندازہ نہ ہوسکا تھا۔ بنیادی بات تو یہ ہے کہ تمام سڑکیں یک طرفہ ہیں۔ کہیں چار لین کی سڑک ایک جانب اور تین چار لین کی سڑک دوسری جانب۔ یوں حادثات کے امکانات میں خاصی حد تک کمی ہوجاتی ہے۔ راہنمائی کے لئے قدم قدم پر ٹریفک سگنلز اور دیگر معلومات۔ اگر ان کے مطابق چلا جائے تو راستہ دریافت کئے بغیر سارا امریکہ گھوم لیجئے' بھٹکنے کی نوبت نہ آئے گی!

وہاں خاصی لانگ ڈرائیو ہوئی مگر شاید ہی کبھی کوئی دقت پیش آئی ہو' دو تین درجن گاڑیاں آپ کے آگے پیچھے ہوں تو پھر اس لین میں آپ اپنی اسپیڈ سے نہیں چل سکتے بلکہ مجموعی اسپیڈ کے مطابق جانا پڑتا ہے۔ آپ کی اسپیڈ میں کمی بیشی سے پوری لین کی گاڑیوں کی اسپیڈ کا ردھم خراب ہوجائے گا۔

ہائی ویز پر بمپر ٹو بمپر گاڑیاں دیکھ کر تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ گویا تمام امریکہ ہی چار پہیوں پر زندگی بسر کررہا ہو۔ ویسے بھی ایک اسپیڈ ٹریفک میں بہت اضافہ ہوجاتا ہے تاہم چار پہیوں پر زندگی بسر کرنے والی جو بات لکھی وہ عملاً چار پہیوں پر آباد "مکان" کی صورت میں نظر آئی۔ اس ٹریلر میں بیڈ روم کے علاوہ کچن باتھ روم فریج اور ٹی وی وغیرہ جملہ سہولتیں موجود ہوتی ہیں۔ جبھی سیریا تعطیلات میں اس کا سب سے بڑا فائدہ ہوٹل یا رہائش کی تلاش اور اخراجات سے نجات دلاتا ہے۔ یوں آپ صرف پیٹرول کے خرچ پر تمام امریکہ کی سیر کرسکتے ہیں۔

سیپ کراچی --- ۳۴

بہت عرصہ پہلے جب آتش جواں تھا اور اس میں خواب دیکھنے کی سکت تھی تو ایسے ہی رواں مکان میں عمر بتانے کا شوق تھا' اندر شعلہ ہم سفر اور باہر بگولے ہم سفر۔ خیر یہ نہ بھی ہو تو تنہائی کا اپنا مزا ہوتا ہے بشرطیکہ انسان تنہائی میں اپنے اکیلے پن سے مکالمہ کا ہنر جانتا ہو۔ مقدر نے ہاتھ میں خواہشوں کو ٹوٹا برتن تھماکر زندگی کے چوراہے پر لاکھڑا کیا۔ میں تو یہ کچھ حاصل نہ کرسکا لہٰذا میں ان رواں دواں انسٹنٹ ہومز میں امریکیوں کو خوش باش دیکھ کر خود کو خوش محسوس کرتا!

ایک اور چیز بھی دیکھی۔ اونٹ کو ریگستان کا جہاز کہتے ہیں یہاں الٹ بات نظر آئی کہ بوٹنگ کے شوقین حضرات کی کاروں کے پیچھے بندھی کشتیاں دیکھیں۔ چھ فٹ کی چھوٹی چھوٹی کشتیوں سے لے کر (ج کی چھت پر بندھی بھی ہوتی ہیں) تیس چالیس فٹ لمبی کشتیاں ہر نوع اور ہر وضع کی۔

"انگوٹھا دکھانا"

اب تو غالباً نہیں کسی زمانہ میں ہچ ہائیکنگ کے ذریعہ بھی سفر ممکن تھا یعنی انگوٹھا کھڑا کرکے لفٹ مانگنا یوں طویل سفر والے لمبے اور آنا دینے والے کے لئے ساتھی حاصل کرلیتے تھے۔ تعطیلات میں طلباء بالعموم اس طرح سیر کرتے تھے۔ اس رویہ کا سراغ آبادکاری کے ابتدائی ایام سے لگایا جاسکتا ہے جب ہر شخص دوسرے کی مدد کرتا تھا مگر اب جرائم کی ہوشربا شرح کی بناء پر خوفزدہ مسافر کسی کے لئے نہیں رکتا حتی کہ حادثہ یا زخمی کو دیکھ کر بھی نہیں۔ کون پولیس کے بکھیڑے میں پڑے۔ تاہم لڑکیوں کو اب بھی لفٹ مل جاتی ہے۔ لیکن یہ بھی ہے کہ لڑکی کا انگوٹھا دکھانا بعض اوقات ریپ کی تمہید بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ گویا ستم ہوجائے تمہید کرم کے برعکس بات ہوجاتی ہے!

"بیٹریاں چارج کرنا"

میں نے امریکہ کی سڑکوں پر خاصہ سفر کیا اور اسے ہمیشہ خوشگوار پایا۔ بنیادی وجہ تو خوبصورت لینڈ اسکیپ ہے' سبزے سے بھری اور اشجار سے لدی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں' ساتھ آب رواں' بعض سائنز یہ ظاہر کرتے کہ یہاں ریچھ اور ہرن ہوتے ہیں بالکل ویسے جیسے دوبئی میں اونٹ ظاہر کرتے ہیں

رات کو سفر کریں تو ایک جانب صرف سرخ ٹیل لائٹس نظر آئیں گی جبکہ دوسری جانب ہیڈ لائٹس کی چمک۔ سڑک کے موڑ اور بالخصوص چڑھائی پر روشنی کی دھاروں اور چمکیلی سرخ لکیروں کا منظر دیدنی ہوتا ہے۔

میں نے خالد کے ساتھ اٹلانٹک سٹی' واشنگٹن اور نیاگرا تک کا سفر کار میں کیا اور ہمیشہ محظوظ ہوا' اگر مجھ جیسا ست جلد تھک جانے والا اور سفر سے الرجک شخص امریکہ کی سڑکوں پر سفر سے مزا حاصل کرسکتا ہے تو پھر سفر پسند کا کیا کہنا!

قدرتی حسن کو محفوظ اور برقرار رکھنے کے لئے جنگلات۔ جھیلوں وغیرہ کو نیشنل پارک قرار دے کر قومی ملکیت میں لے لیا گیا ہے عمارت کی تعمیر اور درختوں کی کٹائی سے ان کی صورت تبدیل نہیں کی جاسکتی صرف کیمپنگ کی اجازت ہے' چنانچہ تعطیلات کے ایام میں ان کیمپنگ سائٹس پر کاروں اور ٹریلروں کا میلہ سالگا ہوتا ہے۔ ویک اینڈ پر امریکی گھر سے باہر بھاگنے کی کوشش کرتا ہے' ہرے بھرے میدانوں میں' جھیلوں کے کنارے' پربہار وادیوں میں' دامن کوہسار میں' سمندر میں بوٹنگ سے' بیچ پر ریلکس ہوکر' باالغرض' حسب ذوق اور حسب توفیق وقت گزار کر اگلے پانچ' دن کے لئے بیٹریاں چارج کرتا ہے! امریکی ویک اینڈ کے دو دن آسودگی سے گزارنے کے لئے پانچ دن جان توڑ کر محنت کرتا ہے اور وہ ہفتہ کی خوشگوار ویکیشن کے لئے سال کے بقیہ ایام کولھو کا بیل بنا رہتاہے۔ بس یوں سمجھے کہ امریکیوں کے لئے ویک اینڈ کی آؤٹنگ ایسے ہی ضروری ہے جیسے کسی پٹھان کے لئے نسوار۔ ویسے پٹھان کے لئے ایک اور چیز بھی ضروری ہوتی

ہے لیکن اس کا ذکر جانے دیں۔

ایک کامیاب انسان تعطیلات کے دن گزارنے میکسیکو گیا ایک دن جھیل میں مچھلیاں پکڑتے اسے ایک مقامی باشندہ دکھائی دیا جو سومبریو (بڑی سی میکسیکن ہیٹ) میں چہرہ چھپائے لمبی تان کر سو رہا تھا۔ کامیاب امریکی کو اس وقت ضائع کرنے والے میکسیکن پر بہت غصہ آیا اس نے اسے فہمائش کی

"تم کتنے سست ہو کہ یوں وقت برباد کرتے ہو"

"مجھے کیا کرنا چاہئے"

"تم محنت کرو"

"کیوں؟"

"محنت کرو' پیسہ کماؤ' خوب پیسہ کماؤ' پھر تم کسی پر فضا مقام پر چھٹیاں گزارو"

"کاہے کے لئے؟"

"تاکہ تم سستا سکو' تازہ دم ہوسکو اور تفریح کرسکو"

"تو تمہارے خیال میں' میں اب کیا کررہا ہوں؟"

یہ لطیفہ مگر زندگی بسر کرنے کے دو اسالیب کا مظہر بھی ہے

"سفر کا جرمانہ"

لانگ ڈرائیور پر گھر سے نکلتے ہی ہر امریکی کار کا ریڈیو آن کرویتا ہے۔ خبروں یا موسیقی کے لئے نہیں بلکہ سڑکوں کی تازہ ترین صورت حال سے باخبر ہونے کے لئے' بیشتر ریڈیو اسٹیشن باقاعدگی سے ٹریفک بلیٹن' نشر کرتے رہتے ہیں۔ فلاں سڑک پر دھند ہے' فلاں پر برف کی اتنے فٹ گہرائی ہے۔ فلاں مرمت کے لئے بند ہے' فلاں پر لینڈ سلائیڈ ہے' فلاں پر پل ٹوٹا ہے' اور فلاں پر حادثہ ہوگیا ہے۔ لہٰذا ادھر جانے والے فلاں سڑک کا رخ کرلیں۔ یوں وقت ضائع کئے بغیر سفر جاری رہتا ہے۔

سڑکوں پر جگہ جگہ ٹول بوتھ بنے ہیں اسے راہداری کا جرمانہ تصور کیا جاسکتا ہے۔ پچاس سینٹ سے لے کر ایک دو تین ڈالر تک ادا کرنا ہوتے ہیں میں یہ دیکھ کر متعجب ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ زیادہ تر عملے کے بغیر یعنی آٹومیٹک تھے' گاڑی روک کر' مقام متعینہ پر' سکہ ڈال دیں۔ بیریئر اٹھ جائے گا' گزر جانے پر یہ خود بخود گر جائے گا۔ یہ ڈبل بچت ہے' عملہ کا خرچ نہیں۔ عملہ ہو تو کسی حد تک بے ایمانی کا بھی شائبہ ہوسکتا ہے مگر مشین تو بے ایمانی بھی نہیں کرسکتی۔

عملہ کی بددیانتی ہی کی وجہ سے اب تمام پلوں کو ٹول ٹیکس کے لئے ٹھیکہ پر دیا جارہا ہے اگر ہمارے ہاں بھی ایسی خود کار مشینیں نصب ہوجائیں تو عملہ کا خرچ بچاکر ٹول میں مزید اضافہ کیا جاسکتا ہے لیکن اور یہ "لیکن" بہت بڑی ہے' اول تو چار دن میں مشین ہی خراب کردی جائے گی اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ مجھ اور آپ جیسے فانی انسان تو خاموشی سے ٹول ادا کردیں گے مگر قانون سے بلند طبقہ یعنی قانون توڑنے کے شوقین لوگ تو اسے نیکی سمجھیں گے کہ سبز پلیٹ والی پجیرو میں بیٹھ کر یوں ٹول ادا کرنے سے ان کا استحقاق مجروح ہوگا۔ لہٰذا ان کی پجیرو بیریر کو توڑتی ہوئی یہ جا وہ جا! لہٰذا ٹھیکیداری موجودہ انتظام ہی بہتر ہے۔

میں نے خالد سے پوچھا "اگر کوئی سکہ ڈالے بغیر ہی گزر جائے تو....."

"سائرن بجے گا۔ اگرچہ اس وقت یہاں پولیس نظر نہیں آرہی لیکن سائرن بجتے ہی نہ جانے کہاں سے پولیس نکل آئے گی اور دھر لے گی اب معمولی سی رقم بچانے کے لئے کون مصیبت میں پھنسے"

"لیکن لانگ روٹ پر یہ معمولی سی رقم بھی مل کر اچھی خاصی رقم بن جاتی ہے۔"

"سائیڈ دیور کی سیرابی"

ہر تیس چالیس میل کے بعد ریسٹ ایریا آتا ہے جہاں گیس مشین (پیٹرول پمپ) ' ریستوران' چھوٹا سا اسٹور اور ریسٹ روم (بیت الخلاء) ہوتا ہے۔ یہاں وہ تمام چھوٹی موٹی اشیاء دستیاب ہوتی ہیں جن کی کسی پل مسافر یا سیاح کو ضرورت پڑ سکتی ہے بالخصوص روڈ میپس

معلوم نہیں یہ بیئر پینے کی وجہ سے یا کیا مگر میں یہ نوٹ کئے بغیر نہ رہ سکا کہ جہاں بھی چلے جاؤ ریسٹ رومز کے سامنے طویل قطاریں نظر آتی ہیں مردوں کے مقابلے میں خواتین کی طویل تر۔۔۔ امریکی قوم کی ایسی جمہوری تربیت ہوئی ہے کہ دباؤ کے باوجود صبر اور سکون سے اپنی باری کے منتظر کھڑے رہیں گے مگر قطار توڑ کر دوسرے کی حق تلفی کا نہ سوچیں گے ایسے ہی ایک موقع پر ایک عورت کی حاجت جب ناقابل بیان شدت اختیار کر گئی تو وہ خالی مردانہ ریسٹ روم میں جا گھسی۔ مگر آسودہ ہو کر جب باہر نکلی تو دھر لی گئی کیونکہ مخالف جنس کے ریسٹ روم میں جانا جنسی جرائم میں شمار ہوتا ہے ایسا کیسا کرتی ہیں یا پھر Idecent Exposures کے شوقین! اس نے وضاحت کی کہ مردانہ ریسٹ روم خالی تھا' میری حالت غیر تھی مگر اس کی ایک نہ سنی گئی اور اس پر تین سو ڈالر جرمانہ کردیا گیا وہ تو جرمانہ ادا کرنے کو تیار تھی مگر اس کی وکیل بہن نے حکومت کے خلاف کیس کردیا۔ جہاں اس کیس کو خصوصی شہرت حاصل ہوئی وہاں ناکافی سہولتوں کی بحث بھی شروع ہوگئی۔ مجھے اس کیس کے فیصلہ کا تو علم نہ ہو سکا تاہم امکان ہے کہ عورت نے کیس جیت لیا ہوگا۔

ہم لوگ اچھے ہیں' بچے گلیوں میں فراغت پاتے ہیں گاؤں کی عورتیں کھیتوں کو قدرتی کھاد فراہم کرتی ہیں تو مرد لوگ سائیڈ دیوار کو سیراب کرتے ہیں۔

"دور کے بول"

امریکہ میں کس طرح ہر قیمت پر وقت اور توانائی بچانے کی کوشش کی جاتی ہے اس کا صحیح اندازہ وہیں جا کر ہوتا ہے مثلاً ٹیلی فون وہاں سونٹھ کی گانٹھ ہے۔ آپ ٹیلی فون سے شاپنگ کرلیں' ہر طرح کے سفر کے لئے ٹکٹ کی بکنگ کرالیں' غلط بل درست کرالیں حتیٰ کہ ٹیلی فون سے ہی ٹیلی فون بھی لگوالیں' آپ تنہا ہیں تو ٹیلی فون تنہائی کی ساتھی مہیا کردے گا ایک خاص نمبر ڈائل کریں تو نہایت ہی HUSKY آواز اور سیکسی لہجہ میں آپ سے فحش کلامی کی جائے گی۔ میں جب فحش کلامی کہتا ہوں تو یہ اس سے مراد واقعی اصلی کے تے وڈی فحش کلامی ہے جو تب تک جاری رہتی ہے جب تک نمبر ڈائل کرنے والے مرد و عورت کے اعصاب اس کا ساتھ دے سکیں۔ اس سیکس کال کا سب سے پرلطف پہلو یہ ہے کہ بعض اوقات یہ ہیجان خیز گفتگو اس قسم کے مرد کرتے ہیں جنہیں اس قسم کی گفتگو کا ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ اور جو آواز میں جنسی مدوجزر پیدا کرسکتے ہوں۔

"حرف شکایت"

شاید ہی کوئی ایسا پاکستانی ہو جسے پانی' بجلی' فون یا گیس کا بل ہمیشہ درست ملا ہوا اگر ایسا ہے تو اس کا بت بنا کر چوراہے پر استادہ کرنا چاہئے۔ غلط بل درست کرانے کے لئے کن اعصاب شکن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اہل کاروں سے بک بک کرنے اور افسروں کی خوشامد کرنے میں کس ذلت کا احساس ہوتا ہے اس سے سبھی آگاہ ہیں مگر وہاں آپ کی بیشتر شکایات صرف فون پر ہی رفع کردی جاتی ہیں۔ ایک تو اس لئے کہ ہمارے برعکس وہاں کسٹمر کو درست سمجھا جاتا ہے۔ پھر عموماً عوامی امروز والے بیشتر محکمے نجی ہیں اس لئے ملازم حکومت کا داماد بن کر نہیں بیٹھ جاتا' کہ مالک کا ایک لفظ "Fired" اسے گھر بٹھادے گا۔

پھر گاہکوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے بعض ادارے اور انجمنیں فعال رہتی ہیں۔ بلکہ ٹیلی ویژن چینلز تو گاہکوں کی شکایت پر تحقیق پروگرام پیش کئے جاتے ہیں ظاہر ہے کہ کوئی بھی فرم یا ادارہ بیڈ پبلسٹی پسند نہیں کرتا۔ میں نے ایسے ہی ایک پروگرام میں دیکھا کہ ایک ریڑھ کی ہڈی کی تکلیف کے مریضوں کے لئے ایک خاص طرح کا گدا بنا کر منی بیک گارنٹی کے ساتھ فروخت کیا جاتا تھا ایک خاتون نے خریدا مگر جب عدم افاقہ کے باعث قیمت واپس مانگی تو کمپنی لیت و لعل کرنے لگی خاتون نے ٹی وی پروگرام والوں کو شکایت بھیجی جس کا اثر یہ ہوا کہ قیمت واپس کردی گئی بلکہ وہ گدا بھی اس کے پاس رہنے دیا گیا۔

ایک بڑا اور اہم سبب مقدمہ کا فون ہے۔ بالخصوص بڑے ادارے مقدمے کے اخراجات وقت کے ضیاع اور نیگیٹو پبلسٹی سے بہت گھبراتے ہیں اس لئے ایسی صورت میں وہ کم مکا کر کے مقدمہ سے بچ جاتے ہیں اس لئے اگر وہاں کسی اسٹور میں **Wet Floor** کا بورڈ دیکھیں تو سمجھ لیں یہ اس لئے لگایا گیا ہے کہ اگر گیلے فرش پر گر کر آپ' کے گھٹنے پر چوٹ آئے تو آپ مقدمہ نہ کرسکیں کہ اس نے تو بورڈ لگا کر آپ کو مطلع کردیا تھا۔

چند برس بیشتر کراچی میں پان ایم کے طیارے پر نامعلوم افراد کی فائرنگ سے جو مسافر ہلاک ہوئے ان میں چھ امریکی بھی تھے۔ ان میں سے ایک کے لواحقین نے اور پھر اس کی دیکھا دیکھی بقیہ پانچ کے لواحقین نے بھی پان ایم پر مقدمہ دائر کردیا اصولی طور پر اس میں ائر لائن کا کوئی قصور نہ تھا مگر طویل مقدمے اور وکیلوں کی موٹی فیسوں سے گھبرا کر انہوں نے پچاس ہزار ڈالر فی کس دے کر عدالت کے باہر تصفیہ کرلیا۔ یہ واحد مثال نہیں اس انداز کے متعدد واقعات مل جاتے ہیں۔

"خفیہ چوٹیں"

بعض لوگوں نے مقدمہ بازی کو رقم بٹورنے کا ذریعہ بنالیا ہے۔

خالد نے اپنا واقعہ سنایا۔

خالد کی گاڑی کو چار کالوں نے ٹکر ماری۔ پولیس آگئی۔ تین نے تو جعلی چوٹوں کی ہائے ہائے شروع کردی جبکہ چوتھا اردو فلموں کے ہیرو کی مانند اپنی یادداشت فراموش کر بیٹھا۔

"تمہارا نام کیا ہے" پولیس مین نے پوچھا۔

اس پر وہ پولیس مانند بولا "کوئی نہیں"

"کیا مطلب" خالد نے گھبرا کر پوچھا

"مجھے میرا نام یاد نہیں آرہا"

"رہتے کہاں ہو؟"

"کچھ یاد نہیں آرہا"

خالد فزیو تھریپسٹ ہے' وہ اور پولیس والا سمجھ رہے تھے کہ یہ سب مکاری ہے لیکن پھر وہی بات' عدالت۔ وکیل۔ وقت۔ لہٰذا خالد نے کچھ دے دلا کر گلو خلاصی کرائی۔ ڈالرز دیکھ کر اچانک اس کی یادداشت بحال ہوگئی اور کیونکہ نوٹ گننے میں غلطی نہ ہوئی۔

خالد نے یہ واقعہ ایک پاکستانی بھائی کو سنایا تو اس نے بھی اسے پیشہ بنالیا۔ خالد سے خفیہ چوٹوں کی ایسی علامات پوچھ لیں جنہیں کسی طرح سے چیک نہیں کیا جاسکتا ایک وکیل سے سازباز کرلی گئی اور یوں یہ ریکٹ چل نکلا۔

"سیکس اسٹوری"

امریکہ میں آباد ہوجانے والوں میں سے اکثریت کی سکس اسٹوری کے منظرنامہ میں خاصی یکسانیت ملتی ہے کچھ تو رشتہ داروں یا احباب کے پاس آتے ہیں جبکہ اکثریت یوں ہی امریکہ فتح کرنے چل نکلتی ہے۔ غیر تربیت یافتہ اور غیر ہنرمند کو خاصی محنت کرنا پڑتی ہے ہے۔ وہ گیس اسٹیشن پر پیٹرول بیچتا ہے' ریستوران میں بیرا یا ڈش واشر بنتا ہے' اخبار بیچتا ہے' ٹیکسی چلاتا ہے' دوکان پر ملازمت کرتا ہے' بعض پارکنگ لاٹ میں رؤ-سٹ بنتا ہے الغرض! ہر وہ کام کرتا ہے جو وطن میں کرنا شاید پسند نہ کرتا' ڈالر تو کما کھائے کسی طور مچھندر! ان ہی میں سے زیادہ ذہین تعلیم یافتہ اور محنتی اپنا مقام بنالیتے اور کامیابی اور تمول کے بعد گھر لوٹنے پر باعث رشک بنتے ہیں۔

خود خالد نے یہ سب پاپڑ بیلے۔ دن رات محنت کی اس نے کئی برس تک اٹھارہ سے بیس گھنٹہ روزانہ کام کیا تب کہیں جاکر کسی قابل ہوا ہر کامیاب خالد کی کہانی ایسی ہی ہے۔

جو کامیاب نہیں ہوتا وہ بھوکا بھی نہیں مرتا لیکن اس معاشرہ میں اپنا مقام بھی نہیں بنا سکتا۔ بعض کے خواب چکنا چور ہوجاتے ہیں تو کچھ دل برداشتہ ہوکر واپس لوٹ آتے ہیں کچھ جرائم کی دلدل میں جا پھنستے ہیں تو بعض منشیات کے دھندہ میں پڑ جاتے ہیں کسی خوش قسمت پر سنہری زلفوں والی مہربان ہوجاتی ہے تو آسانی سے گرین کارڈ مل گیا کچھ بدقسمت گینگ میں جان گنوالیتے ہیں کسی کو رنگ کا تعصب لے بیٹھتا ہے' کوئی ٹریفک کے حادثہ کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے کوئی نسلی تشدد کا شکار ہوجاتا ہے اور کچھ نہیں تو بعض اوقات بے مہارا گولی لے بیٹھتی ہے۔

"بوتل کا جن"

امریکہ میں خاندان' نسل' رنگ' مذہب کے برعکس کسی انسان کی پرکھ کا معیار اس کی کامیابیوں کا گراف ہے۔ گراف میں وفا کا سفر جتنا عمودی ہوگا وہ اتنا ہی اہم معزز مقبول اور مشہور ہوگا اسی لئے امریکی معاشرہ کی بنیاد حصول کامرانی کی جدوجہد پر استوار ہے۔ اس رویہ نے مسابقت کی ایسی فضا پیدا کردی ہے کہ فرد اب خود مسابقت پر اتر آیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں متنوع نفسیاتی مسائل نے جنم لیا ہے۔

کامیاب انسان کی معروف علامات میں بڑا سا گھر' ذاتی بیچ' سوئمنگ پول اور ٹینس کورٹ' تفریح کے لئے یاٹ' تیز رفتاری کے لئے ذاتی جیٹ الغرض! آکاش ہی انت ہے!

کامیاب انسان کی زندگی بسر کرنے اور ہمیشہ اول' نمایاں اور کامران رہنے کے جذبہ نے امریکی معاشرہ کو بہت تیز رفتار بنادیا ہے اور اسی لئے اچھے علاقہ میں مکان' زیادہ مراعات اور تنخواہ والی ملازمت' زیادہ فائدہ بخش تعلق اور زیادہ۔ حسب حال بیوی کی خاطر' پہلی کو غیر جذباتی انداز میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔

کامیاب انسان مزید کامیابیوں کے لئے ہروقت خود کو مہمیز کرتا ہے اس لئے اعصابی تناؤ میں مبتلا رہتا ہے جس سے گھر کے ماحول میں زہر گھلتا رہتا ہے یوں بچے اور بیوی بعض اوقات ہاتھ سے جاتے ہیں۔ شاید اس لئے اب وہاں امیر' معروف اور کامیاب افراد کے لئے السر' ٹینشن' عارضہ قلب اور نفسی عوارض میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے یہ تمام معاشرہ کا حال نہیں کہ بے فکر' ست نکمے اور Bums بھی تو ہوتے ہیں تاہم امریکی معاشرہ کا آئیڈیل کامیاب انسان ہی ہے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ وہ کس شعبہ سے وابستہ ہے لیکن اس سے فرق پڑتا ہے کہ اس کا Head Shrinker (نفسیاتی معالج) کتنا مہنگا ہے۔

ہم تو اسی بات کے قائل ہیں کہ کامیابی کی بوتل کا جن بن کر رہنے میں کوئی لذت نہیں کہ جن بوتل سے باہر آنے کے بعد بھی جن ثابت ہوتا ہے۔

"Disposable"

امریکہ میں تیز رفتار زندگی نے اشیاء کے بارے میں بھی غیر جذباتی رویہ پیدا کردیا ہے ہماری عورت بوڑھی ہوجائے گی مگر وہ جہیز کی اشیاء کے بارے میں ہمیشہ جذباتی رہے گی اس طرح بعض اشیاء مخصوص یادوں سے وابستگی کی بناء پر علامتی حیثیت اختیار کرلیتی ہیں اسی لئے جہیز یا اس نوع کی اشیاء کا ٹوٹنا تو بعض کے خیال میں اچھی خاصی بدشگونی ہوتی ہے مجھے ابھی تک یاد ہے ہمارے گھر میں ایک پلیٹ تھی جس کا بارڈر بارہ سکوں سے بنایا گیا تھا۔ اباجی نے بتایا یہ ان کی پیدائش کے دن خریدی گئی تھی یوں ہم سب کے لئے وہ محض پلیٹ نہ رہی بلکہ اس سے بڑھ کر کچھ اور چیز بن گئی۔ جس دن وہ ٹوٹی تو گھر بھر پریشان رہا۔

ترقی' کامیابی اور بہتر کیریئر کی دوڑ میں شریک' تیز رفتار امریکی کے پاس ایسی جذباتیت کے لئے وقت نہیں' اس لئے وہاں چیزیں سنبھال کر رکھنے کے بجائے' پھینک کر' نئی چیز کے لئے جگہ بنانے کا رجحان قوی تر نظر آتا ہے اس رویہ سے عام امریکی کی اتنی کنڈیشنگ ہوچکی ہے کہ اسے یہی Pragmatic محسوس ہوتا ہے کہ احساس مروت کے کچلے جانے کے بارے میں سوچنے کا وقت نہیں ملتا۔ وقت وہاں ہے کس کے پاس؟ لہٰذا بات محض ڈسپوزیبل پلیٹ' گلاس اور نیپکن تک محدود نہیں رہتی بلکہ یہ رویہ انسانی رشتوں تک ہر اثر انداز ہوتا ہے یوں وہ ڈسپوزیبل شوہر' بیوی' دوست' والدین تک بات جا پہنچتی ہے۔ ٹوٹے گھر' شرح طلاق میں اضافہ' بچوں اور والدین میں عدم ابلاغ اور اولڈ ایج ہاؤسز' یہ سب گلشن کامرانی کے خار دار ثمرات ہیں۔

"باباجی معاف کرو"

اس موضوع پر جن امریکیوں سے گفتگو کا موقع ملا ان میں سے اکثریت نے اسے جائز قرار دیا۔ والدین کی وجہ سے کیریئر متاثر ہورہا ہو یا وہ لائف اسٹائل سے ایڈجسٹ نہیں کرپاتے تو ان کا ایسے "ہوم" میں رہنا زیادہ بہتر ہے جہاں انہیں ہم عمر افراد کی "کمپنی" میسر ہو مگر اس ضمن میں وہ یہ نکتہ فراموش کر بیٹھتے ہیں کہ پژمردہ یا مریض یا معمر کی صحبت پژمردگی' مرض اور عمر میں اضافہ کا موجب بنتی ہے اضافہ کا نہیں!

بہتر خوراک' صاف ستھرے ماحول اور طبی سہولتوں کی وجہ سے امریکہ میں عمر خاصی زیادہ ہے پھر وہاں ساٹھ برس کی عمر میں ملازمت سے ریٹائرڈ نہیں کردیا جاتا بلکہ بعض حالات میں تو ستر برس تک کے فعال زندگی بسر کرتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی معاشرہ ان کا احترام بھی کرتا ہے۔ یعنی انہیں "چاچا" یا "بابا" کہنے کے بجائے "سینئر سٹیزن" کہا جاتا ہے اور بعض فرمیں یا شاپنگ سینٹر انھیں رعایتی نرخوں پر اشیاء فروخت کرتے ہیں اور کرایوں میں بھی بعض اوقات تخفیف کردی جاتی ہے۔

امریکی معاشرہ کی مخصوص صورت حال نے تنہائی کو وبا کی صورت دے دی ہے جس کا سب سے زیادہ شکار ت غیر ملکی ہوتا ہے خود امریکیوں کو بھی اس سے مفر نہیں جواں مرد اور عورت اپنی جوانی اور کیریئر جس مست رہنے سے وقت گزار لیتا ہے لیکن معمر افراد کے لئے تو بعض اوقات تنہائی ناٹ میٹر کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ جس سے تنگ آکر بعض خودکشی تک کرلیتے ہیں۔ 1980ء سے 1986ء تک 65 برس یا اس سے زائد عمر کے 35 ہزار افراد نے خودکشی کی۔ اس شرح میں سفید فام افراد میں 23 اور سیاہ فام افرا میں 42 فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ میاں یا بیوی کے بغیر تنہا افراد میں بھی خودکشی کی شرح بھی خاصی زیادہ رہتی ہے کہ اس عمر میں تنہائی واقعی ناقابل برداشت ثابت ہوتی ہے۔ مردوں کے مقابلہ میں معمر عورتیں اس سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں۔

"بھان متی کا کنبہ"

امریکی کلچر کیا ہے؟

امریکہ میں کلچر نام کی کوئی چیز نہیں' امریکہ کسی ایک قوم' نسل' زبان اور مذہب والوں کا ملک نہیں اگر ایک خدا' مذہب' زبان اد

ماضی ہونے کے باوجود ہمارا کوئی کلچر نہیں بن سکا تو امریکہ میں ایسا ہو ہی نہیں سکتا ہاں یہاں بھان متی کا کنبہ کا کلچر ہو سکتا ہے۔

پہلے ان سے امریکہ تارکین وطن ور آبادکاروں کا ملک تھا' ہے اور رہے گا اگرچہ ہر آباد کار' امریکی ہوجاتا ہے مگر مجاز مرسل کے اسلوب میں وہ پاکستانی' ہندوستانی'چینی' جاپانی اور عرب بھی رہتا' ہے رہتا ہی نہیں بلکہ ہر ممکن طریقہ سے اپنا تشخص برقرار رکھنے کی بھی کوشش کرتا ہے خوراک' لباس' مذہب' ہر ذریعہ سے۔

نووارد احساس تحفظ کی بناء پر بالعموم ہم وطنوں کے ساتھ رہنے کو ترجیح دیتا ہے اسی لئے ہر بڑے امریکی شہر میں ایک چائینا ٹاؤن بھی نظر آتا ہے اس طرح اٹالین' اسپنش جاپانی' فلپینی' ہندوستانی' پاکستانی زیادہ تر اپنے مخصوص علاقوں میں آباد ہوتے ہیں۔ نیویارک میں جیکسن ہائٹس لاہور دھلی کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔

بالعموم دو نسلوں تک سابق وطن' زبان اور رشتہ داروں سے تعلق برقرار رہتا ہے لیکن ماحول زبان اور تعلیم کی وجہ سے تیسری نسل امریکی بن جاتی ہے۔ سابق وطن سے زبان کی وجہ سے ناطہ ٹوٹتا ہے۔ جب زبان گئی تو وطن اور اہل وطن بھی گئے اور ساتھ ہی کھانوں کے مخصوص ذائقے بھی۔ پوپ کارن پر پلا بچہ مکئی کی روٹی اور ساگ کی لذت کو کیا جانے گا؟

آباد کار کی دوسری نسل کے مقابلہ میں تیسری نسل صحیح معنوں میں امریکن مین اسٹریم میں شامل ہوتی ہے۔ بزرگوں کے مقابلہ میں ان کی کنڈیشنگ صحیح معنوں میں امریکی ماحول سے ہوئی ہوتی ہے۔ چند سطروں میں جس عمل کی نشان دھی کی گئی وہ اپنی انفرادی صورت میں خاصہ پیچیدہ ہوتا ہے کہ ہر فرد اپنے وجود میں ایک جزیرہ ہوتا ہے مگر تلخ حقیقت یہ ہے کہ اسے مجمع الجزائر میں زندگی بسر کرنا ہوتی ہے۔

امریکی کلچر کو موزیک سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جس طرح مختلف قطع کے رنگین شیشے مل کر موزیک میں تصویر کی تکمیل کرتے ہیں اسی طرح مختلف دیس کے باسیوں نے امریکہ کو اپنی اپنی سوغاتیں دی ہیں' ملبوسات' رقص' جیولری' میوزک' خوراک' مشروبات' ساز' خیالات' تصورات' شاعری' سامان تزئین' الغرض! امریکہ کے خانہ میں ہر قوم نے اپنا اپنا رنگ بھرا ہے۔ کثرت میں وحدت ہی امریکی کلچر کی اساس ہے۔ اس لئے آپ جو کچھ کھائیں' پئیں' کوئی نوٹس نہیں لیتا۔ اگر آج کسی چھومنتر سے تمام غیر ملکی امریکہ سے چلے جائیں تو باقی صرف سرخ ہندی ہی رہ جائیں گے!

"بحر نوشی"

جمہوریت کا ایک ضمنی فائدہ شخصی آزادی ہے اور بلاشبہ امریکہ میں شخصی آزادی کا کلٹ بن چکا ہے اتنی آزادی کہ ہم محصور پاکستانی اس کا اندازہ بھی نہیں لگاسکتے انفرادی سطح پر ٹاپ لیس عورت تو اجتماعی سطح پر ہم جنس پرستوں کے کلب' ریستوران' بار اور ان کے مخصوص اخبارات ہیں۔

نیویارک میں ہم جنس پرستوں نے جلوس نکالا' میں جلسے جلوسوں کا آدمی نہیں لیکن اگر معلوم ہوتا ہے تو ضرور دیکھتا (شرکت نہ کرتا) کہ Gays اور Dykes جم غفیر دیکھنے میں کیسا لگتا۔

عام امریکی سب کچھ چھوڑ سکتا ہے مگر اپنے "رائٹس" نہیں اور رائٹس میں سب کچھ آجاتا ہے۔ حکومت کے خلاف نعرے سے لے کر عریاں اداکاری تک جب ایک ہوٹل کی نیوڈ ڈانسر کا ڈانس فحاشی پھیلانے کے الزام میں شہری انتظامیہ نے بند کردیا تو اس نے مقدمہ کردیا اس کے وکیل کا یہ استدلال تھا کہ ڈانس نیوڈ نہیں بلکہ یہ تو اس کی شخصیت کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ اب تو یوں محسوس ہونے لگا ہے کہ امریکی خود اپنی آزادیوں کے غلام بن کر رہ گئے ہیں۔ ہم سراب کے ماروں کے لئے پانی کا تصور بہت خوشگوار ثابت ہوتا ہے لیکن زیادہ آسودگی کا مطلب بحر نوشی بھی تو نہیں!

"چھو منتر"

امریکی سب سے پہلے چاند پر پہنچے۔ وہاں کمپیوٹر ہے' طرح طرح کی ایجادات' مشینیں' ان کی سیٹلائٹس نظام شمسی کے بعید ترین گوشوں کی تصاویر ارسال کررہی ہیں۔ الغرض! ہم تیسری دنیا کے پس ماندہ افراد کے لئے امریکہ ترقی' سائنس' عقل و دانش اور منطق کی قوی ترین علامت ہے۔ لیکن میں نے دوران قیام بعض ایسے واقعات سنے کہ دنگ رہ گیا۔

سترہ برس کے دو لڑکے قبر کھود کر مردہ کی کھوپڑی نکال رہے تھے کہ پکڑے گئے۔ معلوم ہوا کہ یہ کھوپڑی جادو کی رسموں میں استعمال ہوتی ہے اور ایک کھوپڑی کے ہزار ڈالر تک مل جاتے ہیں۔ میں لاس اینجلس میں تھا تو اس واقعہ کا بہت چرچا ہوا' ایک رات کے وقت ایک بل بورڈ پر ایک مقتول لڑکی کا ہیولی ابھرتا تھا جسے دیکھنے کو خلقت جمع ہوجاتی۔ ایک عورت نے اپنے مکان فروخت کردیا مگر پھر ارادہ بدل کر خریدار کو رقم واپس لوٹا دی۔ اس گھر میں بھوت تھے جن کے اہل خانہ سے بہت خوشگوار تعلقات تھے لہٰذا وہ اپنے بھوت غیروں کو سونپنے کو تیار نہ تھی اس کا مطلب ہوا کہ پھر "گھوسٹ اور مسز موبر" جھوٹ نہیں اور Bewitched کی مقبولیت بھی سمجھ میں آجاتی۔ ہے اور Rosemarys Babay اور "Bell Book and Candel" جیسی فلموں کی پسندیدگی بھی!

عام تصور کے برعکس امریکیوں کو بھی ہم شریفوں کی مانند جادو' ٹونے' مستقبل بینی' روحوں سے گفتگو' کرسٹل گیزنگ اور عموی توہمات سے دلچسپی ہے۔ لو چارم' لک چارم محض رومانی کہانیوں کی چیزیں نہیں بلکہ عام معمولات میں سے ہیں۔ بڑے شہروں میں جادو کی رسومات میں استعمال ہونے والی اشیاء کے باقاعدہ اسٹور ہیں۔۔۔ وجہ وہی انسانی کمزوری۔ یعنی ہر قیمت پر حصول مقصد اور حصول محبوب!

پیارے پاکستانی! اگر امریکہ جاکر کسی کا بندہ بے دام بننے کو جی چاہے تو اسے عشق پر محمول نہ کرنا ہوسکتا ہے نیلی آنکھوں والی جادوگرنی ہو۔ اسی نے کافی میں Love Potion ملاکر پلادیا ہو۔ ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے دیتے ہیں!

"ہر تیرھواں امریکی۔۔۔"

ڈالر کو روپے پر ضرب دینے سے حاصل ضرب ہمیں شاداں و فرحاں کردیتا ہے لہٰذا ڈالر دیس کے خواب دیکھے جاتے ہیں لیکن خود ڈالر دیس کے باسی کس حال میں ہیں۔ سیاح کو اس کا بھی اندازہ نہیں ہوپاتا کہ وہ تو قابل دید عمارات اور ناقابل دید عورتیں دیکھ دیکھ کر نہال ہورہا ہوتا ہے۔

ہمارے بھائی امریکی معیار سے کماکر اپنے معیار سے دیتے ہیں۔ یوں حاصل بچت دیسی اور تحائف پانے والے اہل خانہ کو خوش رکھتا ہے۔ وطن آتے ہیں تو ڈالر وائرس میں پھیلانے کا موجب بنتے ہیں۔

جس طرح ہم سطح زمین سے چاند تام 2/5 حصہ کبھی بھی نہیں دیکھ سکتے اسی طرح امریکی زندگی کے کچھ پہلو کا ادراک بہت مشکل ہے مثلاً جرائم 'منشیات' بے روزگاری' غربت' بے گھری حتی کہ فاقہ کشی۔ یہ سب کچھ وہاں ہے۔ 1992ء کے اعداد و شمار کے مطابق واشنگٹن دنیا بھر میں جرائم کے لحاظ سے سرفہرست قرار پایا۔ بیکاری کی شرح 8 فی صد اور مفلسی کا یہ عالم کہ ہر تیرھواں امریکی بھوکا سوتا ہے چنانچہ ایک رپورٹ کے مطابق "ایسے غربت کے مارے بھوکے لوگوں میں روزانہ اضافہ ہوتا جارہا ہے اور یہ مسئلہ ہر امریکی ریاست میں بھی موجود ہے۔ امریکی ریاست جارجیا کے شہر اٹلانٹا میں بے گھر اور بھوکے افراد کی تعداد پورے امریکہ میں سب سے زیادہ ہے جب کہ کوکین ہیروئن اور دوسری نشہ آور چیزوں کی لت بھی اس علاقہ میں سب سے زیادہ ہے اور اقتصادی صورت حال بھی خراب ہے۔ اور کساد بازاری کے سبب بے شمار افراد بے روزگار ہوتے ہیں جو روزگار کی تلاش میں دربدر کی ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ حکومت انہیں بے روزگاری الاؤنس تو دیتی ہے لیکن وہ بھی سال چھ مہینے سے زیادہ نہیں چل پاتا لہٰذا کھانا مفت تقسیم ہونے والی جگہوں پر لوگوں کو

قطاریں نظر آتی ہیں۔ اٹلانٹا میں ان بے گھر لوگوں کی زیادہ تعداد سیاہ فاموں کی ہے" (روزنامہ جنگ 28 اپریل ۱۹۹۴ء)۔

"حاصل کلام"

اُٹھیں میرؔ تجھ سے بھی یہ خواریاں
نہ بھائی ہماری تو ہمّت نہیں

(امریکہ کے سفرنامے "اک جہاں سب سے الگ" کا آخری باب)

سرورق: ہینری ماتس کی ایک پینٹنگ

شمارہ نمبر ۶۲ (ناولٹ نمبر) اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴ء

ناشر: نسیم دُرّانی ـــ طابع: احباب پرنٹرز ـــ مقام اشاعت: بلاک ڈی، شیر شاہ کالونی، کراچی ۷۵۷۳۰

آدب • آرٹس • کلچر

سہ ماہی

سیپ

ماہنامہ

الفاظ

ماہنامہ

سمندر

آرٹس

سیپ پبلیکیشنز

پوسٹ بکس نمبر 3224 کراچی 75730
فون — 673267 — 6320106
فیکس — 92-21-684028


ریشم جیسی نرم ملائم
کریم اور لوشن
آپ کے سراپا کے لیے
ریشم سا احساس
MPL